Scanned with CamScanner

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر
اطہر حسین

نائب مدیرہ
شازیہ حمیر

مارکیٹنگ و
سرکولیشن مینجر
ثمر عباس
0301-2454188

07 انشائیہ — جون ایلیا
اس کارگاہ فریب و مکر میں چشم بینا و بصیرت کی مزاحمت کا ماجرا، وہ تحریریں جو ہمیشہ پائندہ رہتی ہیں۔

08 آپ کے خط — مدیرِ اعلیٰ
سسپنس کی محفلِ مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پُرخلوص مشورے

12 ظالم مظلوم — زویا صفوان
ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

35 تلاش — دانش مرزا
محبت کی خاطر جان جوکھوں میں ڈالنے والے عاشق کی کہانی

48 رمز شناس — نازیہ کامران کاشف
خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان

71 قصۂ ناتمام — نعمان اسحاق
معاش کی خاطر دست طلب کرنے والے نوجوان کی بے بسی

76 چیرہ دست — ملک صفدر حیات
ایک نوجوان کے قتل کی لرزہ خیز واردات کا معما

99 زندگی — اے آر راجپوت
سچی محبت کی تلاش میں سرگرداں ایک لڑکی کا ماجرا

108 محفلِ شعر و سخن — قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

جلد 54 • شمارہ 11 نومبر 2025 • زرِ سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 200 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

**دائیں ہاتھ کا کھیل** 111
عیوق بخاری
بلاغرض بھلائی کرنے والے ایک نوجوان کی خودداری

**جنگ باز** 120
ڈاکٹر عبدالرّب بھٹی
معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خون ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

**جال** 145
غنی خان
لالچ میں بھیانک جرم کرنے والے اداکار کا قصہ

**تاوان** 157
مہوش اسد شیخ
ماورائی مخلوق کی ایک جوڑے کے خلاف کارروائی

**بارش کا قیدخانہ** 163
محمد عثمان ذوالفقار
طوفانی بارش میں گھرے زندگی بچانے کی جدوجہد کرنے والے فوجیوں کا احوال

**شاہ شجاع کرمانی** 171
ضیا تسنیم بلگرامی
ایک واصل بحق درویش کے دلچسپ اور ایمان افروز واقعات

**سحر طراز** 179
جاوید بسام
دولت کے لالچ میں جادو کا سہارا لینے والے ایک شخص کا عبرت اثر انجام

**انہونی** 189
عمران قریشی
حالات سے گھبرا کر اپنا سب کچھ لٹا دینے والے شخص کا غلط اقدام

**دیس پردیس** 200
ناہید سلطانہ اختر
دلوں میں امنگ آنکھوں میں سہانے خواب سجائے پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان

**کترنیں** 000
ادارہ
دنیا بھر سے ابھرا ٹھیرے لطیفے چٹکلے اقتباسات مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے



پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول، مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی


digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

انشائیہ

جون ایلیا

# پہچان

میں نے دنیا کی ایک اعلیٰ حکمت سے خبر، خیال، خوش اندیشی، خیر طلبی اور خجستہ کاری کے رموز و اسرار اور راستی کے نہاں اور آشکار کا کچھ توشہ حاصل کیا ہے تاکہ تمہاری شنوائیوں اور بینائیوں کے درمیان برابر برابر بانٹ دوں۔ میں نے اس حکمت سے معنی اور بیان کی وہ دولت پائی ہے جو امن کے دن اور رات کی بدحالی میں تمہارے کام آئے گی۔

اس توشے کو روح اور دماغ کی سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے والی غذا کے حصار قرار پایا اور اس دولت سے شعور اور شائستگی کی سب سے زیادہ بیش قیمت متاع کو اپنا حق ٹھہرایا۔

میں نے اس نادر حکمت سے تمہارے وجود کے باطن اور ظاہر کے لیے جو کچھ کسب کیا ہے، وہ یہ ہے کہ صبح اور شام کی جس کاحرلی میں راہ سے بے راہ ہو جانے کا ڈر ہو اس کے حق میں اپنے گھٹنوں کو شل جانو۔

دلدل کی طرف بڑھنے سے زندگی بھر ایک پتھر کی طرح بے جنبش رہنا کہیں بہتر ہے۔ اس بات کو مت جھٹلاؤ کہ تم اب تک، اس آن تک ایک نگل جانے والی دلدل کی طرف بڑی ترنگ کے ساتھ بڑھتے رہے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ بڑے دکھ کی بات ہے اور اسے بڑے دکھ کے ساتھ کہنا اور سننا چاہیے کہ ایسا ہی تو ہے۔ تم جھوٹ کی اس دلدل کی طرف کب تک بڑھتے رہو گے، آخر کب تک؟

جھوٹ پر لعنت بھیجو اور سچ جہاں بھی ہو اس تک پہنچنے کے لیے دل اور جاں سے گزر جاؤ۔ سچ کے سفر کا آغاز بڑا ہی جان لیوا ہوتا ہے۔ اس میں سفر، اذیت ناک سوزش سے دہکنے لگتا ہے، تلووں میں آبلے اگنے لگتے ہیں اور ستانے کی ایک گھڑی بھی نصیب نہیں ہوتی۔

اگر مسافر نے اس دکھتی اور چبھتی ہوئی اذیت کو سہار لیا تو جانو کہ وہ اس لمبے انجام تک پہنچ گیا۔ ایک ایسے فرخندہ اور فیروز مندانہ انجام تک جسے دیکھنے والے اور اس کے بارے میں سننے والے وہ لوگ بھی جن کی زندگی پر ہمیشہ رشک کیا جاتا رہا ہو، اپنی ساری زندگی اس انجام پر رشک کرتے ہوئے گزار دیں۔

تم میں سے بہت سے لوگ شاید یہ جاننا چاہیں کہ سچ آخر ہے کیا؟ سچی بات یہ ہے کہ میں یہ بتانے سے یکسر قاصر اور عاجز ہوں کہ سچ کیا ہے؟ اس لیے کہ سچ کو شاید جانا نہیں جا سکتا، پر ایک عجیب بات ہے کہ اسے ہر آن اور ہر ساعت پہچانا جا سکتا ہے اور پہچانا گیا ہے، پہچانا جاتا ہے۔

کیا یہاں میں ایک بات کہوں؟ کہو کہ ہاں...... وہ بات یہ ہے کہ جاننے میں اتنی بھلائی نہیں جتنی بھلائی پہچاننے میں ہے۔ پھر یہ کہ جاننے کی بہت سی شرطیں ہیں، بہت سی کڑی شرطیں۔ اس کے لیے دنیا کے بہت سے ہنر سیکھنا پڑتے ہیں اور بہت وقت لگانا پڑتا ہے جو ضائع بھی جا سکتا ہے۔ جاننا ایک پیشہ ہے اور پیشہ تو پیشہ ہی ہوتا ہے، وہ بیٹھے بیٹھے تو نہیں آ جاتا۔

اب رہا پہچاننا تو وہ کوئی "پیشہ" نہیں ہے۔ وہ تو وجود کی معنی شناسی کا معاملہ ہے۔ سو میں تم سے جو بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنے اندر' انسانوں اور "شیطانوں" کی پہچان پیدا کرو کہ پہچان ہی دل اور دانائی کی جان ہے اور وہ انسانوں کے کچھ خاص گروہوں کی میراث نہیں ہے۔

تم ان زبردست لوگوں کو آخر کیوں نہیں پہچانتے جو تمہیں بڑی بے دردی کے ساتھ اپنا زیردست بنائے ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے تو تمہیں جوتوں کی طرح پہن رکھا ہے۔ کیا یہ بات سچ نہیں ہے؟ اگر یہ سچ ہے اور تم اس سچ کو پہچانتے ہو تو پھر کس وجہ سے ان کے جھوٹ اور جھانسوں کو رعایت پر رعایت دیتے چلے آ رہے ہو۔ آخر تم نے ان سے کیا پایا ہے؟ تم نے تو ان کی خاطر سب کچھ کھویا ہے، ڈبویا ہے۔

پہچان سے کام لو اور چوروں کو کوتوال سمجھنا چھوڑ دو۔ تم ان کے لگاتار جھوٹ اور جھانسوں کے مارے ہوئے ہو اور اپنے آپ کو بری طرح ہارے ہوئے ہو۔ قزاقوں کو طبقے کے طور پر بھی سالارِ کارواں نہ کہو۔ یہ لوگ بھونکنے والے کتے اور پھاڑ کھانے والے درندے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے پر غراتے ہیں۔ توانا، ناتواں کو نگل رہا ہے اور بڑا چھوٹے کو (اپنے) پیروں تلے کچل رہا ہے۔ ان میں کچھ چوپائے بندھے ہوئے ہیں اور کچھ چھٹے ہوئے ہیں۔

دوسروں کے غلام بن کے نہ رہو جبکہ خدا نے تمہیں آزاد بنایا ہے۔ اس بھلائی میں کوئی بھلائی نہیں جو برائی کے وسیلے سے حاصل کی جائے اور اس آسودہ حالی میں کوئی بہتری نہیں جس کی خاطر سختیاں جھیلنا پڑیں۔ سب سے برا کھانا وہ ہے جو حرام ہو اور سب سے بڑا ظلم وہ ہے جو کسی ناتواں پر کیا جائے۔

ظالم چاہے اقتدار کی مسندوں پر بیٹھے ہوں یا ان پر بیٹھنے کی ہوس میں ہوں، وہ ہیں بہرحال ظالم ہی۔ ان سے کہو "تم نے لوگوں کے ایک بڑے گروہ کو تباہ کر دیا ہے اپنی گمراہی سے انہیں دھوکا دیا ہے اور انہیں اپنے سمندر کی موجوں میں ڈال دیا ہے۔ ان پر اندھیرے چھائے ہوئے ہیں۔"

سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ پہچان سے کام لو اور صیادوں کو پاسباں نہ سمجھو۔ یہ تمہاری آزادی کے بیری ہیں۔ یہ لوگ اپنے سوا سب کو دیگر اور اسیر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسی میں ان کا عیش اور ان کی آسائش ہے۔ سو پہچان سے کام لو اور ان میں سے کسی کے بھی دھوکے میں نہ آؤ۔

■■■

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

# آپ کے خط

قارئین اکرام!
السلام علیکم!

نومبر 2025ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس ماہ میں ہم شاعرِ مشرق، شاعرِ ملت، مفکرِ اسلام اور مصورِ پاکستان ڈاکٹر محمد علامہ اقبال کا یومِ ولادت عقیدت و احترام کے ساتھ مناتے ہیں۔ علامہ اقبال متحدہ ہندوستان کے وہ فکری راہنما تھے جنہوں نے مسلمانوں کے دورِ زوال میں جنم لیا مگر انحطاط و پستی کی نوحہ گری کرنے کے بجائے نسلی، لسانی، فرقہ وارانہ اور علاقائی گروہوں میں بٹی منتشر الخیال قوم کو خودی، شناسی، وحدت و فکر و عمل اور انقلاب و اجتہاد کا درس دیا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے شاعری اور نثر دونوں اصنافِ سخن کا سہارا لیا اور یہ فکری پیغام دیا کہ اگر اسلامیانِ برصغیر ایک پلیٹ فارم پر ایک قیادت کے جھنڈے تلے اکٹھے نہ ہوئے، گروہوں اور فرقوں میں بٹے رہے تو تشخص اور شناخت سے محروم ہو جائیں گے۔ انہوں نے منزل کے حصول کے لیے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی شکل میں ایک عظیم قائد کی اسلامیانِ برصغیر کو قیادت بھی فراہم کی۔ لہٰذا ہمیں اس دن کو وطنِ عزیز کے لیے کچھ کرنے کا عزم کرتے ہوئے جوش و جذبے سے منانا چاہیے۔ ادھر عالمی منظر نامے کی طرف دیکھا جائے تو اسرائیل کی جنگی جارحیت جاری ہے۔ اسرائیل فلسطین تنازع دنیا کے سب سے زیادہ طویل تنازعات میں سے ایک ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے اس طویل اور خونی تنازعے کو دہائیاں گزر چکی ہیں جس کا مستقبل قریب میں بھی کوئی مستقل حل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ مسلم ممالک کی جانب سے مکمل خاموشی بھی ایک المیہ ہے۔ لاکھوں بے گناہ فلسطینیوں پر دہکتی آگ برسائی جا رہی ہے جس سے معصوم بچے بھی محفوظ نہیں۔ خوراک و ادویات کی قلت ہے اور اسرائیل کی جانب سے وہاں امداد پہنچانے پر بھی پابندی ہے۔ وہ خود امداد کے نام پر لوگوں کو ایک جگہ جمع کر کے وہاں بمباری کر دیتا ہے جو نسل کشی اور بربریت کی انتہا ہے۔ بیشتر ممالک کے لوگ اس پر احتجاج کر رہے ہیں۔ اسی تناظر میں صمود فلوٹیلا نامی 40 سے زائد کشتیوں کا قافلہ غزہ محاصرے کو ختم کرنے کی نیت سے اسرائیل جا رہا تھا اور ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں امدادی سامان خود سے تقسیم کرنے دیا جائے۔ قافلے میں کئی ممالک کے ارکان اور دانشور شامل تھے۔ غزہ کے قریب پہنچنے پر اس قافلے کے لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے قبل بھی گریٹر تھنسل نامی قافلے کو راستے میں روک کر انہیں گرفتار کیا جا چکا ہے۔ اس قافلے میں پاکستانی سینیٹر مشتاق احمد بھی شامل تھے۔ تاہم آخری اطلاعات آنے تک انہیں رہا کر دیا گیا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام مسلم ممالک اس بربریت کے خلاف ایک ہو جائیں اور صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے اسرائیل کو لگام دینے کے لیے ٹھوس اقدامات کریں ورنہ وہ دن دور نہیں جب اسرائیل بدمست ہاتھی کی طرح کسی بھی ملک پر چڑھ دوڑے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کی مدد فرمائے اور تمام مسلمانوں کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی توفیق دے، آمین۔ چلتے ہیں محفلِ خطوط کی طرف جہاں قارئین کے تبصرے ہمارے منتظر ہیں۔

❁ نگاہ حسیب، راولپنڈی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ”ایک طویل غیر حاضری کے بعد پھر سے تازہ شمارے پر تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں۔ اگرچہ جے ڈی پی سے تعلق نہ ٹوٹنے جیسا ہے مگر پھر بھی کبھی کبھی کچھ شمارے پڑھنے سے رہ جاتے ہیں اور کبھی تبصرہ بھیجنے سے اور جب تبصرہ اور مطالعہ دونوں ہو جائیں تو آخری تاریخ گزر جاتی ہے (جناب! تاریخ گزر بھی جائے تو تبصرہ ارسال کر دیا کریں، اسے آئندہ شمارے میں جگہ مل جائے گی)۔ بہرحال شمارے کی طرف بڑھتے ہیں۔ سب سے پہلے تو فہرست میں جناب کاشف زبیر صاحب کا نام دیکھ کر بے اختیار انہی کی تحریر ”کالا جادو“ پڑھنا شروع کی۔ کالے جادو سے متعلق ایک سبق آموز اور عبرت ناک کہانی تھی، عام فہم سے انداز میں لکھی گئی یہ تحریر سید عادل کو چھو گئی۔ ایک بات جو سب سے اہم لگی، وہ یہ تھی کہ کالے جادو کے ذریعے کام ہو تو جاتے ہیں مگر ان کی قیمت چکانا پڑتی ہے، پھر کون جانے کہ ان کی قیمت، حاصل سے بھی کئی گنا زیادہ ہی دینی پڑ جائے۔ اللہ ہم سب کو ان شیطانی کاموں اور ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ جاوید بسام کی تحریر ”پراسرار مہمان“ ایک دلچسپ اور قدرے جدید طرز کی تحریر رہی۔ معصوم بچے کی چھٹی حس نے جس طرح اسے خطرے کا احساس دلایا اور پھر اس کی دشمن کے خلاف کارروائی، سادہ مگر پراثر تحریر تھی۔ عائشہ نصیر کی تحریر ”تاریک سائے“ جرم و سزا کی دنیا کی ایک دلچسپ اور تجسس سے بھرپور تحریر رہی۔ دہری شخصیت کا مالک شخص جسے خود بھی علم نہیں تھا کہ اس سے قتل سرزد ہوا ہے یا نہیں اور پھر قاتل کو سب کے سامنے پکڑنے کا منصوبہ کافی سنسنی خیز ثابت ہوا تھا۔ مجموعی طور پر ایک بہترین تحریر تھی۔ علی اختر صاحب کی تحریر ”بن مول“ دو مرتبہ پڑھنے کے باوجود سر کے اوپر سے گزر گئی۔ کچھ سمجھ نہیں آسکا اور بیان کردہ واقعات کا آپس میں ربط ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکا۔ عامر شاہین کی تحریر ”سوتیلا باپ“ کا موضوع اگرچہ نیا نہیں تھا اور انجام بھی خاصا متوقع تھا، بہرحال کہانی کو اچھے انداز میں لکھا اور نبھایا گیا تھا۔ فاطمہ حسام کی تحریر ”شکارگاہ“ مغربی پس منظر میں لکھی گئی ایک دلچسپ تحریر تھی۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد دنیاوی سیاست کے موضوع پر لکھی گئی ایک ایکشن سے بھرپور کہانی جس میں تجسس کا عنصر خوب رہا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ قدم قدم پر بدلتی ہوئی صورتِ حال نے قاری کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لیے رکھا مگر اس کہانی کا انجام نہایت عجلت کا شکار نظر آیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہانی کو زبردستی سمیٹا گیا ہے لہٰذا تشنگی باقی رہی۔ منظر امام صاحب کی تحریر ”مفرور“ پڑھ کر بہت دیر تک دل غمگین رہا۔ ایک ایسی لڑکی کی داستان جس کی خوبصورتی ہی اس

کی بربادی کی وجہ بن گئی تھی۔ کبھی کبھی انسان کو یوں ہی ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنا پڑتی ہے، بہرحال قلم کرنے والے بھی کبھی خوش نہیں رہتے۔ اللہ سب کو ہدایت دے۔ عثمان ذوالفقار کی تحریر ''ناکردہ جرم'' کافی اچھی ہوئی کہانی محسوس ہوئی۔ مجھے روبوٹس کا اس طرح تیار کیا جانا بالکل سمجھ نہیں آسکا۔ اگر کسی وجہ سے دلی تسکین کی غرض سے ایسا کیا بھی گیا تھا تو پھر یہ غیر قانونی کیونکر ہوا جبکہ جرم اصل میں تو سرزد ہوا ہی نہیں۔ جب جرم نہیں ہوا تو پھر اس کی سزا چہ معنی دارد...... شاہد نقوی کی تحریر ''خزانچی'' ایک سادہ مگر غیر حقیقی سی کہانی لگی۔ ہوسکتا ہے یوں ہی کچھ لوگ کہانیاں مشہور ہوں اور پھر ہر زبان زدِ عام ہوتی ہوں۔ حسام بٹ کی تحریر ''تیرہ بخت'' ہمیشہ کی طرح بہترین اور سنسنی خیز رہی۔ مرزا امجد بیگ کی کہانیوں میں سب سے دلچسپ حصہ عدالت کی کارروائی والا ہوتا ہے جسے پڑھ کر قاری حقیقی معنوں میں محظوظ ہوتا ہے۔ قتل کے الزام میں گرفتار ایک بے گناہ شخص کی بے گناہی ثابت کرنے اور اصل مجرموں تک پہنچنے کے لیے جو تانے بانے بنے گئے، ہمیشہ کی طرح دلچسپ اور تجسس سے بھرپور رہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریر ''گمنام منزلیں'' کے بارے میں کچھ بھی لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ مغل صاحب کی یہ تحریر دلچسپی اور تجسس سے بھرپور رہی جس نے آخر تک قاری کو اپنے ساتھ باندھے رکھا۔ تمام قلمکاروں اور انتظامیہ کے تمام اراکین کی محنت اور کوششوں کے لیے بہت بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آمین (آئندہ ماہ تبصرہ بھیجنا نہ بھولیے گا)۔''

☒ رفعت مقصود کی بھول، سیالکوٹ کینٹ سے۔ ''پہلی بار ستمبر کے سسپنس ڈائجسٹ کے لیے خط لکھا تو میں اپنا اور شہر کا نام لکھنا بھول گئی۔ آپ نے محترمہ نامعلوم کا خط، نامعلوم شہر سے لکھ کر شائع کیا (شکر ہے آپ کو یاد آگیا ورنہ نامعلوم ساتھ ساتھ چلتا رہتا)۔ مجھے بہت ہنسی آئی۔ اکتوبر کا سسپنس بھی دیر سے ملا۔ سرورق اچھا تھا۔ سرورق کی لڑکی شیمپو کنڈیشنر سے بال دھو کر، لپ اسٹک اور آئی لائنر لگا کر اپنے محبوب کے خیالوں میں مستغرق تھی۔ جون ایلیا صاحب کی حساب فہمی نے ششدر کر دیا۔ تاریخ واقعی قوموں کے اعمال کے مطابق حکمران منتخب اور مسلط کرتی ہے۔ سب خطوط اچھے تھے۔ زویا صفوان کی ''ظالم مظلوم'' کا تیسرا حصہ پڑھا۔ آخر میں پھر جاری ہے تھا پھولن دیوی کی کہانی اچھی لگی۔ اس بار بارشوں نے بہت تباہی مچائی تھی کہ بارش کی دعا کرتے بھی ڈر لگنے لگا۔ اتنے مہینوں بعد منظر امام کی کہانی ''مفرور'' دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اللہ منظر امام صاحب کو زندگی و صحت دے (آمین)۔ واقعی جب خدا ساتھ دینے پر آتا ہے تو راستے خود بخود ہموار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ محمد عثمان ذوالفقار کی کہانی ''ناکردہ جرم'' میں شوہر بیچارہ بیوی کا روبوٹ بنوا کر اسے قتل کر کے زندہ بیوی کے قتل کے الزام میں پھانسی پر چڑھ گیا۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی کہانی ''تیرہ بخت'' کے شروع میں ہی محاوراتی جملے تھے۔ وکیل صاحب اور پولیس کی کہانی ہمیں بہت اچھی لگی ہے۔ جب کوئی بے گناہ مصیبت میں پھنسے اور وکیل صاحب اس کی مدد کر کے اسے اس جال سے نہ نکالیں، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے ہی ہوتا ہے جب بڑے لوگوں کی برائی کسی کو پتا چل جائے تو وہ اسے کسی کیس میں پھنسا دیتے ہیں۔ شاہد نقوی کی کہانی ''خزانچی'' اچھی تھی۔ اجو کا مرنے کے بعد نام نوٹوں والی سرکار رکھ دیا گیا۔ بیٹے نے باپ کا مزار بنا کر اسے کمائی کا ذریعہ بنالیا۔ بعض عورتیں ضد میں طلاق لے لیتی ہیں، جب اجو اسے بسانا چاہتا تھا تو اسے شوہر کو تپانے کی کیا ضرورت تھی؟ محفلِ شعر و سخن میں صفیٰ سہیل، کلیم قریشی، ڈاکٹر فرحت اور راجا ناصر کے اشعار اچھے تھے۔ فاطمہ حسام کی کہانی ''شکارگاہ'' میں دونوں میاں بیوی دوسروں کو پھنساتے خود بھی پھنس گئے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے ناول ''جنگ باز'' کی چوالیسویں قسط بھی ایکشن سے بھرپور تھی۔ جاوید بسام کی کہانی ''پراسرار مہمان'' ماورائی سی کہانی تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ''سہل بن عبداللہ تستری'' کا دوسرا اور آخری حصہ بھی اچھا تھا۔ عائشہ نصیر کی کہانی ''تاریک سائے'' یادِ ماضی پر مبنی تھی۔ علی اختر کی ''بن مول'' بھی اچھی تھی۔ عاطر شاہین کی کہانی ''سوتیلا باپ'' میں اس باپ نے رشتوں کے تقدس کا خیال بھی نہیں رکھا۔ مغل صاحب کا ناول ''گمنام منزلیں'' کی آخری قسط اچھی رہی۔ تیمور کو زلال گئی۔''

☒ زوبینہ اشعر کی مبارک باد، کراچی سے۔ ''ملک بھر میں سیلاب کی تباہ کاریوں کے اثرات ابھی باقی ہیں، ہزاروں افراد اپنے گھربار اور مال مویشی سے محروم ہو گئے۔ سیکڑوں افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اللہ پاک رحم فرمائے اور دعا ہے کہ اس مشکل گھڑی میں سب کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ اکتوبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل پسند آیا۔ فہرست والے صفحے پر نظر ڈالی تو سائڈ والے کالم میں مدیر اطہر حسین کا نام نظر آیا۔ اس تبدیلی پر حیرت کے ساتھ پر امید بھی ہوئے کہ نئے مدیر پرچے کو مزید نکھاریں گے اور چار چاند لگائیں گے۔ بہرحال اطہر حسین صاحب کو یہ بھاری ذمے داری سنبھالنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد۔ جون ایلیا کا انشائیہ ''حساب فہمی'' بھی خوب رہا۔ انہوں نے درست فرمایا کہ آج ہم اپنی بدبختیوں کی ذمے داری کبھی تاریخ، کبھی جغرافیہ، کبھی دوستوں اور کبھی دشمنوں کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ کبھی ہم اپنا حساب بھی دیں، اپنے نامۂ اعمال پر ایک نظر تو ڈالیں۔ خطوط کی محفل میں مدیر صاحب ملک میں سیلاب کی تباہ کاریوں پر سیر حاصل گفتگو کرتے نظر آئے۔ ان کی ہر دعا پر آمین کہتے ہیں۔ مہتاب احمد اپنے شاندار تبصرے کے ساتھ کرسیٔ صدارت پر براجمان نظر آئے۔ مبارک باد قبول کریں۔ محفل میں نازیہ سلطان کو خوش آمدید، تبصرہ پسند آیا۔ امید ہے محفل میں ان کی حاضری برقرار رہے گی۔ دیگر احباب میں ملک وحید، ناہید یوسف کی حاضری بھی اچھی رہی۔ عون احمد اپنے شاندار تبصرے کے ساتھ پہلی بار نظر آئے، انہیں بھی محفل میں خوش آمدید۔ اب یہ حاضری ہر ماہ یقینی بنائے رکھیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے زویا صفوان کی ''ظالم مظلوم'' کا تیسرا حصہ پڑھا۔ کہانی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ پھولن اب اپنے اوپر کی گئی ہر زیادتی کا بدلہ لینے کی ٹھان چکی ہے اور اب اس کی بے بسی، کرب، اذیت اور مجبوریاں ایک وحشیانہ انتقامی جذبے میں ڈھل چکی ہیں۔ آگے بھی مزید دلچسپ اور

سنسنی خیز واقعات پڑھنے کو ملنے والے ہیں۔ منظر امام کی "مفرور" میں حالات سے نبرد آزما ایک حسینہ کی دلچسپ کہانی پڑھنے کو ملی۔ خوف میں لپٹی، پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والی نازیہ کامران کاشف کی تحریر "رمز شناس" کا آٹھواں حصہ زبردست رہا۔ ان کے قلم میں ایسا جادو ہے کہ قاری اس کے سحر میں جکڑ جاتا ہے۔ ساتھ ہی واقعات کا تسلسل، پلاٹ پر گرفت اور زبردست مکالمے قاری کا ذہن اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتے۔ ہم نے ایک ہی نشست میں پوری قسط پڑھ ڈالی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ محمد عثمان ذوالفقار کی "ناکردہ جرم" پسند آئی۔ مرزا امجد بیگ کی "تیرہ بخت" بھی خوب رہی۔ نازیہ اور خالد شاہی نے ملی بھگت کرکے ادریس کو عبدالکریم کے قتل میں پھنسا دیا لیکن مرزا امجد بیگ کی کڑی جرح کے باعث اصل مجرم اپنے انجام کو پہنچا۔ شاہد نقوی کی "خزانچی" دلچسپ رہی۔ فاطمہ حسام کی "شکارگاہ" نے کچھ خاص تاثر قائم نہیں کیا۔ کاشف زبیر کی "کالا جادو" حرص و ہوس کی شکار ایک لڑکی کی عبرت اثر کہانی تھی، پسند آئی۔ جاوید بسام کی "پراسرار مہمان" اچھی رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی "سہل بن عبداللہ تستری" کا دوسرا اور آخری حصہ بھی خوب رہا۔ عائشہ نصیر کی "تاریک سائے" زبردست تحریر رہی۔ علی اختر کی "بن مول" دلچسپ تحریر تھی۔ عاطر شاہین کی "سوتیلا باپ" میں رشتوں کے تقدس کو پامال کرنے والے شخص کا لرزہ خیز انجام پڑھنے کو ملا۔ طاہر جاوید مغل کی "گمنام منزلیں" کا آخری حصہ زبردست رہا۔ پاور تمام مشکلات اور زمانے کی سختیوں کو جھیل کر بالآخر اپنے ملک واپس پہنچ گیا اور انسانی اسمگلروں سے خوب انتقام لیا۔ نرملا اور تیمور بھی بالآخر مل گئے۔ محفلِ شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب خوب رہا۔ کترنوں نے مزہ دیا۔"

⊕ سیما شاہ کی دعا، ڈیرہ غازی خان سے۔ "خط کا آغاز اس دعا کے ساتھ کہ اللہ جو رب رحیم ہے، کریم ہے، معاف کرنے والا ہے، وہ ہماری خطاؤں کو معاف کرے۔ ہماری مشکلیں آسان فرماتے ہوئے سیلاب زدگان کے حال پر بہ طفیل محمد ﷺ و آلِ محمد ﷺ کرم فرمائے، انہیں ان کی کمائی کی روزی اور ان کو ان کا اپنا گھر نصیب فرمائے، آمین۔ سیاسی بیان بازیوں اور دکانداریوں سے بچتے ہوئے ہمیں اللہ رب العزت کے سامنے کرم کے لیے گڑگڑانا چاہیے اور اپنے لاچار بہن بھائیوں کی مدد کرنی چاہیے۔ ہم دکھ، پریشانی کی گھڑی میں ان بھائیوں کے ساتھ ہیں جو بے گھر ہوگئے ہیں۔ یقین ہے کہ جلد ہماری دعائیں سن لی جائیں گی اور ان تمام دکھی لوگوں کو سکھ کی گھڑیاں ملیں گی، ان شاء اللہ۔ صدرِ محفل بنے مہتاب احمد کو ڈھیروں مبارک۔ روبینہ اشعر صاحبہ اپنے دلکش انداز میں موجود تھیں، اچھا تبصرہ تھا۔ نازیہ سلطان کو "خیر آیاں نوں"۔ اب آتی رہیں گی نا؟ یقیناً ہاں، تو پھر جاری رکھیے قلم کا یہ خوبصورت انداز۔ ملک وحید نے خوب حاضری دی۔ ناہید یوسف نے پُرمغز تبصرہ لکھا۔ روشنیوں کے شہر سے عون احمد کی حاضری پسند آئی۔ اب آتے ہیں رسالے کی طرف۔ منظر امام کی "مفرور"، جاوید بسام "پراسرار مہمان" عمدہ تحاریر تھیں۔ عاطر شاہین کی "سوتیلا باپ" بھی اچھی کہانی تھی۔ کترنیں زبردست تھیں اور اشعار بھی ہمیشہ کی طرح لاجواب تھے۔ ہر حال میں اپنا معیار برقرار رکھنے والا رسالہ مجموعی طور پر بے مثال تھا۔ قارئین، ادارہ، قلم کاروں کے لیے ڈھیروں دعائیں۔"

⊕ سید محی الدین اشفاق، فتح پور (لیہ) سے اپنی حاضری لگوا رہے ہیں۔ "حاضر ہیں اپنوں کی محفل میں۔ پسندیدہ رسالہ پڑھ چکے ہیں۔ موسم بارش کے بعد تبدیل ہوا ہے، گرمی کا زور ٹوٹ گیا ہے لیکن جس بدترین سیلاب کا سامنا کرکے مشکلات سے ہم نبرد آزما ہیں، اس میں بجائے سکون کے، بے چینی محسوس ہوتی ہے۔ اللہ پاک وطن اور اہلِ وطن کو مسائل کے گرداب سے نکالے اور ہمیں آنے والے وقت میں ان مصائب سے بچائے، آمین۔ مہتاب احمد کو کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ روبینہ اشعر کا حسبِ روایت بہترین تبصرہ تھا۔ نازیہ سلطان کو خوش آمدید۔ ملک وحید، ناہید یوسف، عون احمد کی حاضری بھی خوب رہی۔ سب سے آدھی ملاقات کا شرف حاصل کرکے کہانیاں پڑھیں۔ عائشہ نصیر کی "تاریک سائے" اور کاشف زبیر کی "کالا جادو" بہت پسند آئیں۔ "تیرہ بخت" کے ساتھ مرزا امجد بیگ بھی اپنے خوبصورت انداز میں نظر آئے۔ کترنیں کمال کی تھیں۔ ڈاکٹر نعیم اکبر بحر مانسہرہ والے کی کترن خوب لگی۔ اشعار سارے ہی پسند آئے۔ ادارے کی ترقی کے لیے دعاگو ہیں۔"

⊕ سیدہ روبینہ شاہین روبی، جھل، ساڈھو، پنجاب سے خط لکھ رہی ہیں۔ "طویل غیر حاضری کو خود ہی بری طرح محسوس کرتے ہوئے حاضر ہو رہی ہوں۔ موسم ہلکا ہلکا بدل رہا ہے، ہلکی سی بارش نے کافی تبدیلی پیدا کی ہے۔ بارش بس ہلکی اور رحمت کی ہونی چاہیے۔ پاکستان جس صبر آزما تکلیف سے دوچار ہے، اس میں بارش کے تیز ہونے کا خوف لرزا دیتا ہے۔ خدا سے دعا ہے سیلاب زدگان ہم وطنوں کی مشکلیں آسان کرے، ان کے گھر بسائے، ان کے چہرے پر سکون والی مسکراہٹ لائے، آمین۔ مہتاب احمد کرسیٔ صدارت پر نظر آئے، مبارک ہو۔ ہم نام جی! کیسی ہیں آپ۔ بھئی تبصرہ پڑھ کر تو ہمیشہ کی طرح بڑی باذوق لگیں۔ روبینہ اشعر صاحبہ کمال کا تبصرہ کیا ہے آپ نے۔ ملتان سے سوہن حلوے کی خوشبو لے کر آنے والی نازیہ سلطان کو ویلکم۔ اب مستقل آیئے گا، یہ درخواست ہے۔ ملک وحید نے خوبصورت تبصرہ لکھا۔ ناہید یوسف کا تجزیہ اور عون احمد کی باتیں بھی خوب رہیں۔ منظر امام کی "مفرور"، جاوید بسام کی "پراسرار مہمان" اور محمد عثمان ذوالفقار کی "ناکردہ جرم" بہترین کہانیاں ثابت ہوئیں۔ شاعری پسند ہے اس لیے سارے اشعار اچھے لگے۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ زبردست ہی ہوگا۔ اہلِ وطن کے لیے نیک خواہشات۔"

⊕ انجم فاروق ساحلی، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور سے۔ "امید ہے آپ اور ادارے کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ آج بھی ماضی کی طرح سسپنس کے آنے سے بک اسٹالوں کی رونق بڑھتی ہے۔ قارئین ہماری کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ "نہلے پر دہلا"...... مجسمے کی چوری سسپنس میں شائع ہوئی جو بالکل نئے واقعات اور نئے سیٹل مینکس کی تحریر تھی۔ "آلۂ قتل" بھی سسپنس میں



digest library.com

Scanned with CamScanner

شائع ہوئی۔ اس کے متعلق قارئین کی آرا، خصوصاً کراچی سے رمضان پاشا کے الفاظ محفوظ ہیں۔ ”کہیں کہیں ابنِ صفی کی یاد تازہ ہوگئی۔“ میں نے اپنے اطراف اور حلقۂ احباب میں ہمیشہ سسپنس کو اجاگر کیا۔ تخلیق کار (فنکار) کی زندگی تلوار پر چلنا ہے۔ زندگی کے پل صراط کا زیادہ سفر طے ہو چکا ہے، کچھ باقی ہے۔ امید ہے میرے اور قارئین کے درمیان رابطہ بحال کر دیا جائے گا۔ ملکی سلامتی اور سیلاب زدگان کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بہتر حالات کی طرف لے جائے۔ (جناب! آپ کہانیاں ارسال کریں۔ یقیناً اگر وہ اچھی و معیاری ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی، بس خیال رہے کہ کہانی مختصر ہو)۔“

✠ عون احمد، ملیر کراچی سے۔ ”سسپنس اکتوبر کا شمارہ وقت پر مل گیا۔ سرورق پر موجود جھکی جھکی پلکوں والی حسینہ کچھ سوچ رہی ہے یا شاید سونے کی تیاری میں ہے۔ لبوں پر دو الگ الگ شیڈ کی لپ اسٹک نظر آ رہی ہے۔ سرورق پر تبصرے کے بعد کچھ رسالے پر بھی تبصرہ ضرور ہو جائے۔ ”انشائیہ“ میں جون ایلیا صاحب حکمرانوں کے حساب کتاب کی باتیں کرتے نظر آئے۔ اب کہاں ہوں گے وہ حکمران جو حساب دیتے نظر آئیں۔ یہاں تو اب اللہ ہی دیکھنے والا ہے۔ خطوط کی محفل میں اپنا خط دیکھ کر دل خوشی سے بھر گیا۔ یقیناً یہ حاضری اب مستقل بنیادوں پر رہے گی۔ خطوط کو پڑھ کر تمام قارئین کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ اب ہم بھی ان تمام لوگوں کو جان گئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے سب سے پسندیدہ مصنف طاہر جاوید مغل کی کہانی ”گمنام منزلیں“ کی ابتدائی قسط پڑھی۔ مغل صاحب نے اس کہانی میں بہت اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور روزگار کی خاطر غیر قانونی طور پر بیرونِ ممالک جانے والوں کی مشکلات کو بہترین انداز میں واضح کیا ہے۔ یہ تاثر انگیز کہانی کافی عرصے تک ذہن میں زندہ رہے گی۔ ابتدائی صفحات پر موجود کہانی ”ظالم مظلوم“ بھی ہماری پسندیدہ کہانی ہے۔ زویا صفوان بہت تفصیل اور خوبصورتی کے ساتھ پھولن دیوی کی داستانِ حیات ہمیں سنا رہی ہیں۔ پڑھ کر دکھ کے ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے کہ ایک نازک سی لڑکی پر ایسے ظلم و ستم کرتے ہوئے کسی کے ضمیر نے بھی ملامت نہیں کی۔ یقیناً اس ظلم و ستم کے خاتمے اور بدلے کا وقت زیادہ دور نہ ہوگا۔ اس کے بعد باری آئی ”رمز شناس“ کی۔ کئی زمانوں پر محیط یہ کہانی نہایت خوبصورتی سے آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ شمس المعارف کے کرشمے اور برکتیں ظاہر ہوتی جا رہی ہیں۔ دل کی آنکھ سے پڑھی جانے والی کہانی ہے۔ ”رمز شناس“ کے بعد باری آئی بھٹی صاحب کی ”جنگ باز“ کی جو اپنے مخصوص انداز میں آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ حالات و واقعات کی ترتیب نہایت دلچسپ ہے۔ اب نگہت بھی سہراب کے ساتھ شامل ہو گئی ہے تو دیکھتے ہیں کہ میڈم ٹیمی اور بھانڈیل سائیں کا کیا حشر ہوتا ہے اور وسیم کا انجام کب تک سامنے آتا ہے۔ بات کریں چھوٹی کہانیوں کی تو منظر امام کا نام دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ ان کی کہانی ”مغرور“ بھی پسند آئی۔ کاشف زبیر بھی ایک پرانا نام ہے لیکن ان کی کہانی ”کالا جادو“ نے بڑا گہرا اثر چھوڑا۔ یہ جگہ جگہ بیٹھے ہوئے جھوٹے عامل کیسے کسی کے معاملات سنوار سکتے ہیں۔ شاہد نقوی کی کہانی ”خزانچی“ پڑھ کر مزہ آیا۔ اچھا ستارہ والا فرشتہ ہمیں بھی ملنا چاہیے تاکہ ہم بھی ایک کمرا ایسا بنا سکیں جس میں چھت تک پیسے بھرے ہوں، پھر کس کو کمانے کی فکر، مزے سے زندگی گزاریں گے۔ خیر ایسا حقیقت میں تو ممکن نہیں ہو سکتا۔ فاطمہ حسام کی ”شکارگاہ“ بھی پسند آئی۔ عائشہ نصیر ”تاریک سائے“ لے کر آئیں اور کامیاب ٹھہریں۔ ایوا شیلٹر کے قتل کا خوب سراغ ملا۔ جاوید بسام کی کہانی ”پراسرار مہمان“ بھی دلچسپ تھی، پڑھ کر مزہ آیا۔ ”سہل بن عبداللہ تستری“ کا دوسرا حصہ بھی بہترین تھا۔ صوفیا و اولیاء کے واقعات پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ ”تیرہ بخت“ میں مرزا امجد بیگ نے قاتل کا خوب سراغ لگایا۔ عدالتی کارروائی پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ باقی مستقل سلسلے بھی بہترین ہوتے ہیں۔ اشعار کا انتخاب خوب تھا۔ خط بہت طویل ہو گیا ہے، آئندہ ماہ سسپنس کا انتظار رہے گا۔ پڑھ کر اس پر تبصرہ ضرور کریں گے تب تک کے لیے سب کو خدا حافظ۔“

✠ ملک وحید، کراچی سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”پچھلے ماہ سیلاب نے ملک بھر میں جو تباہی پھیلائی اس پر دل بہت اداس رہا۔ اللہ پاک ہم سب کو آفتِ ناگہانی سے محفوظ رکھے اور ہمارے ملک پر اپنا رحم و کرم فرمائے، آمین۔ اکتوبر کا شمارہ اس بار کچھ لیٹ ملا اور اس کی وجہ ہماری ہی سستی تھی۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ اس ماہ مدیر کی جگہ اطہر حسین کا نام دیکھ کر اچھا لگا۔ امید ہے یہ تبدیلی ادارے اور رسالے کے لیے اچھی ثابت ہوگی۔ نئے مدیر کو ہماری جانب سے ڈھیروں ڈھیر مبارکباد۔ فہرست پر سرسری نظر ڈالی اور پھر جون ایلیا کے پرمغز انشائیہ ”حساب فہمی“ سے مستفید ہوئے۔ خطوط کی محفل میں نازیہ سلطان اور عون احمد کو خوش آمدید۔ دیگر احباب میں مہتاب احمد بروینا اشعر اور ناہید یوسف کی حاضری اپنے شاندار تبصرے کے ساتھ بھرپور رہی۔ زویا صفوان کی ”ظالم مظلوم“ کا تیسرا حصہ بھی زبردست رہا۔ منظر امام کی ”مغرور“ متاثر کن تحریر ثابت ہوئی۔ نازیہ کامران کاشف کی تحریر ”رمز شناس“ کا آٹھواں حصہ بھی خوب رہا اور واقعات کے تسلسل نے کہانی پڑھنے کا مزہ دوبالا کر دیا۔ محمد عثمان ذوالفقار کی ”ناکردہ جرم“ اچھی تحریر تھی۔ اس بار مرزا امجد بیگ کی ”تیرہ بخت“ کچھ خاص پسند نہ آئی۔ صرف دو گواہوں پر جرح میں پورا مقدمہ نمٹا دیا۔ شاہد نقوی کی ”خزانچی“ پسند آئی۔ فاطمہ حسام کی ”شکارگاہ“ بس گزارے لائق رہی۔ کاشف زبیر کی ”کالا جادو“ عبرت اثر کہانی ثابت ہوئی۔ جاوید بسام کی ”پراسرار مہمان“ خوب رہی۔ ضیا تسلیم بلگرامی کی ”سہل بن عبداللہ تستری“ کا دوسرا اور آخری حصہ اچھا رہا۔ عائشہ نصیر کی ”تاریک سائے“ نے متاثر کیا۔ ملی اختر کی ”بن مول“ پسند آئی۔ عامر شاہین کی ”سوتیلا باپ“ معاشرتی برائیوں کو اجاگر کرتی اچھی تحریر رہی۔ طاہر جاوید مغل کی ”گمنام منزلیں“ آخرکار اپنے اختتام کو پہنچی۔ کہانی کا اختتام پسند آیا۔ اشعار اور کترنوں نے لطف دیا۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
ناہید یوسف، اسلام آباد۔ مہتاب احمد، حیدرآباد۔ محمد عدیل، کراچی۔ صہیب احمد، بنوں۔ اعجاز احمد، گجرات۔



Scanned with CamScanner

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

# ظالم مظلوم

زویا صفوان

چوتھا حصہ

تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو مظلوم بھی ظالم بن جاتا ہے لیکن... اس کی شخصیت کے کئی روپ بھی سامنے آتے ہیں... جسے دنیا دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے... وہ معصوم بچی جسے اپنے بھگوان سے چھوٹا سا شکوہ تھا کہ اسے حُسن کی ذرا سی خیرات سے بھی ترسادیا... معمولی شکل وصورت کی حامل یہ بچی آگے چل کر کیا قیامت برپا کرسکتی ہے کسی کو خبر نہ تھی... تاریخ میں اس ہستی کا نام پھولن دیوی کے نام سے رقم ہے جسے زمانے کے ظلم وستم نے اس راہ کا مسافر بنادیا جہاں بچے اپنے بچپن کو بہت پہلے خیرباد کہہ دیتے ہیں... اس نے بھی بہت چھوٹی عمر سے گرم سرد موسموں کا مقابلہ کیا اور ساتھ ہی آنکھوں میں بسنے والے خوابوں کی بھی حفاظت کرتی رہی... اور جب ظلم حد سے سوا ہوا تو اس بچی نے پھولن دیوی کا روپ دھار لیا۔

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

پھولن کے دماغ میں ایک نیا منصوبہ کلبلانے لگا تھا۔
گزشتہ بار بوڑھے ٹھاکر کی پٹائی کے بعد اسے دلی طور پر سکون نصیب ہوا تھا۔ حواس باختگی کے عالم میں اپنی دھوتی پکڑے فرار ہوتے اس ٹھاکر کی دید نہایت کیف بخش تھی۔
اس رات وہ ایک طویل عرصے بعد اطمینان کی نیند سو پائی تھی۔ اسے اس اطمینان و سرور کی مزید طلب تھی۔ وہ اپنے پردۂ تصور پر ایک منظر کی جزئیات طے کرنے لگی۔ اس منظر میں کسی بھی نئے ٹھاکر کی آمد ہوتی، وہ اپنے چہرے پر دلکش مسکراہٹ سجائے اسے اپنے گھر میں لے جاتی اور بعد ازاں کسی طرح دروازہ بیرونی جانب سے مقفل کر کے گھر نذرِ آتش کر دیتی۔
کچھ روز اسی تصور سے بہلتے بیت گئے۔ اس کے بعد وہ خلش محسوس کرنے لگی۔
''ایک ٹھاکر کو آگ لگا دینے سے کیا ہوگا؟ بھگوان کرے اگلی بار زیادہ ٹھاکر آئیں، میں ان سب کی چتا یہیں جلا دوں گی۔'' وہ ایک عزم سے سوچتی۔
دیوی دین اور مولہ کو اس کی خاموشی اور خلاؤں میں تکتے رہنے کی نئی عادت خوفزدہ کر رہی تھی۔ وہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کرتے تا کہ اس کے ذہن میں پنپتے خیالات تک رسائی ہو سکے۔
''پھولن! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے، ایسے کیوں بیٹھی ہے؟'' مولہ نے دریافت کیا۔
''ہاں! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے، ایسے کیوں بات کر رہی ہے؟'' اس نے طنزاً جواب دیا۔
''کیا مطلب...... کیسے بات کر رہی ہوں؟'' مولہ حیران ہوئی۔
''مطلب سیدھا اور صاف ہے۔'' پھولن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''تیری زبان سے یہ مٹھاس شوبھا نہیں دیتی، گالیاں اور کوسنے سنتے رہنے کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ جب تو ایسے بولتی ہے تو مجھے اپنی ماں ہی نہیں لگتی۔''
پھولن کے اس بے باک تجزیے پر مولہ نے خفت سے نظریں چرا لیں۔
''میں تیری ماں ہوں، مجھ سے زیادہ تیری چنتا کسے ہو سکتی ہے؟'' اس نے سرد آہ بھری۔
''کیا باتیں ہو رہی ہیں ماں بیٹی میں؟'' دیوی دین بھی ان کے پاس چلا آیا۔
پھولن نے استہزائیہ نظروں سے دونوں کی جانب دیکھا اور سپاٹ لہجے میں کہنے لگی۔ ''میں ماں کو یہ بتانے لگی تھی، بھگوان سے ملنے کے بعد کیا کہوں گی؟''
دیوی دین اور مولہ کے دل دہل گئے۔ ان کی کیفیات سے بے خبر پھولن نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
''میں اس سے کہوں گی کہ اگلی بار بھول کر بھی کسی غریب اور کائر کے گھر بیٹی پیدا نہ کرنا۔''
دیوی دین کی کمر میں یکدم مزید خمیدگی در آئی۔ پھولن کے ان الفاظ نے مولہ کو بھی گنگ کر دیا۔
''میں بھگوان کو بتاؤں گی کہ بیٹیاں کیول ٹھاکروں کے گھر پیدا کیا کرے۔'' پھولن ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
کمرے میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ پھولن اپنے والدین کو نظر انداز کرتے ہوئے بیل کو چارا ڈالنے چلی گئی۔ اسے اپنے اہلِ خانہ سے زیادہ اس بے زبان کے ساتھ وقت گزاری فرحت دیتی تھی۔

☆☆☆

دیوی دین اس شب مضطرب انداز میں گھر کے باہر ٹہل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بار بار نمی اُمڈ آتی جسے چہرے پر بہنے سے روکنے کے لیے وہ اپنی آنکھیں بے دردی سے رگڑ دیتا۔ اس نمی کی جلن سخت اذیت ناک تھی۔
کچھ ہی دیر بعد اسے دو ہیولے گھر کی سمت بڑھتے دکھائی دیے، دیوی دین کا وجود لمحہ بھر میں ہی پسینے سے شرابور ہو گیا۔ ان کے ڈیل ڈول اور بشرے سے جھلکتا اعتماد دیکھ کر یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے وہاں آئے ہیں۔
''پھولن دیوی کہاں ہے، اسے ہمارے پاس بھیجو۔'' ٹھاکر گوپال نے تحکمانہ کہا۔
''اس سے کیوں پوچھ رہے ہو؟'' چندن ٹھاکر نے اسے ٹوکا۔ ''اندر چلتے ہیں بس۔''
دیوی دین دھاڑیں مار کر رونے لگا۔
''بھگوان کے لیے...... تمہیں بھگوان کا واسطہ ہے...... میری بیٹی کو شما کر دو۔ میں اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے کاٹ دوں گا...... اب وہ کسی کو دکھائی نہیں دے گی...... اسے شما کر دو۔''
ان دونوں کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔
''تم ملاح ہو۔ ایک ملاح، ٹھاکروں کی سیوا کے لیے ہی تو پیدا کیا جاتا ہے۔'' گوپال نے کہا۔
دیوی دین کے آنسوؤں میں مزید شدت پیدا ہوئی۔ اس کی آہ و فغاں سن کر مولہ کا بدن بھی لرزنے لگا۔ پھولن کی



Scanned with CamScanner

آنکھوں میں ایک حدت پیدا ہوئی اور وہ کسی بگولے کے مانند باہر چلی آئی۔

"پھولن سے ملنا چاہتے ہو تم؟" اس نے دونوں افراد کی سمت بغور دیکھا۔

ان کے قیمتی لباس، تاؤ دار مونچھیں اور آنکھوں کی مخصوص چمک اس کی وحشت مہمیز کر رہی تھیں۔

"ہاں، کہاں ہے وہ؟ اس کے بارے میں بہت سن رکھا ہے۔" گوپال کہنے لگا۔

"کیا سن رکھا ہے؟" وہ بے خوفی سے مستفسر ہوئی۔

"یہی کہ وہ ٹھاکروں کو خوش کرنا جانتی ہے، اب تو ملنے کی اِچھا ہے بس۔" گوپال نے حظ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بس ذرا کام سے باہر گئی ہے، آتی ہی ہوگی۔" اس نے ایک توقف سے جواب دیا۔

"کیا کسی اور ٹھاکر نے اسے بلا رکھا ہے؟" چندن متجسس ہوا۔

پھولن نے اعتماد سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کس ٹھاکر کے پاس ہے وہ؟" گوپال جز بز ہوا۔ اسے اپنے سرور میں رخنہ اندازی پسند نہیں تھی۔

"ارے، وہی ٹھاکر جس کے پاس تیری ماں، بیوی، بہن اور بیٹی تیرے کسی بھی ملاح کے گھر جانے کے بعد جایا کرتی ہیں۔"

پھولن کے یہ الفاظ کسی دھماکے سے کم نہ تھے۔ گوپال اور چندن کی نگاہیں شرارے برسانے لگیں۔ دیوی دین خوفزدہ ہو کر بیٹی کی جانب دیکھنے لگا، پھولن ان سبھی کی کیفیات سے بے نیاز مزید گویا ہوئی۔

"اس ٹھاکر کی اِچھا تھی کہ پھولن تیری ماں، بہن، بیوی اور بیٹیوں کو بھی ٹھاکروں کو خوش رکھنے کے سبھی گر سکھا دے۔"

چندن غصے سے بے قابو ہو کر آگے بڑھا۔ وہ اس کی زبان ہی گدی سے کھینچ لینا چاہتا تھا۔

"ماں! میری رائفل تو باہر لانا۔" پھولن نے اطمینان سے مولہ کو صدا دی۔

گوپال اور چندن کے چہروں پر پہلی بار تشویش جھلکی۔

"جھوٹ بولتی ہے، تیرے پاس کوئی رائفل نہیں ہے۔" گوپال نے کہا۔

"ابھی دکھا دیتی ہوں۔" اس کا اطمینان برقرار تھا۔

"ویسے بھی میری رائفل بہت دنوں سے پیاسی ہے، اسے ٹھاکروں کے خون کی چاٹ لگ چکی ہے۔"

پھولن کی آنکھوں، الفاظ اور لہجے میں غیر معمولی حدت تھی۔ گوپال اور چندن کا اعتماد ہوا ہونے لگا۔

"ماں! کہاں رہ گئی ہو؟" وہ چلائی۔ "جلدی لا رائفل۔"

گوپال نے چندن کی سمت دیکھا، وہ اپنے ساتھی کا عندیہ بھانپ گیا۔ ان دونوں نے فرار ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔ قرب و جوار کے گھروں میں چھتوں اور دروازوں سے جھانکتے افراد بھی خوفزدہ ہو گئے تھے۔ انہیں بھی پہلی بار پھولن سے خوف محسوس ہوا تھا۔

☆☆☆

اگلے چند روز میں یہ خبر گاؤں بھر میں گردش کرنے لگی تھی۔ ہر ایک کی زبان پر پھولن کی گوپال اور چندن سے ملاقات کا ہی ذکر تھا۔ اہل علاقہ پھولن کو دیکھتے ہی راہ بدل لیا کرتے۔ اس تمام تر صورت حال نے مولہ کی اعصابی کشمکش میں مزید اضافہ کر دیا۔ وہ حسب عادت بیٹی کو کوسنے لگی۔

"کیا ضرورت تھی وہ سب تماشا کرنے کی؟ تجھے اندازہ بھی ہے کہ تو نے ہم سب کے لیے کتنی بڑی مصیبت کھڑی کر دی ہے؟"

"کیا ضرورت تھی مجھے جنم دے کر اس دنیا میں لانے کی؟" اس نے مولہ کے ہی انداز میں جواب دیا۔ "تجھے اندازہ بھی ہے کہ تو نے ٹھاکروں کے لیے کتنی بڑی مصیبت کھڑی کر دی ہے؟"

مولہ مشتعل ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے بیٹی کو اس بدزبانی کا جواب دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ پھولن نے بے خوفی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھ پر ہاتھ اٹھانے کے بجائے اپنا یہی غصہ ان حرام خور ٹھاکروں پر نکالا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔"

مولہ اور دیوی دین اس کے انداز گفتگو اور بے خوفی پر ساکت رہ گئے۔

"کس کی شہ پر یہ سب کر رہی ہے تو؟" مولہ کا بدن لرزنے لگا۔ "سچ بتا، تو اب بھی زمیندار کے ٹھاکر پھول سنگھ سے ملتی ہے نا؟"

"مجھے کسی کی شہ نہیں ہے۔" وہ تلخی سے کہنے لگی۔ "اس سنسار میں سب ایک سے بڑھ کر ایک مطلبی ہیں۔ میں نے سہارے کے لیے دوسروں کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔"

دیوی دین کرب سے بیٹی کو دیکھنے لگا۔ اس نے اپنی عمر سے کہیں زیادہ دکھ جھیلے تھے۔ وہ اپنی فطری کمزوری اور بزدلی کے باعث بیٹی کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ اس نے اذیت سے آنکھیں میچیں اور اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے



digest.library.com
Scanned with CamScanner

کہنے لگا۔
''ہے بھگوان! تو نے اس سنسار میں بیٹی کیوں بنائی؟ اگر بنائی ہی تھی تو اسے مجھ جیسے غریب اور کائر کے گھر میں پیدا نہ کرتا۔ میری پھولن کی سرکھشا کرنا، اس کی قسمت میں اور کتنی پریکشا لکھی ہے تو نے؟''
اسی لمحے دیوی دین کو اپنے آنسوؤں کی دھندلاہٹ میں ایک مانوس چہرہ دکھائی دیا۔ اس چہرے کی دید نے اس کے وجود میں اضطراب سوا تر کر دیا۔ وہ شخص تریہان کا ٹھاکر پھول سنگھ تھا جو سنجیدگی سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ مولہ کی رنگت بھی متغیر ہو گئی۔
''میری بات غور سے سنو۔'' اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اپنی بیٹی کو یہاں سے کہیں دور بھیج دو۔''
''اس نے کچھ نہیں کیا، وہ نردوش ہے۔'' مولہ نے کہا۔
''میں جانتا ہوں۔ جو کہہ رہا ہوں، کیول وہی کرو۔'' وہ مزید سختی سے گویا ہوا۔ ''پھولن کی عزت اور جیون دونوں ہی خطرے میں ہیں۔ معاملہ میری پہنچ سے بہت دور ہو گیا ہے، میں اب اس کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔''
دیوی دین اور مولہ نا سمجھی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

پھولن کے وجود میں تنہائی کا صحرا ہولناک حیثیت اختیار کرنے لگا تھا۔ وہ والدین کے بعد چھوٹے بھائی اور بہن سے بھی ذہنی وجسمانی طور پر دور ہو گئی تھی۔ ذہنی حالت اس قدر دگرگوں تھی کہ بیٹھے بٹھائے ہی پتی لال کے مظالم اور حالیہ جنسی وجسمانی استحصال کے آسیب میں جکڑے جانے کے بعد چیختا چلّانا شروع کر دیتی۔
اس ہسٹریائی کیفیت میں وہ میادین اور سرپنچ کے گھروں کا رخ کرتی اور بیرونی سمت کھڑے ہو کر چیختے ہوئے کہتی۔
''مار دو مجھے۔ کیوں جیوت رکھا ہوا ہے؟ میرا جیون ختم کر دو ورنہ موقع ملتے ہی میں تمہارا سروناش کر دوں گی۔''
مولہ اس کے پیچھے لپکتی ہوئی وہاں چلی آتی اور اس کا بازو گرفت میں لے کر گھر لے آتی۔
''ایسا کیوں کرتی ہے پھولن انہیں کیوں اپنا دشمن بنا رہی ہے؟'' دیوی دین گڑگڑایا۔
''وہ ہمارے اپنے کب تھے بابو؟ وہ تو شروع سے ہی ہمارے دشمن تھے۔ تم ہی یہ بات آج تک نہیں سمجھ سکے۔''
''گاؤں والے بھی ہم سے دور ہونے لگے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔'' مولہ نے دکھ سے کہا۔
وہ اپنے اس شکوے میں بالکل حق بجانب تھی۔ کچھ روز قبل ان کا بیل کسی موسمی وبا میں مبتلا رہنے کے بعد مرگیا تھا۔ اس کی لاش اٹھانے کے لیے گاؤں بھر سے کسی نے بھی مدد نہ کی تھی۔ دیوی دین، پھولن اور مولہ اسے کسی نہ کسی طرح خود ہی گھسیٹتے ہوئے دریا بُرد کر آئے تھے۔
''تمہیں اب بھی گاؤں والوں کی ہی چنتا ہے۔'' پھولن تلخی سے ہنسی اور مولہ کو تاسف سے دیکھتے ہوئے چارپائی پر لیٹ گئی۔
مولہ کے پاس بیٹی کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

اس واقعے کے اگلے روز پھولن حسبِ سابق کھیتوں میں کام کرنے میں مشغول تھی کہ ایک آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ اس کے قریب زرد دانتوں، پچکے رخساروں اور لمبی خمیدہ ناک والا ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ ایک قریبی گاؤں کا سرپنچ تھا۔
''پھولن دیوی کہاں رہتی ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔
پھولن نے چبھتی ہوئی نظروں سے نووارد کو دیکھا۔ یہ کراہت انگیز سوال اسے مشتعل کر دیتا تھا۔
''وہ...... وہاں رہتی ہے۔'' اس نے میادین کے گھر کی سمت اشارہ کر دیا۔
''میرا ایک سندیسہ دے دوگی اسے؟'' وہ ایک توقف کے بعد کہنے لگا۔
''کیا کام ہے تمہیں اس سے؟'' پھولن کو اچنبھا ہوا۔
''وہ آج رات اسے لے جائیں گے۔ میادین اور سرپنچ نے بہت گہری چال چلی ہے۔'' اس نے اپنی آواز دھیمی کر لی۔ ''میں بہت خطرہ اٹھا کر یہاں آیا ہوں۔''
اس شخص کے روانہ ہوتے ہی پھولن تیزی سے بھاگتے ہوئے اپنے گھر پہنچی اور مولہ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔
''کون تھا وہ شخص؟'' اس نے دریافت کیا۔
''مجھے نہیں پتا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میادین اور سرپنچ نے بہت گہری چال چلی ہے۔ اس کی بات میں دم تھا۔ وہ دونوں...... راکفل والی بات پر خاموش تو نہیں رہ سکتے تھے۔'' اس نے بے اختیار گالیاں دیتے ہوئے حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا۔
''میں تجھے منع کرتی تھی کہ ان کے سامنے یہ سب

باتیں نہ کیا کر۔" مولہ نے سر پیٹا۔

"مجھے روش دیتے رہنے سے پہلے کچھ ہوا ہے جواب ہوگا؟" وہ تندی سے کہنے لگی۔ "میرے ساتھ کالپی چلو، تھانے رپورٹ لکھواتے ہیں۔"

مولہ نے ایک توقف کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

کالپی کا سفر خدشات اور تفکرات سے لبریز تھا۔ تھانے میں موجود اہلکار کی وید نے پھولن کو کراہنے پر مجبور کر دیا۔ اس شخص نے گزشتہ بار بھی اسے خاصی زک پہنچائی تھی۔ مولہ نے اسے تمام تر صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"تمہاری بیٹی کوئی اپسرا ہے جو ہر کوئی اس کے پیچھے ہی رہتا ہے۔ کبھی اسے جان سے مارنا چاہتے ہیں تو کبھی اپہرن کی شکایت لے کر آجاتی ہو۔"

"ہم سچ کہہ رہے ہیں۔" پھولن نے قطعیت سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ رپورٹ درج کر لیتا ہوں۔ اب واپس جاؤ، مجھے اور بھی بہت کام ہیں۔" وہ بے نیازی سے کہتا اپنے کاغذات کی جانب متوجہ ہوگیا۔

☆☆☆

کالپی سے واپسی کا سفر نہایت پُرہول تھا۔ تیز رفتار بارش نے ان کے کپڑے شرابور کر دیے۔ کیچڑ آلود زمین پر قدم جمانا شدید دشوار ہو رہا تھا۔ وہ گرتی پڑتی کسی نہ کسی طور گھر پہنچیں۔ پھولن مویشیوں کو چھپر تلے باندھ کر ان کا چارا تیار کرنے لگی۔ اس کا ذہن ہنوز اسی شخص کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

رات تک بارش طوفانی حیثیت اختیار کر چکی تھی، گاہے بگاہے سنائی دینے والی بجلی کی کڑک دل دہلا دیتی۔ پھولن کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اسی اثنا میں اسے ایک زوردار کڑک سنائی دی۔ لمحہ بھر کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ صحن کی دیوار ہی ڈھے گئی ہو۔ بارش کے باعث ایسے حادثات ایک معمول تھے تاہم کچھ ہی دیر میں اسے اصل صورت حال کا علم ہوگیا۔ گھر کا مرکزی دروازہ قبضوں سے اکھڑ چکا تھا۔ خاکی وردیوں میں ملبوس نصف درجن سے زائد افراد رائفلیں سونت کر گھر میں گھس آئے تھے۔ ان کا سب سے پہلا نشانہ دیوی دین تھا جو مویشی خانے کے راستے میں ہی سویا ہوا تھا۔

"پھولن کہاں ہے؟" ایک طویل قامت شخص نے اپنی پاٹ دار آواز میں دریافت کیا۔

اس کا نام بابو گجر سنگھ تھا۔ سیاہ رنگت، ایک آنکھ میں اتری سفیدی اور لمبی خمیدہ ناک کے باعث اس کا شخصی تاثر مقابل کو ہولا دیتا۔

"کون...... ہو...... تم...... لوگ؟" اس کی گھگی بندھ گئی۔

"تم سے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔" وکرم نامی شخص نے اپنی ٹھہری ہوئی گمبھیر آواز میں اسے مخاطب کیا۔

اسی لمحے مولہ بھی سنسناتی ہوئی کمرے سے باہر چلی آئی۔ اس کے وجود میں خوابیدہ رہنے والی بے خوفی یکدم ہی عود کر آئی تھی۔

"کیا لینے آئے ہو تم لوگ یہاں؟" وہ چلائی۔

پھولن گھاس کے گٹھروں کی اوٹ سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ نووارد افراد کی خاکی وردیاں بادی النظر میں پولیس اہلکاروں کا تاثر دے رہی تھیں۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ان افراد نے مولہ اور دیوی دین کی مشکیں کس دیں۔ پھولن رینگتی ہوئی چھت کی جانب لپکی تاکہ کسی دوسری جگہ کود کر اپنا فرار یقینی بنا سکے۔ اس کا یہ منصوبہ پہلے ہی مرحلے میں ناکام ہوگیا۔ گھر کے باہر بھی کم و بیش اتنے ہی ٹارچ بردار افراد موجود تھے۔ وہ انہیں کسی بھی طور جل نہیں دے سکتی تھی۔

"کہاں ہے پھولن؟" بابو گجر چنگھاڑا۔ "وہ ہمارے سامنے نہ آئی تو اس پورے گھر کو پھونک دیں گے۔"

پھولن گھاس کے گٹھروں میں روپوشی کی کوشش میں تھی۔ بابو گجر سنگھ کے عندیے پر دیگر افراد نے گھر میں ایک نیا طوفان برپا کر دیا۔ وہ برتن اور دیگر سامان اٹھا کر پھینکنے لگے تھے۔ بھوری اور شیو نارائن خوفزدہ ہو کر چلانے لگے۔ بابو گجر نے معنی خیز نگاہوں سے شیو نارائن کی جانب دیکھا اور اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے دبوچ لیا۔

"اس کا جیون چاہتے ہو تو پھولن کو ہمارے سامنے لے آؤ۔"

مولہ کے بدن میں اینٹھن پیدا ہونے لگی۔ دیوی دین نے رحم طلب نگاہوں سے اسے دیکھا اور روتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہم غریب ملاح ہیں، ہمارے حال پر دیا کرو۔"

وکرم نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کا تعلق بھی ملاح برادری سے ہی تھا تاہم اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل پھولن از خود ہی ان کے سامنے نمودار ہوگئی۔

"میرے بھائی کو چھوڑ دو۔" اس نے اپنی توانائی مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

"پھولن! تو یہاں سے چلی جا۔" دیوی دین چلایا۔



Scanned with CamScanner

وکرم اور بابو گجر سنگھ حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ انہیں پھولن کے روپ میں ایسی کم عمر لڑکی دیکھنے کی توقع ہی نہیں تھی۔ وہ کسی دراز قد، پختہ عمر اور چوڑی چکلی عورت سے ملاقات کا تصور لیے یہاں آئے تھے۔

''ہم سے مکر کرتے ہو۔'' بابو گجر نے شیو نارائن کی گردن پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ ''یہ اتنی سی چھوکری پھولن دیوی کیسے ہوسکتی ہے؟''

مولہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے انہیں کوسنے دینے لگی۔ وہ مدد کے لیے گاؤں کے افراد کو بھی پکار رہی تھی۔ بابو گجر نے جھنجلا کر ہوائی فائرنگ کی اور اپنی پاٹ دار آواز میں کہنے لگا۔

''اگر کسی نے یہاں آنے کی ہمت کی تو اس رائفل کا سارا بارود اس کے شریر میں اتار دوں گا۔''

قرب وجوار کے سبھی افراد اپنے گھروں میں دبکنے پر مجبور ہوگئے۔ بابو گجر کی ہوسناک نگاہیں پھولن کے بدن پر رینگ رہی تھیں۔ وکرم نے اس کے عزائم کو بھانپ کر کہا۔

''اسے کچھ نہیں کہنا۔''

''تیرا دماغ چل گیا ہے کیا؟'' وہ بدک گیا۔ ''اگر اسے یونہی چھوڑ دیا تو وہ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے؟''

''میں کسی کے کچھ بھی سوچنے کی پروا نہیں کرتا۔'' اس نے بابو گجر کی آنکھوں میں جھانکا۔

''یہ لڑکی ہمارے ساتھ جائے گی۔'' بابو گجر نے ایک توقف کے بعد حتمی انداز میں کہا۔

مولہ اور دیوی دین صدمے سے ساکت رہ گئے۔

☆☆☆

کیچڑ آلود زمین پر برہنہ پا مسافت طے کرتے ہوئے پھولن کو علم نہیں تھا کہ اس کی تقدیر ایک نئے بھنور میں داخل ہورہی ہے۔ وہ درجن بھر افراد اسے اپنے نرغے میں لیے دریا کے کنارے چلے آئے تھے۔

''اس کا دھیان رکھنا، کہیں دریا میں چھلانگ ہی نہ لگادے۔ ملاح کی بیٹی ہے، تیرنا تو جانتی ہی ہوگی۔'' بابو گجر نے اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیں۔

پھولن حسرت سے دریا کی جانب دیکھنے لگی جو اس کے بچپن کی ان گنت یادوں کا امین تھا۔ سفر کا آغاز ہوا تو ان چوڑے کندھوں اور بھاری بھرکم افراد کی نگاہیں، معنی خیز فحش گفتگو ایک نئی اذیت کا سبب بن گئی۔ پھولن نے کراہتے ہوئے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ اس کا حلق خوف سے خشک ہوچکا تھا۔

کشتی کے سفر کا اختتام ہوتے ہی کھیتوں، ندی اور نالوں کی مسافت کا آغاز ہوگیا۔ صبح ہونے تک وہ ایک ایسے بلند پہاڑی نالے تک پہنچ چکے تھے جو چٹانوں اور پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ نشیب میں دور دور کہیں میدان اور دریا دکھائی دے رہے تھے۔ پھولن کی جسمانی حالت نہایت خستہ ہوچکی تھی۔ چٹانوں پر نکیلے پتھروں میں برہنہ پاؤں چلنے کے باعث پاؤں لہولہان تھے۔ شب بھر بارش میں بھیگنے سے بوسیدہ لباس نے چیتھڑوں کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اس کی کنپٹیاں درد سے بے طرح سنسنا رہی تھیں۔ رفع حاجت کا دباؤ ناقابل برداشت ہوچکا تھا۔

''مجھے کسی جنگل میں جانے دو۔'' اس نے التجا کی۔

''تو ہمیں مورکھ سمجھتی ہے کیا؟'' بابو گجر نے استہزائیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''وہاں چلی جاؤ۔'' وکرم نے ایک بڑے سے پتھر کی جانب اشارہ کیا۔ وہ اس کی پریشانی و مشکل بھانپ گیا تھا۔

بابو گجر خشمگیں نگاہوں سے وکرم کو دیکھنے لگا۔

''تو یہ سب ٹھیک نہیں کررہا۔''

''صحیح اور غلط تو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔'' وکرم نے بے رخی سے جواب دیا۔

''ایک ڈکیت کے لیے مجھ سے تکرار رہا ہے؟''

''وہ ڈکیت نہیں ہے، یہ بات اب تک تجھے بھی سمجھ آگئی ہوگی۔'' اس نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں قطعیت سے کہا۔

''تو یہ سب اس لیے کررہا ہے نا کہ وہ بھی تیری طرح ملاح ہے؟'' بابو گجر نے کف اڑایا۔

وکرم نے اس کی بات نظر انداز کردی۔ پھولن اب پتھر کی اوٹ سے نکل کر خوفزدہ نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے اردگرد وہ سبھی افراد خاکی وردیوں میں ملبوس تھے۔ کمر کے گرد کارتوسوں کی پیٹیاں، پیشانی پر بندھی سرخ پٹیاں، بڑی بڑی مونچھیں اور لہو رنگ آنکھیں اس کے بدن میں لرزش پیدا کرنے لگیں۔ ان میں سے چند ایک زمین پر کمبل بچھا کر دراز ہوچکے تھے۔ دیگر البتہ اپنے سروں تلے چرمی تھیلے رکھ کر ہی محو استراحت تھے۔

پھولن کو اب اس بات میں کوئی شائبہ نہ رہا تھا کہ وہ ڈکیتوں کے نرغے میں ہے۔ ان کی نگاہوں سے جھلکتے عزائم بھی مخفی نہ تھے۔ وہ اس لمحے شدت سے موت کی متمنی تھی۔ اس اثنا میں وکرم ملاح اس کے قریب چلا آیا۔ اس نے اپنے تھیلے سے ایک ساڑی اور ربر سول کے جوتے نکال کر اسے



Scanned with CamScanner

تمہارے ہے۔

''انہیں پہن لو لیکن کسی کے سامنے نہ پہننا۔''

پھولن نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے پہلی بار کسی مرد سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

سفر کا دوبارہ آغاز ہوا تو پھولن کے لیے اپنی جسامت سے بڑی وہ ساڑی اور جوتے سنبھالنے مشکل ہونے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ پہاڑی نالوں کے درمیان ایک بستی میں چلے آئے۔

اس بستی کی ہیئت بہت مختلف تھی۔ چوبی جھونپڑیوں کے نزدیک ڈھیر کی صورت میں درخت کاٹ کر رکھے گئے تھے۔ اس کے ہم سفر ایک ایسی جھونپڑی کی سمت بڑھ گئے جو نصف سے زائد زمین میں دھنسی ہوئی تھی۔ جھونپڑی سے برآمد ہونے والا شخص پتلون اور قمیص میں ملبوس تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان سبھی کا استقبال کیا اور وکرم کے ایما پر چند پتلونیں، قمیصیں اور جوتے لے آیا۔

''ان میں سے جو بھی تمہیں پورا ہو، پہن لو۔'' وکرم نے پھولن کو مخاطب کیا۔

پھولن اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک مختصر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ بابو گجر جھونپڑی میں بچھی چارپائی پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں ہنوز پھولن پر ہی مرکوز تھیں۔ لباس کی تبدیلی کے بعد وہ اپنا سر پلو سے ڈھک نہ پائی تھی۔ نتیجتاً اس کے بال بکھر کر منتشر ہو چکے تھے۔ بابو گجر نے اسے وحشیانہ انداز میں بالوں سے دبوچا اور چارپائی پر گھسیٹ لیا۔

''اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لو۔'' وکرم نے اسے گھورا۔

''تم اس لڑکی کو بچانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟ اس سے پہلے تو تمہارے من میں کبھی کسی کے لیے اتنی ہمدردی پیدا نہیں ہوئی۔'' اس نے دانت پیسے۔

''اس کا جواب بھی تم خود ہی دے چکے ہو۔'' وکرم نے کہا۔ ''یہ لڑکی میری برادری کی ہے۔''

''پریوار کی تو نہیں ہے نا۔'' گجر سنگھ بے ہنگم انداز میں ہنسا اور پھولن سے دست درازی کرنے لگا۔

وکرم نے اس پر اپنی رائفل تان لی اور سرد لہجے میں کہنے لگا۔ ''اگر تم نے اسے چھوا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

کچھ ہی دیر میں وہاں صورت حال تبدیل ہو چکی تھی۔ وکرم کی اس جسارت پر بابو گجر کے حامیوں نے اپنی بندوقیں سونت لیں۔ اس کے ردعمل میں وکرم کے ہم نواؤں نے بھی انہیں اپنے نشانے کی زد میں رکھ لیا۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

بھیگے بھیگے موسم کی دل فریبیاں

اکتوبر کے شمارے کی ست کہانیاں

**جھیل کنارے**

ایک محبت، سو افسانے میں الجھی خونی داستان کے سنسنی خیز پُرانتقام واقعات

**احمد نعمان شیخ** کی بدلی سوغات

**سربکف**

ماضی کی دھندلی پرچھائیوں کے تعاقب میں دوڑتے بھاگتے کردار کی پُراسرار داستان.....

**طاہر جاوید مغل** کے قلم سے

**دبر**

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچہ گردی

**حسام بٹ** کے قلم سے سلسلے وار کہانی

**سرورق کے رنگ**

**پہلا رنگ**

حسن و خوبصورتی کے پجاریوں کا محبت سے رشتہ نہیں ہوتا۔ خود غرضی اور بیوفائی کی راہ پر چلنے والوں کی عبرت اثر کہانی **عائشہ نصیر** کی کاوش

**دوسرا رنگ**

میڈیا کے ذریعے انسانی نفسیات اور ذہنیت بدلنے والوں کا خوفناک کھیل

**زویا صفوان** کی تحریر کے خدوخال

**چینی نکتہ چینی**

آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں



Scanned with CamScanner

”اپنی ضد چھوڑ دے وکرم! ورنہ یہاں بہت خون خرابا ہوگا۔“ بابو گجر نے دھمکایا۔

”تو ہو جانے دے۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”کیا تجھے مرتیو سے ڈر لگنے لگا ہے؟“

”ایک چھوکری کی خاطر مجھ سے جھگڑ رہا ہے؟“ وہ ہنوز بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔

”تو اسے بالکل ہاتھ نہیں لگائے گا، بس بات ختم۔“ وکرم نے قطعیت سے کہا۔

”مجھے کارن بتا دے، اس کے بعد ہی کوئی اور بات ہوگی۔“ بابو گجر کی ہٹ دھرمی برقرار تھی۔

”تو کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے بابو!“ وکرم تلخ ہوا۔ ”تجھے اچھی طرح پتا ہے کہ ہمیں دھوکا دیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے ہمارا فائدہ اٹھایا ہے، یہ لڑکی بہت چھوٹی ہے، ڈکیت نہیں ہوسکتی۔“

وکرم کی اس بات پر پھولن کی حسیات مزید چوکنا ہوگئیں۔

”کن لوگوں نے؟“ اس کے ذہن میں ایک فطری سوال پیدا ہوا۔ ”کیا وہ شخص ٹھیک کہہ رہا تھا، یہ سب نیا دین اور سرپنچ کی چال ہے؟“

”دھوکا یہ چھوکری دے رہی ہے۔“ بابو گجر نے زور دیا۔ ”اس کی آنکھوں میں آگ نظر آتی ہے۔ یہ کوئی معمولی یا چھوٹی بچی نہیں ہے۔“

”یہ آگ حالات کے کارن بھی ہوسکتی ہے۔“ وہ اپنے موقف پر قائم تھا۔

”اگر ہم نے اسے چھوڑ دیا تو وہ لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے؟ ہمارا خوف تو ختم ہو جائے گا۔“ اس نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

”ہمارا خوف کسی ایک جھوٹ کے کارن ختم نہیں ہوسکتا۔“ وکرم نے بھی اپنے ہر ایک لفظ پر زور دیا۔

”اگر یہ لڑکی تیری ہے تو پھر مجھے بھی اس پر پورا ادھیکار ہے۔“ بابو گجر کی اکلوتی سلامت آنکھ میں شہوت کی تیز چمک تھی۔

”میں اس کا رکھشک ہوں، عزت کا لٹیرا نہیں ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے اس لڑکی کو کوئی بھی ہاتھ نہیں لگائے گا۔“ وکرم نے اپنی رائفل پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا۔

اس کی قطعیت، بے خوفی اور دلائل بابو گجر کو جز بز کرنے لگے۔ وہ اپنے غیر متوازن تنفس پر قابو پاتے ہوئے کینہ توز نگاہوں سے پھولن کو دیکھنے لگا۔ اگلے ہی لمحے پھولن اس کے زوردار دھکے سے لڑھکتی ہوئی زمین بوس ہوگئی۔

وکرم نے نرمی سے اسے اٹھایا اور رسان سے کہنے لگا۔ ”تم اندر چلی جاؤ، میرا اچھا ”دارے لال“ کھانا لے کر آتا ہی ہوگا۔“

پھولن حیرت و بے یقینی سے اس عجوبۂ روزگار کو دیکھنے لگی۔ وکرم ملاح اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا جس نے آبرو ریزی کے بجائے خود کو اس کا محافظ ثابت کیا تھا۔ وکرم کے نقوش میں ایک عجیب کشش تھی۔ اس کی رنگت سفید، مونچھیں پتلی اور چہرے پر ایک نرم سا تاثر غالب رہتا۔ آنکھوں سے چھلکتی اصول پسندانہ قطعیت پھولن کے لیے ناقابلِ یقین امر تھیں۔ اسے اپنی زندگی میں پے در پے حالات و واقعات کے باعث صنفِ مخالف سے کراہت کی حد تک نفرت ہوچکی تھی۔ تاہم وہ اس لمحے وکرم پر دل و جان سے اعتماد کرنے لگی تھی۔ دیوی دین کے بعد وکرم ہی وہ واحد شخص تھا جس سے پھولن کو خوف یا کراہت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وکرم کے تینوں ساتھی رگھوناتھ، مادھو اور بھرت بھی حتی الامکان اس کی حفاظت کے لیے کوشاں تھے لیکن وہ فی الوقت وکرم جیسا اعتماد قائم نہیں کر پائے تھے۔

☆☆☆

پھولن دیوی کی زندگی مسلسل ایک بگولے کی زد میں تھی۔ وہ ان ڈکیتوں کے ہمراہ مسافت طے کرتے رہنے پر مجبور تھی۔ اس کا بدن تھکاوٹ سے چور ہو جاتا تھا، ٹانگیں قدموں کو مزید آگے بڑھانے سے انکار کرتیں تو اسے عقبی سمت سے ہتھیار کے ٹھوکے اور گرجتی ہوئی آواز سنائی دیتی۔

”چلتی رہو، رکیں تو ماری جاؤ گی۔“

’کیا اس جیون سے مرتیو ہی اچھی نہیں ہے؟‘ اس کے دماغ میں سوچ ابھرتی۔

’میرے پریوار میں جانے سب کیسے ہوں گے؟‘ دل بھر آنے لگتا۔

اسے والدین، شیو نارائن اور بھوری سے زیادہ رام کماری کی یاد ستاتی تھی۔ بچپن کے بے پروا اور کھیل کود کی مستی سے مزین شب و روز میں وہی اس کی ہم نوا اور ہم رکاب ہوتی تھی۔ ان خیالات میں غلطاں وہ دوبارہ اپنے اہلِ خانہ سے ملاقات کے خواب سجانے لگتی۔ اس بار یہ ملاقات کسی خوش رنگ سی صبح اور بہتر حالات میں ہوتی۔

وہ چشمِ تصور سے دیوی دین کو دیکھنے لگی۔ اس کے رخسار صحت مندی کی سرخی سے چمک رہے تھے، فہیدہ کر

میں ایک باوقار ٹھہراؤ در آیا تھا۔ مولہ کے بدن پر ایک نفیس اور بیش قیمت ساڑی دکھائی دیتی۔ یہ ساڑی سیاد ین کی نئی نویلی بیوی کے لباس سے بھی دیدہ زیب تھی۔ شیونارائن اور بھوری بہترین خوراک اور پھل، دودھ لینے سے نہایت صحت مند تھے۔ وہ کسی بڑے اسکول میں بہترین تعلیم حاصل کررہے تھے۔ اس کے بعد پھولن کا ذہنی ارتکاز اپنی ذات کی جانب مرکوز ہو جاتا۔

'میں کیا کررہی ہوں گی بھلا؟' اس نے سوچا۔

"جلدی قدم اٹھا چھوری! تیری یہ سستی ہم سب کو مروائے گی۔" اسے عقب سے ایک درشت آواز سنائی دی۔

"بھگوان کرے تم سب مری جاؤ۔" وہ زیر لب کہتی پژمردگی سے قدم اٹھانے لگی۔

اس کے ہر ایک اٹھتے قدم کے ساتھ دل پر بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔

☆☆☆

بابو گجر اور وکرم کی یہ مسافت ایک ایسے گاؤں میں ختم ہوئی جہاں کئی تین منزلہ پختہ مکانات موجود تھے۔ اس علاقے میں پہنچتے ہی سبھی افراد نے منظم انداز میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کردیا۔ انہوں نے اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق گروہ دو حصوں میں تقسیم کرلیا تھا۔ وکرم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گاؤں کے دوسرے حصے کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے پھولن کو ایک چھکڑے میں بٹھایا اور اپنی ٹھہری ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"تم یہیں بیٹھی رہو، بس تھوڑی ہی دیر کی بات ہے۔"

پھولن نے مضطرب ہو کر تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔

اسی اثنا میں کچھ لوگ برق رفتاری سے چھتوں پر چڑھ گئے۔ ان کی نگاہوں میں سفاکی اور وحشت دیکھ کر پھولن کا دل خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ بابو گجر نے اپنے سامان سے ایک میگا فون برآمد کیا اور پاٹ دار آواز میں دشنام طرازی کرنے لگا۔

کچھ ہی لمحوں میں وہاں ایک ہڑبونگ برپا ہو چکی تھی۔ بابو گجر کے ساتھی مختلف گھروں میں داخل ہو کر صندوق برآمد کرنے لگے۔ یہ صندوق چوراہے میں لا کر رکھ دیے جاتے جہاں موجود دو افراد گولیاں برسا کر انہیں فیر منتقل کرتے اور زیورات، قیمتی سامان اپنے تصرف میں لے لیتے۔

"اس کبوتری کو بھی دکھاؤ کہ ڈکیتی کیسے ہوتی ہے؟" بابو گجر نے اپنے چند ساتھیوں سے کہا۔

وہ تینوں افراد پھولن کی جانب بڑھے اور اسے گھسیٹتے ہوئے ایک گھر میں لے گئے۔

"ان عورتوں کو مار پیٹ کر زیورات کا پتا کرو۔" بابو گجر نے اسے حکم دیا۔

پھولن پھٹی ہوئی نگاہوں سے بابو گجر اور ان عورتوں کو دیکھنے لگی۔

"سنا نہیں تو نے..... آگے بڑھ۔" وہ دہاڑا۔

خواتین ہذیانی انداز میں چیخ اٹھیں۔ وہ رحم طلب نگاہوں سے ان سب کو دیکھ رہی تھیں۔

"مت مارو...... ہمیں مت مارو۔ تمہیں جو چاہیے لے جاؤ۔" وہ چیخی تھیں۔

اسی اثنا میں بابو گجر کی نگاہ ایک الماری کی اوٹ میں پوشیدہ لڑکی پر پڑ گئی۔ اس کی واحد سلامت آنکھ میں تیز چمک لہرانے لگی۔ وہ وحشیانہ انداز میں آگے بڑھا اور لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گیا۔

اس لڑکی کی دید نے پھولن کا اضطراب سوا تر کردیا۔ اس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ رحم کی دہائیاں دیتی بابو گجر کی گرفت میں مچلنے لگی۔ اگلے چند لمحے قیامت خیز تھے۔ بابو گجر نے اسے گاؤں کے چوراہے میں بے آبرو کیا اور دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے ساتھیوں کی سمت اچھال دیا۔ اس لڑکی کی چیخیں، آہیں، دہائیاں اور تڑپ پھولن کو ہذیان میں مبتلا کرنے لگی۔ ان مناظر اور آوازوں سے پھولن کی نہایت اذیت ناک یادیں وابستہ تھیں۔ وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بے بسی سے چیخنے لگی۔

"بس کرو..... بھگوان کے لیے بس کردو۔"

پھولن کی اس چیخ و پکار نے بابو گجر کے ساتھیوں کو قہقہہ بار کردیا۔

"کیا ہوا ننھی کبوتری! یہ سب اچھا نہیں لگ رہا کیا؟" وہ اپنے قہقہے بمشکل ضبط کر پا رہے تھے۔

پھولن کے دل و دماغ میں ان سبھی کو گولیوں سے بھون دینے کی خواہش مچلنے لگی۔ اس کی ہم عمر لڑکی کی چیخیں نیم غشی کی کراہوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

اس گاؤں میں کامیاب واردات کے بعد بابو گجر کا خمار سوا تر ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو تمام تر سامان سمیٹنے کا حکم دیا اور پھولن کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ پھولن نے خوف و اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔ بابو گجر نے اس کا بازو دبوچا اور چوراہے میں لے جا کر بے لباس کردیا۔ اس کے عزائم سے پھولن کی گھگی بندھ گئی۔ درجنوں افراد کے سامنے

برہنگی کا وہ احساس ناقابلِ بیان اذیت تھی۔

بابو گجر نے اسے اپنی وحشت کی زد میں رکھا ہی تھا کہ ایک جانب سے وکرم نمودار ہو گیا۔ اس کا چہرہ طیش سے سرخ ہو چکا تھا۔

"اسے چھوڑ دے بابو!" وہ غرّایا۔

"نہیں چھوڑوں گا...... بالکل نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے پھولن کو بھنبھوڑنے کا آغاز کر دیا۔

"اگر تو نے اسے نہ چھوڑا تو انجام اچھا نہیں ہوگا۔" وکرم نے سنگین لہجے میں دھمکایا۔

پھولن کی مزاحمت اور چیخ و پکار قرب و جوار میں موجود افراد کو لطف اندوز کر رہی تھی۔ بابو گجر کی ہٹ دھرمی دیکھتے ہوئے وکرم نے اپنی بندوق تانی اور دہاڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"تو نے اس گاؤں کو ابھی لوٹا ہے، اگر میں تجھ پر ایک بھی ہوائی فائر کر دوں تو یہ سب لٹے ہوئے افراد تیری بوٹیاں نوچ لیں گے۔ اچھی طرح سوچ لے کہ فائدہ کس بات میں ہے؟"

بابو گجر کی وحشت یکدم رک گئی۔ وہ حیرت و تاسف سے وکرم کی جانب دیکھنے لگا۔

"تو یہ سب اچھا نہیں کر رہا وکرم ملاح!"

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔" اس نے پھولن کو اپنی آڑ میں لیتے ہوئے لباس پہننے کا اشارہ کیا۔

"تو نے ثابت کر دیا کہ تو نیچ ذات سے تعلق رکھتا ہے۔" وہ تنفر سے کہنے لگا۔

"تو نے بھی اپنی ذات کے کوئی ترگمے نہیں گاڑے۔" وکرم نے استہزائیہ جواب دیا اور پھولن کو لیے آگے بڑھ گیا۔

"رک جاؤ وکرم!" بابو گجر چلایا۔

پھولن کے قدموں میں مزید تیزی آ گئی۔

"میں تجھے اس چھوکری کی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔" وہ اپنے ہوش و حواس کھونے لگا تھا۔ پھولن کی آبرو ریزی اب اس کی انا کا مسئلہ بن چکی تھی۔

وکرم بے نیازی سے آگے بڑھتا رہا۔ وہ بابو گجر کی خصلت اور کمزوریوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اپنی تمام تر وحشت اور افرادی قوت کے باوجود وہ کسی بھی ڈکیتی کی منصوبہ بندی کے لیے اس کا محتاج ہے۔ وکرم کی ذہانت اور معاملہ فہمی ہی ہر نئی مہم میں کلیدی کردار ادا کیا کرتی تھی۔

"وکرم! میں اس چھوکری سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔" بابو گجر چلایا۔

"تاریخ بتا دینا، میں کنیا دان کرنے کے لیے اسے لے کر آ جاؤں گا۔" وکرم نے اطمینان سے جواب دیا۔

بابو گجر کینہ توز نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

گاؤں در گاؤں مسافت کا یہ سلسلہ طویل تر ہونے لگا تھا۔ پھولن کے دل میں افسردگی نے دائمی ڈیرے جما لیے تھے۔ غیر متوازن پہاڑیوں، پگڈنڈیوں، جنگلوں اور ویرانوں سے گزرتے ہوئے اہلِ خانہ کی یاد ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہ ہوئی تھی۔

اسی سفر کے دوران وہ "مادھ پور" کے باہر پڑاؤ زن ہوئے ہی تھے کہ بابو گجر کو ایک بارہ، تیرہ سالہ لڑکی دکھائی دی۔ اس کی خوبصورتی اور نزاکت دیکھ کر بابو کی اکلوتی سلامت آنکھ میں وہی کریہہ چمک لہرانے لگی۔

"سنو لڑکی! ہمارے لیے پانی لے آؤ۔ ہم مسافر ہیں، رستہ بھول گئے ہیں۔" اس نے نرمی سے کہا۔

لڑکی نے اسے پانی پلایا ہی تھا کہ بابو گجر نے اسے دبوچ لیا۔ اس کی چیخ و پکار اور بابو کے بدمست قہقہے پھولن کو ایک بار پھر بہیش پور کے ان کٹھن زدہ شب و روز کی یاد دلانے لگے۔ اسے اس لڑکی کے روپ میں پھولن دیوی اور بابو گجر کی جگہ پتی لال دکھائی دے رہا تھا۔ وہ وحشیانہ انداز میں کسی ایسے پتھر کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی جس سے بابو کا سر کھول سکے۔

وکرم گہری نگاہوں سے اس کی کیفیات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے پھولن کو نرمی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم یہ سب نہیں کر سکو گی۔"

پھولن کے آنسوؤں میں مزید روانی پیدا ہو گئی۔

"تم اسے روکتے کیوں نہیں؟" وہ سسکنے لگی۔

"اگر میں نے اسے روکا تو وہ تمہیں شکار کرنا چاہے گا۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

پھولن اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔

"مجھ پر ایک دیا کرو گے؟" وہ ایک توقف کے بعد اس کی جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

"میں تمہیں اس درندے سے بچانے کی پوری کوشش کرتا رہوں گا۔ تم چنتا نہ کرو۔ میرے ہوتے یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔" وکرم نے تسلی دی۔

پھولن نے شدومد سے نفی میں سر ہلایا اور مزید ملتجی انداز میں کہنے لگی۔

''میرا جیون سماپت کر دو، مجھے اپنی بندوق سے گولی مار دو۔''

''جیون سے لڑنا سیکھو۔'' وکرم نے جواب دیا۔ ''مر تو ہی ہر سمسیا کا اپائے نہیں ہوتی۔''

''تم کچھ نہیں جانتے۔'' وہ کراہی۔ ''تم کچھ نہیں جانتے۔ میں نہیں بچ پاؤں گی۔ میرے بھاگیہ میں یہی لکھا ہے۔ بابو گجر بھی مجھے نوچ کھائے گا۔ یہاں موجود ہر شخص مجھے نوچے گا۔ میں سنسار کے کسی بھی کونے میں چلی جاؤں، میرے ساتھ یہی ہوتا رہے گا۔ یہی میرا بھاگیہ ہے۔ میں نے پچھلے جنم میں جانے کون سے پاپ کیے تھے کہ بھگوان نے مجھے یہ بھاگیہ دے کر اس سنسار میں بھیج دیا۔''

وکرم تاسف سے اس کمسن لڑکی کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن میں خیالات کی یورش برپا تھی۔ چند لمحے اسی خاموشی میں بیت گئے۔ اسی اثنا میں بابو گجر اس نیم جان لڑکی کو اپنے دیگر ساتھیوں کے حوالے کر چکا تھا۔ وکرم لمبے ڈگ بھرتا اس کی جانب بڑھ گیا۔

''آؤ وکرم ملاح!'' وہ اسے دیکھتے ہی استہزائیہ کہنے لگا۔ ''کیا تمہیں بھی شکار میں حصہ چاہیے تھا؟''

بابو گجر کی اس بات پر وکرم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے متوازن لہجے میں گویا ہوا۔ ''ہمیں یہ سچ سویکار کر لینا چاہیے کہ ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔''

بابو بے نیازی سے اپنی ران کھجانے لگا۔ وکرم نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ لڑکی ڈکیت نہیں ہے، اسے واپس بھیج دینا ہی بہتر ہے۔''

وکرم کی اس تجویز پر پھولن کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگیں۔ والدین اور بہن بھائیوں سے ملنے کی آس مزید توانا ہو گئی۔

''اس کا گاؤں تو یہیں پاس ہی ہے۔ یہ چاہے تو اکیلی بھی جا سکتی ہے۔'' بابو گجر نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

پھولن کے وجود میں سنسناہٹ پیدا ہونے لگی۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔'' وکرم نے رسان سے کہا۔ ''اسے واپس بھیج دیتے ہیں۔ یہ ہمارے کسی کام کی نہیں۔''

بابو گجر نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھولن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''یہ دریا پار کر لو، اس کے بعد تمہیں آگے کا راستہ سمجھ آ جائے گا۔''

پھولن کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ برق رفتاری سے دریا کی سمت بڑھی ہی تھی کہ اسے گولی کی گونج کے ساتھ اپنے بازو میں جلن کا احساس ہوا۔ وہ دہشت سے منجمد ہو کر رہ گئی۔ بابو گجر کی چلائی ہوئی گولی اس کے بازو کو چھو کر گزری تھی۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' وکرم بھنایا۔ ''گولی کیوں چلائی ہے؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں اس لڑکی کو واپس بھیج کر ان لوگوں پر اپنی کمزوری ثابت کروں گا؟'' وہ غرایا۔ ''اس لڑکی کو وہاں بھیجنے کا مطلب ہے کہ ہم اس سے ہار گئے۔''

''تم اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھ رہے کہ ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس لڑکی کے پریوار سے اپنی کسی پرانی دشمنی کا بدلہ چکایا ہے۔'' وکرم جھلا گیا۔

''یہ حساب میں خود ہی چکتا کر لوں گا۔'' وہ اطمینان سے کہنے لگا۔ ''لڑکی کہیں نہیں جائے گی، میں اس سے بیاہ کروں گا۔''

پھولن نے اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کے دل میں پیدا ہونے والی آس نے آخری ہچکی لیتے ہوئے دم توڑ دیا تھا۔

☆☆☆

مادھو پور سے روانگی کے بعد پھولن نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اسے وکرم اور بابو گجر کے باہم رشتے کی بھی قدرے سمجھ آنے لگی تھی۔ اس گروہ میں سبھی افراد بابو سے شدید خائف رہتے تھے۔ وہ بھی ان میں سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ ان درجنوں افراد میں صرف وکرم ہی بے باکی اور صاف گوئی سے اپنا مطمح نظر بیان کر پاتا تھا۔

وکرم کے درجن بھر ساتھیوں میں اکثریت ملاحوں کی تھی۔ چند ایک افراد البتہ نچلی ذاتوں سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ بابو گجر کے ہم نواؤں میں ٹھاکر غالب تھے۔ یہ دونوں گروہ رات بھر سفر کرتے، مختلف گاؤں اور علاقوں سے رسد لیتے اور دن کا بیشتر حصہ آرام میں گزارتے ہوئے اگلی مہم کی مکمل منصوبہ بندی کرتے۔ چند ایک گاؤں ان کی دسترس سے محفوظ تھے۔ وہ ان علاقوں سے اپنے لیے اشیائے خورونوش حاصل کرتے اور لوٹ مار کے مال سے غریب دیہاتیوں کو بھی مخصوص حصہ دان کر دیتے۔ ان دونوں گروہوں میں واحد فرق یہ تھا کہ وکرم اور اس کے ساتھی عورتوں کی آبرو ریزی نہیں کرتے تھے۔

کچھ روز بعد وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں بمشکل کچھ دیر کے لیے پڑاؤ زن ہونا تھا۔ وکرم اور بھرت قرب و جوار کا جائزہ لینے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اسی اثنا میں بابو گجر کے ذہن میں سودا سمایا اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ

لوٹ مار کے لیے روانہ ہو گیا۔ ان کی نگاہوں میں کریہہ چمک دیکھ کر پھولن کا دل کسی خشک پتے کی طرح لرزنے لگا۔ اس میں اب مزید خواتین کی آبروریزی دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔

وکرم اور بھرت واپسی کے بعد اس نئی صورت حال پر تلملا گئے۔ بابو گجر کی یہ خودسری وکرم کا خون کھولا رہی تھی۔

''یہ راکھشس خود بھی مرے گا اور ہمیں بھی مروائے گا۔'' اس نے دانت پیسے۔

''اسے واپس کیسے بلائیں؟'' بھرت نے دریافت کیا۔ وہ قدرے کوتاہ قامت اور گول مٹول جسامت کا حامل تھا۔

وکرم نے لمحاتی سوچ بچار کے بعد اپنے سامان سے ایک میگا فون برآمد کیا اور ہڑبڑاہٹ کے عالم میں پولیس کی آمد کا اعلان کرنے لگا۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ بابو گجر اور اس کے ساتھی نیم برہنگی کی حالت میں بوکھلائے ہوئے وہاں لوٹ آئے۔ وکرم نے پھولن کا ہاتھ تھاما اور قریبی جنگل کی راہ لی۔ دیگر افراد بھی ان کے پیچھے ہی تھے۔

جنگل میں ایک مخصوص مقام تک پہنچ کر بابو کے ساتھیوں نے اپنے سردار کے لیے ترپال لگا دی تاکہ بارش سے بچاؤ ممکن ہو سکے۔ زمین پر ایک چادر بچھا کر تکیہ دے دیا گیا۔ دیگر افراد ایسے کسی بھی اہتمام کے بغیر اپنے تھیلوں کو سرہانے رکھے زمین پر درختوں کے نیچے سو گئے۔ وہ فضا کی ٹھنڈک اور مرطوب زمین سے بے نیاز تھے۔ بابو بھی کسی بدمست ہاتھی کی طرح اپنے خیمے میں چلا گیا۔

وکرم ایک درخت کے تنے سے پشت لگائے سگریٹ پینے لگا۔ اس کی نگاہوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ پھولن کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس نے جنگل کے راستے میں کالی ماتا کا ایک مندر دیکھا تھا۔ اسے رہ رہ کر ایک ہی خدشہ ستا رہا تھا کہ بابو گجر اس سے زبردستی بیاہ میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس تصور سے پھولن کے پیٹ میں خوف کے بگولے اٹھنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد بابو کی خمار آلود آواز نے اسے بدکنے پر مجبور کر دیا۔

''مجھے اکیلے نیند نہیں آرہی، اس چھوکری کو اندر بھیج دو۔''

پھولن نے مدد طلب نگاہوں سے وکرم کی جانب دیکھا۔ وہ اپنا سگریٹ ایک جانب پھینک کر گہرے سانس لینے لگا۔

''سو جاؤ بابو گجر! کل تمہارا بیاہ ہو ہی جائے گا۔'' اس نے رسان سے کہا۔

''ڈر کیوں رہے ہو ملاح؟ میں بہت تھک گیا ہوں۔ اگر یہ چھوکری اپنے نرم ہاتھوں سے میری ٹانگیں دبا دے تو سکون کی نیند سو جاؤں گا۔'' وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم تھا۔

پھولن کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وکرم نے اسے آنکھ کے خفیف اشارے سے خیمے میں جانے کا عندیہ دے دیا۔ پھولن چاروناچار خیمے میں چلی گئی۔ بابو گجر اسے دیکھتے ہی جھوم اٹھا۔

''آ، میری ننھی کبوتری!''

پھولن اپنے لرزیدہ وجود کو سنبھالتی آگے بڑھ گئی۔ بابو کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی وحشت کی تسکین کا آغاز کیا ہی تھا کہ وکرم خیمے میں چلا آیا۔

''اسے چھوڑ دے بابو!'' وہ چلایا۔

''تو یہاں سے چلا جا وکرم!'' اس نے بدمزگی سے کہا۔ ''میرے بیاہ کی تیاریاں کر۔''

''میں جانتا ہوں کہ تو اس سے بیاہ نہیں کرے گا۔'' وہ زہر خند تھا۔

بابو گجر کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وکرم نے اپنی بندوق کی نال اس کے سر پر رکھی اور لگاتار دو گولیاں چلا دیں۔ بابو کے بوجھ تلے دبی پھولن کے حلق سے ہذیانی چیخیں برآمد ہونے لگیں۔ گرم لہو نے اس کا بدن شرابور کر دیا تھا۔

گولیاں چلنے کی آواز سنتے ہی بابو گجر کے ساتھی سنسناتے ہوئے خیمے میں چلے آئے۔ اگلے چند لمحے خونریز تھے۔ وکرم کے ہم نواؤں نے ان کے بدن روح سے آزاد کر دیے۔ کچھ ہی دیر میں حالات یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔ وکرم کے ساتھی بابو گجر کی لاش کو ٹھوکریں مارتے رقص کرنے لگے۔ پھولن ہنوز ہذیان زدہ تھی۔ وارے لال نے نرمی سے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

''کنوئیں سے پانی لے کر اپنا شریر صاف کر لو۔''

پھولن دیوانہ وار کنوئیں کی جانب بھاگی۔ اس کی حسیات میں رچی لہو اور بارود کی بدبو معدے میں اینٹھن پیدا کر رہی تھی۔

''اسے اکیلا مت چھوڑو، کہیں آتماہتیا ہی نہ کر لے۔'' وکرم تشویش زدہ تھا۔

''میں اس کے پاس چلا جاتا ہوں۔'' بھرت نے اپنی خدمات پیش کیں۔

وکرم نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے سامان سے ایک کاغذ برآمد کر کے لکھنے لگا۔

''بابو گجر سنگھ کو پھولن دیوی کے نام پر قتل کیا گیا ہے۔''

وارے لال نے اپنے سر کو تائیدی جنبش دی اور کاغذ



Scanned with CamScanner

بابو گجر کی جیب میں رکھ دیا گیا۔ اس کی بندوق اور دیگر جیبوں سے برآمد ہونے والے لوٹ مار کے مال کو البتہ نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

”یہاں سے چلتے ہیں اب۔“ وارے لال نے بھتیجے سے مشورہ طلب کیا۔

”پھولن کا خیال رکھنا ہے۔“ وکرم نے یاددہانی کروائی۔

وارے لال کے ہونٹوں پر مبہم مسکراہٹ رینگ گئی۔

☆☆☆

بابو گجر کی موت کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ جمنا کے کنارے دیہاتوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس علاقے کے رہائشی اس کے مظالم اور خواتین پر مجرمانہ حملوں کے باعث بے حد زچ تھے۔ ”آستا“ نامی گاؤں سے چند خواتین وکرم سے ملاقات کے لیے چلی آئیں۔

”تم نے بہت پن کا کام کیا ہے بیٹا!“ وہ اسے ہار پہنانے لگیں۔

پھولن حیرت سے ان خواتین کو دیکھنے لگی۔ اس کے اندازے کے مطابق ان کی عمر بیس، بائیس برس رہی ہوگی۔ وکرم ملاح کم از کم پچیس برس کا تھا۔ وہ اسے نہایت محبت وعقیدت سے بیٹا کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں۔

”اب آپ لوگ بالکل سُرکھشت ہیں۔ ہم آپ کی سہائتا بھی کرتے رہیں گے۔“ وکرم نے نرمی سے کہا۔

”اپنا خیال رکھنا، کوئی بھی انسان جب ستیہ اور انیائے کے راستے پر چلتا ہے تو اس کے اپنے ہی ورودھی ہوجایا کرتے ہیں۔“ ایک عورت نے گمبھیر انداز میں گہرا نکتہ بیان کیا۔

”آپ میرے لیے پرارتھنا کرتی رہیں گی تو مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ وہ مسکرایا۔

پھولن گہری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتی رہی۔ وکرم اس کی زندگی میں آنے والا ایک انوکھا مرد تھا۔ اس کی عادات، رویہ اور فطرت دیکھتے ہوئے پھولن کو اپنی بصارت پر ہی شائبہ ہونے لگتا تھا۔ اس لیے بھی وکرم کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کی ذہنی رو اپنے اہلِ خانہ کی جانب منتقل ہوگئی۔

”بابو گجر نے اب تک کتنی ہی عورتوں کے ساتھ کھلواڑ کیا تھا۔ وہ میرے ساتھ بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی مرتیو میرے کارن ہی ہوئی ہے۔“

اس احساس نے پھولن کے دل میں ایک تفاخر کا احساس پیدا کردیا۔ اگلے ہی پل وہ اپنی واپسی کے متعلق سوچ کر مضطرب ہونے لگی۔

”اگر وکرم نے مجھے اورایا واپس بھیجا تو میں منع کر دوں گی۔ مجھے دیکھ کر میادین اور سرپنچ، ماں اور بابو کا جیون اور بھی مشکل کردیں گے۔ میں رکمنی کے گھر چلی جاؤں گی۔ اس کے بچوں کا دھیان رکھ کر جیون گزار دوں گی۔“

میادین اور سرپنچ کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں ایک برق کوندی۔

”وکرم سے بنتی کرتی ہوں کہ مجھے انیائے چاہیے۔ میادین اور سرپنچ کو بھی بابو گجر کی طرح گولیاں مار دے۔ اس کے بعد گاؤں والوں سے کہے کہ مجھے انسان سمجھ کر برتاؤ کیا کریں۔ اس کے ڈر سے میرے ساتھ سب ٹھیک ہوجائیں گے۔“

انہی خیالات میں غلطاں پھولن، وکرم کے دیگر ساتھیوں کی طرح ایک کشتی میں سوار ہوگئی۔ ان کی منزل جمنا کے کنارے ایک دور افتادہ گاؤں تھا۔ دریا کے چمکیلے پانی اور کناروں پر دکھائی دینے والی سرمئی ریت اسے ایک بار پھر اورایا کی یاد دلانے لگی۔

اس سفر کا اختتام ایک مندر کے پاس ہوا۔ وارے لال، بھرت، مادھو اور دیگر ساتھی وکرم کے ہمراہ مندر کے احاطے میں داخل ہوگئے۔ اگلے نصف گھنٹے کی گفت وشنید کے بعد ان سب نے وکرم کو اپنا سردار تسلیم کرلیا تھا۔

”اس لڑکی کا کیا کرنا ہے؟ صاف دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنے گھر پریوار کو بہت یاد کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہر سمے ایک پیاس نظر آتی ہے۔“ وارے لال نے دریافت کیا۔

”اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا۔“ وکرم نے اعتراف کیا۔ ”اگر اسے واپس بھیجا تو اس کے ساتھ پھر وہی کچھ کیا جائے گا۔ اتنا تو تم بھی جانتے ہو کہ اس کے پریوار سے پرانی دشمنی نکالی گئی ہے۔“

”تو پھر اسے اپنے ساتھ رکھ لو۔“ وارے لال نے بلا تامل تجویز دی۔ ”اس سے بیاہ کرلو۔ اس طرح گروہ کا کوئی دوسرا شخص اسے کبھی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا۔“

چچا کی یہ تجویز اس کے دل کو لگی۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ اپنے دل میں پھولن کے لیے نرمی اور ہمدردی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے لمحاتی تذبذب کے بعد پھولن سے براہ راست گفتگو کا فیصلہ کرلیا۔ وہ مندر کے باہر چلا آیا جہاں پھولن کے علاوہ اس کے دیگر ساتھی بھی موجود تھے۔

”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“ وکرم نے اپنے مخصوص نرم انداز میں دریافت کیا۔

”میری طبیعت کو کیا ہوا تھا؟“ وہ حیران ہوئی۔



Scanned with CamScanner

وکرم اس کی حیرت پر بے ساختہ مسکرا اٹھا اور رسان سے کہنے لگا۔ ”تم نے جیون میں پہلی بار کسی کا خون ہوتے دیکھا ہے۔ میں جانتا ہوں خون اور بارود کی بدبو کئی روز تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ بدبو سپنے میں بھی تمہیں تنگ کرتی ہوگی۔“

وکرم کے اس تجزیے پر پھولن دنگ رہ گئی۔ اس نے پھولن کے ذہن میں رواں کشمکش کو گویائی دے دی تھی۔ وہ لمحات بے حد عجیب تھے۔ پھولن کو پہلی بار کوئی ایسا شخص ملا تھا جو اس کی ذہنی وجذباتی کیفیت کو سمجھ پا رہا تھا۔ ماضی قریب وبعید میں رام کماری کے علاوہ اس نہج تک کوئی بھی نہ پہنچ سکا تھا۔ دیوی دین اور مولہ بھی اس کی کیفیات وجذبات سے چشم پوشی کر دیا کرتے تھے۔ ان لمحات کے زیر اثر پھولن کی آنکھیں بھر آنے لگیں۔

وکرم اس کی لحظہ بہ لحظہ متغیر کیفیات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک توقف کے بعد مزید نرمی سے کہا۔

”میں تمہیں کیسا لگتا ہوں پھولن؟“

اس سوال نے پھولن کو گڑبڑا دیا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔ وکرم کے ساتھی اس صورت حال پر قہقہہ بار تھے۔ ان کے معنی خیز جملے پھولن کو مزید الجھانے لگے۔ اپنے اغوا کے بعد پھولن کو ایک مشکل درپیش رہی تھی۔ وہ ان افراد کی گفتگو مکمل طور پر سمجھ نہیں پائی تھی۔ اس کا لہجہ ان سبھی کے لہجوں سے یکسر مختلف تھا۔ اوریائے اور دیگر قصبوں کی مادری زبان کا تضاد ہی اس تبدیلی کا سبب تھا۔ اوریا کے گاؤں میں ”بندھیل کھنڈی“ جبکہ وکرم اور اس کے ساتھی ”چوراسی“ کی بولی استعمال کرتے۔ جج، وکیل اور جیل کے محافظ بھی اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔

اپنی کم فہمی کے باعث اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہوگئے۔ ان آنسوؤں کا در پردہ محرک یہ احساس بھی تھا کہ وکرم بھی اسے واپس بھیجنے کے لیے سنجیدہ نہیں ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ ہی بندی رکھنا چاہتا ہے۔

”رو کیوں رہی ہو؟“ وہ اس کے بال نرمی سے سہلانے لگا۔ ”میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا۔“

وکرم کے اس لمس نے پھولن کے وجود میں عجب گدگداہٹ پیدا کر دی۔ وہ کسی بھی مرد کے ایسے نرم اور محبت بھرے لمس سے نا آشنا تھی۔

”اچھا اب بتاؤ نا، میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟“ اس نے ایک بار پھر دریافت کیا۔

پھولن کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

”ارے بڑھوا وہ لڑکی ہے، اپنی زبان سے کیسے بتائے گی؟“ ایک ساتھی نے تان لگائی۔

”مستانہ جی! کچھ تو سمجھداری سے کام لو۔“ بھرت نے اسے مخصوص عرفیت سے مخاطب کیا۔ ”ایسی باتیں اکیلے میں پوچھی جاتی ہیں، تم نے ہم سبھی کے سامنے پنچایت لگالی۔“

”اسے اکیلے میں بتاؤ تم اس سے اتنا پریم کرتے ہو کہ یہ سب کچھ بھول جائے گی۔“ مادھو نے مسکراتے ہوئے تجویز دی۔

زبان میں فرق کے باعث پھولن ایک بار پھر الجھ گئی۔ وہ چوراسی زبان میں پریم کے لیے مستعمل لفظ کے مطلب سے انجان تھی۔

”شاید یہ کوئی میٹھی اور لذیذ کھانے والی چیز کی بات کر رہے ہیں۔“ اس نے قیاس کیا۔

وکرم نے ایک گہری سانس لی اور پھولن کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ بہت غلط کیا گیا ہے۔ ٹھاکروں نے تم پر بہت اتیاچار کیے ہیں۔“

پھولن کے آنسوؤں میں مزید روانی آگئی۔ وارے لال کی آنکھوں میں اس کم عمر لڑکی کے لیے تاسف درج تھا۔

”رو کیوں رہی ہو، کیا تمہیں میری بات اچھی نہیں لگی؟“ وکرم مضطرب تھا۔

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”تو پھر کیا بات ہے؟ کچھ تو بتاؤ۔“ اس کا اضطراب بڑھنے لگا۔

پھولن چند لمحوں کے لیے تذبذب میں مبتلا ہوگئی۔ اسے اپنی کیفیات وجذبات کا اظہار کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ وکرم کی گہری نگاہیں اس کے چہرے کے تغیرات پر ہی مرکوز تھیں۔ پھولن نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا اور دھیمے انداز میں کہنے لگی۔

”میں نے اپنے جیون میں سب سے زیادہ نفرت مرد ذات سے کی ہے۔ مجھے آج تک کسی نے نرمی یا پریم سے نہیں چھوا۔ اس سنسار میں میرے باپو کے سوا ہر کسی نے مجھے تکلیف دی ہے، میرے شریر کو کچلا ہے۔ باپو کے بعد تم پہلے مرد ہو جس کے چھونے سے مجھے تکلیف نہیں ہوئی بلکہ حوصلہ اور سکون ملا ہے۔“

پھولن کے خاموش ہو جانے پر وکرم نے رسان سے دریافت کیا۔ ”تمہارے باپو واقعی بہت بھلے آدمی ہیں۔“

”ہاں، لیکن وہ بہت کمزور ہے۔ تم شکتی شالی ہو، تمہارے چھونے سے شکتی بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے

کہ اب میں سرگشت ہوں۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''تم اب بالکل سرگشت ہو پھولن! میرے ہوتے ہوئے کوئی بھی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔'' وہ قطعیت سے کہنے لگا۔

پھولن نے گہری سانس لیتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''میں وچن دیتا ہوں کہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا، تمہاری رکھشا کروں گا، تمہاری آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آنے دوں گا۔'' اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔

''مجھے تم پر وشواس ہے۔'' وہ گلنار ہوگئی۔

''مجھ سے بیاہ کرلو پھولن!'' وکرم نے کہا۔

''بیاہ.....!'' اس کے وجود میں خوف کی لہریں موجزن ہونے لگیں۔ ذہن کے نہاں خانوں سے کچھ مناظر اور آہ وفغاں مضطرب کرنے لگے تھے۔

''اگر تم راضی نہیں ہو تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔ بیاہ تو من کی خوشی سے ہوتا ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''میرا بیاہ تو ہو چکا ہے وکرم!'' اس نے سسکی لی۔ ''میں بہت چھوٹی تھی، مجھے پتی لال کے ساتھ بیاہ کے بعد مہیش پور بھیج دیا گیا تھا۔''

''شش..... خاموش ہو جاؤ۔'' وکرم نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''یہی تمہارا پہلا بیاہ ہے اور میں تمہارا پہلا پتی ہوں۔''

پھولن بے چینی سے اپنے ہونٹ کچلنے لگی۔

''بیاہ کروگی نا مجھ سے؟'' اس نے ایک توقف کے بعد اپنا سوال دہرایا۔

''ہاں، کروں گی۔'' پھولن نے بے اختیار جواب دیا۔

وارے لال اور دیگر ساتھی خوشی سے ہوا میں گولیاں چلانے لگے۔ ان کا جوش وخلوص دیکھ کر پھولن کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

☆☆☆

پھولن کے اقرار نے وکرم میں جوش وجذبہ کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اس نے اپنے چند ساتھیوں کو قریبی گاؤں سے اشیائے خورونوش اور دیگر اہم سامان لانے کے لیے روانہ کردیا۔ ان ساتھیوں نے اب جنگل میں مخصوص مقام پر وکرم سے ملاقات کرنی تھی۔

وارے لال، وکرم اور بقیہ ماندہ افراد جنگل پہنچ کر برگد کے ایک گھنے پیڑ تلے پڑاؤ ڈالن ہوگئے۔ گاؤں جانے والے ساتھیوں کی واپسی نے ماحول یکدم ہی گرما دیا۔ وہ اپنے ہمراہ پھولوں کے ہار، تلک، بندیا اور سیندور بھی لے آئے تھے۔

وکرم نے گیندے کا ایک ہار پھولن کے گلے میں ڈالا اور پیشانی پر سیندور آویزاں کردیا۔ پھولن کی آنکھیں ایک بار پھر آنسوؤں کی طغیانی کی زد میں تھیں۔ وکرم کے بھی ساتھی رقص کرتے شادی کے گیت گانے لگے۔ ان کی فائرنگ سے درختوں پر بیٹھے سبھی پرندے اڑ گئے۔

یہ ہنگامہ تھمتے ہی وکرم سنجیدگی سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''آج تم سب لوگوں کو ایک سوگند کھانا ہوگی۔ میں تمہارا سردار ہوں اور پھولن تمہارے لیے بہن اور ماں جیسی ہے۔''

''ہم تیار ہیں۔'' وہ یک زبان تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دریا کے کنارے پر موجود تھے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے اپنی ہتھیلی میں پانی لیا اور اسے دریا میں گراتے ہوئے یکساں الفاظ دہرائے۔

''وکرم میرا سردار ہے، میں اس کے ہر حکم کا پالن کروں گا۔''

اس کے بعد یہ عمل ایک بار پھر دہراتے ہوئے کہا گیا۔

''پھولن میری بہن ہے۔ میں اس کی عزت کروں گا۔ اس کی ہر حال میں رکھشا کروں گا۔''

ان رسومات کے اختتام پر وارے لال نے وکرم سے کہا۔ ''تم دونوں گاؤں میں چلے جاؤ۔ کچھ روز وہیں رہ لو تو بہتر ہے۔ یہاں سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔''

وکرم نے تائیدی انداز میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

☆☆☆

''یہ کس کا گھر ہے؟'' پھولن نے اپنے نئے پڑاؤ پر پہنچتے ہی دریافت کیا۔

''یہاں میرا چچیرا بھائی رہتا ہے۔ ہم کچھ روز یہیں رہیں گے۔'' اس نے اپنے مخصوص نرم انداز میں جواب دیا۔

وکرم کو دیکھتے ہی اس مکان کے رہائشی خوشی سے کھل گئے۔

''بہت سے بعد آئے ہو مستانہ!'' درمیانی عمر کے ایک شخص نے محبت سے شکوہ کیا۔

''اب آگیا ہوں تو یہیں رہوں گا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''یہ لڑکی کون ہے؟'' دوسرا شخص متجسس ہوا۔

''پھولن..... میری پتنی..... ہم نے آج ہی بیاہ کیا ہے۔'' وکرم نے بتایا۔

اہل خانہ حیرت وخوشی کی متضاد کیفیات میں مبتلا ہوگئے۔ وکرم سے منسوب ہر شے ہی انہیں بے حد عزیز تھی۔

''ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ آرام کرنا چاہتے ہیں۔''

وکرم کی اس فرمائش پر فی الفور ایک کمرا تیار کر دیا گیا۔ پھولن خالی الذہنی کی کیفیت کا شکار تھی۔ اسے یہ سب کچھ کسی خواب کے مانند محسوس ہو رہا تھا۔ دل و دماغ غیر اختیاری طور پر ماضی کے اس ان چاہے رشتے سے تقابل کر رہے تھے۔ پتی لال سے وابستگی کسی جبر اور گھٹن سے کم نہ تھی۔ وکرم کی سنگت میں طمانیت، تحفظ اور سکون کے ناقابلِ بیان احساسات موجزن تھے۔

وکرم کے کمرے میں آتے ہی پھولن جبلی طور پر سہم گئی۔ وہ اس پر اعتماد کے باوجود اپنے خوف و سابقہ تجربات سے پیدا ہونے والی وحشت سے نجات حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ وکرم متانت سے بستر کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس نے پھولن سے فاصلہ برقرار رکھا ہوا تھا۔ اسے پھولن کی نگاہوں میں خوف و وحشت واضح دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک گہری سانس بھرتے ہوئے کہنے لگا۔

”تم جانتی ہو اس سنسار میں پتی اور پتنی کا سمبندھ سب سے سندر ہوتا ہے۔“

پھولن نے بے ساختگی سے نفی میں سر ہلایا اور سراسیمگی سے کہنے لگی۔ ”نہیں، یہ سمبندھ بہت تکلیف دیتا ہے۔ پتنی مار پیٹ کے لیے ہی اس سنسار میں آتی ہے۔“

وکرم کی نگاہوں میں تاسف در آیا۔ وہ نرمی سے مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

”تم اپنے بارے میں مجھے کچھ بتانا چاہو تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے اس سمبندھ کی شروعات بالکل اچھے انداز میں ہو۔ کسی کے دل پر کوئی بوجھ نہ ہو۔“

پھولن کے روح و قلب پر موجود تمام تر آبلے یکدم ہی پھوٹ گئے۔ وہ کسی مقناطیسی رو میں بہتی چلی گئی۔ اس نے وکرم کو پتی لال سے شادی، اپنے گاؤں واپسی، میادین کی کم ظرفی، بیہش پور دوبارہ روانگی، اذیت و گھٹن بھرے شب و روز اور دیوی دین کے گھر دوبارہ آمد کے بعد اپنے جسمانی استحصال کی روداد بلا کم و کاست سنا دی۔

وکرم حیرت و رنج سے اس کمسن لڑکی کی جانب دیکھنے لگا جس نے اس دنیا کی وحشت و جبر کا جانے کیسے سامنا کیا تھا۔

”تم چنتا نہ کرو، اب تم میری پتنی ہو۔ کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“ اس نے پھولن کے ہاتھ پر نرمی سے بوسہ دیا۔

پھولن کے وجود میں نفرت و بے حسی کی برف یکدم ہی پگھلنے لگی۔ اسے اس لمس میں بے حد لطافت محسوس ہوئی تھی۔

”میں تمہارے لیے کچھ تحفے لایا ہوں۔ اسے پہنو گی تو مجھے اچھا لگے گا۔“ وکرم نے چند اشیا اس کی جانب بڑھا دیں۔

پھولن حیرت سے طلائی ہار، ناک میں پہننے کے لیے نقرئی لونگ اور دیدہ زیب پلاسٹک کی چوڑیاں دیکھنے لگی۔ ان اشیا کو ہاتھ میں لیتے ہی سماعت میں ہذیانی چیخوں کی آواز گونجنے لگی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں پر انگاروں کی سی جلن محسوس ہونے لگی۔

”تم غلط سوچ رہی ہو۔“ وکرم نے ایک بار پھر اس کے خیالات تک رسائی حاصل کر لی۔ ”یہ ڈکیتی کا مال نہیں ہے، بہت سمے سے میرے پاس پڑے ہیں۔ تب میں ڈکیت نہیں تھا۔“

پھولن لمحہ بھر میں ہی آسودگی محسوس کرنے لگی۔ اس نے استحقاق سے وہ چیزیں تھام کر اپنے بدن کا حصہ بنا لیں۔ وکرم کی نگاہوں میں سوچ کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ اس نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے پھولن سے کہا۔

”ہمارے بارے میں بھی کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ اگر تم نے غلطی سے بھی ہم میں سے کسی کے بارے میں باہر کوئی بات کہی تو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے مار دوں گا۔“

پھولن مضطرب ہو کر اپنے ہونٹ کچلنے لگی۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی حائل ہو گئی تھی۔

”تم یہاں آرام سے سو جاؤ۔ میں فرش پر لیٹ جاتا ہوں۔“ وکرم نے تجویز دی۔

پھولن لمحہ بھر کے لیے الجھ گئی اور ایک توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”تم اسی کنارے پر لیٹے رہو، میں دوسری طرف لیٹ جاؤں گی۔“

وکرم کے ہونٹوں پر تشکرانہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح پھولن کی آنکھ بہت تاخیر سے کھلی۔ اسے خود بھی اس بات پر حیرت تھی کہ اسے جانے کتنے عرصے بعد اتنی گہری اور پرسکون نیند آئی تھی۔ میزبانوں نے بہترین ناشتے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وارے لال بھی وہیں چلا آیا۔ اس کے چہرے سے تشویش اور الجھن عیاں تھی۔

”ہمیں یہاں سے چلنا ہوگا مستانہ!“

”کیا ہوا، کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟“ وکرم بھی الجھ گیا۔

”ہو بھی سکتی ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ پولیس بابو گجر کے قاتلوں کو ڈھونڈ رہی ہے۔ یہاں سے ترنت نکلو۔“



Scanned with CamScanner

اس نے بتایا۔

وکرم نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور برق رفتاری سے دیگر مراحل طے کرتے ہوئے ''جماؤ'' نامی گاؤں پہنچ گئے۔ اس علاقے کی ظاہری ہیئت پھولن کے آبائی علاقے جیسی ہی تھی۔ بیشتر مکانات کچے تھے، پختہ مکانات وسیع اور دیدہ زیب تھے۔ یہاں مختلف ذاتوں کے لوگ آباد تھے۔ اکثریت البتہ ''جاٹوں'' کی تھی۔ وکرم نے پھولن کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ گاؤں کے بڑے بازار سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے گھر کے سامنے رک گیا۔ اس نے چوبی دروازے پر دباؤ بڑھایا اور اعتماد سے اندر بڑھ گیا۔

وسیع صحن پر مشتمل یہ گھر نہایت صاف ستھرا تھا۔ صحن میں پانچ عورتیں مختلف کاموں میں مشغول دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک عورت کی نظر وکرم پر پڑی تو وہ والہانہ انداز میں اس کی جانب بڑھ آئی۔ پھولن نے گھبرا کر وکرم کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

وکرم اس عورت سے بغلگیر ہوا اور طمانیت سے کہنے لگا۔ ''یہ پھولن ہے...... تمہاری نئی بیٹی!''

عورت کے چہرے پر حیرت جھلکنے لگی۔ اسی اثنا میں ایک اور درمیانی عمر کی عورت بھی وکرم کے پاس چلی آئی۔

وکرم نے پھولن سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ میری ساس ہے۔''

پھولن اس انکشاف پر دنگ رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں میں یکدم ہی جلن محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی نگاہیں ایک لڑکی پر پڑیں جو اپنی گود میں دو، تین سالہ بچی کو سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لڑکی کی عمر لگ بھگ بیس سال تھی۔ لمبے گھنے بال، دودھیا رنگت اور دلفریب نقوش میں بلا کی جاذبیت تھی۔ بچی کے بال، رنگت اور نقوش بھی ماں جیسے ہی تھے۔ اپنی تمام تر کند ذہنی اور سادہ لوحی کے باوجود پھولن کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وکرم اور اس لڑکی میں کیا رشتہ ہے؟ اسے یکدم ہی احساس کمتری نے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ وہ شاکی نظروں سے وکرم کی جانب دیکھتے ہوئے یہاں سے کہیں دور چلے جانے کا منصوبہ بنانے لگی۔

''تم ایک بار پھر غلط سوچ رہی ہو۔'' وکرم نے ٹوکا۔

''تم نے مجھ سے جھوٹ بول کر بیاہ کیا ہے، مجھے دھوکا دیا ہے۔'' اس کی آواز پھٹنے لگی۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے بیٹی!'' ایک مرد نے اسے مخاطب کیا۔

پھولن نے اچٹتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور نقوش میں مماثلت کے باعث آسانی سے بھانپ لیا کہ وہ وکرم کا والد ہے۔

''ان دونوں کا ''بال وِواہ'' کیا گیا تھا۔'' مرد کہنے لگا۔ ''اس سے تو انہیں بیاہ کا مطلب بھی نہیں پتا ہوگا۔''

وکرم کے بشرے میں کسی قسم کی بے چینی نہ تھی۔ وہ اطمینان سے پھولن کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں راجیشوری نامی وہ لڑکی بھی پھولن کے پاس چلی آئی۔

''دیکھو بہن اپنی پتی کے سمبندھ میں شک اچھا نہیں ہوتا۔ وکرم تمہارے پتی ہیں، ان پر وشواس کرو گی تو جیون سورگ بن جائے گا۔''

پھولن حیرت سے اس لڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔ وکرم کی ماں نے اسے ایک چارپائی پر بٹھایا اور منہ دکھائی کی رسم ادا کرتے ہوئے بیس روپے مٹھی میں دبا دیے۔

''جگ جگ جیو، سدا سہاگن رہو۔ بھگوان تم دونوں کی رکھشا کرے۔'' اس نے پھولن کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

وکرم کے والد، ساس اور دیگر اہل خانہ نے بھی فراخدلی سے یہ رسم ادا کی۔ کچھ ہی دیر میں پھولن کی عدم اطمینانی اور بے چینی قدرے زائل ہو گئی تاہم وہ ہنوز راجیشوری کے متعلق سوچ رہی تھی۔

''اس نے میرے رنگ روپ کے متعلق کیا سوچا ہوگا؟ اسے اپنے پتی کے دوسرے بیاہ کا بالکل دکھ نہیں ہوا کیا؟''

ان خیالات میں غلطاں وہ گاہے بگاہے گھر کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ اسے کچھ ہی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ ایک ہی برادری سے تعلق ہونے کے باوجود وکرم کا خاندان آسودہ حال ہے۔ ان کا گھر دیوی دین کے مکان سے بڑا اور کشادہ تھا۔ ایک کمرے میں اناج کا خاصا ذخیرہ بھی موجود تھا۔ تمام تر رسومات کی ادائیگی اور مختصر قیام کے بعد روانگی کے وقت پھولن ایک حتمی فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کا ذہن ایک ہی نکتے پر مرکوز تھا۔

''راجیشوری بہت سندر سہی لیکن وکرم نے مجھ سے بیاہ کرلیا ہے۔ اس نے اپنی مرضی سے یہ قدم اٹھایا ہے۔ راجیشوری تو یہیں اسی گھر میں رہے گی۔ اس کے ساتھ ہر جگہ میں ہی رہا کروں گی۔ وکرم اب میرا پتی ہے اور میں اسے اپنا بنائے رکھنے کے لیے کچھ بھی کروں گی۔''

مرد ذات سے نفرت کرنے والی پھولن ایک مرد کی محبت، توجہ اور اپنائیت کی اسیر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

سفر کا دوبارہ آغاز ہوا تو پھولن کے ذہن میں اپنے والدین کا خیال کلبلانے لگا۔ اسے وہاں سے آئے جانے

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

کتنے روز ہو چکے تھے۔ وہ اپنی لاعلمی کے باعث ہنوز گنتی کرنے سے قاصر تھی۔ وکرم سے شادی اور اس کے خاندان سے ملاقات کی بابت جاننے کے بعد ان کا ردِعمل سوچتے ہوئے وہ ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔

''پھولن! اس جگہ کو پہچانتی ہو؟'' وکرم نے دریافت کیا۔

وہ بے نیازی سے قرب وجوار کا جائزہ لیتے ہوئے یکدم چونک گئی۔ اسے ایک مقام کی دید نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ سماعت میں گیارہ سالہ بچی کی آواز گونجنے لگی۔

''میں یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔''

''مہیش پور...... یہ مہیش پور ہے؟'' اس کا بدن سنسنا گیا۔

وکرم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھولن وحشت کے عالم میں ان گلی کوچوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے پردۂ تصور پر لہو میں تربتر ایک بچی پناہ کی تلاش میں بھاگتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس بچی کے عقب میں بھیڑیے کی طرح ایک شخص کی دید اس کے لہو میں چنگاریاں برپا کرنے لگی۔

''اس کے گھر کا پتا معلوم ہے تمہیں؟'' وکرم نے استفسار کیا۔

''نہیں، بس اتنا یاد ہے کہ گھر سے باہر چولہا جلانے کے لیے لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوتا تھا۔'' اس نے الجھ کر بتایا۔

وکرم نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ مختلف گھروں میں پتی لال کی رہائش گاہ کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ ایک آدمی نے بالآخر اس کے گھر کی نشاندہی کر دی۔

''کیا تم اس راکشس سے انتقام لینا چاہتی ہو؟'' وکرم نے دریافت کیا۔

پھولن کا بدن بے طرح سنسنا گیا۔ اس کی ذہنی کیفیت نہایت دگرگوں تھی۔ پتی لال سے وابستہ یادیں روح کے ریشے ادھیڑ رہی تھیں۔ وکرم نے تاسف سے اس کی جانب دیکھا اور ملامت سے کہنے لگا۔

''دیکھو پھولن! اگر تمہیں من کی شانتی چاہیے تو آج اس سے انتقام لینا ہی ہوگا۔''

پھولن کی رنگت متغیر ہونے لگی۔ پتی لال کا جبر، وحشت اور سفاکی اس کے اعصاب میں شکستگی پیدا کر رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں تم نے جس عمر میں وہ سب اتیاچار جھیلا ہے، اس کے بعد خود کو سنبھالنا اور اس جیسے راکشس کا سامنا کرنا آسان نہیں ہے۔'' اس نے پھولن کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ متشکر و متحیر نگاہوں سے وکرم کو دیکھنے لگی جو نہایت آسانی سے اس کے خیالات تک رسائی حاصل کر لیتا تھا۔

وکرم نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ایک کامیاب ڈکیت وہی ہوتا ہے جو سب سے پہلے اپنے کسی بھی خوف کا سرو ناش کرے۔ اگر تمہارے من میں کسی بھی چیز کا ہلکا سا خوف بھی باقی رہا تو تم کبھی بھی ہمارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکو گی۔''

وکرم کی اس بات نے پھولن کو سراسیمہ کر دیا۔ وہ اس مختصر عرصے میں ہی اس کے وجود اور محبت کی عادی ہو گئی تھی۔ اسے ایک عجیب سی خلش نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھولن اپنی کم سنی اور سادہ لوحی کے باعث ایک آفاقی حقیقت سمجھنے سے قاصر تھی کہ محبت جب عادت بن جاتی ہے تو مزید مہلک ہو جاتی ہے۔ پھولن دیوی بھی اسی آزار میں مبتلا ہو چکی تھی۔

''اس کے گھر چلو۔'' وکرم نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ''پھولن فی الحال ہماری آڑ میں ہی رہے گی۔''

کچھ ہی لمحوں بعد وہ دندناتے ہوئے پتی لال کے گھر میں داخل ہوئے اور غراتے ہوئے اسے آوازیں دینے لگے۔ عقبی سمت میں موجود پھولن کی ٹانگوں میں شدید کپکپی در آئی تھی۔ پیٹ میں اٹھتے بگولے دماغ چکرانے لگے تھے۔ اس گھر کے آنگن، سیڑھیوں، چھت اور کمروں کی دید برسوں قبل کے مناظر مکمل جزئیات کے ساتھ اجاگر کرنے لگی تھی۔ اسی اثنا میں اندرونی سمت سے پتی لال بھنّاتا ہوا باہر چلا آیا۔ گزرے ماہ و سال نے اس کی جسمانی ہیئت میں تاسف انگیز تغیرات پیدا کیے تھے۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بوڑھا اور ناتواں محسوس ہو رہا تھا۔ گردن کے گرد لٹکتی کھال، آنکھوں کی جھریاں اور ہاتھوں کی ابھری ہوئی نسیں دیکھ کر پھولن کے دل میں کراہت پیدا ہونے لگی۔

''کیا بات ہے، کون ہو تم لوگ...... چلا کیوں رہے ہو؟'' وہ رکھائی سے کہنے لگا۔

''تم پتی لال ہو؟'' وکرم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کیا کام ہے تمہیں مجھ سے اور یہ برات ساتھ میں لیے کیوں پھر رہے ہو؟'' اس کا طنطنہ ہنوز برقرار تھا۔

''تم پھولن دیوی کو جانتے ہو؟'' وکرم نے اگلا سوال داغا۔

پتی لال لحہ بھر کے لیے متذبذب ہوا۔ اسے برسوں بعد اس نام کی گونج سنائی دی تھی۔ وہ کسی نو وارد سے ایسے سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

''ہاں، وہ میری پتنی تھی۔'' اس نے تنفر سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

''اب کہاں ہے وہ؟'' وکرم کے لہجے کی سنگینی میں



Scanned with CamScanner

اضافہ ہوا۔

''ہوگی کہیں......!'' پتی لال نے پھولن کے لیے بے دریغ دشنام طرازی کی۔ ''میری ہی قسمت پھوٹی تھی جو اس...... سے بیاہ کرلیا۔'' اس نے مزید فحش القابات استعمال کیے۔

عقبی سمت میں کھڑی پھولن ساکت ہوگئی۔ اس کے وجود میں ایک چنگاری بھڑکی تھی جو ایک ہی پل میں شعلے کی حیثیت اختیار کرگئی۔ اس کی زندگی میں بربادی کا آغاز کرنے والے شخص کی زبان سے ایسی حقارت برداشت کرنا اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ تنتناتی ہوئی آگے بڑھی اور پتی لال کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''مجھے پہچانا، بوڑھے گدھ؟''

پتی لال کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی، چہرے پر حقارت اور تمسخر در آیا تھا۔

''ارے واہ...... اپنی برات خود ہی لے کر چلی آئی ہو۔ میری کمی اتنی محسوس ہوتی تھی تمہیں؟'' اس نے فحش انداز میں کہا۔

پھولن کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے وکرم کے ہاتھ سے بندوق چھینی اور اسے لاٹھی کی طرح بے دریغ استعمال کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں پتی لال کا سر اور چہرہ لہولہان ہوگئے، دانت ٹوٹ کر فرش پر خون کی لکیر بنانے لگے۔ وہ وحشیانہ انداز میں چیخ رہا تھا۔

''تم نے میرے باپو کے ساتھ دھوکا کیا، مجھے دھوکے سے بیاہ کر یہاں لائے۔ تمہیں اچھی طرح جانکاری تھی کہ ایک گیارہ سالہ لڑکی کسی رنڈوے کے ساتھ جیون نہیں گزار سکتی۔ تم نے مجھے جانوروں کی طرح پیٹا، میرے باپو کو ذلیل کیا۔ میری اس بربادی کی شروعات تم ہی نے کی تھی۔''

پھولن کا ہاتھ برق رفتاری سے لاٹھیاں برسا رہا تھا۔

وکرم اس منظر اور پھولن کے ردعمل سے بے حد مسرور تھا۔ پھولن دیوی نے بالآخر اپنے خوف کو پچھاڑ کر انتقام کی راہ پر پہلا قدم رکھ دیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی جوش سے نعرے لگاتے مزید حملوں کی ترغیب دینے لگے۔

پھولن نے لمحہ بھر کے لیے اپنا ہاتھ روک لیا۔ پتی لال کے چہرے کی کھال ادھڑ چکی تھی۔ وہ اس کے قدموں سے لپٹتے ہوئے گڑگڑانے لگا۔

''مجھے شما کردو، مجھ پر دیا کرو۔ میں اب بھی تمہارا پتی ہوں، میری بات تو سنو۔''

ان فقرات نے پھولن کا انتقامی جذبہ مزید مہمیز کردیا۔ وہ اپنے بھاری بھرکم جوتوں سے پتی لال کے زیریں بدن پر ٹھوکریں رسید کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں گزرے ماہ وسال میں بہائے آنسوؤں کی جلن تھی۔ پتی لال اذیت سے دوہرا ہونے لگا۔ پھولن کی جانب سے نازک مقامات پر رسید کی گئی ضربات ناقابلِ برداشت تھیں۔

''مجھے شما کردو، بھگوان کے لیے مجھ پر دیا کرو۔'' وہ کرب سے بے حال ہوچکا تھا۔

''تم نے مجھ پر دیا کی تھی؟'' پھولن غرائی۔ ''تم میرا بچپن کھا گئے، تمہارے کارن میرے ماتا پتا گاؤں میں رسوا ہوئے۔'' پھولن کی وحشت، جنون میں ڈھل گئی تھی۔

کچھ ہی لمحوں میں پتی لال کا زیریں بدن بھی لہو سے تربتر ہوچکا تھا۔ اس کا لباس چیتھڑوں کی صورت اختیار کرگیا تھا۔ اس میں گویائی کی تاب بھی نہیں رہی تھی۔

متحدہ عرب امارات میں مقیم
اردو قارئین کے لیے خوشخبری
جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)
کے چاروں رسائل
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت
ایک فون کال کے فاصلے پر
آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔
اردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زاید آر ڈی، ای 311 شارجہ
971504805734
URDU BOOKS WORLD FZC.
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA,
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

digest library.com



Scanned with CamScanner

"ایسے مزہ نہیں آرہا پھولن!" بھرت نے سر کھجایا۔
"ہاں، تم اسے یہیں مارتی رہو گی تو گاؤں والے اس پر دیا کھائیں گے، سوچیں گے بیچارہ ڈکیتوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہیں بھی تو اس کی اصلیت دکھائی دینی چاہیے۔" وارے لال نے نکتہ اٹھایا۔
"پورا گاؤں اس کے کرتوت جانتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "لیکن تمہاری بات بھی ٹھیک ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی کہانی بنالے گا۔"
"تو پھر کیا سزا دینا چاہتی ہو اسے؟" وکرم محظوظ ہوا۔
پھولن تنتناتی ہوئی اندرونی سمت چلی گئی۔ اسے اس گھر کا محل وقوع اور اشیا کی ترتیب ہنوز یاد تھی۔ اس نے ایک رسی برآمد کی اور پتی لال کی گردن کے گرد باندھ کر اسے چوپائے کی طرح گھسیٹنے لگی۔
گاؤں کی خاک آلود گلیاں پتی لال کے لہو سے رنگین ہو رہی تھیں۔ اہلِ علاقہ اس منظر کو دیکھتے جھرجھرانے لگے۔ پھولن نے اسے گاؤں بھر میں دیدۂ عبرت نگاہ بنانے کے بعد ایک بار پھر ٹھوکروں کی زد میں رکھ لیا۔
"کیا تم اس کی ہتھیا کرنا چاہتی ہو؟" وکرم نے دریافت کیا۔
"نہیں، میں اسے آسان موت نہیں دینا چاہتی۔" اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔
وکرم کے لیے اس کا یہ نیا روپ نہایت محظوظ کن تھا۔
"تو پھر ایک کام کرتے ہیں۔" اس نے معنی خیزی سے کہا۔ "اسے گھر کے باہر باندھ کر شریر پر ایک سندیسہ چھوڑ جاتے ہیں۔"
"گھر سے باہر کیوں؟" وہ سفاکی سے گویا ہوئی۔
"گاؤں کے باہر باندھتے ہیں، آتی جاتی گاڑیوں اور بسوں کو دیکھ کر ہر پل ایک نئی موت مرے گا۔"
وکرم نے بلا تامل تائیدی انداز میں سر ہلا دیا اور ایک کاغذ پر جلی حروف میں لکھا۔
"بوڑھے لوگوں کی کسی بھی بچی سے بیاہ کے جرم میں ایسی ہی سزا دی جاتی رہے گی۔"
یہ کاغذ پتی لال کے بدن پر چپکا کر ماہرانہ انداز میں باندھ دیا گیا۔ پھولن غیر اختیاری طور پر دوبارہ اس گھر میں داخل ہوئی۔ اس کی تشنہ نگاہیں اپنے والدین کے دیے گئے سامان کو دیکھتے ہوئے نم ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک کونے میں بندھی گائے کی رسی کھول لی۔
"ہم جانور ساتھ لیے نہیں پھر سکتے پھولن!" وکرم نے سمجھایا۔
"میرے باپو نے پائی پائی جوڑ کر یہ سب سامان خریدا تھا۔ قرض چکاتے اس کی کمر ٹوٹنے لگی تھی۔" اس کے لہجے میں آتش سی لگی تھی۔
"چنتا کیوں کرتی ہو؟ آج اسے کنگال کر کے ہی یہاں سے جائیں گے۔" وکرم نے کہا۔
مہیش پور سے روانگی کے وقت پھولن کے اعصاب بالکل ہلکے پھلکے ہو چکے تھے۔ اس کے ذہن میں اپنی بربادی کے ذمے داران کے چہرے گردش کر رہے تھے۔ وہ ان سبھی کو ایسے ہی نشانِ عبرت بنانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

پتی لال سے نمٹنے کے بعد پھولن کی زندگی یکسر تبدیل ہو گئی۔ وہ زیادہ وقت جمنا کے کنارے رہتے تھے، ان کا پڑاؤ دیہاتوں کے قریب ہوا کرتا۔ بسا اوقات جنگل اور وادیاں بھی عبور کرنا پڑتیں۔
اس تمام تر سفر میں وہ رات کے اوقات میں میلوں اور کوسوں تک بھاگتے رہتے۔ پھولن کے بال شاخوں سے الجھ جایا کرتے، کانٹے دار جھاڑیاں اس کے لباس کو چیتھڑوں میں تبدیل کر دیتی تھیں۔ اس کے باوجود وکرم اس کا ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد نہ ہونے دیتا۔ اس بھاگ دوڑ میں پھولن کا تنفس بے ربط ہو جاتا۔ وہ ہانپتے ہوئے اپنی رفتار سست کرتی تو وکرم سختی سے کہتا۔
"آگے بڑھو پھولن! ہمت نہیں ہارنا ہے۔"
"میری ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی وکرم!" وہ بدقت کہہ پاتی۔ "میں اور نہیں بھاگ سکتی۔"
"بس، من میں اتنا ہی انتقام تھا؟" وکرم تاسف سے سر ہلاتا۔ "تمہیں ابھی بہت دور جانا ہے پھولن! ابھی سے ہمت ہار دو گی تو تمہارے دشمن خوشی سے ناچتے پھریں گے۔ وہ اب بھی تم جیسی کئی لڑکیوں کا جیون برباد کر رہے ہوں گے۔"
پھولن کے وجود میں انگاروں کی سی جلن پیدا ہو جاتی۔ وہ ایک بار پھر اس بے رحم دوڑ میں شامل ہو جاتی۔ انہیں رات بھر میں کئی کئی کوس کا سفر طے کرنا پڑتا۔ وکرم راستے میں آنے والے پہاڑ کے تیز نالوں کو چھلانگ مار کر عبور کرتا اور پلٹ کر قطعیت سے کہتا۔
"کود جاؤ!"
پھولن کے چہرے پر تذبذب دیکھ کر اسے طیش آجاتا تھا۔ وہ سرد مہری سے متنبہ کرتا۔
"اگر تم کود کر اس طرف نہ آئیں تو میں واپس آکر

تمہیں دھکا دے دوں گا۔"

پھولن حیرت وسراسیمگی سے اس کا یہ روپ دیکھنے لگی۔ اس کے پاس تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا۔

رات بھر جاری رہنے والے اس سفر کے دوران کئی مقامات پر دریا کہیں گھنے جنگلوں میں سے گزرتا تھا تو کہیں سنگلاخ پہاڑیوں میں سے بل کھاتے ہوئے اپنی روانی برقرار رکھتا۔ یہ بے آب وگیاہ پہاڑیاں ان سبھی کے لیے کٹھن آزمائش ہوتی تھیں۔ ان پر قدم رکھنے کے لیے کہیں جگہ ہوتی نہ ہی کسی جھاڑی کا سہارا مل پاتا۔ چڑھائی کی کوشش میں بھربھری چٹانوں کی ریت ہاتھوں سے پھسل جاتی تھی۔ نتیجتاً وہ گر کے بل زمین بوس ہو جاتے اور کسی بھی چوٹ کی پروا کیے بغیر دوبارہ اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگتے۔ اس موقعے پر پھولن نے حیران کن قوتِ ارادی کا مظاہرہ کیا۔ وہ قلیل عرصے میں ہی ایسی ڈھلوان پہاڑیوں پر چڑھائی میں طاق ہوگئی۔ اس کی رفتار وکرم کے مساوی ہو چکی تھی۔

اس بھاگ دوڑ میں پھولن نے متعدد بار خونخوار جانوروں کی آوازیں بھی سنیں۔ ایسے کسی بھی موقعے کے لیے وکرم اسے ایک بات سمجھایا کرتا تھا۔

"جنگل جتنا سندر ہے، اتنا ہی خوفناک بھی ہوتا ہے۔ یہاں اپنے قدم روکنے کی کبھی غلطی نہ کرنا۔"

"اگر مجھے پیاس لگے تو کیا کروں؟" وہ جھنجلاتی۔ "پیاس کے کارن تو دوڑا ہی نہیں جا سکتا۔"

"اس کا ایک ہی اُپائے ہے۔" اس نے بتایا۔ "جب پیاس لگے تو ہاتھ بڑھا کر کوئی نہ کوئی رسیلا پھل توڑ لو۔"

"مجھے ایک اور سمسیا بھی ہے وکرم!" پھولن ہچکچائی۔

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "تم ماس (گوشت) نہیں کھاتیں۔"

پھولن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وکرم کے گروہ میں شمولیت کے بعد وہ شدید الجھن کا شکار تھی۔ سفر کے دوران بعض اوقات شکاریوں کے فائر سنائی دیتے تھے۔ گروہ کے آدمی ان گولیوں کا نشانہ بننے والے ہرن یا خرگوش آگ پر بھوننے کے بعد خوب سیر ہو کر کھاتے۔ پھولن اپنے اہلِ علاقہ کی طرح سبزی خور تھی۔ اسے گوشت کی خوشبو سے ہی کراہت محسوس ہوتی تھی۔

"باپو کہتا تھا، اپنے کھانے کے لیے کسی جانور کی جان لینا پاپ ہے۔" اس نے خوابناک سے انداز میں بتایا۔

"ہم اپنی خوراک دیہاتوں سے حاصل کرتے ہیں۔ تم آلو، چنے، دال، گیہوں کا آٹا استعمال کر لیا کرنا۔ چرواہے دودھ دے جایا کرتے ہیں، کسانوں سے مرغیوں کے انڈے مل جاتے ہیں، تمہارا جو بھی من چاہے، کھا لیا کرنا۔" وکرم نے سمجھایا اور کچھ یاد آنے پر کہنے لگا۔

"ہمیں سب سے زیادہ آم ملتے ہیں۔ تم آم تو کھاتی ہو نا؟ ہم درختوں سے ڈھیروں ڈھیر توڑا کرتے ہیں۔"

پھولن کے رخسار میں یکدم جلن ہونے لگی۔ اسے پردھان کے گھر میں ایک آم کی فرمائش کے بعد رسید کیا جانے والا طمانچہ یاد آ گیا تھا۔ اپنے سامنے ڈھیروں آم دیکھتے ہی وہ بہن بھائیوں کو یاد کرتے ہوئے رونے لگی۔

"بھگوان جانے سب کس حال میں ہوں گے...... مجھے یاد کرتے ہوں گے یا نہیں؟ شاید یہی سوچتے ہوں گے کہ بلا سر سے ٹلی۔" وہ یاسیت میں مبتلا ہو جاتی۔

وکرم سے اس کی یہ کیفیت پوشیدہ نہیں تھی۔ اسے علم تھا کہ وہ کس گھٹن اور کرب کا شکار ہے۔ وہ اسے ملائمت سے سمجھاتے ہوئے کہتا۔

"میں جانتا ہوں تم اپنے پریوار سے ملنا چاہتی ہو۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟" وہ آس سے اس کی جانب دیکھتی۔

"وہاں جاؤ گی تو واپس نہیں آ سکو گی، دشمن تمہاری موت چاہتے ہیں۔ ابھی کچھ سمے انتظار کرو۔ میں وچن دیتا ہوں، تمہیں خود وہاں لے جاؤں گا۔"

پھولن کے پاس تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

☆☆☆

حالات وواقعات میں تیزی سے تغیرات رونما ہو رہے تھے۔ پھولن کا لباس، اندازِ گفتگو، عادات اور معمولات یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر پولیس انسپکٹر کی وردی میں ملبوس رہتی۔ اس وردی پر دو پھول آویزاں تھے۔ وکرم کی وردی البتہ تین پھولوں پر مشتمل تھی۔

ان تبدیلیوں کے باوجود وہ ایک شعبے میں بالکل کوری تھی۔ گولی کی آواز سنتے ہی خوف سے بدک جایا کرتی۔ گروہ کے دیگر ساتھی اس کی کمزوری سے خوب لطف اندوز ہوتے۔ وہ اسے اونگھتے دیکھ کر دبے پاؤں قریب آتے اور ہوا میں چند ایک گولیاں برسا دیتے۔ پھولن کا ردعمل دیکھتے ہی وہ قہقہہ بار ہو جایا کرتے تھے۔

"پھولن! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔" اس نے ایک روز سنجیدگی سے کہا۔

وہ انہماک سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔



Scanned with CamScanner

"تمہیں کسی سے بھی زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہنسی مذاق کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"یہ سب ہمارے ساتھی ہی تو ہیں۔" پھولن الجھ گئی۔

"وہ میرے ساتھی ہیں، تمہارے نہیں۔" اس کی سنجیدگی میں اضافہ ہوا۔

"ایک ہی تو بات ہے۔"

"ایک بات نہیں ہے پھولن!" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "تمہیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہے تو چاچا وارے لال سے کہہ دو۔ پانی، کھانا یا کوئی بھی چیز چاہیے تو مجھ سے بات کرنے کے بجائے چاچا سے کہو۔"

"تم سے کیوں نہ کہوں؟" اسے حیرت ہوئی۔ "تم میرے پتی ہو۔"

"بالکل ہوں...... لیکن یہ سمبندھ ان کے سامنے ظاہر کرتے رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ ان کے من میں ایسے سمبندھ کی اِچھا پیدا نہیں ہونے دینی ورنہ تمہارے لیے یہاں بھی وہی خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔"

وکرم کی اس تنبیہ پر پھولن بے اختیار سراسیمہ ہو گئی۔

"میں تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں۔" اس نے سمجھایا۔ "کسی سے بھی بات کرتے ہوئے آواز میں نرمی ظاہر نہ ہونے دینا، سختی اور حکم دے کر بات کرنا۔"

پھولن نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔

"ایک بات اور...... میں تمہیں ان کے مذاق کا نشانہ بنتے نہیں دیکھ سکتا۔ تمہیں اپنے اس خوف پر قابو پانا ہوگا۔ محنت اور دھیان سے نشانہ لینا سیکھو۔"

اگلے روز نشانہ لینے کی مشق کا آغاز کر دیا گیا۔ وکرم نے اسے تھری ناٹ سکس کی ہلکی رائفل تھما دی۔ پھولن بے بسی سے اپنے قد کے مساوی اس رائفل کو دیکھنے لگی جسے اٹھانا بے حد مشکل تھا۔ وکرم نے اس کا تذبذب نظر انداز کرتے ہوئے ایک درخت پر نشانہ لٹکایا اور بے لچک انداز میں کہنے لگا۔

"گھوڑا دبا دو۔"

پھولن نے اپنے ہونٹ کچلتے ہوئے کسی نہ کسی طور نشانہ لگایا اور دھماکے کی سماعت شکن آواز سے اس قدر حواس باختہ ہوئی کہ رائفل سمیت زمین بوس ہو گئی۔ گروہ کے افراد اس ہیئت کذائی پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ وکرم نے شکوہ کناں نگاہوں سے پھولن کی جانب دیکھا۔ وہ شرمندگی سے نظریں چرا کر رہ گئی۔

دھیرے دھیرے وہ نشانہ بازی کے امور ذہن نشین کرنے لگی۔ ساتھی اراکین کو گولیاں ضائع ہونے کا قلق ہوتا، تاہم وکرم اپنے بے لچک انداز میں ایک ہی بات کہتا۔

"پھولن دس گولیاں ضائع کرے یا پچاس، میں اسے نشانہ سکھا کر ہی رہوں گا۔"

اگلے چند ہفتوں میں اس کی مشق بہتر ہونے لگی۔

☆☆☆

وکرم کی یہ دور اندیشی ان کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئی۔ کچھ ہی عرصے بعد انہیں ایک ہنگامی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس روز انہوں نے اپنے کپڑے دھو کر دریا کے کنارے ہی سکھانے کے لیے پھیلا رکھے تھے۔ پہریدار کی جانب سے سیٹی کی آواز نے یکدم ہڑبونگ پیدا کر دی۔ یہ سیٹی پولیس اہلکاروں کی آمد کا عندیہ تھی۔ وہ برق رفتاری سے اپنا سامان سمیٹ کر کشتی میں سوار ہونے لگے۔ اسی اثنا میں پہاڑی کے اوپر سے گولیاں برسائی جانے لگیں۔ پولیس ان کے نشیب میں ہونے کے باعث بہتر طور پر حملہ کر سکتی تھی۔ وکرم اور اس کے ساتھی بہاؤ کے رحم و کرم پر تھے۔

"ہمیں گرفتاری دے دینی چاہیے، مقابلہ کیا تو مارے جائیں گے۔" پھولن منمنائی۔

"ایسی بات بھول کر بھی کسی کے سامنے نہ کرنا۔" وکرم غرایا۔ "یہ بات ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ ہمیں گرفتار کرنے کے لیے نہیں بلکہ مارنے آئے ہیں۔"

پھولن کے لیے یہ صورتِ حال بالکل انوکھی تھی۔ وکرم لمحہ بھر کے لیے حواس باختہ نہ ہوا۔ اس کے ایما پر سبھی نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ رائفلیں البتہ ہوا میں ہی بلند تھیں۔ وکرم گاہے بہ گاہے پانی سے سر نکالتا اور بے دھڑک گولیاں چلا دیتا۔

"پھولن! ان پر فائر کرو۔" وہ کچھ لمحے بعد پانی سے سر نکالتے ہی چلایا۔

پھولن نے پولیس اہلکاروں کا نشانہ لے کر بے دریغ گولیاں چلا دیں۔ دھیرے دھیرے دریا کی طغیانی میں اضافہ ہونے لگا۔ پانی میں ایسے بھنور پیدا ہو رہے تھے کہ انہیں بہاؤ کے مخالف جانا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کی صورتِ حال بھانپتے ہوئے پولیس کی جانب سے گولیاں برسانے میں مزید تیزی آ گئی۔

پھولن کو اپنی نگاہوں کے سامنے موت رقصاں دکھائی دینے لگی۔

(جاری ہے)

**ماخذات**

میں ہوں پھولن دیوی، از: پھولن دیوی



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

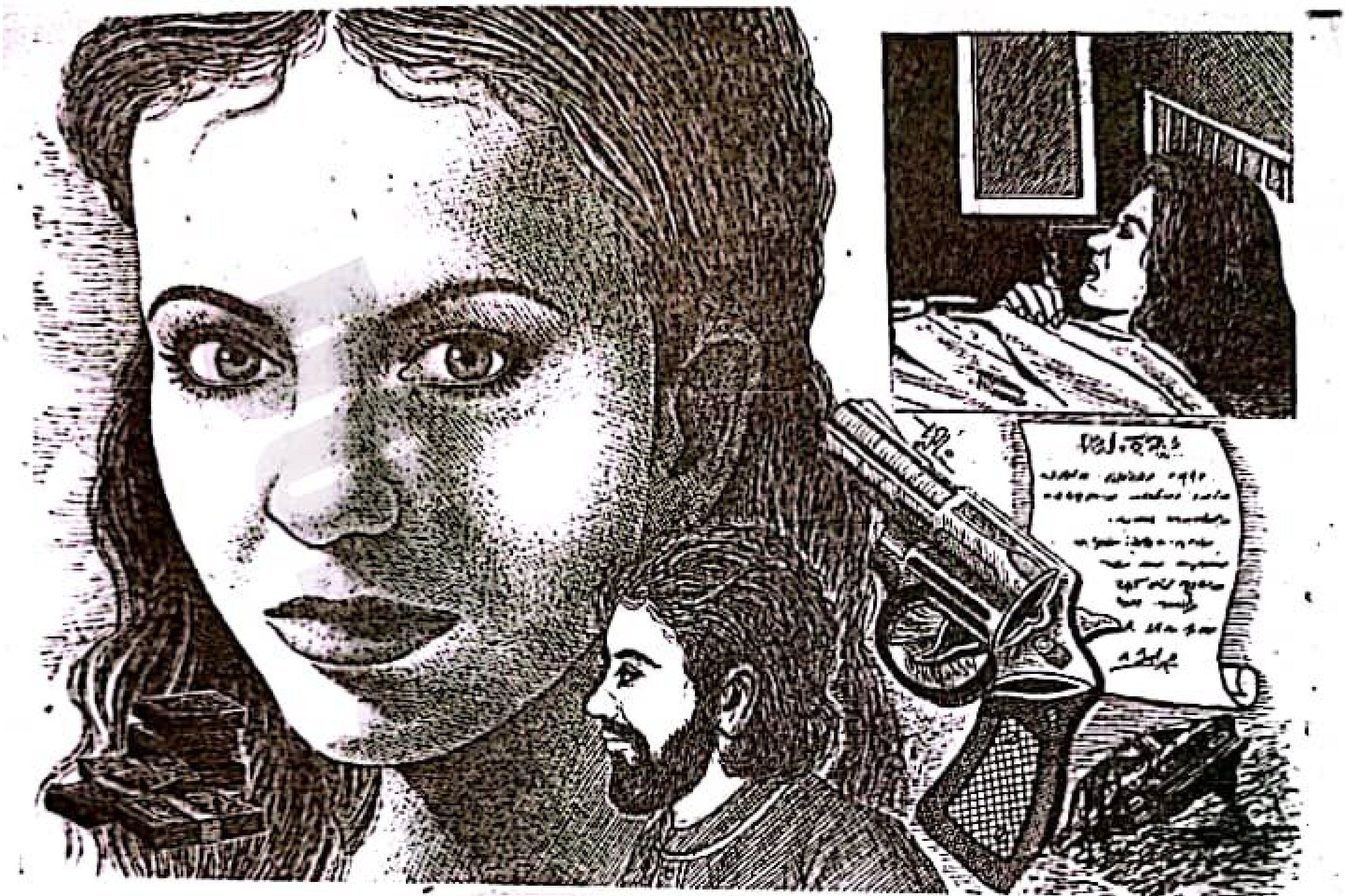

# تلاش

دانش مرزا

**محبت بھی کیا چیز ہے... اگر محبوب زندہ نہ بھی رہے تو اس کا خیال اور اس کا لمس ہر دم ساتھ رہتا ہے... ایسے میں اس کی موت کے بعد اس کی خواہش اور کسی بھی کام کو پورا کرنے کا عزم اس کے عاشق کے لیے کسی عہد سے کم نہیں ہوتا... وہ بھی اپنی محبوبہ کے دیے گئے ایک کام کو کرنے کے لیے نکل پڑا... ایسے کسی کو تلاش کرنا تھا... کام نہایت خطرناک تھا۔ اس میں جان جانے کا بھی اندیشہ تھا... کیونکہ اس کے مقابل بااثر افراد تھے جو سفاک بھی تھے... ایسے میں اس کی تلاش کا کیا نتیجہ نکلتا، یہ تو آگے چل کر ہی پتا چلنے والا تھا۔**

## محبت کی خاطر جان جوکھوں میں ڈالنے والے عاشق کی داستان

جینیفر نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اگلے جمعے کو مر جائے گی۔

اس کے ڈاکٹر نے بھی اس کی زندگی کا آخری سہارا، یعنی زندگی بچانے والے آلات بند کرنے کا کہہ دیا ہے۔

جینیفر چاہتی ہے کہ اس دن میں وہاں نہ رہوں، نہ کمرے میں، نہ ہی عمارت میں... [illegible] دونوں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوگا۔

شاید وہ ٹھیک کہتی ہے۔ وہ مجھ سے بڑی ہے اور کہیں زیادہ عقلمند بھی لیکن اب وہ تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ اگرچہ

digest library.com

ہم شادی شدہ نہیں، پھر بھی اگر ممکن ہوتا تو میں ایک لمحے میں اس کی جگہ لے لیتا۔

لیکن میں نہیں لے سکتا۔ وہ چلی جائے گی...... ایک بہتر جگہ پر، مجھے یہی امید ہے۔

وہ کہتی ہے کہ میری تحریریں مجھے بچا لیں گی۔ اس نکتے پر مجھے شک ہے۔

☆☆☆

پانچ سال پہلے میں ایک غصیلا زخمی فوجی تھا، نشے کے علاج سے نیا نیا نکلا ہوا۔ عراق میں ڈیوٹی کے دوران لکھے گئے نوٹس سے بھرا ایک کاغذی پیکٹ ہاتھ میں لیے اس کے پاس پہنچا تھا۔

جین اس وقت اسکرائبر کی سینئر ایڈیٹر تھی، اس نے ان بکھرے ہوئے صفحات کو ایک لڑی میں پرونے میں میری مدد کی کہ ایک ناکام مصنف سے میں ایک ایسا مصنف بن جاؤں جس کی کتاب جنگ کی ان یادیں بیان کرے جو ہر کوئی بھول جانا چاہتا ہے۔

لیکن اس کے بغیر؟

میں وہی غصیلا، شکست خوردہ سپاہی ہوں جو پہلے تھا۔ اتنا پاگل کہ اسے ''موت کے چنگل'' سے واپس لانے پر غور کر رہا تھا۔

جیسے جیسے اس کا وقت قریب آرہا ہے، ایک موہوم سی امید جڑ پکڑ رہی ہے کہ شاید وہ اپنا ارادہ بدل دے۔

☆☆☆

جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوا، اس کی اسسٹنٹ، ایمی یوجر ایک خالی کرسی پر بیٹھی تھی مگر جین نہیں تھی۔

زندگی کا سہارا دینے والے آلات ہٹا دیے گئے تھے، بستر اور کمرا صاف کر کے اگلے مریض کے لیے تیار کر دیا گیا تھا۔

ایمی کی حالت بہت خراب لگ رہی تھی، جیسے وہ ایک ہفتے سے سوئی نہ ہو۔ شاید وہ واقعی نہیں سوئی تھی۔

''وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا، حالانکہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔

''چلی گئی۔'' ایمی نے کہا۔ ''انہوں نے کل رات ملاقات کا وقت ختم ہونے کے بعد، سب کچھ بند کر دیا، پھر......'' ایمی نے بمشکل سسکی روکی۔ ''وہ گزر گئی، ایک گھنٹے کے اندر بڑے امن طریقے سے۔''

''تم وہاں تھیں؟''

''میں...... بس باہر تھی۔ اس کی درخواست کے مطابق اسے بغیر کسی تقریب کے ہندوؤں کی طرح جلا دیا جائے گا۔ اس کی راکھ اس کے والد کو بھیجی جائے گی تاکہ اوہائیو کے خاندانی فارم پر بکھیر دی جائے۔ وہ خاندانی فارم کو بہت پسند کرتی تھی۔

''مجھے معلوم ہے کہ وہ کس چیز سے محبت کرتی تھی۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''تم ابھی تک یہاں کیوں ہو؟''

''تمہیں بتانے کے لیے۔'' ایمی نے سادہ لہجے میں کہا۔ ''اور تمہیں یہ دینے کے لیے۔'' اس نے ایک لفافہ اٹھایا۔ ''وعدہ کرو کہ تم اسے پڑھو گے۔'' پھر ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ ''اس نے کہا تھا کہ تم ناراض ہو جاؤ گے مسٹر لیگارٹ اور ہوسکتا ہے کہ بغیر پڑھے ہی اسے پھاڑ دو۔ تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔''

میں صرف اسے گھورتا رہا۔ وہ اب بھی لفافہ تھامے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''خدا کی قسم ایمی! میں یہ لفافہ نہیں پھاڑوں گا۔ اسکاؤٹ کا وعدہ۔''

''تم کبھی اسکاؤٹ نہیں رہے۔'' اس نے کہا۔ پھر بھی اس نے مجھے لفافہ دے دیا۔

''میں اسکرائبر چھوڑ رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''اور پینگوئن جا رہی ہوں بطور ایڈیٹر۔ اگر تم دوبارہ لکھنے کا فیصلہ کرو تو میرے ساتھ تمہارا کام کرنا میرے لیے اعزاز ہوگا۔''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں ابھی تک صدمے میں تھا، اس نئی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کب ایمی چلی گئی۔ نہ کوئی الوداع، نہ کوئی گلے لگنا، نہ مصافحہ۔ سمجھدار لڑکی۔ مجھے اس خالی کمرے میں اکیلا چھوڑ گئی۔ غصے میں بھرا ہوا۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ خط نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

''مجھے تم سے ایک بڑا احسان درکار ہے۔ تمہیں کسی توجہ کی ضرورت ہے...... تو میں امید کرتی ہوں کہ ہم ایک صفحے پر ہوں گے ہمیشہ کی طرح ٹھیک؟''

میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ ہمیشہ ٹھیک کہتی تھی۔ میں نے پڑھنا جاری رکھا۔

''میں نے تمہیں یہ کبھی نہیں بتایا کہ جب میں سولہ سال کی تھی تو میں ایک ناجائز بچے کی ماں بن گئی تھی۔ یہ پیدائش بہت مشکل تھی۔ میں نے صرف چند منٹ کے لیے بچے کو تھاما، پھر بے ہوش ہوگئی۔ جب میں ہوش میں آئی،



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

میرا بوائے فرینڈ اور بچی دونوں جا چکے تھے...... ہمیشہ کے لیے۔ مجھے وہ بچی بہت یاد آئی، اس سے کہیں زیادہ جتنا میں نے اس کے باپ کو مس کیا۔

”نرسیں ہمدرد تھیں۔ انہوں نے کہا کہ میری بچی کو اچھے لوگ ملے ہیں۔ لیکن ہر گود لینے والے کی طرح نام اور تفصیلات کو خفیہ رکھا گیا ہے۔

”میں ایک تباہ حال کمزور اور بیمار لڑکی تھی۔ جیسے ہی چلنے کے قابل ہوئی، نیویارک گئی، اخبارات کے دفاتر میں صفائی کی نوکری کی۔ اتنی محنت ومشقت اور جدوجہد کے بعد میں اب ایک سینئر ایڈیٹر ہوں۔ میری زندگی شاندار رہی اور ان آخری سالوں نے سب سے زیادہ خوشی دی۔ لیکن ایک بات ہے...... کچھ سال پہلے، تم سے ملنے سے بھی پہلے، میں نے ایک نجی جاسوس، فرینک کارنز کو بھاری رقم دے کر ہائر کیا تاکہ وہ میرے سابق بوائے فرینڈ، کیری سیئرز کو تلاش کرے۔ اس کے ذریعے ہی میری کھوئی ہوئی بچی کا پتا چل سکتا ہے۔

”میں صرف یقین دہانی چاہتی تھی...... اس نے کیری سیئرز کو انڈیانا میں تلاش کیا اور بطور ثبوت مجھے ایک تصویر بھیجی۔ یہ واقعی کیری ہی تھا۔

”میں نے لفافہ چیک کیا۔ اندر ایک لمبے، پتلے آدمی کی تصویر تھی۔ ڈینم (جینز) پہنے، سنہری بال اور گوٹی ڈاڑھی والا۔“

وہ آگے لکھتی ہے۔ ”پھر بلیک میلنگ شروع ہوئی، کارنز نے مزید پیسے مانگے تاکہ تلاش جاری رکھے۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ قریب ہے لیکن اس سے پہلے کہ میں رقم اکٹھی کرتی، وہ غائب ہو گیا۔ میری تمام کالز وائس میل پر جاتیں، کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔ وہ اپنے دفتر بھی واپس نہ آیا۔ میں نے انڈیانا اسٹیٹ پولیس کو رپورٹ کی لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ وہاں کیوں گیا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری بیٹی کی زندگی کارنز کی کسی بکواس سے خراب ہو لیکن اب جیسے جیسے میری سانسیں ختم ہو رہی ہیں، میں چاہتی ہوں کہ تم کیری کو تلاش کرو اور پھر میری بیٹی کو بھی تاکہ یقین ہو جائے کہ وہ ٹھیک ہے۔ رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ میری انشورنس کی رقم تمہیں اور میری گمشدہ بیٹی کو ملے گی۔ یہ کام میرے لیے آخری بار کر دو، پلیز...... “

مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر تک اس خط کو گھورتا رہا۔ تبھی ایک نرس آئی اور مجھے خالی کمرے میں بیٹھے دیکھ کر وہ کچھ کہنے لگی لیکن میں نے اوپر دیکھا تو وہ رک گئی۔

پھر بھی اس کا اثر ہو چکا تھا۔ میں اٹھا، آخری بار ارد گرد دیکھا اور تب جا کے احساس ہوا کہ میں کیوں رکا رہا۔

کمرے کی فضا میں جین کے پرفیوم کی مدھم خوشبو باقی تھی۔

☆☆☆

اپنے اپارٹمنٹ واپس جا کر میں نے آدھا پیگ لیا پھر اپنی زندگی کا حساب کتاب شروع کر دیا۔ میرا منصوبہ فوج میں جانا تھا۔

مجھے تکریت پہنچا دیا گیا، جہاں میں غلط دروازہ کھول بیٹھا۔ اندر سے بم پھینکا گیا، بم پھٹنے سے میں کورٹ یارڈ میں جا گرا جہاں اپنے جوتے اور کیریئر دونوں کھو دیے۔

مجھے ایک بیس اسپتال میں ہوش آیا۔ پھر مجھے رامسٹائن، جرمنی بھیج دیا گیا۔ جہاں کئی ماہ لگا کر مجھے واپس انسان جیسی حالت میں لایا گیا لیکن میں ایک لڑاکا سپاہی تھا اور مجھے دفتر کی نوکری میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اب میں لڑ نہیں سکتا تھا، اس لیے میں نے سوچا کہ جنگ کے بارے میں لکھوں گا، لوگوں کو بتاؤں گا کہ جنگ کی اصل حقیقت کیا ہوتی ہے۔

دو سال تک میں اچھی تحریر لکھنے کا طریقہ سیکھنے کی کوشش کرتا رہا، مایوسی اور شراب نوشی سے لڑتا رہا، پھر ایک دن میں جین کے دفتر جا پہنچا۔ غصے میں آ کر، اپنے تازہ ترین رجیکشن لیٹر کو لہراتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

اس نے لیٹر دیکھ کر بتایا کہ میں غلط جگہ غصہ نکال رہا ہوں، یہ لیٹر کسی دوسرے اخبار کا ہے۔ پہلی بار ایک ایڈیٹر نے واقعی مجھے سمجھا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔ اس نے میرے ادھورے مسودے کو لیا اور اسے مکمل کتاب میں ڈھالنے میں میری مدد کی۔ اسی نے مجھے مصنف بنایا اور ہم ایک ماہ کے اندر اندر عاشق بن گئے، یہ ایک غیر متوقع جوڑ تھا۔

میں ایک بگڑا ہوا فوجی تھا، جو دنیا بھر میں پوسٹنگ دیکھ چکا تھا۔

جین مجھ سے کچھ بڑی تھی۔ میں نے کبھی اس کی عمر نہیں پوچھی نہ ہی یہ پروا کی کہ وہ ”کوگر“ (جنگلی بلی) کہلائے۔ سچ کہوں تو، وہ مجھ سے کہیں زیادہ ہوشیار تھی اور میں اس سے محبت کرتا تھا کیونکہ وہ عقلمند ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت بھی تھی۔

وہ اپنے انداز میں کافی پرکشش تھی۔ دھیمی، بے پے تلے انداز میں بلی جیسی چال کے ساتھ، چہرے کی ساخت اور

حرکت میں بلی ہی جیسی لچک، بال کالے جیسے کوے کے پر اور آنکھیں ایسی گہری کہ ان میں ڈوب جانے کو دل چاہے۔

جین میری زندگی کا بہترین حصہ تھی لیکن اب وہ باب ختم ہو چکا تھا مگر مجھے اب بھی اس کے آخری احسان کا بدلہ چکانا تھا۔

'یہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔' میں نے سوچا۔ 'جس طرح جین کے جاسوس نے اس کے سابقہ دوست کو تلاش کیا تھا، میں بھی کر سکتا ہوں۔'

ویسے بھی اب انٹرنیٹ پوری دنیا میں پھیل چکا ہے اور کوئی بھی اب چھپ نہیں سکتا۔

کیری سیمز کو تلاش کرنے میں بمشکل ایک گھنٹا لگا۔ اس نام کے صرف چند ایک رجسٹرڈ تھے۔ دو خواتین تھیں، ایک کی عمر نوے سال تھی، ایک اور نام تھا جو کہ ایک بار کا مالک نکلا۔ تصویر کے ساتھ پروفائل مکمل تھی۔ یقیناً وہی کیری تھا۔ بوفیلڈ کاؤنٹی، انڈیانا کا رہائشی۔ بوفیلڈ جو کبھی امریکا کی سب سے بڑی چونا پتھر کی کانوں کا مرکز تھا۔

وہیں اس کا بار تھا۔ بار کے باہر ایک سائن بورڈ تھا۔ ''خوش آمدید، اسٹون کنٹری۔''

میں نے اپنا ایمرجنسی سامان کا بیگ اور لیپ ٹاپ اپنی پرانی لینڈ رover میں پھینکا اور چل پڑا۔ ایک اے ٹی ایم پر رکا، تھوڑے سے پیسے نکالے اور ایک گھنٹے کے اندر اندر انڈیانا پولس کے لیے نکل پڑا۔

میں چاہتا تو فلائٹ لے سکتا تھا لیکن مجھے کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔

اس مشن میں کچھ بھی رومانوی یا ایمرجنسی والی بات نہیں تھی۔ کسی کو میرے سفر کا پتا بھی نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ نیویارک سے بارہ گھنٹے کی مسافت ہوگی۔

میں نے ہائی وے 70-1 سے سات گھنٹے مسلسل سفر کیا۔ ایک جگہ پٹرول بھروانے کے لیے رکا، پھر ہائی وے کے ایک ہوٹل پر پہنچا۔ ایک بوتل جیک ڈینئل پی، پھر بالکل بے سدھ سو گیا۔

صبح جلدی آنکھ کھل گئی۔ میں تھکا ہوا تھا اور سردی سخت تھی۔ گرم کپڑے پہنے، کافی اور درد کش دوا لی اور پھر 70-1 پر دوبارہ نکل پڑا۔ اگر کیری سیمز بار میں کام کرتا تھا تو ممکن ہے کہ وہ رات میں ہی آتا ہو۔

میں بوفیلڈ، انڈیانا میں داخل ہوا۔ شام کا وقت تھا، ہالیڈے ان میں کمرا بک کیا اور شہر کی سیر کرنے نکل پڑا۔

یہ ایک چھوٹا سا خاموش قصبہ تھا جو اب زوال کا شکار تھا۔ ایک وقت تھا جب یہاں کی چونا پتھر کی کانیں مشہور تھیں، اب سب ختم ہو رہا تھا۔

مزدور اپنا سامان سمیٹ کر دوسرے قصبوں کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ 70ء کی دہائی میں آبادی 40 ہزار تھی، اب اس سے بھی آدھی رہ گئی ہے۔ مکان، دکان برائے فروخت کے سائن، خالی دکانیں اور ویران سڑکیں شہر کی بدحالی کی نشانیاں تھیں۔

کیری سیمز کا بار شہر کی مین سڑک کے آخر میں واقع تھا، جیسے ہر قصبے میں ہوتا ہے۔

میں اندر داخل ہوا، کچھ لمحے کے لیے دروازے پر رکا اور اندر کا جائزہ لیا۔ ہال شاید تیس کی دہائی میں بنا تھا اور تب سے زیادہ صفائی نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی بار کے اندر مزدوروں کے لیے مناسب ماحول تھا۔ لکڑی کا فرش، بھاری فرنیچر اور لمبا سا بار۔

کارنز کی کھینچی ہوئی تصویر اب بھی بار کے اوپر لٹک رہی تھی۔ زیادہ لوگ نظر نہیں آ رہے تھے، بس گنتی کے چند ایک لوگ...... زیادہ تر کان کن جو اب بھی گرد آلود کپڑوں میں ملبوس تھے۔

میں بھی انہی جیسا دکھتا تھا اس لیے کسی نے زیادہ توجہ نہیں دی۔

باقی لوگ بڑی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ اسکرین پر فٹ بال کا میچ دکھایا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ بلیئرڈ کھیل رہے تھے۔ جک باکس جیسن ایلڈین کے کنٹری راک گانے بجا رہا تھا۔

میں بار کے ایک کونے میں جا بیٹھا، ٹی وی سے دور۔ جب ایک بوتل سنبھالے سنہری بالوں والی ویٹریس میرے پاس آئی۔ میں نے ایک مشروب کا آرڈر دیا اور پوچھا۔ ''کیا کیری سیمز آس پاس ہے؟''

''کیا کیری تمہیں جانتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، لیکن وہ جاننا چاہتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس سے کہو کہ میں اس کا قرض دار ہوں۔''

میں نے اپنی بات پر زور دینے کے لیے دس ڈالر کا نوٹ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس نے تھوڑا سا شانہ جھٹکا، پھر بار کے آخری سرے پر ایک دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

اسی دروازے سے میرا مطلوبہ شخص باہر نکلا۔

تقریباً چار سال گزر چکے تھے تکریت سے نکلے لیکن مجھے یوں لگا جیسے میں اس آدمی کو نشانہ بندوق سے دیکھ رہا ہوں۔



Scanned with CamScanner

اس نے بھی مجھے اسی طرح دیکھا اور مکمل جانچ پڑتال کی۔ وہ کافی ہوشیار لگتا تھا۔ پھٹی پرانی جینز، سینڈی رنگ کے بال، کاؤبوائے جوتے۔ گالوں پر وسکی کی سرخی اور سانپ جیسی تنگ آنکھیں۔

جین صرف سولہ سال کی تھی جب یہ سب ہوا اور اس نے اسے یوں چھوڑ دیا جیسے وہ کوئی آوارہ بلی ہو۔

میرا دل چاہا کہ اسے زمین میں گاڑ دوں لیکن مجھے معلومات چاہیے تھیں۔

وہ رکا، سامنے آ کر بولا۔ ''مارگی کہہ رہی ہے تمہارے پاس میرے لیے کچھ ہے۔ اگر تم پولیس والے ہو تو اپنی باتیں اپنے پاس رکھو۔ میں کسی ڈیل میں دلچسپی نہیں رکھتا۔''

''میں بھی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''بات سیدھی کرتا ہوں۔ پچیس سال پہلے تم نے سولہ سالہ لڑکی کو حاملہ کیا اور اس کا بچہ چھین لیا۔''

''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔ ''کس کے لیے کام کر رہے ہو؟''

''دوست کے لیے کام کر رہا ہوں۔'' میں نے اپنی جیکٹ سے ایک لفافہ نکالا اور اسے بار پر رکھا۔ ''یہ دس ہزار ہیں۔ گن لو اگر چاہو تو۔''

اس نے خاموشی سے دیکھا، جیسے جواب ''نہیں'' ہو۔

میں نے لفافہ کھولا، اس میں سے آدھی رقم نکالی اور لفافہ اس کی طرف سرکا دیا۔ ''یہ سنجیدگی کا ثبوت ہے۔ بس مجھے ایک نام چاہیے۔ اگر نام صحیح ہوا تو باقی رقم اور نو مزید لفافے تمہارے۔ دس ہزار، صرف ایک نام کے لیے۔''

اس نے پلک بھی نہ جھپکی۔

''مجھے سمجھ نہیں آئی۔'' اس نے کہا۔ ''اب کون ہوگا جسے پرانی گرل فرینڈ میں دلچسپی ہو؟ ویسے، وہ کیسی ہے؟''

''وہ مر چکی ہے۔'' میں نے سختی سے کہا۔ ''اور میرا صبر ختم ہونے کو ہے۔ اگر تم ڈیل نہیں چاہتے تو میں کسی اور کو ڈھونڈ لوں گا۔''

''نہیں، تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ اگر جین چلی گئی ہے تو اب کوئی نہیں جو اس معاملے کو جانتا ہو۔ اور کسی کا نام بتانا میرے لیے بھی مصیبت بن سکتا ہے۔''

''یہ کام تمہیں دس ہزار بھی دلا سکتا ہے۔ دیکھو، میں یہاں مسئلہ بنانے نہیں آیا، بس نام دو اور بتاؤ کہ وہ لڑکی کہاں ہے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''خدا کی قسم۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کچھ بھی نہیں پتا، ہے نا؟ اس بچی کا معاملہ کچھ سنجیدہ لوگوں سے جڑا ہوا ہے۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ ان کا راز رکھوں گا۔''

''کون سا راز؟'' لیکن پھر مجھے سمجھ آ گئی۔

''جین نے کہا تھا جب وہ جاگی تو بچی پہلے ہی لے جائی جا چکی تھی۔ اڈاپشن اتنی جلدی نہیں ہوتا۔ تم نے اس کے لیے پہلے سے کوئی ڈیل طے کر لی تھی۔ مجھے پروا نہیں کہ ماضی میں کیا ہوا۔ مجھے بس یہ یقینی بنانا ہے کہ وہ لڑکی ٹھیک ہے۔ بس اس کا نام اور موجودہ پتا دے دو، پھر میں چلا جاؤں گا۔''

''چالیس ہزار میں۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔

''بات یہ ہے کہ جین اور بچی دونوں بہت مشکل وقت سے گزر رہے تھے، وہ تقریباً ہوش و حواس سے باہر تھی۔ ہم خود بھی بچے ہی تھے، ایک اور بندہ بھی تھا جو ہم سے بھی زیادہ برے حال میں تھا۔ اس کا بچہ مردہ پیدا ہوا تھا اور اس نے مجھے نرس سے گود لینے کی بات کرتے سن لیا تھا۔''

''تو تم نے اس سے ڈیل کی؟'' میں نے کہا۔ ''تم نے بچی بیچ دی، ٹھیک ہے نا؟ کتنے میں؟''

''اتنا کہ یہ جگہ آرام سے خرید لی۔ میں قسم کھاتا ہوں، لڑکی بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اگر تم نے جا کر اس کا پتا لگانے کی کوشش کی تو سب کو پتا چل جائے گا کہ تمہیں معلومات کس نے دی۔''

''مجھے بس یہ دیکھنا ہے کہ وہ ٹھیک ہے۔ اگر سب درست ہوا تو کسی سے بات نہیں کروں گا لیکن اگر تم دس ہزار چاہتے ہو تو لڑکی کا نام تو دینا ہی پڑے گا۔''

اس نے لمحہ بھر سوچا، پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے لیکن بہتر ہوگا کہ تم اس کے قریب بھی نہ جاؤ، ورنہ تمہاری جان کو خطرہ ہوگا۔ اس کا نام گریس کولین ہے۔ سینیٹر ہیارلڈ کولین کی بیٹی۔ سینیٹر کولین اس علاقے کی بڑی شخصیت ہے، گورنر کے لیے الیکشن لڑ رہا ہے اور اس کی سیکیورٹی بلٹ پروف ہے۔ تم اس کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔''

''میرے پاس کوئی وجہ نہیں کہ میں اسے ڈھونڈوں لیکن وہ کہاں ہے؟''

''تم نے نام مانگا، وہ تمہیں مل گیا۔ باقی معلومات ڈیل کا حصہ نہیں ہیں۔''

''اب وہ معلومات میرے لیے ضروری ہے۔ میں رات کو پیدا ہوا ہوں لیکن پچھلی رات نہیں۔ میں تمہارے

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

الفاظ پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ اگر تمہاری بات درست نکلی تو باقی رقم تمہیں مل جائے گی۔"

"میں چاہوں گا کہ رقم ابھی دے دو۔ اگر تم سینیٹر کے آس پاس منڈلاتے ہوئے نظر آئے تو شاید تمہیں دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔"

"کیا مطلب؟"

"بس اتنا کہ یہ کھیل پہلے بھی کئی بار کھیلا گیا ہے اور ہمیشہ برا ہی انجام ہوا ہے۔"

"مجھے سمجھ نہیں آیا۔" لیکن پھر سمجھ آ گیا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔

میں نے اسے کوئی اشارہ کرتے تو نہیں دیکھا لیکن کوئی سگنل ضرور دیا گیا کیونکہ ایک آدمی جو پول کھیل رہا تھا، اس نے اچانک گیند جیب میں ڈالی اور ہماری طرف آ گیا۔ وہ اپنا کیو اسٹک ابھی تک تھامے ہوئے تھا۔

وہ قدآور تھا، تقریباً چھ فٹ چار انچ لمبا، دو سو ساٹھ پاؤنڈ کے قریب وزن ہوگا اور دانتوں میں سے دو سامنے کے غائب تھے۔ وہ دیکھنے میں بار کا غنڈا لگتا تھا لیکن وہ صرف شو تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے پچھلے بیس سال جم، رنگ اور زمین پر مارشل آرٹس کی تربیت میں گزارے تھے اور میں یقیناً ایک ڈانس کے موڈ میں تھا۔

"بار پر میرے دس رکھ دو۔" کیری نے کہا۔ "اور یہاں سے نکل جاؤ، صحیح سلامت۔"

میں نے اس پر توجہ نہ دی۔ کیری کوئی بڑا خطرہ نہیں تھا لیکن اس کا ساتھی واقعی خطرناک لگ رہا تھا۔

میرے چہرے پر وار ہوا۔ میں نے وار اپنے بازو سے روکا، اسے ایک طرف ہٹایا اور اپنی کہنی سے اس کی آنکھوں کے بیچ میں مارا۔ ضرب نے اسے چونکا دیا لیکن وہ گرا نہیں۔ وہ سخت جان تھا۔

ہم دونوں ایک ہی جیسے تھے، اس لیے سائز کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔

لیکن وہ پاگلوں جیسا غصہ لیے لڑ رہا تھا، حکمت عملی کے بغیر۔ اس نے ایک مکا مارا، پھر دوسرا۔

میں نے اس کے تیسرے وار کا وقت پر اندازہ لگایا اور اس کی دفاعی پوزیشن کے اندر جا گھسا۔ میں نے اس کے بال پکڑے اور اس کا چہرہ پوری قوت سے بار پر دے مارا۔ بس وہی کافی تھا۔ وہ سیمنٹ کے تھیلے کی طرح گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

میں نے اس کے پیٹ پر ایک لات ماری جس کی شاید ضرورت نہیں تھی۔ پھر میں واپس سیئرز کی طرف مڑا، جو بھوت کی طرح سفید ہو چکا تھا۔

"پریشان نہ ہو، ہماری ڈیل اب بھی قائم ہے۔" میں نے کہا۔ "بس مجھے بتا دو کہ سینیٹر کولین کہاں ہے۔ ساٹھ سیکنڈ کے اندر۔"

اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا اور میں واپس چل دیا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر ایک لمحہ رکا تاکہ دیکھ سکوں کہ کوئی میرا پیچھا تو نہیں کر رہا لیکن سب ٹھیک تھا۔

سیئرز کسی کو فون کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ کسے۔

☆☆☆

سیئرز نے جو ایڈریس دیا تھا، اسے تلاش کرنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے اپنے فون پر گوگل میپ کھولا اور دیکھا کہ شوگر ہل کے بیچ میں تھا جو بوفیلڈ کے مغرب میں واقع ایک پرتعیش کالونی تھی۔

وہاں کے گھروں کے نمبر نہیں ہوتے بلکہ نام ہوتے ہیں۔

کولہان ہال ایک انیسویں صدی کی حویلی، بڑی اینٹوں سے بنی ہوئی، پتھروں کی شاندار تراش خراش اور بلند و بالا گوتھک ٹاورز کے ساتھ۔ اسے ایک امیر تاجر نے بنوایا تھا لیکن اب یہ وقت کے ساتھ جدید ہو چکی تھی۔

پرانے اصطبل اب گیراج بن چکے تھے، نوکر اب سیکیورٹی گارڈز میں بدل چکے تھے۔ ایسے لوگ جو گورنری کے امیدوار کے گرد حفاظتی دائرہ بناتے ہیں۔

دروازے بند ہوتے تو یہ جگہ قلعہ لگتی لیکن اس رات کھلے ہوئے تھے۔ پارکنگ میں مہنگی گاڑیاں تھیں اور یارڈ کی لائٹس چمک رہی تھیں۔

میں نے موسیقی کی آواز سنی۔ اندر پارٹی چل رہی تھی۔ میں نے گاڑی پارک کی اور پرانے وقتوں کی طرح مرکزی دروازے کی طرف بڑھا لیکن اندر نہیں گیا۔

ایک لمبا، سیاہ فام آدمی جس کا سر گنجا ہوا تھا اور جس کے سینے پر چپل کا نام والا بیج تھا، میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"معذرت، آج رات داخلہ صرف دعوت نامے پر ہے اور میں تمہیں نہیں جانتا۔ کیا تم باہر سے آئے ہو؟"

"کچھ ایسا ہی ہے۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "مجھے اسکرائبر پبلشنگ نے بھیجا ہے۔ اگر گریس کولین اندر ہے تو میں صرف ایک لفظ کہنا چاہوں گا۔"

تبھی میں نے گریس کولین کو راہداری پار کرتے دیکھا۔ دبلی پتلی، بلی جیسی چال، بال کالے اور چمکدار......

میں دنگ رہ گیا۔ مکمل طور پر حیران لیکن یہ صرف مشابہت

تھی...... حیرت انگیز مشابہت۔

اس نے مجھے مکمل طور پر چونکا دیا، میں کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔ جیسے کوئی جمی ہوئی سطر میں قید ہو گیا ہو۔

گریس کولین نے غالباً میری حیران کن نظریں محسوس کیں اور مجھے تجسس سے دیکھا پھر قریب آ کر بولی۔ ''کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟''

اور میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ منہ جیسے بند ہو گیا ہو۔

''میں...... میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے، ہے نا؟''

اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''لائبریری میں؟ کیا آپ ممبر ہیں یا......؟''

''میں یہاں کا نہیں ہوں۔'' میں نے بمشکل کہا۔ ''لیکن چند لائبریریوں میں آتا جاتا ہوں۔ میں مصنف ہوں۔ جیکب ٹیگارٹ۔''

''آہا! وہی تو۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے آپ کو کتاب کے کور پر دیکھا ہے، ری ڈیپلائڈ، ٹھیک کہا نا؟ میں نے نہیں پڑھی لیکن یہ کافی مقبول ہے نوجوانوں میں۔ میں گریس کولین ہوں، بوفیلڈ مین کی لائبریرین۔''

میں بس گھورتا رہا۔ کچھ کہہ نہ سکا۔

''یہ چھوٹا سا قصبہ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی، یہ سیاسی مہم ہے اور پریس ہے۔ آپ یہاں کیوں ہیں، مسٹر ٹیگارٹ؟''

''یہ تھوڑا پیچیدہ معاملہ ہے، مس۔ کیا ہم الگ جا کے بات کر سکتے ہیں؟''

''کس بارے میں؟'' اس نے بھویں اس انداز سے اٹھائیں کہ مجھے نظریں ہٹانی پڑیں۔

''پیسوں کے بارے میں۔'' میں نے کہا۔

''اور میرا خیال ہے کہ میں نے اس قسم کی باتیں سنی ہیں۔'' باؤنسر نے قریب آ کر کہا۔ ''مجھے پہلے فون آیا تھا، ٹیل نے کہا تھا کہ کوئی مسئلہ ہے۔ میں نہیں جانتا تم کیا بیچ رہے ہو لیکن یہ غلط مارکیٹ ہے۔ پیر کو دفتر فون کرنا، اپائنٹمنٹ لینا اور اپنی بات وہیں کرنا۔''

''رکو، باس۔'' گریس نے کہا اور اس کا بازو چھوا۔ ''مسٹر ٹیگارٹ! آپ کس پیسے کی بات کر رہے تھے؟''

''یہ وراثت ہے، مس۔''

''کس کی طرف سے؟ دیکھو، اگر یہ واقعی کوئی فراڈ ہے تو......''

''ایسا نہیں ہے مس! خدا کی قسم یہ کوئی فراڈ نہیں۔ میں صرف پیغام دینے آیا ہوں۔''

''لیکن کیوں؟ پیسے بھیجنے والا کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہی تو اصل الجھن ہے، مس۔ دراصل...... چلیں چھوڑیں، سیدھی بات یہ ہے کہ یہ آپ کی ماں کی طرف سے ہے۔''

اس نے مجھے ایسے گھورا جیسے میں پاگل ہوں۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، مسٹر ٹیگارٹ۔ میری ماں، کلیئر کولین اوپر آرام کر رہی ہیں۔ وہ اکثر بیمار رہتی ہیں لیکن وہ زندہ ہیں۔ میری کوئی اور ماں نہیں ہے۔ مجھے گود نہیں لیا گیا مسٹر ٹیگارٹ۔ آپ ضرور کسی اور گریس کولین کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔''

میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بس کوشش کر رہا تھا کہ زبان کھلے۔

''مسز کولین کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے، جناب...... جو بھی آپ کا نام ہے۔'' باڈی گارڈ نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ آپ اپنا تماشا کہیں اور جا کر دکھائیں۔'' اس نے انگلی اٹھائی تو دوسرا سیکیورٹی گارڈ بھی آ گیا۔ وہ باس سے بھی لمبا تھا۔ اس کے بیج پر نام لکھا تھا۔ ''کالڈویل۔''

''نہیں، قائل کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''جیسا کہ لیڈی نے کہا، لگتا ہے میں نے غلط کولین خاندان پکڑ لیا ہے۔ یہی سچ ہے، غلط فہمی کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔''

''اتنی معذرت کافی نہیں ہوگی۔'' کالڈویل نے کہا۔ ''اب فوراً نکل جاؤ، مسٹر۔''

''کوئی مسئلہ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں۔''

جو بالکل درست نہیں تھا لیکن میں واقعی فوراً جانا چاہتا تھا۔ ہر قدم جیسے پیچھے ہٹنے کا موقع دے رہا تھا۔ میں جیسے جال میں پھنس گیا تھا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا زینے سے نیچے اترا اور اپنی لینڈ روور کی طرف بڑھ گیا۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے جنگ کے میدان میں گولہ باری سے بچ رہا ہوں۔ باؤنسر باس میرے پیچھے آ رہا تھا۔ میں نے باہر نکلتے وقت اپنی گاڑی کا نمبر لکھنے پر زور دیا اور اس نے مجھے بڑی بڑی آنکھوں سے گھورا۔

موٹیل واپس آ کر میں نے اپنے لیے مشروب تیار کیا لیکن فوراً نہ پیا۔ کچھ دیر گھورتا رہا، پھر اسے سنک میں انڈیل دیا اور بوتل خالی کر دی۔ کولین کے برآمدے میں پیش آنے والی ملاقات نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے سوچنا تھا اور اس کے لیے دماغ صاف چاہیے تھا۔

سب سے پہلے تو وہ باؤنسر محض گارڈ نہیں تھا، وہ پیشہ ور تھا۔ شانے پر ہولسٹر لٹکا ہوا تھا اور ایک پسٹل ساتھ رکھا



Scanned with CamScanner

تھا۔ وہ اکیلا بھی نہیں تھا۔ دوسرا غنڈا کالڈویل، باس سے بھی لمبا چوڑا تھا اور سخت بھی۔ اور مجھے سوچے بغیر چین نہ آیا کہ کچھ سال پہلے فرینک کارٹر بھی اسی برآمدے میں کھڑا تھا۔ وہ گریس کولین سے بات کرنے آیا تھا اور پھر غائب ہو گیا۔

تو میں نے آخر سیکھا کیا؟

گریس واقعی جینیفر کی بیٹی تھی، اس میں کوئی شک نہیں۔ وہ اتنی زیادہ جینیفر سے مشابہت رکھتی تھی کہ دیکھنے والے اسے بہن سمجھتے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ گود لی گئی تھی لیکن شاید اسے اس کا پتا نہیں تھا۔ ممکن ہے اس لیے کہ گود لینے کا معاملہ ہوا ہی نہیں تھا۔

سالوں پہلے، اسپتال کے ویٹنگ روم میں کیا ہوا تھا؟ سینیٹر کولین اور گیری سمرز کا جو معاہدہ ہوا تھا وہ گود لینے کا نہیں تھا۔ وہ ایک سودا تھا۔ سمرز نے جینیفر کی بچی کو کولین کو ایسے بیچ دیا جیسے کوئی کتا بیچتا ہے۔ میں نے دیکھا تھا کہ والدین اپنی بیٹیوں کو غلامی اور جسم فروشی میں دھکیل دیتے ہیں۔ ایک کو بیچنا، باقیوں کو بچانے کے لیے۔

یہ ایک ظالمانہ، غلیظ کاروبار تھا اور یہاں امریکا میں تو یہ بڑا جرم تھا۔ اگر یہ بات سامنے آجاتی تو سینیٹر کے سیاسی کیریئر کا جنازہ نکل جاتا اور شاید وہ جیل میں ڈال دیا جاتا۔ جو کہ کارٹر کے لیے تباہی کا باعث بنا۔ وہ ایک پروفیشنل انویسٹی گیٹر تھا، اس نے ضرور یہ بات جان لی ہوگی مگر اس کے ساتھ کیا ہوا؟ کچھ اچھا نہیں، میں شرط لگا سکتا تھا۔

اس موقع پر عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں۔ جینن نے مجھ سے کہا تھا کہ لڑکی کو ڈھونڈ کر دیکھوں کہ وہ ٹھیک ہے۔ یقیناً، میں نے وہی کیا جو کہا گیا تھا۔ گریس کولین زندہ تھی، تندرست، محفوظ اور مطمئن۔ وہ انشورنس کے پیسوں کو سنبھالنے کے قابل تھی۔ میں نیویارک یا جینیوا سے اس کے نام چیک بھیج سکتا تھا۔

میں چاہتا تو اس کے دروازے پر ایک کاغذی لفافے میں نقدی رکھ آتا اور گھنٹی بجا کر بھاگ جاتا۔ اسے شاید ویسے بھی اس پیسے کی ضرورت نہ تھی لیکن...... میں نے یہ سوچ فوراً رد کر دی۔

پلان بی زیادہ خطرناک تھا، لیکن اس کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ مجھے گریس کولین سے دوبارہ ملنے کا موقع ملتا۔ قریب سے اور ذاتی طور پر اسے اس کی ماں کے بارے میں بتانے کا۔

کیا پلان بی زیادہ خطرناک تھا؟ بالکل، فرینک کارٹر بھی اسی طرح کا کام کرتے ہوئے غائب ہوا تھا۔ میں گریس سے مل سکتا تھا اور یہ میرے لیے سب سے زیادہ اہم تھا۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ مجھے خود کو سنبھالنا ہوگا۔ میں پہلے ہی بڑی غلطی کر بیٹھا تھا کہ کولین کے گھر جا دھمکا۔ جیسے کسی برتنوں کی دکان میں ہاتھی...... اور یہی غلطی شاید کارٹر نے بھی کی تھی۔

جب شک ہو تو محتاط رہو......

میں موٹیل سے باہر آ گیا۔ اپنا سامان رووَر میں ڈالا پھر اسے نعل کی شکل والے ڈرائیو وے سے گھما کر ایک ڈلیوری وین کے سائے میں پارک کر دیا اور سکون کا سانس لیا۔

چند منٹ بعد ہی ایک سیاہ کیڈی لاک موٹیل کے نچلے حصے میں بنے میرے کمرے کے سامنے رک گئی اور سینیٹر کولین کے دو غنڈے باہر نکل آئے۔ بغیر ہچکچاہٹ کے دونوں نے ہتھیار نکالے۔ وہ میرے خالی کمرے کی طرف بڑھے، دروازے کے باہر رکے پھر ماسٹر چابی سے اسے کھولا اور اندر گھس گئے۔

وہ صرف چند منٹ اندر رہے پھر واپس نکلے۔ اس بار انہوں نے ہتھیار ہولسٹر میں ڈالے ہوئے تھے۔ انہوں نے پارکنگ لاٹ کو غور سے دیکھا لیکن خوش قسمتی سے مجھے نہ دیکھ سکے۔ پھر وہ اپنی گاڑی میں واپس بیٹھے اور چلے گئے۔ میں نے سیٹ پیچھے کر کے آنکھیں بند کیں اور پانچ منٹ بعد ہی سو گیا۔

اگلی صبح میں ناشتا، پارکنگ لاٹ کا ایک چکر لگایا، سائے میں رہتے ہوئے۔ سب کچھ صاف تھا۔

بوفیلڈ ڈسٹرکٹ لائبریری شہر کے بیچوں بیچ تھی۔ وہ کسی پرانے قلعے جیسی لگ رہی تھی، جیسے کوئی شش محلوں کے کھنڈر۔ میں نے قریب والی گلی میں گاڑی پارک کی جس سے مجھے داخلی دروازے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد گریس کولین ایک چمکتی نئی پورش میں آئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اندر گئی، میں بھی سڑک پار کر کے سیڑھیاں چڑھا اور سیدھا لائبریری کے مرکزی دروازے تک جا پہنچا۔ گریس ابھی کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے آتے دیکھا تو سر ہلا دیا۔

”ہیلو۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں واقعی بات کرنی ہے۔ صرف پانچ منٹ۔“

”معاف کیجیے گا، مسٹر لینگ کارٹ لیکن میرے والد نے خبردار کیا تھا کہ آپ شاید پھر کوشش کریں گے......“

”پانچ سیکنڈ کیسے رہیں گے؟ کیا اتنا وقت نکال سکتی ہیں؟“ میں نے جینز کی جیب سے تصویر نکالی اور کاؤنٹر پر الٹی رکھ دی۔ گریس نے اس پر ایک نظر ڈالی پھر اس کی

آنکھیں پھیل گئیں اور اس نے غور سے دیکھا پھر میری طرف نظریں اٹھا کر کہا۔ ”یہ کیا ہے؟ کوئی جعلی تصویر؟“

”یہ جینیفر مارکس کی تصویر ہے، جو دو سال پہلے لی گئی تھی۔ آپ کی ہاں۔ اگر آپ کو اپنے بارے میں کوئی شک ہے تو یہ تصویر اپنے گال کے ساتھ ملا کر آئینے میں دیکھ لیں۔“

”نہیں، میں...... میں دیکھ سکتی ہوں۔“ گریس نے سر ہلایا۔ اتنے میں ایک قاری کئی کتابیں اٹھائے ہماری طرف آیا۔

”میں یہاں زیادہ بات نہیں کر سکتی۔“

”یہ جگہ میرے لیے بھی اچھی نہیں۔ آدھے گھنٹے میں سڑک کے پار اسٹار بکس پر ہوں گا۔ وہاں آ جائیں۔ نہ آئیں تو آپ کی مرضی۔“

”مجھے ایک لمحہ دیں، میں حاضری لگوا دوں پھر آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“

میں لائبریری کی سیڑھیوں پر انتظار کرتا رہا، یہ سوچتے ہوئے کہ وہ باس یا اس کے ساتھی کو بلا لے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جب وہ دروازے سے باہر نکلی اور میرے پاس آئی تو میں نے ایک گہری سانس لی۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ ”کیا؟“

”کچھ نہیں...... معاف کیجیے گا۔ آپ اور جینیفر میں حیران کن مشابہت ہے۔“

”مجھے بھی بڑی حیرت ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں عادی ہو جاؤں گی۔“

میرے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے اس نے کہا۔ ”میرے جانے کے بعد کیا ہوا؟“

”سینیٹر...... میرے والد کو یہی لقب پسند ہے اور کچھ نہیں۔ میری ماں بھی انہیں یہی کہتی ہیں۔ وہ بعد میں مجھ پر برس پڑے، یہ جاننے کے لیے کہ میں تمہیں کیسے جانتی ہوں اور کیا ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی تعلق میں ہیں۔“

”آہ۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

”نہیں، ایک لحاظ سے تو یہ باعثِ سکون ہے، دراصل میرے والدین......“ وہ رک گئی پھر پیشانی پر بل ڈال کر بولی۔ ”میرے منہ بولے والدین؟ ہمارا کبھی خاص تعلق نہیں رہا۔ میری ماں کو گولیوں کی بہت لت ہے۔ وہ زیادہ تر نشے میں کھوئی رہتی ہے اور سینیٹر تو سیاست میں ہی مگن ہے، اگلا انتخاب جیتنے میں یا گورنر بننے میں یا جو بھی اگلا ہدف ہو۔ میں صرف ربن کاٹنے یا ریاستی عشائیوں میں بطور آرائش شامل ہوتی ہوں لیکن اس کے علاوہ؟ مجھے یاد نہیں کہ آخری بار ہم


بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
انوکھی داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ نومبر 2025ء
کی جھلکیاں

ضمیر فروش
اہلِ وطن غلامی سے نجات کے لیے نکلے تو اس نواب نے ہم وطنوں کا شکار شروع کر دیا

ماں جائی
پالنے سے اغوا ہوئی بچی جوانی میں والدین کی تلاش میں نکلی تو کہانی در کہانی جنم لینے لگی

سازشی ملکہ
عالم اسلام کی ایک جلیل القدر لیکن کینہ پرور ملکہ کی داستان

کھیل قسمت کا
ایک ایسی سچ بیانی جس کا ہر باب چونکا دے گا

جوابی تھپڑ
یورپ سے درآمد رقابت کا ایک انوکھا واقعہ

اس کے علاوہ

پاکستانی فلم نگری کی کہی ان کہی داستان جام جم
غلطی سے دشمن ملک کا بارڈر کراس کر لینے والے کی لہورنگ سرگزشت جان بجا

بہت سے دلچسپ سچے قصے،
سچ بیانیاں، سچے واقعات

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

نے کوئی بات کب کی تھی...... سوائے کیریئر کے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، یہ سب بہت کچھ ہے۔ یہ جینفر کے لیے بھی مشکل تھا۔ جب تم آئیں تو وہ محض سولہ سال کی تھی۔ اسے ہمیشہ تمہیں چھوڑنے کا افسوس رہا اور مرنے سے پہلے اس کی خواہش تھی کہ وہ تمہیں تلاش کرے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ تم ٹھیک ہو۔''

''لیکن اس نے اتنی دیر کیوں کی؟ میرا مطلب ہے، جب سب کچھ ختم ہو چکا تھا؟''

''اس نے پہلے بھی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔''

''مطلب...... میں سمجھی نہیں۔''

''اس نے کسی پرائیویٹ جاسوس کو تمہیں تلاش کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ بوفیلڈ تک پہنچا پھر غائب ہو گیا۔''

''تم کہہ رہے ہو کہ وہ شخص؟''

''میں کچھ نہیں کہہ رہا، ظاہر ہے کہ کول فیملی تمہارے منہ بولے والدین ہیں اور کوئی اس بات کو نہیں جانتا...... سوائے تمہارے۔''

''تم کہہ رہے ہو کہ انہوں نے مجھ سے میری اصل زندگی کا سچ چھپایا...... ایسا کیوں کیا؟''

''اس کے لیے تمہیں ان سے پوچھنا پڑے گا۔ اصل میں، اس کی کوئی خاص وجہ نہیں۔''

''میں اب بچی نہیں رہی۔ تو...... کیا تم میری حقیقی ماں کے بارے میں بتا سکتے ہو؟''

میں نے اسے بتایا۔ ''ایک پیاری دیہاتی لڑکی جو بڑے شہر آئی اور برسوں میں اس نے خود کو ایک مہذب اور باوقار خاتون میں ڈھالا۔ ایک ایسی عورت جس کی نظر کچے ٹیلنٹ کو پہچاننے میں ماہر تھی۔ اپنے دائرے میں، وہ عملی طور پر ایک شہزادی تھی۔''

گریس غور سے سنتی رہی، سب کچھ جذب کرتی رہی۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ میرے اور بھی رشتے دار ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے خونی رشتے۔''

''درحقیقت، تم ایک بڑے خاندان سے ہو۔ تمہاری دو خالائیں ہیں، بیریل، جو جینی کی بڑی بہن ہے، چھ کزنز، ایک ملا جلا سا خاندان۔ ایک کی عمر شاید تیس کے قریب ہے، ایک نے جونیئر کالج کے استاد سے شادی کی ہوئی ہے، بلومنگٹن میں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان کے بارے میں مزید نہیں جانتا۔ تمہارے نانا ابھی زندہ ہیں اور حال ہی میں دوبارہ شادی کی ہے، ایک عورت سے جسے میں نہیں جانتا۔ وہ دونوں ریٹائرڈ اساتذہ ہیں، جواب لورین، اوہائیو میں فیملی فارم پر رہتے ہیں۔

جینی کی راکھ وہیں بکھیر دی جائے گی۔ پوری فیملی اس ہفتے کے آخر میں فارم پر جمع ہو رہی ہے، آخری رسومات کے لیے۔ میں وہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں بھی آ سکتی ہوں؟ میرا مطلب ہے، میں کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔''

''یقیناً ہم اکٹھے جا سکتے ہیں...... اگر تم چاہو تو۔''

''مجھے یہ بہت اچھا لگے گا۔ شاید تم میرا تعارف کرا سکو۔''

''تمہاری مسکراہٹ ہی تمہارا تعارف ہو گی، کوئی بھی شک نہیں کرے گا کہ تم کون ہو۔ وہ تمہاری ماں سے محبت کرتے تھے۔ تمہیں خوش آمدید کہا جائے گا۔''

''تم ایسا سوچتے ہو؟'' وہ پلٹی، اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''مجھے معاف کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے یہ سب کچھ ہضم کرنا بہت مشکل ہے۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔'' اس نے آہ بھری اور میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ''میری پوری زندگی میں مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا رہا کہ کچھ کمی ہے۔ اب مجھے پتا چل گیا کہ ایسا کیوں تھا۔ اس کے لیے شکریہ...... شکریہ مجھے ڈھونڈنے کے لیے۔''

''میں نے یہ حقیقتاً تمہارے لیے نہیں کیا، یہ تو......''

اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ سڑک کے اس پار ایک کالی کیڈی لاک لائبریری کی پارکنگ میں آ کر رکی تھی۔ باس نیچے اترا، اپنے ساتھی کے ساتھ، وہی دوسرا غنڈا جسے میں ہوٹل پر دیکھ چکا تھا۔

''وہ یہاں تمہیں ڈھونڈنے نہیں آئے، مسٹر لیگارٹ۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔''

''ہمیں؟''

''میں تمہارے ساتھ جا رہی ہوں اوہائیو...... اپنی ماں کی آخری رسومات میں شرکت کرنے۔''

''یقیناً...... لیکن کیا تمہیں سامان نہیں لینا؟''

''اوہائیو میں دکانیں ہیں، میں وہاں سے جو چاہے خرید لوں گی۔ میں نے ٹیسن ایکشن دیکھی ہے، مسٹر لیگارٹ! میں وہ سب دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتی اور نہ ہی تم دیکھنا چاہو گے۔ یقین کرو۔''

میں نے اس کی بات مان لی۔

ایک گھنٹے بعد ہم ہائی وے پر روور میں مشرق کی طرف جا رہے تھے، اوہائیو کی سرحد کی طرف۔ ہم بیس میل بھی نکلے نہیں کر پائے تھے کہ میں نے پیچھے پولیس کی لائٹس



Scanned with CamScanner

دیکھیں۔ دو کاؤنٹی پیٹرول کاریں تیزی سے آ رہی تھیں، اوورٹیک کرتی ہوئی۔ پاؤں سے دھاتی پیڈل پر زور دیتے ہوئے میں نے گاڑی سائڈ پر کرلی تا کہ وہ گزر جائیں لیکن وہ نہیں گزرے۔ ایک پولیس وین ہمارے سامنے آ کر رکی۔ میں نے رودور کو زور سے بریک لگا کر روکا۔ وہ پہلے ہی کاروں سے نکل آئے تھے، چار نائب شیرف اور مسلح۔

ایک لمحے بعد میں پستول کی نال کے سامنے تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے تا کہ نظر آتے رہیں۔ جس سپاہی کے ہاتھ میں پستول تھا، وہ کم عمر تھا اور اس کی وردی بہت زیادہ تنگ تھی۔ وہ ایک ساتھ خوفزدہ اور پُرجوش تھا اور میری کھوپڑی اڑانے سے محض ایک لرزش دور تھا۔

''گاڑی میں رہو، ہلنا مت۔'' اس نے چیخ کر کہا۔

''کوئی نہیں ہل رہا۔'' گریس نے کہا۔ ''آفیسر! کیا تم جانتے ہو میں کون ہوں؟''

''جی میڈم! آپ محفوظ ہیں۔ سب ختم ہو گیا۔''

''کیا ختم ہو گیا؟''

''آپ کا اغوا۔''

''میں اغوا نہیں ہوئی۔''

''یہ رپورٹ ہو چکا ہے، میڈم۔ اگر کوئی غلط فہمی ہے تو ہم اسٹیشن جا کر اسے صاف کر سکتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے، ہم صرف آپ کے الفاظ پر اعتبار نہیں کر سکتے۔''

''میں ایک امریکی سینیٹر کی بیٹی ہوں۔'' اس نے جملہ مکمل کیا۔ ''ٹھیک ہے، ہم اسٹیشن چلتے ہیں۔''

دوسرے افسر نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا اور اسے اپنے ساتھ پیٹرول کار کی طرف لے گیا۔ وہ افسر جس نے مجھ پر گن تان رکھی تھی، وہ وہیں رہا۔

گاڑی جس میں گریس بیٹھی تھی، تیزی سے یوٹرن لے کر روانہ ہو گئی، واپس بوفیلڈ کی طرف یا شاید براہ راست شوگر ہل کی طرف۔ وہ لڑکا جس کے ہاتھ میں گن تھی، اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ میں بھی نہیں ہلا۔

چند منٹ بعد ایک اور کار پیچھے سے پوری رفتار کے ساتھ آئی۔ ایک سیاہ کیڈی لاک۔ اس میں سے دو آدمی اترے، باس اور اس کا دوست کالڈ ویل!

باس نے اس افسر کے کندھے پر ہاتھ رکھا جس کے ہاتھ میں گن تھی اور اسے ایک طرف لے گیا۔ میں اس کی بات کا صرف آدھا حصہ سن سکا لیکن باقی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

سپاہی واپس اپنی گاڑی میں چڑھا اور بغیر لائٹس یا سائرن کے روانہ ہو گیا لیکن میں اب بھی عملی طور پر بندوق کی زد پر تھا۔ باس نے مجھے رودور سے بندوق کی نوک پر باہر نکلنے کا اشارہ کیا پھر مجھے دھکیلتا ہوا کیڈی لاک کی سیٹ پر بٹھا دیا۔ اس کا ساتھی میرے پیچھے آیا۔ بندوق کی نال میرے سر کے قریب رکھتے ہوئے دونوں انتہائی محتاط تھے، مکمل پیشہ ور، جو کسی اچھے امکان کی علامت نہیں تھا۔ میں امید کر رہا تھا کہ بات چیت ہوگی لیکن لگتا تھا مجھے مار پڑنے والی ہے۔

اب ایسا نہیں رہا۔ یہ مسئلہ صرف کسی منہ بولی بیٹی کو بھگانے سے کہیں زیادہ گہرا تھا۔ میں اب بھی یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، جب باس نے ایک غلط سوال پوچھ کر اصل بات بتا دی۔

''یہ کارنز کون ہے، مسٹر لیگارٹ؟ تمہارا باپ یا کوئی پرانا دوست؟''

''اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا، نہ پہلے کبھی ملا، نہ ہی کوئی دوستی۔ مجھے بس اتنا پتا ہے کہ وہ کہیں گیا اور پھر لاپتا ہو گیا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا؟''

''جو کچھ بھی ہوا، اس نے خود ہی اپنے ساتھ کیا۔ آدمی کچھ تمہاری طرح کا تھا۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ساٹھ سال کا موٹا، اسے میرے جیسے بندے سے پنگا نہیں لینا چاہیے تھا۔ ہم ایک منٹ کے لیے گھومے پھرے پھر وہ گر گیا، زبان باہر نکال کر سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے خود کو مار لیا۔''

''افسوس کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ حادثہ ہی تھا، ہے نا؟''

باس نے تیزی سے کہا۔ ''ہمیں حکم ملا تھا۔ بندے کو سیدھا کرو، بس اتنا لیکن لگتا ہے اس بار تم پر اثر ہوگا۔''

یہ آخری بات تسلی کے لیے تھی۔ مجھے تھوڑی مار پڑنی تھی پھر وہ مجھے چھوڑ دیتے۔ وہ کارنز کے بارے میں مجھ سے اتنے آرام سے بات کر رہا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ میں بھی کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ کبھی بھی نہیں۔

اس نے گاڑی کو موڑا اور ایک کچے راستے پر لے گیا جو پہاڑیوں کی طرف جاتا تھا۔ یہ راستہ بہت زیادہ خراب تھا، شاید چونے کے پتھر کی کان سے آنے والے بھاری ٹرکوں کے گزرنے کی وجہ سے۔ غالباً وہ وہیں مجھے دفن کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ مجھے یہ خیال مضحکہ خیز لگا، جس پر باس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''کوئی بات مزے کی لگی؟'' اس نے پوچھا۔

digest library.com



Scanned with CamScanner

میں نے بس سر ہلا دیا۔ کوئی ایسی وضاحت نہیں کر سکا جو اس کے لیے معنی رکھتی ہو۔

لیکن...... اگر میں ان غنڈوں کے سامنے جھک جاتا تو میں ناکام ہو جاتا جس نے بھی جین سے وعدہ کیا تھا۔ اس نے مجھے اس لیے بھیجا تھا تاکہ یقین دہانی ہو سکے کہ اس کی بیٹی محفوظ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ گریس کہاں ہے۔ کیا وہ اب بھی محفوظ ہے۔

کسی نہ کسی طرح مجھے زندہ رہنا تھا تاکہ اپنی موجودگی کو معنی دے سکوں، جو آسان نہیں تھا۔ میرے دونوں اغوا کار پروفیشنل قاتل تھے جو اس سے پہلے بھی کئی جانیں لے چکے ہوں گے۔ وہ یقینی طور پر کارٹز کو مار چکے تھے اور بچ نکلے تھے۔

میں جنگ کے میدان میں کئی مشکل حالات سے بچ نکلا تھا لیکن یہاں یہ معاملہ زیادہ خطرناک لگ رہا تھا۔

یہ سب کچھ میرے خلاف تھا۔ میں نہتا تھا۔ وہ دو تھے اور ایک میرے پیچھے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی ہم متروکہ کواری پتھر کی پرانی کان تک پہنچتے، مجھے پیچھے سے گولی مار دی جاتی۔ مکمل ختم۔

میرا وقت تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ہم ان سائن بورڈز کے پاس سے گزر رہے تھے جن پر لکھا تھا احتیاط کواری قریب ہے۔ چند ہی منٹوں میں تو میں ویسے بھی مرنے والا تھا تو پھر جہنم میں جائے سب۔ میں نے اچانک اپنی سیٹ بیلٹ کھولی، خود کو سیٹ سے نیچے دبا لیا، پھر ایک جھٹکے سے گیئر شفٹ کے اوپر جھپٹ کر باس کے بوٹ پر وزن ڈالا اور زور سے ایکسلریٹر پر مارا۔

گاڑی نے ایک بدحواس ہرن کی طرح چھلانگ ماری اور تنگ سڑک پر ایک راکٹ کی طرح بھاگ نکلی، جبکہ باس اسٹیئرنگ کے ساتھ لڑتا رہا اور گاڑی کو سیدھا رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

وہ شاید گاڑی کو بریک لگا کر آہستہ کر سکتا تھا، اگر اس نے بایاں پاؤں استعمال کیا ہوتا لیکن وہ بس گاڑی کو ٹریک پر رکھنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔

ہم جنگل سے نکل کر ایک کھلے کنارے پر آن پہنچے، جو ایک فٹبال کے میدان جتنا بڑا تھا۔ کواری کو دس فٹ اونچی زنجیر والی باڑ نے گھیر رکھا تھا جس پر خاردار تار لگی تھی لیکن وہ ہمیں زیادہ روک نہ سکی۔

ہم ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے اس باڑ سے ٹکرائے اور سیدھے کھائی میں جا گرے اور پھر کواری کی دیوار کے نیچے تیزی سے لڑھکنے لگے۔ باڑ کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے، فولادی باڑ چیخ رہی تھی جیسے کیڈی لاک کا وزن زمین سے زنجیروں کو کھینچ رہا ہو۔

ایئر بیگز پھٹ گئے، سفید کپڑا پھیل گیا اور ہمیں سیٹ سے پیچھے دھکیل دیا۔ میں سانس نہیں لے پا رہا تھا۔

میں کالڈویل کی چیخ سن سکتا تھا، جو گاڑی میں لڑھک رہا تھا اور گرجتے ہوئے گالیاں دے رہا تھا۔ پھر جیسے ہی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا، وہ فضا میں اُچھلا اور پھر نیچے پتھروں پر جا گرا۔

کیڈی لاک پتھر سے جا ٹکرائی، اگلا حصہ اچھلا۔ پھر وہ ایک سے دوسرے کنارے لڑھکتی ہوئی سیدھی کھڑی ہو گئی، چاروں ٹائروں پر۔

میں مکمل طور پر سُن ہو چکا تھا، چند منٹوں تک ہل بھی نہیں سکا، صرف سفید کپڑا نظر آ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی میں دھند سے باہر آیا، مجھے یاد آیا میں کون ہوں اور ابھی کیا ہوا تھا۔

میں نے آہستہ آہستہ اپنی سیٹ پر گھومتے ہوئے باس کی طرف دیکھا۔ اس کی جیکٹ پر ہاتھ مارا اور اس کا ہتھیار نکالنے کی کوشش کی۔ اس کی پسلی کے نیچے سے میں نے گن تک تین انگلیاں پہنچا دیں اور جھٹکے سے ہولسٹر سے گن نکال لی لیکن اس سے کچھ فرق نہ پڑا۔

جیسے ہی میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا، مجھے دل کی دھڑکن محسوس نہ ہوئی۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔

اس کی آنکھیں کھلی ہوئیں لیکن اس کا سر مڑا ہوا تھا، ایک غیر فطری زاویے پر اور اس کی پتلیاں پھیل چکی تھیں۔ سیٹ بیلٹ نہ ہونے کی وجہ سے وہ گاڑی کے الٹنے کے دوران اچھلا اور جھٹکے سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

اس کے ساتھی کی لاش کواری کی دیوار پر آدھی پھیلی ہوئی تھی جیسے کوئی کٹھ پتلی ہو جس کی ڈوریں ٹوٹ گئی ہوں۔ جانچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کوئی بھی اتنی اونچائی سے گرنے سے زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ ہاں اگر میں نے سیٹ بیلٹ نہ باندھی ہوتی تو شاید میں بھی نہ بچتا۔

میرا ایئر بیگ اب بھی ڈھیلا ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو اس لعنتی چیز سے آزاد کیا، سیٹ سے نکلا، شیشے سے باہر اور ٹوٹے ہوئے ونڈ شیلڈ سے رینگ کر گاڑی کے ہڈ پر آیا۔ وہاں سے پھسل کر نیچے کواری کے فرش پر جا گرا اور کچھ دیر وہیں بیٹھا سانس بحال کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کانوں میں اب بھی گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ پھر میں بمشکل اپنے قدموں پر کھڑا ہوا۔ تلاش کا وقت نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ انہوں نے فرینک کارٹز کی لاش کو کہیں اسی کواری میں دفن کیا ہوگا۔

ایک تنگ راستہ کواری کی دیوار میں بنا ہوا تھا۔ سیفٹی ریل کے ساتھ میں نے لمبی چڑھائی کی پھر لینڈ روور تک پہنچا جو اب بھی ہائی وے کے کنارے پارک تھی، چابی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔ وہ لوگ شاید امید کر رہے تھے کہ کوئی اسے چوری کرے گا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی، ٹرن لیا اور واپس بوفیلڈ کی جانب چل پڑا۔ راستے میں، میں نے وہ ہتھیار چیک کیا جو میں نے باس سے لیا تھا۔ ایک براؤننگ ہائی پاور، نائن ملی میٹر، تھری ڈاٹ سائٹس کے ساتھ مکمل میگزین، تیرہ گولیاں اور ایک چیمبر میں۔ ایک پروفیشنل کا ہتھیار۔ میں نے اس کا فون بھی لیا تھا اور اسے استعمال کر کے 911 پر کال کی حادثے کی اطلاع۔ پھر فون کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا تا کہ ٹریس نہ ہو سکے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ گریس کولین کو پولیس کسٹڈی میں نہیں رکھنا چاہیں گے، وہاں گواہوں کی بھرمار ہوتی۔ غالب امکان یہی تھا کہ کوئی ڈپٹی اسے سیدھا گھر لے گیا ہوگا اور ایک بار پھر میرا اندازہ درست نکلا۔

جب میں لینڈ روور کو کولین ہال کے طویل دائرہ نما راستے میں لے کر پہنچا تو میں نے دیکھا گریس سیڑھیوں پر بیٹھی تھی، اس کے گھٹنوں پر بیگ رکھا ہوا تھا۔ مجھے لگا شاید میں بچ نکلوں لیکن جیسے ہی میں نے گاڑی روکی اور باہر نکلا، سینیئر کولین اندر سے نکلا اور گریس کے پیچھے ڈیک پر آ گیا۔

بوڑھا آدمی جنونی سا لگ رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے، ڈاڑھی بڑھی ہوئی، آنکھیں وحشی سی۔

اس کے ہاتھ میں رائفل تھی، بولٹ ایکشن، ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی۔ شاید یہ صرف نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بھری ہوئی تھی یا نہیں۔ میں نے باس کی براؤننگ اپنی کمر کے پیچھے چھپا رکھی تھی اور میرا دایاں ہاتھ اس کے دستے پر تھا۔

آخری چیز جو میں چاہتا تھا، مزید جھگڑا تھا لیکن اگر اس نے حرکت کی تو؟ گریس میرے اور گولی کے درمیان آ جائے گی۔

مسئلہ اس وقت اور بڑھ گیا جب گریس اٹھ کر اس کا سامنا کرنے لگی۔ میں انہیں باتیں کرتے دیکھ سکتا تھا لیکن سن نہیں سکتا تھا۔ بہت دور تھا۔ بحث ہوتی نظر آ رہی تھی۔

پھر گریس نے اپنا بیگ اٹھایا اور میری طرف چل پڑی۔

میں نے باس کی بندوق نکال لی، اسے نیچے کیے رکھا، میری توجہ پوری طرح کولین کے ہتھیار پر تھی۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ گریس ایک طرف ہو جائے۔

''میرا اکلوتا بچہ زندہ نہیں بچا۔'' کولین نے اس پر چیختے ہوئے کہا۔ ''پر اگر تم پیٹھ پھیر کر ہمیں چھوڑ دیتی ہو، جو ہم نے تمہارے لیے کیا اس کے بعد..... تو تم لعنت کی حقدار ہو۔''

گریس رکی، پھر پلٹ کر بولی۔ ''آپ نے میرے لیے فیصلہ آسان کر دیا۔ شکریہ۔ مام سے کہیے گا میں اسے کال کروں گی۔''

اور وہ مڑ کر آگے بڑھی۔

''شکر گزار نہ ہونے والے بچے سے سانپ کے دانت بہتر ہیں!'' بوڑھا آدمی چلایا۔

''یہ تو صحیفہ ہے!''

اس کی انگلیاں ہتھیار پر جمی ہوئی تھیں لیکن اس نے ابھی تک اسے اٹھایا نہیں تھا۔

''اصل میں، یہ آپ کی شکست ہے، ڈیڈ۔'' گریس نے آہ بھری۔

بوڑھے آدمی نے غصّے سے دیکھا لیکن کچھ نہیں کہا۔ اس نے اپنی رائفل کو سہارا بنا کر آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر بیٹھنا شروع کیا اور پھر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

میں نے اشارہ کیا، وہ میرے پاس آ گئی اور لینڈ روور میں سوار ہو کر ہم وہاں سے نکل گئے۔

ہم دونوں کافی دیر تک خاموش رہے۔ شاید آدھے گھنٹے تک۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھور رہی تھی۔ ایک ایسا انداز، اتنا مانوس کہ میں نے گلا خشک ہوتا محسوس کیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''جب باس اور کالڈویل نے تمہیں گھسیٹا، میں نے سوچا کہ شاید میں تمہیں دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔''

جب ہم اوہائیو کی سرحد کے قریب پہنچے تو وہ میرے کندھے سے آ لگی۔

''تمہیں اعتراض تو نہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''میں واقعی بہت تھکی ہوئی ہوں۔'' اور وہ فوراً سو گئی۔

ایسا محسوس ہوا...... اتنا قدرتی کہ تھوڑی دیر کے لیے میں یہ بھول ہی گیا کہ جین اب اس دنیا میں نہیں رہی کیونکہ یہی وہ طریقہ تھا جو وہ طویل ڈرائیوز میں کیا کرتی تھی۔

اور ایک لمحے کے لیے، مجھے ایسا لگا جیسے جین وہیں، ہمارے ساتھ موجود ہو۔ بیٹی کو اپنے خاندان والوں سے ملنے جاتے ہوئے خوشگوار انداز میں دیکھ رہی ہو۔

⌘⌘⌘

# رمز شناس

نازیہ کامران کاشف

قسط نمبر: 9

وہ صدیوں پر محیط ایک ایسا گہرا راز تھا جس کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین سے لے کر مصر اور انگلستان تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان جڑوں میں علم کا ایسا خزانہ دفن تھا جسے صدیوں کوئی تلاش نہ کرسکا... مگر کوئی ایسا بھی تھا جسے اس خزانے کی تلاش تھی۔ یہ بھی کائنات کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی اس رمز شناس کی ایسی کوشش تھی جس نے ان سوئی ہوئی شیطانی قوتوں کو گہری نیند سے جگا دیا تھا، جن پر قابو پانا کسی عام انسان کے لیے ناممکن تھا مگر علم کی معراج پر پہنچ کر اس نے ان پُراسرار علوم کو عام کرنے کی ناقابلِ فراموش داستان رقم کردی اور اس نے تاریخ کے اوراق پر انہیں عبرت کا نشان بنادیا... صدیاں گزرتی رہیں اور ایک بار پھر اٹھارویں صدی کے اوائل میں ان قوتوں نے سر اٹھایا... مگر کیا مصر کے عیاد ایبی، انگلستان کے آرتھر اور ہندوستان کے کاویہ سے... مقابلہ کرنا آسان تھا...؟ ہاں عشق اور فرض کے درمیان اسے ہی کامیابی حاصل ہوئی جو سارے بھید جان گیا تھا۔

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے

ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان

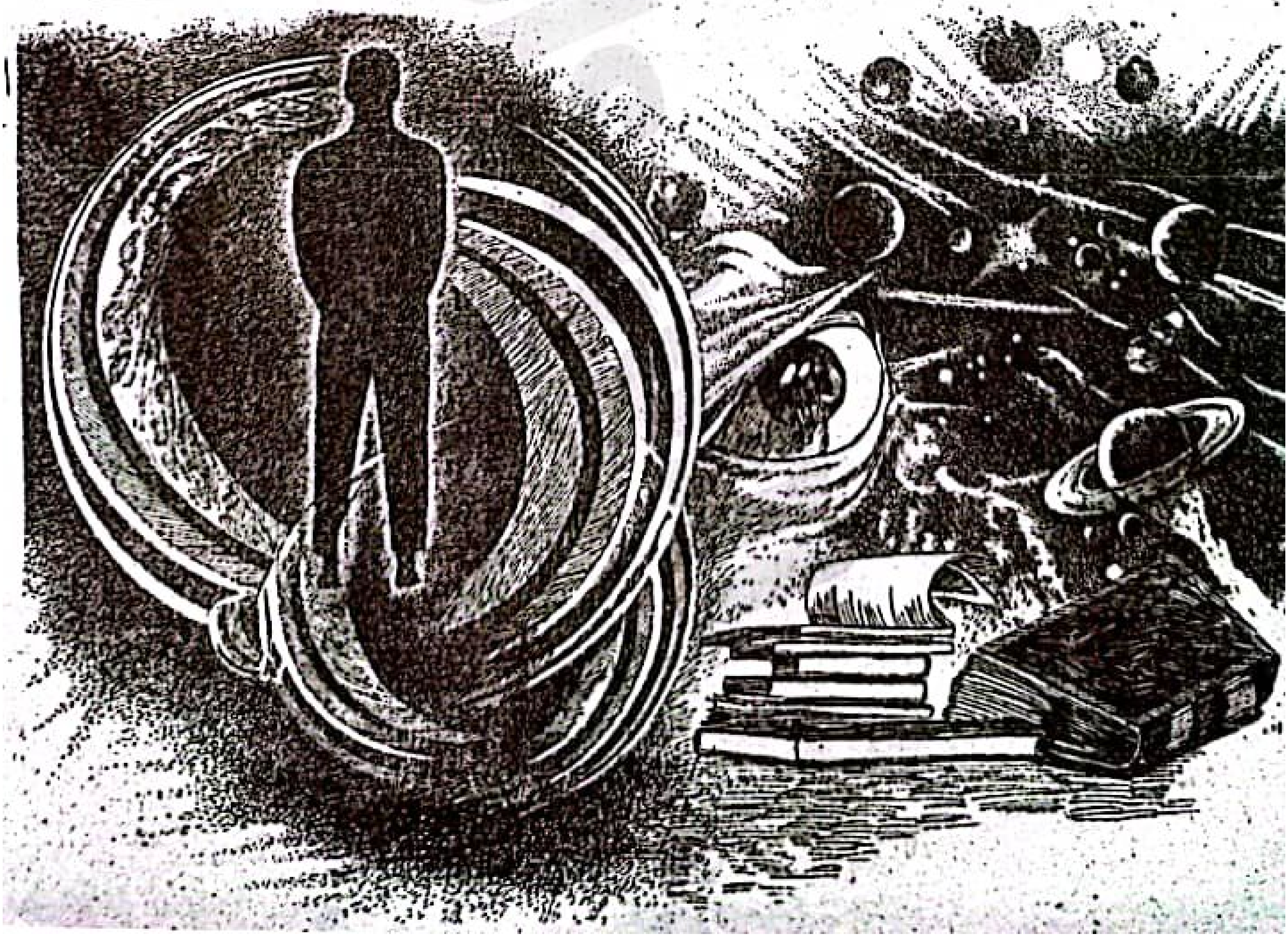

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

**ایڈنبرا۔اسکاٹ لینڈ**

**Year 1773**

ایلینا کی طبیعت میں بہتری آرہی تھی، اس کے ایگزارسزم کو ایک ماہ بیت چکا تھا۔ رچرڈ اور ڈیوڈ اسے باقاعدگی سے چرچ لے جاتے تھے۔اس کے زخموں کا علاج بھی ساتھ ہی چل رہا تھا لہٰذا زخم کافی حد تک مندمل ہو چکے تھے۔اب وہ پہلے کی طرح آسیب زدہ نہیں لگتی تھی، اس کی صحت بھی بہتر ہوئی تھی۔اس کی رنگت میں ظاہر ہونے والی وہ پیلاہٹ اب سرخی میں بدل رہی تھی۔

وہ پرسکون نیند سوتی تھی اور مناسب غذا بھی لے رہی تھی۔اس کے گھر والے مطمئن ہو چکے تھے۔انہیں کسی حد تک تسلی ہو چکی تھی کہ ایلینا بہتر ہو رہی ہے۔بس جو شک باقی تھا وہ اس کی خاموشی کی وجہ سے تھا۔ہر وقت ہنسنے بولنے والی ایلینا اب خاموش اور سنجیدہ رہنے لگی تھی۔ایوا نے کوشش کی تھی کہ وہ دوبارہ سے لوگوں سے گھلنے ملنے مگر اس کی سہیلیاں اور قصبے کے لوگ ایلینا سے ڈرنے لگے تھے۔جب وہ چرچ جانے کے لیے رچرڈ اور ڈیوڈ کے ساتھ نکلتی تو لوگ اسے دیکھ کر راستہ بدل لیتے۔ان کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگتا، یہاں تک کہ ایلینا کی سہیلیاں بھی اسے دیکھ کر نظریں پھیر لیتیں۔

جہاں یہ حالات ایلینا کے لیے تکلیف دہ تھے، وہیں اس کے گھر والوں کو بھی بہت کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔وہ اس قصبے میں اچھوت تصور کیے جانے لگے تھے۔صرف ڈیوڈ ہی تھا جو ان کے گھر آتا جاتا رہتا اور ان کی خیریت دریافت کرتا۔اگر وہ نہ ہوتا تو شاید ایلینا اب تک زندہ بھی نہ ہوتی۔

وہ ان کا محسن تھا۔ڈیوڈ نے انہیں یہ قصبہ چھوڑ کر جانے کا مشورہ دیا۔اس کے مطابق جگہ کی تبدیلی نہ صرف ایلینا کی طبیعت پر اچھا اثر ڈالتی بلکہ رچرڈ کے گھر والوں کے لیے بھی سود مند ثابت ہوتی مگر رچرڈ اس بات کے لیے راضی نہیں تھا۔یہاں اس کا گھر، اس کا کاروبار تھا۔وہ یہ سب چھوڑ کر کیسے چلا جاتا؟ رچرڈ کے مطابق وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جانا تھا۔ڈیوڈ کو ایسا لگتا تو نہیں تھا مگر وہ اس معاملے پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا خاموش ہو گیا۔وہ جانتا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ رچرڈ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ یہ قصبہ چھوڑنا اس کے لیے ضروری کیوں ہے۔

قصبے کے لوگوں کو توہمات پر اس قدر یقین تھا کہ وہ ایلینا کو کبھی قبول نہ کرتے اور یہ تنہائی ایلینا کو نفسیاتی مسائل سے بھی دوچار کر سکتی تھی۔ڈیوڈ کے بیوی بچے دوسرے قصبے میں رہائش پذیر تھے لہٰذا وہ خود ہی جتنا ممکن ہو سکتا، اس کا دل بہلائے رکھتا۔کبھی اسے بگھی میں بٹھا کر قصبے کا بازار گھماتا اور کبھی چرچ لے جاتا۔وہ زیادہ تر خاموش بیٹھی رہتی اور اس کے بار بار مخاطب کرنے پر ہلکا سا مسکرانے پر ہی اکتفا کرتی۔نہ جانے اس کے دل و دماغ میں کیا کشمکش جاری تھی۔ڈیوڈ کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کم عمری میں اس قدر خوفناک تجربے سے دوچار ہونے کے بعد انسان کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے۔اس کی یہی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح ایلینا کی سوچ پڑھ سکے، اس کے دماغ میں ابھرنے والے خیالات تک پہنچ کر اس کی مدد کر سکے اور اس کے دل کا حال جان سکے مگر ایلینا کی زبان کو تو جیسے تالا لگ چکا تھا۔

جہاں رچرڈ گھر اور جگہ تبدیل کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، وہیں اس نے اپنے گھر میں موجود ایک کمرا ڈیوڈ کے لیے تیار کروا دیا تھا۔ڈیوڈ کا گھر دوسرے قصبے میں تھا۔جن دنوں وہ ایڈنبرا میں قیام کرتا، ان دنوں وہ اپنے اصطبل میں ہی سوتا تھا۔رچرڈ اپنے محسن کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے اپنے گھر میں موجود غیر استعمال شدہ کمرا ڈیوڈ کے لیے تیار کروا دیا۔ڈیوڈ نے اس کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا مگر ایوا اور رچرڈ کے بہت زیادہ اصرار کرنے پر وہ ان کے گھر قیام کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اس کی ضرورت کا تمام سامان اصطبل سے اس کمرے میں منتقل کرنے میں رچرڈ کے بیٹے ایتھن نے اس کی مدد کی۔وہ بھی اپنے والد کے اس فیصلے سے بہت خوش تھا۔ڈیوڈ کے آنے سے ان کے گھر کی دیواروں پر چھایا سکوت ٹوٹ جاتا تھا۔ایلینا کی بیماری سے لے کر صحت یاب ہونے تک ڈیوڈ نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا اور جس طرح قصبے کے لوگوں نے انہیں نظر انداز کرنا شروع کیا تھا، اگر ڈیوڈ نہ ہوتا تو شاید وہ تنہائی اور وحشت کا شکار ہو جاتے۔

یہ ڈیوڈ کی رچرڈ کے گھر میں پہلی رات تھی۔ ہزار کوششوں کے باوجود بھی اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ بار بار ایگزارسزم والی رات اس کے ذہن کے پردے پر ابھر آتی۔ حالانکہ اس سے پہلے اس کے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔شاید یہ اس لیے ہو رہا تھا کہ وہ اسی گھر میں موجود تھا جہاں فادر نے اس شیطان کا خاتمہ کیا تھا۔اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار وہ منظر گھوم جاتا۔

بالآخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔نیند تو ویسے ہی نہیں آرہی تھی۔اس نے اپنے سامان میں موجود کتاب نکالی اور مطالعہ کرنے کی غرض سے کمرے میں موجود موم بتی جلا لی۔مطالعہ کرنا اس کا شوق تھا۔اس کے پاس کوئی نہ کوئی کتاب موجود رہتی تھی مگر اس



Scanned with CamScanner

شوق کو پورا کرنے کے لیے وقت کم ہی ملتا تھا۔

ایڈنبرا کا موسم سرد ترین ہو چکا تھا۔ ایسے میں بند کمرے اور گرم بستر میں بیٹھ کر کتاب کا لطف اٹھانے کا الگ ہی مزہ تھا۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے مطالعہ کرنے لگا۔ ابھی اسے مطالعہ کرتے ہوئے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ وہ باہر ہونے والے کھٹکے سے چونک پڑا۔ ایسا لگا جیسے کوئی گھر کے اندر کودا ہو۔

وہ آہستگی سے اپنے بستر سے اترا اور دیوار سے کان لگا کر آہٹ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے واضح طور پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔

آدھی رات بیت چکی تھی اور رچرڈ کے گھر والے بھی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ تو پھر اتنی سردی میں صحن میں کون چل پھر رہا تھا؟ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اسے خوف محسوس ہوا مگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا اس نے صحن تک جانے کا فیصلہ کیا۔

ڈیوڈ نے کمرے میں موجود سامان پر نظر دوڑائی۔ اسے دیوار کے ساتھ رچرڈ کی درانتی رکھی نظر آئی۔ ڈیوڈ نے درانتی اٹھائی اور احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

چاروں طرف دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا کمرا رچرڈ کے گھر کے رہائشی حصے سے قدرے الگ تھلگ اور پچھلے صحن کی طرف جانے والے راستے کے ساتھ بنا ہوا تھا، آواز بھی پچھلے صحن سے ہی آئی تھی۔ اس کے کمرے سمیت گھر کے تمام کمروں کی کھڑکیاں پچھلے صحن میں ہی کھلتی تھیں۔ وہ چوکنا انداز میں دبے قدموں صحن کی طرف بڑھنے لگا۔ صحن بھی دھند کی لپیٹ میں تھا۔ سخت سردی کی وجہ سے اس کے ہاتھ بے حس ہو رہے تھے۔ وہ صحن کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک قدموں کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ڈیوڈ نے دیوار کی اوٹ سے جھانکا۔ ایک سایہ لیلینا کے کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیلینا کے کمرے کی کھڑکی بند تھی۔ سایہ کھڑکی کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ دھند کی وجہ سے ڈیوڈ کو دیکھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

اچانک سائے نے لیلینا کے کمرے کی کھڑکی پر آہستگی سے دستک دی۔ ڈیوڈ چونک پڑا۔ یقیناً یہ کوئی بدروح نہیں تھی ورنہ دستک دینے کی ضرورت کیوں پڑتی۔

”یہ کون ہو سکتا ہے؟“ ڈیوڈ نے درانتی پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

سایہ دستک دینے کے بعد کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڈ نے اچانک ہی اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ قابو کرنے کے بعد ڈیوڈ نے اسے دیوار کے ساتھ لگا کر دوسرے ہاتھ میں پکڑی درانتی اس کی گردن پر رکھ دی۔ وہ شخص اس اچانک افتاد پر بری طرح بوکھلا گیا اور اسے اپنا دفاع کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ یقیناً وہ بھی دھند کی وجہ سے ڈیوڈ کو دیکھ نہیں پایا تھا۔

”کون ہو تم؟“ ڈیوڈ غرایا۔ اس شخص نے اپنا چہرہ مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا۔

”ڈ ڈ ڈ...... ڈیوڈ صاحب!“ وہ شخص ہکلاتے ہوئے درانتی سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔

”میں نے پوچھا، کون ہو تم اور رات کے اس پہر یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ڈیوڈ نے اپنی گرفت مزید تنگ کی۔ اس شخص کی آواز مانوس سی لگی۔ اگر وہ خود اس کا مفلر نیچے کھینچتا تو اسے اس شخص کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد کرنا پڑتے۔

”م...... م...... میں ہوں...... انتھونی!“ انتھونی کی روح خشک ہو چکی تھی۔

”انتھونی......؟ تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ڈیوڈ نے درانتی پر اپنی گرفت ڈھیلی کی اور اس کے دونوں ہاتھ آزاد کر دیے۔

”وہ...... میں...... وہ...... میں لیلینا سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔“ انتھونی نے ڈرتے ڈرتے بات مکمل کی۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ یہ کون سا وقت ہے کسی لڑکی سے ملنے کا...... اور کس منہ سے تم اس سے معافی مانگنا چاہتے ہو؟ یاد کرو، تم اس کی حالت دیکھ کر دم دبا کر بھاگ گئے تھے۔“ ڈیوڈ نے درانتی پیچھے کر لی اور سخت لہجے میں بولا۔

”م...... میں ڈر گیا تھا...... م...... مگر میں اس کی سہیلیوں سے روز اس کی خیریت معلوم کرتا تھا۔“ انتھونی گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

”کن سہیلیوں کی بات کر رہے ہو؟ لیلینا کسی سے نہیں ملتی۔ زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ یہ مت بھولو کہ ابھی لیلینا کا انکل ڈیوڈ سائے کی طرح اس کے ساتھ ہے۔ تم جیسے بزدل انسان کی لیلینا کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔ لیلینا تمہاری ناپاک خواہشات کی وجہ سے ہی اس شیطان کے چنگل میں پھنسی تھی۔ کاش! اس رات یہ حادثہ تمہارے ساتھ ہو گیا ہوتا۔“ ڈیوڈ کو اس کی بات سن کر شدید طیش آیا۔

”میں اسی لیے معافی مانگنا چاہتا ہوں، مجھے ایک موقع دیں۔“ انتھونی گڑگڑاتے ہوئے بولا۔



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

''بکواس بند کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ آئندہ اس گھر کے آس پاس بھی نظر آئے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارا کام تمام کروں گا۔'' ڈیوڈ نے اس کا گلا دبوچ لیا۔

''جج...... جاتا ہوں...... جاتا ہوں۔'' انتھونی نے معافی مانگنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

''بس یہیں تک تھی تمہاری بہادری اور محبت؟ لعنت ہو تم پر۔ نکلو یہاں سے۔'' ڈیوڈ غرایا۔

ڈیوڈ ایک لمحے کی دیر کیے بغیر وہاں سے بھاگتا ہوا پچھلے صحن کی دیوار تک گیا اور دیوار پھلانگ کر دوسری طرف اتر گیا۔

انتھونی افسوس سے سر ہلاتے ہوئے پلٹا اور اچانک بری طرح اچھلا۔ صحن کے داخلی راستے پر کوئی کھڑا تھا۔ دھند کی وجہ سے ڈیوڈ کو اسے پہچاننے میں دیر لگی۔

وہ لیلینا تھی...... سفید فراک، کھلے بال اور ننگے پیر...... رات کے اس پہر وہ اس سخت سردی میں یہاں کیا کر رہی تھی۔

ڈیوڈ تیزی سے چلتا ہوا اس تک پہنچا۔

''لیلینا بیٹی! تم یہاں اس وقت کیا کر رہی ہو؟ اندر چلو، باہر بہت ٹھنڈ ہے۔'' ڈیوڈ نے اسے مخاطب کیا۔

وہ خاموشی سے اسے تکنے لگی۔

ڈیوڈ کو خوف محسوس ہوا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ شیطان اب تک......؟ نہیں...... نہیں۔ میں نے خود اس کا خاتمہ اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھا تھا۔'' ڈیوڈ نے اپنے دل میں اٹھنے والے تمام خدشات کو تھپکی دے کر سلایا۔

''کیا ہوا، کچھ کہنا چاہتی ہو؟'' ڈیوڈ نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

''میں انتھونی کی دستک سے جاگی تھی۔'' بالآخر وہ بول پڑی۔

''ہمم...... وہ تمہارے لائق نہیں ہے لیلینا! میں نے اسے بھگا دیا ہے لیکن اگر تم اس سے ملنا چاہتی ہو تو میں کل صبح اسے لے آؤں گا۔ رات کے اس پہر اس کا اس طرح یہاں آنا مجھے ٹھیک نہیں لگا۔'' ڈیوڈ سنجیدگی سے بولا۔

''آپ نے ٹھیک کیا۔ میں اس سے نہیں ملنا چاہتی۔'' وہ یہ کہہ کر واپس پلٹ گئی۔ ڈیوڈ وہیں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا اور پھر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی درانتی ایک طرف رکھی اور بستر پر بیٹھ گیا۔ نیند تو اب کہاں آنی تھی لہٰذا اس نے دوبارہ کتاب اٹھالی۔ اسی لمحے اس کے کمرے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک پڑا۔

'شاید لیلینا ہو۔' اس نے یہ سوچتے ہوئے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

باہر سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ ڈیوڈ نے باہر نکل کر چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

'شاید میرا وہم تھا۔' اس نے دل میں سوچا مگر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے دستک کی آواز سنی تھی۔

وہ سر جھٹک کر دوبارہ اندر چلا آیا اور سونے کا ارادہ کرتے ہوئے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ آج رات کے لیے اتنی ورزش ہی کافی تھی۔

ابھی اس نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ دستک دوبارہ ہوئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کون ہے؟'' اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

دستک دوبارہ ہوئی مگر کسی نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ سر جھٹک کر اٹھا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ باہر معمول کی خاموشی تھی۔ دھند نے ماحول کو مزید پراسرار بنا دیا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے وہیں کھڑا ہو گیا۔ دستک دوبارہ ہونا شروع ہوئی۔ ڈیوڈ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس بار دستک میں تیزی آ گئی تھی۔

کوئی تھا جو بغیر رکے دروازہ بجا رہا تھا۔ ڈیوڈ نے کانپتے ہاتھوں سے دروازے کی کنڈی پکڑی اور تیزی سے دروازہ کھولا۔ دستک رک چکی تھی اور باہر کوئی نہیں تھا۔ ڈیوڈ نے خدا کو یاد کرنا شروع کیا اور دروازے کو آہستگی سے بند کر دیا۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ رچرڈ کے گھر پر اب تک شیطان کا پہرا تھا اور وہ یقیناً ڈیوڈ کو ستا رہے تھے۔ ڈیوڈ نے اپنے سامان میں رکھی بائبل نکالی اور اسے پڑھنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں خدا سے مدد بھی مانگ رہا تھا۔ اسے یہ کرتے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اچانک دیوار کے ساتھ رکھی درانتی زوردار آواز سے نیچے گر گئی۔

وہ درانتی کو گھورنے لگا، دستک دوبارہ نہیں ہوئی۔ شاید درانتی بھی خود ہی گری ہوگی۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ اچانک اسے دوبارہ کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس بار وہ اپنے بستر پر ہی بیٹھا رہا۔ کوئی تھا جو پچھلے صحن کی طرف جا رہا تھا۔ یہ رات کچھ زیادہ ہی طویل اور خوفناک ہو چکی تھی۔ وہ نہ چاہ کر بھی کھڑکی کے قریب چلا آیا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ بند تھے۔ اس نے کھڑکی میں موجود جھری سے آنکھ لگائی۔

''لیلینا......؟'' وہ حیرت سے گنگ رہ گیا۔



Scanned with CamScanner

وہ پچھلے صحن میں چل پھر رہی تھی۔ وہ یقیناً لیلینا ہی تھی۔ اس کی سفید فراک باہر پھیلی دھند میں بھی واضح نظر آ رہی تھی۔

"یہ دوبارہ کیوں باہر نکلی؟ کہیں وہ خبیث انتھونی دوبارہ تو نہیں چلا آیا؟" ڈیوڈ کو پہلا خیال یہی آیا۔ اس وقت وہ دروازے پر ہونے والی اس دستک کو بھی بھلا چکا تھا۔ لیلینا کی حفاظت زیادہ ضروری تھی۔ وہ اسے اپنی بیٹی کی طرح عزیز رکھنے لگا تھا۔ اس نے ایک بار پھر درانتی اٹھائی اور باہر نکل آیا۔

"اس بار نہیں چھوڑوں گا اسے۔" وہ خود کلامی کرتے ہوئے صحن کی طرف بڑھا۔

صحن سنسان پڑا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے اپنی آنکھوں سے لیلینا کو وہاں دیکھا تھا۔

"لیلینا...... لیلینا......!" اس نے آہستگی سے لیلینا کو آواز لگائی۔ وہ اس وقت رچرڈ کو جگانا نہیں چاہتا تھا۔

"انکل ڈیوڈ! میں یہاں ہوں۔" صحن کے قدرے اندھیرے گوشے سے لیلینا کی آواز سنائی دی۔ وہاں کاٹھ کباڑ رکھا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اس حصے کی طرف بڑھا۔

"یہاں اس وقت کیا کر رہی ہو؟ اندر چلو، کیا وہ خبیث دوبارہ آیا تھا؟" ڈیوڈ نے قریب پہنچ کر لیلینا کو مخاطب کیا جو اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔

"کیا ہوا، خاموش کیوں ہو؟" وہ کوئی جواب ہی نہیں دے رہی تھی۔ ڈیوڈ نے آس پاس نظریں دوڑا کر انتھونی کو ڈھونڈنا چاہا۔

لیلینا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور وہ اچانک گھر کی دیوار پر چھپکلی کی طرح چڑھنے لگی۔ ڈیوڈ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلنے لگیں۔ لیلینا دیوار پر چڑھتے ہوئے چمنی تک جا پہنچی اور اچانک وہ چمگادڑ کی طرح چمنی سے الٹی لٹکنے لگی۔ اس کے بال نیچے کی طرف جھول رہے تھے، چہرہ خوفناک شیطان کا روپ اختیار کر چکا تھا۔

ڈیوڈ کے قدم خوف سے جم گئے۔ لیلینا پر اب تک شیطان کا قبضہ تھا؟

لیلینا الٹی لٹکی جھول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ قریب تھا کہ وہ ڈیوڈ پر چھلانگ لگا دیتی، اچانک ڈیوڈ کے ذہن نے کام کرنا شروع کیا۔ ڈیوڈ نے خدا کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ لیلینا نے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔

"کیا ہوا ڈیوڈ! تم ڈر گئے؟ ابھی سے......؟ ابھی تو بہت کچھ ہونا باقی ہے۔" لیلینا کے منہ سے غیر انسانی آواز نکلی اور اس کی گردن لمبی ہوتے ہوتے ڈیوڈ تک آنے لگی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا...... ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ یہ کہتے ہوئے پیچھے ہونے لگا اور کسی چیز سے ٹکرا کر خوف سے چلاتے ہوئے نیچے گر گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"ڈیوڈ...... ڈیوڈ! کیا ہو گیا؟ تم ٹھیک تو ہو؟" رچرڈ کی آواز سنائی دی۔

ڈیوڈ نے جلدی سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ سامنے رچرڈ پریشان کھڑا تھا۔

"کیا ہوا، رات کے اس پہر یہاں کھڑے کیوں چلا رہے ہو؟" رچرڈ نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر بھی پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔

"وہ...... وہ لیلینا...... وہاں......!" ڈیوڈ نے چمنی کی طرف اشارہ کیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

"کیا ہوا لیلینا کو؟ وہاں کیا ہے؟" رچرڈ نے چمنی پر نظر ڈالی۔

"وہ وہاں تھی اوپر...... اس کا چہرہ...... رچرڈ......! میرا یقین کرو...... لیلینا یہاں تھی۔" وہ اپنے حواس قابو میں نہیں رکھ پا رہا تھا۔

"ڈیوڈ! لیلینا اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔ باہر شور سن کر میں سب سے پہلے اس کے کمرے کی طرف ہی بھاگا تھا۔ چلو اندر چلو، یہاں بہت ٹھنڈ ہے۔ اندر چل کر بات کرتے ہیں۔" ڈیوڈ نے اسے تسلی دی اور اسے ساتھ لیے اندر چلا آیا۔

"یہ لو، پانی پیو۔ اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟" رچرڈ نے اسے پانی کا گلاس تھمایا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

"کیا میں لیلینا کو دیکھ سکتا ہوں؟" ڈیوڈ حواس بحال ہوتے ہی بولا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔" رچرڈ اسے خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہوئے لیلینا کے کمرے تک لے آیا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ لیلینا گہری نیند سو رہی تھی۔ رچرڈ نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔

"جب تم باہر آئے تو کیا یہ اس وقت بھی سو رہی تھی؟" ڈیوڈ بولا۔

"ہاں، میں اسے دیکھ کر ہی باہر نکلا تھا۔ ہوا کیا ہے آخر؟" رچرڈ فکرمند ہوا۔

"کچھ نہیں۔ شاید میں نیند میں تھا۔ معاف کرنا، بلاوجہ ہی تمہیں پریشان کر دیا۔" ڈیوڈ بولا۔



digest library.com

"کوئی بات نہیں، تم آرام کرو۔ بہت رات ہو گئی ہے۔" زرچرڈ نے اسے تسلی دی۔

ڈیوڈ سر ہلا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جو کچھ اس نے دیکھا، وہ خواب نہیں تھا۔ ضرور کوئی گڑبڑ تھی۔ اس نے اگلی صبح ہی فادر سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

## Year 1773

راج گڑھ۔ ہندوستان

شاہی دسترخوان سجا تو سب کو وہیں جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ رتناوتی بھی راگنی کے ہمراہ شاہی تناول خانے کی طرف چل پڑی۔ بالآخر اس کا اور کاویہ کا آمنا سامنا ہونے کا وقت آچکا تھا۔ وہ اعتماد کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ پاروتی وہاں سب کے ساتھ پہلے سے موجود تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر رتناوتی کا مہمانوں سے تعارف کروایا۔ رتناوتی، رادھا اور مہارانا پرتاپ سنگھ سے آشیرواد لینے کے بعد اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

پاروتی اب راگنی کا تعارف کروا رہی تھیں، اسی لمحے کمرے میں امرتا داخل ہوئی۔ شکنتلا بھی اپنی نشست سے کھڑی ہوگئی اور بڑھ چڑھ کر امرتا کا سب سے تعارف کروانے لگی۔ رتناوتی نے اپنی نشست پر بیٹھ کر وہاں موجود لوگوں پر تفصیلی نظر دوڑائی۔ کاویہ وہاں موجود نہیں تھا۔ صرف شاہی خاندان کے اہم لوگ ہی موجود تھے۔

"ہمارے سپوتر کاویہ بھی آچکے ہیں۔" اچانک رادھا کی آواز کمرے میں گونجی۔

کاویہ، روبندر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا شاید وہ دونوں سیر کے لیے باہر نکلے تھے۔ رتناوتی نے پلٹ کر اسے دیکھنے سے گریز کیا۔ ویسے بھی یہ شاہی آداب کے خلاف تھا۔ چند لمحوں بعد وہ ویسے ہی سب کے ساتھ آکر بیٹھ جاتا۔ اسے کسی راج کمار میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے برعکس شکنتلا نے فوراً ہی امرتا کا تعارف کاویہ سے کروایا۔ رتناوتی نے اپنی مسکراہٹ دبالی۔

امرتا سے ملنے کے بعد وہ راگنی سے ملا جو اب تک پاروتی کے ساتھ ہی کھڑی تھی اور یہ تعارفی سلسلہ ختم ہونے کے بعد وہ اپنی نشست کی طرف چلا آیا۔ آخر اسے بھی تو دیکھنا تھا، جس کی تعریفوں میں آس پاس کی ریاستوں کے راج کماروں نے زمین آسمان ایک کر رکھا تھا۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھنے لگا تو مان سنگھ نے خود آگے بڑھ کر رتناوتی کا تعارف کروانا شروع کردیا۔

"کاویہ! ان سے ملیے۔ یہ ہیں ہماری راج کماری رتناوتی!" کاویہ نے ان کے اشارے کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو رہی تھی۔ نیلی ساڑی میں لپٹا اس کا وہ متناسب جسم، سونے جیسی رنگت اور کمر سے نیچے تک جھولتے اس کے گھنے سیاہ بال ایک ہی لمحے میں اس کے دل کی دنیا اتھل پتھل کر گئے۔ مزید قیامت ان کاجل بھری کٹھئی آنکھوں نے ڈھائی۔ اس نے معمولی سے زیورات پہن رکھے تھے۔ شاید گلے میں ایک نازک سی مالا اور ہاتھوں میں چند کڑے۔ اس کا چہرہ بناؤ سنگار سے پاک تھا۔ شاید وہ اپنے حسن سے باخبر تھی۔ وہ جو یہ سوچ کر آیا تھا کہ اپنا رعب ڈالنے کے لیے وہ اسے نظر انداز کرے گا، اب اسے بنا پلکیں جھپکائے تک رہا تھا۔

نہ جانے مان سنگھ اور کیا کہہ رہے تھے، وہ سن ہی کہاں رہا تھا۔ وہ تو ایک اپسرا کو دیکھنے میں مگن تھا جس کی تعریفیں اس کے سامنے سارا زمانہ کرتا رہا۔ اب اسے سمجھ آرہا تھا کہ لوگ رتناوتی کے لیے آہیں کیوں بھرتے تھے۔

رتناوتی شاید سر کے اشارے سے اسے پرنام کر رہی تھی۔ اچانک رادھا نے اس کا بازو پکڑا۔ اسے ہوش آیا۔ وہ بھی سر کے اشارے سے اسے جواب دے کر اپنی ماں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ رتناوتی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ تاثرات اس کے لیے نئے نہیں تھے۔ اسے عادت ہو چکی تھی۔ اکثر لوگ اسے دیکھ کر اسی طرح مرعوب ہو جاتے تھے۔ وہ اپنی نشست پر آبیٹھی۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔

وہ ریاستی معاملات کے حوالے سے کی جانے والی گفتگو میں اپنے پتاجی کا ساتھ دیتی رہی۔ مہارانا پرتاپ سنگھ اس کی دور اندیشی سے کافی متاثر ہوئے۔ کاویہ نے بھی گفتگو میں حصہ لینا شروع کردیا شاید یہی ایک طریقہ تھا اسے مخاطب کرنے کا۔ وہ نہ صرف ریاستی بلکہ خارجی اور تجارتی معاملات میں بھی بہت اہم مشورے دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ کھانا ختم ہونے تک وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

پاروتی کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی مگر شکنتلا بار بار پہلو بدل رہی تھیں۔ ان کے ہزار دفعہ سمجھانے کے باوجود بھی امرتا نے ریاستی معاملات میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی اور نہ ہی وہ کبھی اس طرح کی گفتگو میں حصہ لیتی تھی۔ اس کے نزدیک لڑکیوں کے لیے بناؤ سنگار کرنا اور تعلیم حاصل کرنا ہی اہم تھا۔

بہرحال انہیں ایک اطمینان تو تھا کہ رتناوتی ہمیشہ کی طرح اس رشتے سے بھی انکار کرنے والی تھی اور پھر یہ رشتہ یقیناً امرتا کے لیے قبول کرلیا جاتا۔ رتناوتی ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی۔ اس کے معیار پر بھی کوئی پورا نہیں اترا تھا۔ شکنتلا کی نظر میں وہ ایک مغرور اور خود پسند لڑکی تھی مگر یہی لڑکی سب کو ہمیشہ پسند آجاتی تھی۔ انہیں ماضی میں لوٹائے جانے والے رشتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا مگر راجپوتوں کی شان سے وہ اچھی طرح واقف تھیں۔ اس لیے اس بار انہیں رتناوتی کچھ زیادہ ہی کھل رہی تھی۔

کھانے کے بعد سب آرام کی غرض سے اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دیے۔ شام کو دوبارہ ملاقات ہوتی۔ اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے امرتا کو اپنے کمرے میں بلوا بھیجا۔ وہ اسے شام سے پہلے کچھ اہم باتیں سمجھانا چاہتی تھیں تاکہ وہ کادیہ کو اپنی طرف مائل کرسکے۔ امرتا جو آرام کی غرض سے بستر پر نیم دراز تھی، ماں کا پیغام سن کر بیزاری سے اٹھ بیٹھی۔

”ماتا جی بھی نا...... جاؤ، انہیں کہو ہم کچھ دیر میں آرہے ہیں۔“ اس نے کنیز کو وہاں سے چلتا کیا اور دوبارہ سے اپنے بستر پر نیم دراز ہوگئی۔

انہیں قلعے کے اس شاندار محل میں رہائش اختیار کیے بہ مشکل ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ مہمان بھی ساتھ ہی چلے آئے تھے۔ وہ صحیح طرح سے محل اور آس پاس کے علاقے کا جائزہ بھی نہیں لے سکی تھی۔ یہ ایک ہفتہ تو اس نے اپنے کمرے کے شاہانہ طرز کے تزئین و آرائش پر صرف کیا تھا۔ ابھی تو وہ پوری طرح اس سے بھی لطف اندوز نہیں ہوئی تھی۔ اوپر سے پتا جی کے حکم کے مطابق ایک ہفتے تک روز سورج نکلنے سے پہلے تمام شاہی خاندان کا راج مندر میں جمع ہوکر سورئے نمشکار کرنا بھی ضروری تھا۔ اس کی نیند بھی ٹھیک طرح سے پوری نہیں ہو پا رہی تھی۔ آج سورئے نمشکار کا ایک ہفتہ مکمل ہوا تو مہمانوں کی آمد کی وجہ سے جلدی اٹھنا پڑا اور اب بھی اسے نیند پوری کرنے کے بجائے کادیہ کو رجھانے کے طریقے سیکھنے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کچھ بھی کرلے، کادیہ نے رتناوتی کو ہی پسند کرنا تھا مگر اس کی ماتا شری کو کون سمجھاتا۔

اس نے کوفت سے سر جھٹکا اور بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ بستر سے نیچے اترتی، اسے اپنی مسہری کے نیچے حرکت کا احساس ہوا۔ وہ بے اختیار ہی مسہری کے نیچے جھانکنے پر مجبور ہوئی مگر نیچے کا منظر دیکھ کر اس کے حلق سے

ایک روح فرسا چیخ بلند ہوئی۔ اس کے کمرے کے دروازے کے باہر موجود پہرے دار اور کنیزیں دوڑتے ہوئے اندر آئے مگر ان کے قدم کمرے میں داخل ہوتے ہی جم چکے تھے۔ وہ سنہری رنگ کا ایک دیوقامت اژدہا تھا جو راج کماری کی مسہری کے نیچے سے نکل کر مسہری کے چاروں طرف لٹکے پردوں پر لپٹتا چلا جارہا تھا مگر ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

راج کماری کی مسہری چاروں طرف سے اس کے نرغے میں تھی اور امرتا کا اس کے چنگل سے نکلنا ناممکن نظر آرہا تھا۔ اژدہے کی پھنکاریں پورے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ کنیزوں نے بھی یہ منظر دیکھ کر چلانا شروع کردیا۔

شور سن کر رویندر دوڑتا ہوا امرتا کے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کے قدم بھی جم گئے مگر بہن کی جان خطرے میں دیکھ کر اس کے ذہن نے فوری کام کرنا شروع کیا۔ اس نے لمحے کی دیر کیے بغیر میان سے اپنی تلوار نکالی اور پہرے داروں کو حملہ کرنے کا حکم دے کر خود آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ اژدہا پھنکارتا ہوا رویندر کی طرف لپکا۔ ساتھ ہی اس نے مسہری کے گرد اپنا گھیرا مزید تنگ کردیا۔ رویندر اور پہرے دار اس کے وار سے بچتے بچاتے اس پر حملہ کرنے کی کوشش کررہے تھے مگر وہ مسلسل اپنا پھن نکالے ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔

یہ شور سن کر نہ صرف رتناوتی اور راگنی بلکہ کادیہ بھی اس کمرے کی طرف دوڑے۔ شکنتلا جو امرتا کا انتظار کررہی تھیں، اس کی نیند پوری کرنے کی عادت کو جانتے ہوئے خود ہی اس کے کمرے کی طرف چل پڑیں۔ اس افراتفری کو دیکھ کر ان کا دل بھی دہل گیا۔ سب امرتا کے کمرے کی طرف دوڑ رہے تھے اور اس کے کمرے سے مسلسل اس کی اور کنیزوں کی چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ انہوں نے دوڑنا شروع کردیا۔ ایک طرف سے مان سنگھ اور پاروتی بھی اسی طرف دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ ان کے من میں عجیب وسوسے جنم لینے لگے۔

”کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے چلّا کر پوچھا۔

ایسا لگ رہا تھا سارا محل ہی امرتا کے کمرے میں جمع ہوگیا ہو۔ پرتاپ سنگھ اور رادھا بھی حالات سے بے خبر سب کی پیروی کرتے ہوئے امرتا کے کمرے تک پہنچے اور وہاں موجود منظر دیکھ کر ان کا سانس بھی رک گیا۔ اس قدر لمبا اور دیوقامت اژدہا تو انہوں نے ساری زندگی نہیں دیکھا تھا۔ رویندر، کادیہ اور رتناوتی تلوار ہاتھ میں تھامے محل



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

کے سپاہیوں کے ساتھ اس پر حملہ آور ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ امرتا اپنی مسہری پر بے ہوش ہو کر پڑی تھی۔ مان سنگھ اور پرتاپ سنگھ نے بھی ان تینوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔

"تم دونوں پیچھے کی طرف جاؤ۔ میں سامنے سے وار کرتا ہوں۔" کاویہ نے رویندر اور رتناوتی کو اشارہ کیا۔

وہ دونوں اس کی دُم کی طرف بڑھے تو اژدہے کا دھیان ان دونوں کی طرف چلا گیا۔ وہ ان پر حملہ کرنے پلٹا تو کاویہ نے اس کی گردن پر وار کر دیا۔ زخمی اژدہا پھنکارتا ہوا کاویہ کی طرف پلٹا اور مسہری کو اپنے بل سے آزاد کر کے کاویہ کے جسم کے اردگرد لپٹ گیا۔

"کاویہ.....!" رادھا نے چلّانا شروع کر دیا۔ وہ سب اژدہے پر ایک ساتھ حملہ کرنے لگے مگر اژدہا کاویہ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اژدہے نے اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کاویہ کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا مگر اس کا ذہن کام کر رہا تھا۔ بس ایک بار ہمت کرنا تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی تلوار پوری قوت سے چلائی۔ اژدہے کا پھن کٹ کر دور جا گرا۔

اژدہے نے تڑپتے ہوئے کاویہ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور چاروں طرف اپنا سر مارنے لگا۔ کمرے میں لگا فانوس اس کے سر سے ٹکرا کر نیچے آ گرا۔ چاروں طرف باریک کانچ کے ٹکڑے بکھر گئے۔ جہاں اس کا سر لگتا، وہاں رکھا سامان ٹوٹ کر نیچے گر جاتا۔

"سب کمرے سے باہر نکل جائیں۔ رویندر! تم امرتا کو فوراً اٹھاؤ۔" رتناوتی چلّائی۔

کاویہ بھی لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ رویندر نے دوڑ کر امرتا کو اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ مان سنگھ نے وہاں کھڑے باقی افراد کو بھی کمرے سے باہر جانے کا حکم دیا۔ اژدہا زخمی ہو کر مزید خطرناک ہو چکا تھا۔

اچانک اژدہا تیزی سے رتناوتی کی طرف بڑھا اور اس کے اردگرد لپٹ گیا۔ وہ چاہ کر بھی خود کو آزاد نہیں کروا پا رہی تھی۔ اژدہے نے اپنا منہ کھول لیا تھا۔ شاید وہ اسے سالم نگلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ مان سنگھ تیزی سے اژدہے کی طرف بڑھے مگر اژدہے نے اپنی دُم کے ذریعے انہیں دور پھینک دیا۔

رتناوتی کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اژدہے نے منہ کھول لیا تھا مگر اچانک ہی کاویہ کی تلوار بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آئی۔ وہ جست لگا کر اژدہے کی طرف بڑھا اور اژدہے کا سر کٹ کر دور جا گرا۔ رتناوتی پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ وہ نیچے گرنے لگی تو کاویہ نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

اژدہے کا جسم چند لمحے تڑپتا رہا اور پھر بے جان ہو کر گر پڑا۔ وہ سب سُن کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتے، اچانک اژدہے کے مردہ جسم میں خود بخود آگ بھڑک اٹھی۔

"جلدی کرو...... باہر نکلو۔" پرتاپ سنگھ چلّائے۔

وہ سب دوڑتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔

کمرے میں شدید بو پھیل چکی تھی۔ چاروں طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ محل کے خادم اور پہرے دار آگ بجھانے کے لیے پانی لے کر کمرے میں داخل ہو گئے۔

"کاویہ! آپ ٹھیک تو ہیں؟" رادھا بے اختیار ہی کاویہ کی طرف بڑھیں۔ اس نے سر ہلا کر اپنی خیریت سے انہیں آگاہ کیا اور تسلی دی۔

شکنتلا، رویندر کے ساتھ امرتا کو تھامے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں جبکہ رانی، پاروتی کے ساتھ کمرے کے باہر ہی کھڑی تھیں۔ آگ بجھی تو وہ سب کمرے میں ایک ساتھ داخل ہوئے۔ وہاں اژدہے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آگ جلنے کی وجہ سے کمرے میں کافی نقصان ہو گیا تھا۔

"وہ اژدہا کہاں گیا؟" پرتاپ سنگھ حیرت سے بولے۔

"حضور! ہمیں بھی نہیں معلوم۔ ہم نے آگ بجھائی تو کمرے میں کچھ نہیں تھا۔" ایک سپاہی بولا۔

"حیرت ہے۔ آگ تو اژدہے کے جسم کو ہی لگی تھی۔ اس کا جلا ہوا جسم تو ملتا۔" پرتاپ سنگھ کی حیرت ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

"چلیں، میری آرام گاہ میں چلتے ہیں، وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ کاویہ! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" مان سنگھ نے بات کو وہیں ختم کرنا مناسب سمجھا ورنہ محل کے خادم بات کو بڑھا چڑھا کر ایک دوسرے سے بیان کرتے اور نتیجتاً خوف و ہراس پھیل جاتا۔

"جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" کاویہ نے انہیں اطمینان دلایا۔

"ہم آپ کا یہ احسان جیون بھر نہیں بھولیں گے۔ آپ نے ہماری سپوتری کی جان اس اژدہے سے بچائی۔" وہ رتناوتی کو خود سے لگاتے ہوئے مشکور لہجے میں بولے۔

"یہ خود بہت بہادر ہیں۔ میں نے بس ان کی مدد کی ہے۔" کاویہ مسکرایا۔



Scanned with CamScanner

رتناوتی خاموشی سے اسے تکتی رہی۔ یہ سچ تھا کہ وہ اس کی بہادری کی قائل ہوگئی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پرائی آگ میں اس طرح کودنے کو کبھی ترجیح نہ دیتا۔ خاص طور پر جب وہ کہیں مہمان بھی ہوتا۔

وہ سب مان سنگھ کی آرام گاہ کی طرف بڑھ گئے جبکہ پاروتی، راگنی کو لیے اس کی آرام گاہ کی طرف چلی گئیں۔ وہ کافی خوفزدہ تھی اور اکیلے جانے کو تیار نہ تھی۔ حالانکہ اس کے کمرے میں کنیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔

رویندر بھی امرتا کو شکنتلا کے کمرے میں چھوڑ کر وہیں چلا آیا۔ کمرے میں مان سنگھ کے علاوہ پرتاپ سنگھ، رادھا، کاویہ، رتناوتی اور آدیش موجود تھا جو خبر ملتے ہی فوراً محل پہنچا تھا۔

''کیسی ہے امرتا؟'' رتناوتی نے اسے دیکھ کر سوال کیا۔

''ابھی ہوش میں نہیں آئی ہے۔ شاہی طبیب آچکے ہیں۔ امید ہے جلد ہوش آجائے گا۔'' رویندر بولا۔

''محل میں یہ اژدہا کیسے داخل ہوا آدیش! اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ وہ امرتا کے کمرے میں کیسے پہنچا؟'' مان سنگھ بالآخر آدیش کی طرف پلٹے۔

''حضور! میں خود نہیں جانتا۔ اتنے بڑے اژدہے کا کسی کی نظروں سے گزرے بغیر محل میں داخل ہونا اچنبھا ہے اور پھر راج کماری کے کمرے میں ایسی کوئی کھڑکی یا جھروکا نہیں جہاں سے اتنا بڑا اژدہا اس کمرے کے اندر داخل ہوسکے۔'' آدیش بھی پریشان تھا۔

''کیسے داخل ہوا، یہ تو ہم بعد میں بھی سوچ سکتے ہیں مگر مجھے حیرت اس بات پر ہورہی ہے کہ وہ غائب کہاں ہوگیا؟ ہم نے خود اس کے جسم میں آگ لگتے دیکھی تھی اور کمرے میں دھواں بھرنے کے بعد اس کا کوئی اتا پتا نہ چلا۔'' مہارانا پرتاپ سنگھ ابھی تک اس انہونی پر حیران تھے۔

''حضور! آپ جانتے ہیں اس قلعے اور محل کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ راجا بھگونت سنگھ کے راج کے وقت بھی ایسے ہی واقعات مشہور ہوئے تھے۔'' آدیش دھیمے لہجے میں بولا۔

''میں ان سب باتوں میں وشواس نہیں رکھتا۔ اتنی بڑی جگہ پر کسی کی بھی نظر ہوسکتی ہے۔ میں اپنے پرکھوں کی زمین کسی کے جادو ٹونے کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتا اور ہم نے راج گرو سے اجازت اور آشیرواد لینے کے بعد ہی یہاں رہائش اختیار کی تھی۔ تم چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر فوراً راج گرو کی کٹیا کی طرف روانہ ہوجاؤ اور انہیں اس گھٹنا کے بارے میں بتاؤ۔ وہ ضرور کوئی اپائے بتائیں گے۔'' مان سنگھ سنجیدگی سے بولے۔

''جی حضور! میں ابھی روانہ ہوجاتا ہوں۔'' آدیش یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ مزید بات کرنے کا فائدہ نہیں تھا اور ویسے بھی مہمانوں کے سامنے وہ اس بات پر زیادہ زور نہیں دینا چاہتا تھا۔

''مجھے لگتا ہے آدیش کی بات ٹھیک ہے۔ ہم نے بھی اپنے پرکھوں سے اس قلعے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ آپ کو یہاں مہا پوجا کروانی چاہیے۔'' پرتاپ سنگھ نے مشورہ دیا۔

''ہم نے اس قلعے کی تعمیر دوبارہ شروع کروانے اور یہاں رہائش اختیار کرنے سے پہلے مہا پوجا رکھوائی تھی۔ رہائش اختیار کرنے کے بعد جو مہا پوجا ہونی تھی، اس کے لیے ہم آپ کا انتظار کررہے تھے۔ ہم کل ہی مہا پوجا کے انتظامات کرواتے ہیں۔ بھگوان کی کرپا رہی تو کوئی شکتی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔'' مان سنگھ بولے۔

''آپ کی آگیا ہو تو مہا پوجا کے ساتھ ہم ایک اہم ذمے داری سے بھی مکت ہوجائیں؟'' پرتاپ سنگھ نے رادھا کے اشارہ کرنے پر بات کو دوسرا رخ دیا۔

''کون سی ذمے داری؟'' مان سنگھ کو ان کی بات سمجھ نہیں آئی۔

''ہم یہاں رتناوتی اور کاویہ کے دیواہ کی بات کرنے آئے تھے۔ ہمارے سپوتر کے دل کا حال اس کی آنکھوں سے نظر آرہا ہے۔ آپ بھی مہارانی پاروتی جی سے مشورہ کرکے ہمیں جواب دے دیں تو کل مہا پوجا کے شبھ موقعے پر ہم ان دونوں کے دیواہ کا اعلان کردیں گے۔ ہمارے راج پنڈت بھی آج رات یہاں پہنچ رہے ہیں۔ ان دونوں کی کنڈلیاں دیکھنے کے بعد دیواہ کی تاریخ بھی طے ہوجائے گی۔'' پرتاپ سنگھ نے تو جیسے اپنی طرف سے رشتہ طے کردیا۔ کاویہ نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

رتناوتی ان کی بات سن کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''میرے لیے تو بہت سو بھاگیہ کی بات ہے کہ کاویہ جیسا بہادر اور سمجھ دار نوجوان رتناوتی کے جیون کا ساتھی بنے۔ میں پاروتی اور رتناوتی سے مشورہ کرکے آپ کو جواب دوں گا۔'' مان سنگھ کو کاویہ بہت پسند آیا تھا مگر وہ رتناوتی کی مرضی کے بغیر کوئی بھی فیصلہ نہیں لینا چاہتے تھے۔

''آپ ضرور مشورہ کریں۔ ہمیں جواب کا انتظار رہے گا۔'' رادھا بولیں۔

''حضور! تمام کمروں کی جانچ مکمل ہوچکی ہے۔ محل

digest library.com



Scanned with CamScanner

ہر طرح سے محفوظ ہے۔" اسی اثنا میں ایک سپاہی نے اندر داخل ہو کر انہیں اطلاع دی۔ آدیش کے پہنچنے پر محل کے تمام کمروں کی دوبارہ سے جانچ پڑتال کی گئی تھی تاکہ مہمانوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے۔

"ٹھیک ہے۔ آپ لوگ آرام کریں۔ شام کو ملاقات ہوگی۔" مان سنگھ بولے اور پرتاپ سنگھ اپنی پتنی اور کاویہ سمیت اپنے کمروں کی طرف چل دیے۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، کاویہ اور رتناوتی کا جوڑ ٹھیک رہے گا؟" مان سنگھ نے ان کے جانے کے بعد رویندر سے سوال کیا۔

"پتا شری! اگر رتناوتی کو کوئی اعتراض نہیں تو یہ بندھن ایک بہترین جوڑ ثابت ہوگا۔ کاویہ بہادر اور ذہین ہے اور راجپوتوں کا تخت اسے ہی سنبھالنا ہے۔ اس رشتے سے ہمارے قدم ہندوستان میں مزید مضبوط ہو جائیں گے۔" رویندر بولا۔

"ہم...... تم بھی آرام کرو۔ میں امرتا کی خیریت معلوم کرتا ہوں۔" وہ بولے۔

رویندر سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ شکنتلا کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

امرتا اب تک بے ہوش تھی مگر شاہی طبیب کے مطابق اسے جلد ہی ہوش آجاتا۔ اس کے جسم پر کسی زخم یا کھروچ کے نشان نہیں تھے۔ وہاں سے مطمئن ہو کر وہ پاروتی کے کمرے میں چلے آئے۔ انہیں کاویہ اور رتناوتی کے رشتے کی بات کرنا تھی۔ پاروتی کو کاویہ پہلی ہی نظر میں پسند آیا تھا لہٰذا انہوں نے فوراً ہی آمادگی ظاہر کر دی مگر رتناوتی سے پوچھنا بھی بہت ضروری تھا لہٰذا وہ دونوں پتی پتنی ایک ساتھ ہی رتناوتی کی مرضی معلوم کرنے کے لیے اس کے کمرے میں پہنچے۔ وہ چونکہ پرتاپ سنگھ کی باتیں اپنے کانوں سے سن چکی تھی لہٰذا خود کو ذہنی طور پر اس صورت حال کے لیے تیار کر چکی تھی۔

کاویہ ایک دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے دوران اسے اس کی ذہانت کا اندازہ بھی ہوا تھا۔ وہ ریاستی اور تجارتی معاملات میں کافی دلچسپی رکھتا تھا اور اس کی معلومات بھی وسیع تھیں۔ ساتھ ہی وہ اس کی بہادری کے جوہر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ اس رشتے سے مان سنگھ کے قدم ہندوستان میں مضبوطی سے جم جاتے۔

اسے کاویہ کے رشتے سے انکار کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ نظر نہیں آئی۔ اسے ایسے ہی جیون ساتھی کی تلاش تھی جو ہر طرح کے حالات میں اس کے شانہ بشانہ کھڑا رہتا۔ لہٰذا اس نے مان سنگھ کو اس رشتے کے لیے اپنی رضامندی دے دی۔

مان سنگھ اور پاروتی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ انہوں نے شام کا انتظار کیے بغیر پرتاپ سنگھ کو اپنی رضامندی کا پیغام بھیج دیا۔ محل میں جو خوف و ہراس اژدہے کے ظاہر ہونے سے پھیلا تھا، وہاں اچانک ہی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شاہی باورچی خانے میں بڑے پیمانے پر مٹھائیوں کی تیاری شروع کی جا چکی تھی۔

راجپوتوں کے راج پنڈت بھی رات تک پہنچ جاتے مگر مان سنگھ نے اپنی ریاست کے راج پنڈت کو جو کہ قلعے کے راج مندر میں مقیم تھے، بلوا بھیجا۔ ان کے مطابق کاویہ اور رتناوتی کی کنڈلیوں کے سارے گن مل رہے تھے اور یہ ایک شبھ دیواہ ثابت ہونے والا تھا۔ مان سنگھ ایک طرح سے بے فکر ہو گئے۔

شام کے کھانے پر خاص اہتمام کیا گیا۔ شکنتلا کو اڑتی اڑتی خبر ملی تو وہ تلملا کر رہ گئیں۔ امرتا کو کاویہ کو اپنی طرف مائل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور یہاں رتناوتی نے آناً فاناً اس رشتے کے لیے "ہاں" کر دی تھی۔ کہاں وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ امرتا کے ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے اسے سخت سنائیں۔ وہ حیران پریشان ان کی باتیں سنتی رہی۔ اس کے دل و دماغ پر اس خوفناک حادثے کی یادداشت تازہ تھی۔ بجائے اس کے کہ کوئی اس سے ہمدردی کرتا، یہاں محل میں شادیانے بجانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ اوپر سے اسی کو سخت سست اور بے وقوف جیسے القابات سے بھی نوازا گیا۔

شکنتلا اسے سنا کر کمرے سے جا چکی تھیں۔ اسے بے تحاشا غصہ آیا۔ اسے رتناوتی سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ پسند تو وہ اسے پہلے بھی نہیں رہی تھی مگر رتناوتی سے اس قدر شدید نفرت کا احساس اسے پہلی دفعہ ہوا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کاویہ کو دل دے بیٹھی تھی مگر اس کے ساتھ پیش آنے والے اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی ہمیشہ کی طرح سب کی توجہ کا مرکز رتناوتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ شکنتلا کے مطابق امرتا کو سب ڈرپوک اور بے وقوف تصور کر رہے تھے۔ اس پر اسے مزید آگ تب لگی جب اسے رات کے کھانے پر اچھی طرح تیار ہو کر آنے کا حکم ملا تھا۔ اس کا خون کافی دیر کھولتا رہا مگر اب وہ کسی بھی قسم کا جذباتی قدم اٹھا کر خود کو مزید نیچا ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا خاموشی سے تیاری میں مصروف ہو گئی۔



Scanned with CamScanner

رات کے کھانے کی محفل میں بھی تو مان سنگھ کی خوشی دیدنی تھی۔ راجپوتوں کے راج پنڈت نے بھی کاویہ اور رتناوتی کی جنم کنڈلیوں کے سارے گن ملنے کی گھوشنا کردی تھی اور تین ماہ بعد بہار کی آمد کے ساتھ ہی کاویہ اور رتناوتی کو ویواہ کے بندھن میں باندھ دیا جاتا۔ رتناوتی کے چہرے پر کئی رنگ بکھیلے تھے۔ دوسری طرف شکنتلا اور امرتا خاموش اور سنجیدہ بیٹھی تھیں۔ جو بھی امرتا کی طبیعت دریافت کرتا یا ہمدردی کرتا، امرتا روکھا سا جواب دے کر خاموش ہو جاتی۔ وہ رتناوتی کے بہادری کے جوہر دکھانے کے ناٹک کی وجہ سے سب کے لیے قابلِ ترس بن چکی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کھانے کے تھال الٹ کر وہاں سے چلی جائے۔ کاویہ کی وہ محبت لٹاتی، معنی خیز نظریں جو رتناوتی کا احاطہ کیے ہوئے تھیں، امرتا کو بری طرح چبھ رہی تھیں۔

''میں بھی دیکھتی ہوں یہ ویواہ کیسے ممکن ہوتا ہے۔ رتناوتی! یہ میرا وعدہ ہے کہ تم کبھی کاویہ کی پتنی نہیں بن سکو گی۔'' امرتا نے رادھا کو رتناوتی کے ہاتھوں میں ہیرے جواہرات جڑے خاندانی کڑے ڈالتے دیکھ کر دل میں یہ عہد کرلیا۔

اسی دوران آدیش بھی لوٹ آیا۔ اس نے مان سنگھ کو خبر دی کہ راج گرو کل صبح خود قلعے میں ہونے والی مہا پوجا میں شامل ہوں گے اور قلعے کو نحوستوں سے پاک کردیں گے۔ یہ بات سن کر سب ہی خوش ہو گئے تھے کیونکہ کاویہ اور رتناوتی کو راج گرو کا آشیرواد جو ملنے والا تھا۔ جو راج گرو کا آشیرواد پالیتا اس کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرسکتا تھا۔

☆☆☆

**Year 1773**

**اسکاٹ لینڈ۔لندن**

امتحانات کے نتائج آچکے تھے۔ وہ سب صبح سویرے ہی انسٹی ٹیوٹ پہنچے تھے۔ نتائج کو انسٹی ٹیوٹ کے باہر ایک تختی پر چسپاں کیا گیا تھا۔ وہ تینوں ایک طرف کھڑے رش کے ختم ہونے کا انتظار کررہے تھے۔ بالآخر انہیں موقع مل ہی گیا۔ وہ تینوں ملی جلی کیفیات کے ساتھ آگے بڑھے۔ آخر کار ان تینوں کو اپنا نام ان بیس خوش قسمت ترین طالب علموں کے ساتھ لکھا نظر آیا جو کامیاب ہو کر انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم جاری رکھنے والے تھے۔ ازابیلا کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اس کی اس کامیابی کا سہرا آرتھر کے سر تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا اور اسے تمام مضامین الگ سے وقت لگا کر نہ سمجھاتا تو وہ یقیناً اس امتحان میں ناکام ہو جاتی۔ اس نے خاص طور پر آرتھر کے گلے لگ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ آرتھر کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔ ایک طرف تو وہ خود بھی اس امتحان کو کامیابی سے پار کر چکا تھا اور دوسری طرف اس کے دونوں بہترین دوست بھی اس کے ساتھ آگے بڑھنے والے تھے۔

''میں بھی اسی طرح کی مبارک باد کا حقدار ہوں۔ میرا نام سب سے اوپر لکھا ہے، یعنی میں پہلے درجے پر آیا ہوں۔'' الیگزینڈر نے کندھے اچکائے۔

''اوہ، ہاں...... تمہیں بھی بہت بہت مبارک ہو۔'' ازابیلا نے خلوص سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ الیگزینڈر نے خاموشی سے اس کا ہاتھ تھاما اور مسکرا کر شکریہ کہہ دیا۔ جبکہ آرتھر اس سے بغلگیر ہوگیا۔ وہ تینوں ایک ساتھ انسٹی ٹیوٹ کے اندر داخل ہوئے۔

وہاں تمام پروفیسرز ماسوائے فادر تھامس کے، موجود تھے۔ سب نے ہی انہیں مبارک باد دی۔ کامیاب ہونے والوں کو ہال کی طرف جانے کی ہدایت کی جارہی تھی۔ وہ تینوں بھی اسی ہال میں چلے آئے جہاں بیٹھ کر وہ لیکچر لیا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہال میں فادر تھامس باقی پروفیسرز کے ساتھ داخل ہوئے۔ تمام پروفیسرز نے انہیں نیا نظام الاوقات دیا۔ مضامین کی تعداد کم ہو چکی تھی اور اب نظریاتی تعلیم کے بجائے عملی تجربات پر زیادہ زور دیا جارہا تھا۔

انہیں مردہ جسم کے عمل جراحی، آسیب زدہ علاقوں کے دورے اور ایگزارسزم جیسے خطرناک عمل میں اپنے استادوں کے ساتھ کھڑے رہنا تھا۔ یعنی اب وہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں سے ایک بہترین ایگزارسسٹ بننے کا سفر شروع ہوتا تھا۔

آخر میں فادر تھامس کی باری تھی۔ ایگزارسزم کے تجربات انہی کی زیرِ نگرانی تکمیل دیے جانے تھے۔ انہوں نے سب کو مبارک باد دینے کے بعد ہال پر نظر دوڑائی اور بالآخران کی نظر الیگزینڈر پر ٹھہر گئی۔

''تم نوجوان! کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟'' فادر تھامس نے اسے پکارا۔

''الیگزینڈر...... فادر!'' وہ اپنی نشست پر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''تم اول درجے پر ہو۔ مبارک ہو تمہیں۔ تمہارے کاندھوں پر یہ بھاری ذمے داری عائد کی جارہی ہے کہ اب سے تم میرے اسسٹنٹ کے طور پر میرے ساتھ رہو گے۔ میری غیر موجودگی میں میرے آفس کے انتظامات اور لیکچر



digestlibrary.com
Scanned with CamScanner

سے متعلق ساری معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری تمہاری ہے اور اس کے علاوہ......" انہوں نے ہال پر دوبارہ نظر دوڑائی۔

"تم نوجوان! کھڑے ہو جاؤ اور اپنا نام دوبارہ بتاؤ۔" وہ آرتھر سے مخاطب تھے۔ وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

"فادر! میرا نام آرتھر نیسلن ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ہم...... آرتھر! تم بھی بطور مددگار الیگزینڈر کے ساتھ رہو گے۔ میرے معاملات کی دیکھ بھال کسی ایک کے بس کی بات نہیں اور تم دونوں کو میں نے یہ ذمے داری اس لیے سونپی ہے کہ الیگزینڈر پہلے درجے پر ہے اور دوسرا تم نے میرے لیکچرز کے دوران سب سے بہترین سوالات پوچھے۔ باقی سب کو بھی انسٹی ٹیوٹ کے حوالے سے وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی ذمے داری سونپی جائے گی۔ جو طالب علم رہ گئے ہیں، وہ یہاں موجود باقی پروفیسرز سے اپنی ذمے داریوں کی تفصیلات حاصل کر سکتے ہیں۔" فادر تھامس نے ہال میں بیٹھے دوسرے طالب علموں پر نظر ڈالی۔

"بہت شکریہ فادر!" الیگزینڈر اور آرتھر نے ایک ساتھ ہی ان کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے لیے تو یہ ہی بہت تھا کہ انہیں فادر تھامس کی صورت میں ایک بہترین معلم ملا تھا مگر اب وہ ان کے اسسٹنٹ کے طور پر ہمیشہ ان کے ساتھ رہنے والے تھے۔ اس سے بڑی خوش نصیبی اور بھلا کیا ہو سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ان میں انعامات کی تقسیم کی گئی اور اس کے بعد تمام طالب علم اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے مگر وہ تینوں انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں چلے آئے۔

"آرتھر! میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں۔ تمہارے سوال ہمیشہ بہت اہم ہوتے تھے۔ میں جانتی تھی کہ تم ضرور فادر تھامس کی نظروں میں آؤ گے۔ دیکھو، آج انہوں نے تمہیں اپنا اسسٹنٹ چن لیا ہے۔" ازابیلا کے چہرے پر حقیقی خوشی تھی۔ الیگزینڈر کے چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا۔

"بہت شکریہ! مجھے تو الیگزینڈر کی دوستی پر فخر ہے کہ اتنا ذہین اور قابل شخص ہمارا دوست ہے۔ ہمیں الیگزینڈر سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔" آرتھر جلدی سے بولا۔ شاید اس نے الیگزینڈر کی خاموشی کو محسوس کر لیا تھا۔

"ہاں، بالکل۔ الیگزینڈر کی قابلیت کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ آخر وہ امتحانات میں پہلے درجے پر آیا ہے۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ اسی خوشی میں تم دونوں آنے والے ہفتے کے دن میرے گھر دعوت پر مدعو ہو۔" ازابیلا اپنی غلطی محسوس کر کے جلدی سے بولی۔

"ارے نہیں۔ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں ویسے بھی کافی مصروف رہتا ہوں۔ تم لوگوں کو بلاوجہ تکلیف ہوگی اور جس جگہ میرا قیام ہے، اگر اس علاقے میں رات کو پہنچنے میں دیر ہو جائے تو واپسی پر سواری ملنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔" الیگزینڈر نے سنجیدگی سے معذرت کر لی۔

"اس میں تکلف والی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم دوست ہیں اور میں تم لوگوں کے ساتھ اس خوشی کو بھرپور طریقے سے منانا چاہتی ہوں۔ تمہیں زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا، بلکہ میں چاہتی ہوں کہ تم لوگ صبح سے میرے گھر آ جاؤ اور میرے ساتھ کچن میں مدد کرواؤ۔ ہم مل کر پکائیں گے اور مل کر کھائیں گے۔ ہفتہ آنے میں ابھی پانچ دن باقی ہیں۔ جو بھی کام ہے، تم پہلے سے نمٹا لو کیونکہ اس کے بعد ہمیں ایسی دعوتوں کا وقت نہیں ملے گا۔ پھر سے ہمارے لیکچرز دوبارہ شروع ہو جائیں گے۔" ازابیلا نے اصرار کیا۔

"ازابیلا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بلکہ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہفتے کی رات تم میرے ساتھ گزارو۔ دن بھر ہم ازابیلا کے ساتھ کھانا بنائیں گے اور دعوت سے فراغت کے بعد تم میرے کمرے میں رات گزارنا۔ اس طرح واپسی پر دیر ہو جانے کی صورت میں تمہیں سواری کا مسئلہ بھی درپیش نہیں ہوگا۔" آرتھر نے فوراً ہی اس کے مسئلے کا حل پیش کیا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے آرتھر!" ازابیلا خوشی سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ میں ضرور آؤں گا۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ انسٹی ٹیوٹ خالی ہو چکا ہے۔" الیگزینڈر نے کندھے اچکائے۔ ان تینوں کو باتوں کے دوران وقت کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

وہ تینوں بھی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ آرتھر گھر پہنچا تو مسز مارتھا کو لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر اسے بے انتہا خوشی ہوئی۔ وہ واپس لوٹ آئی تھیں اور اس کے لیے بھی بہت سارے تحفے تحائف لے کر آئی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں آرتھر نے ان کے گھر کا پورا خیال رکھا تھا۔

گھر اور کچن صاف ستھری حالت میں تھے۔ مسز مارتھا نے اس کی بہت تعریف کی اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے کیک بیک کیا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ میں پانچ دن کی چھٹی تھی اور وہ یہ چھٹیاں بھرپور طریقے سے گزارنا چاہتا تھا۔

مسز مارتھا کے آنے سے گھر میں دوبارہ رونق ہو گئی تھی۔ وہ صبح جلدی اٹھ کر کچن میں ان کی مدد کرواتا اور پھر

ازابیلا کے والد کے ساتھ دکان پر جا کر بیٹھ جاتا۔ ان کی غیر موجودگی میں اسے ازابیلا کے گھر جانا مناسب نہیں لگتا تھا۔ وہ دکان پر ازابیلا کے والد کی مدد کرواتا اور ان سے گپیں بھی لگاتا پھر شام کو انہی کے ساتھ گھر لوٹتا اور جینیفر کی پڑھائی میں مدد کرتا۔ رات کو ان سب کے ساتھ کھانا کھاتا اور دیر تک گفتگو کرتا رہتا۔ مسز مارتھا بھی اس گفتگو کا حصہ ہوتیں۔ ازابیلا انہیں بلالاتی۔ جب تک ان کی انسٹی ٹیوٹ کی چھٹیاں تھیں، آرتھر اور مارتھا رات کا کھانا ان کے ساتھ ہی کھانے والے تھے۔ ازابیلا کے والد نے ان دونوں کو اس بات کے لیے بے حد اصرار کر کے منایا تھا۔ ان کے گھر کی تنہائی ختم ہو چکی تھی۔ اب ان کا گھر ہر شام ہی قہقہوں سے گونجنے لگتا۔ ان کا باورچی خانہ اشتہا انگیز خوشبوؤں سے مہکا رہتا۔ ازابیلا اور آرتھر مل کر مزیدار سا کھانا تیار کرتے اور پھر وہ سب خوشگوار ماحول میں کھانا تناول کرتے اور کافی سے لطف اندوز ہوتے۔

اس دن بھی آرتھر اور ازابیلا کچن میں کسی نئے تجربے میں مصروف تھے جب مسز مارتھا وعدے کے مطابق رات کے کھانے کے لیے ان کے گھر میں داخل ہوئیں۔

''آئیں مسز مارتھا!'' ازابیلا کے والد انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر حسب عادت اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ان کے ساتھ ہی لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''آج تو بڑی اچھی خوشبو آرہی ہے۔ لگتا ہے کچھ خاص تیار ہو رہا ہے۔'' مسز مارتھا نے باورچی خانے سے آنے والی اشتہا انگیز خوشبو کو گہری سانس لے کر اپنے اندر اتارا۔

''معلوم نہیں۔ یہ دونوں ہی لگے رہتے ہیں مگر جو بھی تیار کرتے ہیں، ہوتا بہت لذیذ ہے۔ آج ان کا دوست الیگزینڈر بھی کھانے پر مدعو ہے اسی وجہ سے خاص تیاری ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کو اس باورچی کو مستقل طور پر اپنے گھر رکھ لینا چاہیے؟'' مسز مارتھا نے اپنے دل کی بات کی۔ وہ بہت دنوں سے ازابیلا کی آنکھوں میں آرتھر کے لیے دلچسپی اور پسندیدگی دیکھ رہی تھیں مگر دوسری طرف آرتھر اس کے جذبات سے انجان اچھے دوستوں کی طرح اس کی مدد کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ بالآخر انہوں نے ہی ازابیلا کے والد سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک بار ان کی رضامندی معلوم ہو جاتی پھر وہ آرتھر سے خود بات کر لیتیں۔ آرتھر کے مطابق اس کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا تو اب اسے اپنا گھر بسانے پر غور کرنا چاہیے تھا۔ ازابیلا ہر لحاظ سے اس کے لیے موزوں تھی۔ وہ خوبصورت تھی، سمجھ دار تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اسے پسند بھی کرتی تھی۔ آرتھر کو بھی اپنا گھر مل جاتا اور ازابیلا کے والد کو ایک مضبوط سہارا۔

''کیا مطلب...... میں سمجھا نہیں؟'' وہ مسز مارتھا کی بات سن کر چونک پڑے۔

''کیا آپ نے ازابیلا کی آنکھوں میں آرتھر کے لیے پسندیدگی نہیں دیکھی؟'' وہ سرگوشی میں بولیں۔

''دیکھی ہے، بالکل دیکھی ہے مگر دوسری طرف آرتھر اس سے ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح ہی برتاؤ کرتا ہے۔'' وہ گہری سانس لے کر بولے۔

''ہاں...... کیونکہ وہ ساری زندگی اکیلا رہا ہے۔ اسے رشتوں اور جذبوں کو پہچاننے میں مشکل ہوتی ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس سے اس سلسلے میں بات کر سکتی ہوں۔ جہاں تک میں نے اس کی شخصیت کا مشاہدہ کیا ہے، وہ ایک شریف النفس انسان ہے۔ سب کا خیال رکھنے والا اور پیار محبت بانٹنے والا۔ وہ ازابیلا کے لیے ہر لحاظ سے مناسب ہے اور دوسری طرف آرتھر کی صورت میں آپ کو ایک بیٹا بھی مل جائے گا۔'' مسز مارتھا نے گویا ان کے دل کی بات کر دی تھی۔

''کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا آپ کو لگتا ہے کہ آرتھر مان جائے گا؟'' ان کے لہجے میں امید تھی۔

''کیوں نہیں مانے گا؟ ازابیلا میں کیا کمی ہے؟'' وہ پر یقین لہجے میں بولیں۔

''ٹھیک ہے۔ آپ بات کر کے دیکھیے مگر اسے مجبور مت کیجیے گا۔ میری بیٹی بہت خوددار ہے، میں نہیں چاہتا کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔

''آپ بے فکر رہیں۔ میرے لیے آرتھر بیٹوں کی طرح ہے اور میں اپنے بیٹے سے بات کرنا اچھی طرح جانتی ہوں۔'' انہوں نے مسکرا کر انہیں تسلی دی۔

اسی اثنا میں گھر کا دروازہ بجا۔ آرتھر کچن سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''ارے الیگزینڈر! آؤ، اندر آؤ۔ تم صحیح وقت پر آئے ہو۔ کھانا بالکل تیار ہے۔'' آرتھر اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں وعدے کے مطابق صبح سے نہیں پہنچ سکا۔ دراصل کچھ ضروری کاموں میں مصروف تھا مگر آتے ہوئے میں کیک ساتھ لیتا آیا ہوں اور یہ بوتل بھی۔'' الیگزینڈر نے اسے ایک پرانی شراب کی



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

بوتل تھمائی جو دیکھنے میں ہی کافی قیمتی لگ رہی تھی۔
''زبردست! آج تو ہم بھرپور قسم کی دعوت سے لطف اندوز ہونے والے ہیں۔'' آرتھر خوشی سے بولا۔ ازابیلا بھی کچن سے نکل کر اس سے ملنے آئی اور اس کے ہاتھ سے کیک لے کر واپس کچن میں چلی گئی۔
وہ مسز مارتھا اور ازابیلا کے والد کے ساتھ لاؤنج میں آبیٹھا۔ جینیفر بھی پڑھائی کرنے کے بعد وہیں چلی آئی جبکہ آرتھر دوبارہ سے ازابیلا کے ساتھ کچن میں مصروف ہو چکا تھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے ان کے قہقہے اور باتیں سن سکتا تھا۔
گو کہ وہ مسز مارتھا اور ازابیلا کے والد سے گفتگو کر رہا تھا مگر اس کا سارا دھیان انہی دونوں کی طرف لگا ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ سب ناقابلِ برداشت تھا۔ اسی وجہ سے وہ یہاں صبح سے نہیں آیا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح آج رات تک اسے یہ سب برداشت کرنا ہی تھا کیونکہ اس کے بعد آرتھر اس کے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹنے والا تھا۔ وہ آرتھر کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا کر آیا تھا۔ آج رات اسے آرتھر کے ساتھ قیام کرنا تھا اور اسے ختم کرنے کا اس سے بہتر موقع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔
کھانا لگا دیا گیا تھا۔ ان سب نے باتوں اور قہقہوں کے دوران کھانا ختم کیا۔ اس کے بعد کافی اور کیک کا دور چلا۔ ازابیلا کے گھر والوں سمیت مسز مارتھا کی آرتھر کے ساتھ بے تکلفی اور ان سب کی اس کے لیے پسندیدگی دیکھ کر اسے دل ہی دل میں آرتھر سے شدید حسد محسوس ہو رہا تھا۔
اس نے آرتھر کے مسکراتے چہرے پر نظر ڈالی۔ بس چند گھنٹے اور...... پھر یہ چہرہ ہمیشہ کے لیے قبر میں سو جائے گا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔
''ایسا مت سوچو الیگزینڈر! فی الحال اپنے مقصد پر دھیان دو۔ اس سے ہم بعد میں نمٹ لیں گے۔'' اس کے ہمزاد نے اندر سے سرگوشی کی۔
''تم خاموش رہو۔ مقصد...... اور صرف مقصد۔ میری خواہشات کا کیا؟ میری آنکھوں کے سامنے میری محبت کسی اور کی ہو رہی ہے اور تم مجھے تسلیاں ہی دیتے رہو گے۔ اس کے خاتمے کے بعد میں سکون سے اپنا مقصد پورا کروں گا ورنہ میری ساری توجہ اسی طرف رہے گی۔'' اس نے ہمزاد کو خاموش کروا دیا۔
''کہاں گم ہو؟'' آرتھر نے اس کا کندھا ہلایا۔ وہ بیٹھے بیٹھے کسی سوچ میں گم ہو چکا تھا۔
''نہیں، بس ایسے ہی۔'' وہ سر جھٹک کر دوبارہ محوِ گفتگو ہو چکا تھا۔
بالآخرہ محفل برخاست ہوئی۔ وہ آرتھر اور مسز مارتھا کے ساتھ ان کے گھر چلا آیا۔ مسز مارتھا کو اس کے آرتھر کے ساتھ ٹھہرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ دونوں آرتھر کے کمرے کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ اچانک مسز مارتھا نے آرتھر کو آواز دے کر روکا۔
''آرتھر! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔ تم اپنے دوست کو کمرے میں چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے نیچے آسکتے ہو؟'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں آرتھر سے یہ بات کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ وہ صبح تک کا انتظار نہیں کرنا چاہتی تھیں۔
''جی کیوں نہیں۔ آپ بیٹھیں، میں آتا ہوں۔'' وہ ہمیشہ کی طرح فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے ان کی بات مان گیا۔
''میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔ تم بات سن لو۔'' الیگزینڈر نے اس کا بازو تھام کر اسے نیچے رکنے کا اشارہ کیا اور خود اوپر کی طرف قدم بڑھا دیے۔
مسز مارتھا اسے جاتا دیکھ کر لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں اور آرتھر کو بھی وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے ان کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔
''جی کہیے، سب ٹھیک تو ہے نا؟ اگر آپ کو الیگزینڈر کے یہاں آنے پر اعتراض ہے تو آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ صرف ایک رات کے لیے ہی یہاں رکنے آیا ہے۔'' مسز مارتھا کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر وہ اپنی طرف سے اندازے لگانے لگا۔
''نہیں، مجھے الیگزینڈر کی بات نہیں کرنا بلکہ مجھے ازابیلا کی بات کرنا ہے۔'' وہ وقت ضائع کیے بغیر سیدھا مدعے پر آئیں۔
''ازابیلا کی بات؟ کیا ہوا ازابیلا کو؟ سب خیریت تو ہے؟'' وہ پریشانی سے بولا۔ مسز مارتھا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ حقیقتاً ازابیلا کی فکر کرتا تھا۔
''ہاں، سب خیریت ہے۔ تم بالکل پریشان مت ہو بلکہ میں تو چاہتی ہوں کہ تم ہمیشہ کے لیے اس کی ساری پریشانیوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لو۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔'' آرتھر کو واقعی ان کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔
''دیکھو آرتھر! مجھے گھما پھرا کر بات کرنا پسند نہیں۔ تم


Scanned with CamScanner

جب یہاں آئے تھے تو تم نے بتایا تھا کہ تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم اسے اپنا ہی گھر سمجھو مگر انسان کا اپنا گھر اس کے خاندان کے ساتھ بنتا ہے۔ اس کے ماں، باپ، بیوی، بچے، بہن، بھائی۔ تمہارے نہ ماں باپ ہیں اور نہ بہن بھائی...... تو تم شادی کرنے کے بعد اپنا خاندان مکمل کر سکتے ہو۔ ازابیلا ایک اچھی لڑکی ہے۔ وہ خوبصورت اور ذہین بھی ہے اور جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، وہ تمہیں پسند بھی کرتی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم دونوں کو شادی کر لینی چاہیے۔ تمہاری زندگی میں کسی اپنے کی کمی بھی پوری ہو جائے گی اور ازابیلا کو بھی ایک مضبوط سہارا مل جائے گا۔" انہوں نے ایک ہی سانس میں اپنی بات مکمل کر کے آرتھر کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"مسز مارتھا...... میں سمجھا نہیں...... اور...... اور یہ کیسے ممکن ہے بھلا؟ کوئی مجھے اپنی بیٹی کا رشتہ کیوں دے گا؟ میں بے روزگار ہوں، میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ازابیلا ایک سمجھدار لڑکی ہے۔ وہ مجھے کبھی بھی جیون ساتھی کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہے گی۔" آرتھر حیرانی سے بولا۔

"انسان نیک ارادہ کرے تو روزگار بھی مل ہی جاتا ہے۔ روزگار دینا خدا کا کام ہے اور جہاں تک بات ہے تمہارے اس دنیا میں اکیلے ہونے کی، تو میں ہوں نا۔ میں تمہارے لیے ازابیلا کا ہاتھ مانگوں گی۔ تم ایک بار راضی تو ہو جاؤ۔" مسز مارتھا سنجیدگی سے بولیں۔

"مسز مارتھا...... میرا ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں یہاں کسی مقصد کے تحت آیا ہوں۔ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے کچھ بننا چاہتا ہوں۔ بلاشبہ ازابیلا ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ کسی بھی نوجوان کا خواب ہو سکتی ہے مگر مجھ جیسے نگر نگر پھرنے والے کے ساتھ وہ خوش نہیں رہ سکے گی اور ازابیلا کے والد بھی اس رشتے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا؟" وہ بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اگر میں کہوں کہ تم سے پہلے میں یہ بات ازابیلا کے والد سے کر چکی ہوں تو؟ ان کی دل سے خواہش ہے کہ تم ان کی بیٹی کا ہاتھ تھامو اور کیا تمہیں ازابیلا کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت اور پسندیدگی نظر نہیں آئی؟ حیرت ہے...... تم تو چیزوں کو چھو کر ان سے جڑی توانائی تک پہنچ جاتے ہو پھر ازابیلا کے دل کا حال کیوں نہیں جان سکے؟ ٹھیک ہے...... تم اپنی پڑھائی مکمل کرو اور اس کے بعد شادی کرو مگر اس رشتے کو کوئی نام ضرور دو تا کہ نگر نگر گھومتے ہوئے یہ احساس تمہارے ساتھ رہے کہ کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" مسز مارتھا نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ ان کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ اس نے کبھی ازابیلا کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے لیے وہ ہمیشہ سے اچھی دوست رہی تھی مگر مسز مارتھا کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ازابیلا کی پسندیدگی کی خبر اس کے علاوہ سب کو ہے۔

"تم وقت لو اور اس بارے میں اچھی طرح سوچو، اس کے بعد مجھے جواب دو۔ باقی معاملات کیسے طے کرنے ہیں، یہ اپنی ماں پر چھوڑ دو۔" انہوں نے اس کی خاموشی کو محسوس کر کے اسے تسلی دی۔

"جی...... مجھے کچھ وقت دیں۔ میں آپ کو سوچ کر جواب دوں گا لیکن اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ آپ کا بے حد شکریہ۔ آپ اس کڑے سفر میں میرے لیے ایک مضبوط سہارا ہیں۔" وہ خلوص سے بولا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"جاؤ، اب تم آرام کرو...... اور ہاں، ازابیلا کو خبر نہیں کہ میں نے اور اس کے والد نے تم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے لہٰذا اسے اس معاملے سے بے خبر ہی رکھنا۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

الیگزینڈر جو سیڑھیوں کے ساتھ کان لگائے کھڑا ان کی ساری گفتگو سن رہا تھا، آہٹ پا کر دبے پاؤں آرتھر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ یہ ساری گفتگو سن چکا تھا۔ آرتھر خوش قسمت تھا۔ ازابیلا اسے اتنی آسانی سے مل گئی تھی بلکہ پیش کی جا رہی تھی۔

"میں بھی دیکھتا ہوں کہ یہ کیسے ممکن ہو گا۔ تم یہ خوشی دیکھنے کے لیے زندہ ہی نہیں رہو گے۔" وہ دل میں آرتھر کے خاتمے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد آرتھر پانی کا جگ اور گلاس اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا ہوا، تم سوئے نہیں؟" وہ اسے بستر پر خاموش بیٹھے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"نہیں۔ میں بس تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ کیا ہوا، سب خیریت ہے نا؟" وہ چونک کر آرتھر سے پوچھنے لگا۔

"ہاں، سب خیریت ہے۔ بس مسز مارتھا کتابوں کے حوالے سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ اصل میں، میں ان کی کتابیں اٹھا کر ادھر اُدھر رکھ دیتا ہوں نا۔ بس وہی ڈھونڈ کر دے رہا تھا۔" آرتھر نے نظریں چراتے ہوئے جھوٹ بولا۔ فی الحال وہ یہ بات کسی سے بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

اسے ازابیلا کے وقار اور عزت کا خیال تھا۔ الیگزینڈر اس کے اس جھوٹ پر اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ تو سوچ کر بیٹھا تھا کہ اگر آرتھر اس سے مشورہ کرے گا تو وہ اس کا ذہن ازابیلا کی طرف سے بدلنے کی کوشش کرے گا مگر وہ تو اس بات کو راز رکھنا چاہتا تھا۔

"آرام کرنا ہے یا باتیں؟ میں موم بتی بجھا دوں؟" آرتھر بولا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔ کافی تھکن ہے۔ دراصل دن میں کچھ کام نمٹائے ہیں نا۔" الیگزینڈر فوراً ہی لیٹ گیا۔

"ٹھیک ہے۔" آرتھر نے ایک طرف رکھا بستر زمین پر بچھایا اور موم بتی بجھا کر زمین پر لیٹ گیا۔ وہ بھی اس وقت کسی سے باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھا بلکہ سکون سے ازابیلا کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ موم بتی بجھتے ہی کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔

الیگزینڈر نے دل ہی دل میں وہ شیطانی جاپ دہرانا شروع کیا۔ اسے وہ طلسمات دہراتے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اچانک باہر ہوا تیز ہو گئی۔ بند کھڑکی کے شیشے بھی ہوا کے زور سے بجنے لگے تھے۔ وہ آرہا تھا۔ الیگزینڈر، آرتھر کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے شیطانی طاقت کا سہارا لیا تھا۔ وہ ایک عفریت تھا جو انسانوں کی گردن مروڑ دیا کرتا تھا۔ اس کے ذریعے آرتھر کا خاتمہ بھی ہو جاتا اور کسی کو الیگزینڈر پر شک بھی نہ ہوتا۔

"لگتا ہے طوفان آرہا ہے۔" آرتھر کی آواز اندھیرے کمرے میں گونجی۔ الیگزینڈر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ طلسم روکتا تو عفریت واپس چلا جاتا یا اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا۔ وہ خاموش لیٹا رہا۔

"لگتا ہے الیگزینڈر سو چکا ہے۔ میں اٹھ کر دروازے کھڑکیاں دیکھ لیتا ہوں ورنہ مسز مارتھا کو اندھیرے میں تکلیف ہو گی۔" وہ خود کلامی کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور موم بتی جلا کر الیگزینڈر کو دیکھا۔ وہ شاید گہری نیند میں تھا۔ آرتھر موم بتی اٹھائے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اب اس کے سیڑھیاں اترنے کی آواز آرہی تھی۔

الیگزینڈر نے جاپ مزید تیز کر دیا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ آرتھر نیچے کی منزل میں مارا جاتا۔ ایسی صورت میں کسی کو الیگزینڈر پر رہا سہا شک بھی نہ رہتا ورنہ دوسری صورت میں عفریت کمرے میں داخل ہو کر آرتھر کا خاتمہ کرتا۔

اسی لمحے باہری دروازے کے دھماکے سے کھلنے کی آواز آئی۔ وہ پہنچ چکا تھا۔ آرتھر کی موت گھر کی دہلیز تک پہنچ چکی تھی۔ الیگزینڈر نے خاموش ہو کر باہر سے آنے والی آوازوں پر کان لگا دیے۔ اچانک کسی چیز کے زوردار چھناکے کے ساتھ ٹوٹنے کی آواز گونجی اور پھر آرتھر کی خوف اور دہشت میں لپٹی چیخ بلند ہوئی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ الیگزینڈر کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ شکار ہو چکا تھا۔ وہ گردن مروڑنے کے بعد دوسرا موقع ہی کہاں دیتا تھا جو انسان مدد کے لیے پکار سکے۔

"بے چارہ آرتھر!" وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے قدم نچلی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں آرتھر کی لاش اس کی منتظر تھی۔ اسے بہت ساری ذمے داریاں اٹھانا تھیں۔ اس مشکل وقت میں ازابیلا کا سہارا بننا تھا اور آرتھر کی تدفین کے انتظامات بھی تو کرنے تھے۔ آخر اس دنیا میں آرتھر کا تھا ہی کون؟

☆☆☆

**Year 1773**

قاہرہ۔ مصر

جماعت میں خاموشی چھا چکی تھی۔ کسی کے ذہن میں کوئی بھی سوال باقی نہیں رہا تھا بلکہ وہ عیاد کی فراہم کردہ معلومات سے مستفید ہونے اور اسے جذب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"مجھے لگتا ہے آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ آپ لوگ چاہیں تو یہ تمام تحقیق اپنے پاس نقل کر لیں۔ ان شاء اللہ زندگی رہی تو کل پھر ملاقات ہو گی۔ میرا مددگار جماعت میں اس وقت تک موجود رہے گا جب تک آپ اسے مکمل نقل نہیں کر لیتے۔ مجھے اجازت دیجیے۔ یوسف......!" عیاد نے بات مکمل کر کے یوسف کو آواز لگائی۔

یوسف اس کی آواز پر فوراً ہی اندر آیا۔ عیاد نے اسے وہاں کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور خود باہر نکل گیا۔ تمام طالب علم خاموشی سے اس تحقیق کو نقل کرنے لگے۔ جو نقل کر لیتا، وہ اجازت لے کر وہاں سے روانہ ہو جاتا۔ سب سے آخر میں اکبر اور حلیمہ نے نقل مکمل کی تھی۔

"تم دونوں بہت سست ہو۔ کوشش کر کے اپنی لکھنے کی رفتار بڑھاؤ۔" یوسف جو وہاں کھڑے کھڑے تھک چکا تھا، ان کی طرف سے کام مکمل کرنے کا اشارہ پا کر بارعب آواز میں گویا ہوا۔ ان دونوں کی ہنسی نکل گئی۔

"اف...... جماعت کے آداب کا سلیقہ بھی نہیں۔" یوسف کوفت سے عیاد کے کاغذ سمیٹنے لگا۔

"جی استادِ محترم! معافی چاہتے ہیں۔ آئندہ خیال



Scanned with CamScanner

رکھیں گے۔'' الیرا شرارت سے بولی اور جواب میں انہیں یوسف کی تنقیدی نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔

''ٹھیک ہے۔ اب جاؤ، جاتی کیوں نہیں؟'' وہ ان کے وہیں جمے رہنے پر ناراضگی سے بولا۔

''وہ میں...... استادِ محترم سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتی ہوں۔'' الیرا اٹکتے ہوئے بولی۔

''مگر عیاد تو جماعت برخاست کر چکے ہیں۔ یہ ان کے آرام کا وقت ہے۔'' وہ عیاد کے والد کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے بولا۔

''اصل میں سوالات بہت اہم ہیں۔ ورنہ میرا کام نامکمل رہ جائے گا۔'' الیرا بے چارگی سے بولی۔

''ٹھیک ہے۔ تم دونوں یہیں بیٹھو، میں عیاد کو بھیجتا ہوں۔'' وہ رعب سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''حلیمہ! تم جاؤ، بھی میں میرا انتظار کرو۔ میں سوالات حل کروا کے آتی ہوں۔'' وہ فوراً ہی حلیمہ کی طرف پلٹی۔

''میں بھی رک جاتی ہوں نا۔ میں بھی سمجھ لوں گی۔'' حلیمہ جانا نہیں چاہ رہی تھی۔

''میں تمہیں سمجھا دوں گی۔ تم نے دیکھا نہیں، وہ لڑکا ہماری یہاں موجودگی سے پریشان ہو رہا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ استادِ محترم بھی پریشان ہوں۔'' وہ بغیر سر پیر کا بہانہ بنانے لگی۔ حلیمہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑا۔ کیا کر سکتی تھی۔ یہاں آنے جانے کے لیے تو وہ پہلے ہی الیرا کی محتاج تھی۔

یوسف نے آکر اسے الیرا کا پیغام دیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔

''کیا ہوا، بیٹھے کیوں ہو؟ وہ لڑکی تم سے کچھ سوال کرنا چاہتی ہے۔'' بالآخر یوسف نے ہی اسے ہوش دلایا۔

''تم بھی میرے ساتھ چلو۔'' وہ حلیمہ کو باہر نکلتے دیکھ چکا تھا لہٰذا اکیلے کمرے میں جانا نہیں چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' یوسف اس کی بات سمجھ کر اس کے ساتھ کمرے میں چلا آیا۔ وہ ایک طرف خاموش بیٹھی تھی۔

''جی...... یوسف نے مجھے بتایا کہ آپ کچھ سوالات حل کروانا چاہتی ہیں؟'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ اس بار اس نے الیرا کی طرف دیکھنے سے پرہیز کیا تھا۔

الیرا اس سے سوال کرنے کے بجائے یوسف کو دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا؟ پوچھو جو پوچھنا چاہتی ہو۔ تم نے ہی تو کہا تھا۔ مجھے کیوں گھور رہی ہو؟'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔ آج سب ہی عجیب سا برتاؤ کر رہے تھے۔

''میں استادِ محترم سے اکیلے میں کچھ سوالات کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''آپ کو جو بھی سوالات کرنے ہیں، آپ یوسف کی موجودگی میں کریں۔'' عیاد نے اپنی بات پر زور دیا۔

اسی وقت نبیل بھی کمرے میں ظاہر ہوا۔

''ٹھیک ہے۔ میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے اس دن میرے ہاتھ کی لکیروں میں ایسا کیا دیکھا تھا کہ آپ واضح طور پر پریشان ہو گئے تھے؟'' وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بولی۔

''ایسی کوئی خاص پریشانی والی بات نہیں تھی۔ بس میں یہی کہنا چاہوں گا کہ آپ پانچ وقت کی نمازوں کا اہتمام کریں اور زیادہ سے زیادہ ذکر کریں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت رحیم و کریم ہے۔ وہ سب کی حفاظت کرنے والا ہے۔ آپ خود کو اللہ کی پناہ میں دے دیں اور تمام مخلوقات کے شر سے پناہ مانگیں۔'' عیاد نے اسے اصل بات نہ بتا کر بھی بہترین مشورہ دیا تھا۔

وہ خاموشی سے اسے تکنے لگی۔

''اور کوئی سوال کرنا چاہتی ہیں آپ؟'' وہ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے دوبارہ گویا ہوا۔

الیرا نے یوسف پر نظر ڈالی۔ اچانک نبیل نے یوسف کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

''عیاد! مجھے لگتا ہے باہر کچھ طالب علم معلومات کے لیے آئے ہیں۔ میں آتا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ شاید وہ نبیل کا اشارہ سمجھ چکا تھا۔

''میں آپ سے بہت متاثر ہوں یا شاید یہ حد بھی پار کر چکی ہوں۔ میرے دل میں آپ کا خاص مقام بن چکا ہے۔'' الیرا نے فوراً ہی یوسف کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس اب چند ہی دن باقی ہیں۔ اس کے ساتھ یا تو ہر وقت حلیمہ ہوتی تھی یا یوسف ہمیشہ عیاد کے ساتھ موجود رہتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ اپنے دل کا حال کہہ سناتی۔ مزید دیر کرنے کی صورت میں یہ بات ہمیشہ کے لیے اس کے دل میں مقید رہ جاتی۔

''بلاشبہ استاد اور طالب علم کا رشتہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' وہ سمجھ کر بھی ناسمجھ بن رہا تھا مگر الیرا کی اس بات پر اس کا دل لمحے بھر کے لیے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ نبیل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ رشتہ استاد اور طالب علم سے



Scanned with CamScanner

زیادہ گہرا ہے۔ میں آپ کو پسند کرنے لگی ہوں۔" وہ بالآخر اظہار کر بیٹھی۔ دیر اور جھجک اس کے لیے وقت کا گھیرا مزید تنگ کر دیتی۔

عیاد نے اس ساری گفتگو کے دوران پہلی دفعہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تیر رہی تھی۔ وہ اس کی بے باکی پر بچ بچ حیران ہوا تھا۔ حیران تو نبیل بھی ہوا تھا۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ یہ لڑکی اچانک عیاد کے سامنے اپنے دل کا حال کہہ دے گی۔

"مجھے لگتا ہے کہ آپ کو اب جانا چاہیے۔" وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ امیرا سے کیا کہے یا کس طرح کا ردِعمل ظاہر کرے۔

"آپ نے میری الجھن کا حل نہیں بتایا؟" وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی مگر اس کا لہجہ پر اعتماد تھا۔

"میرے پاس آپ کی اس الجھن کا کوئی حل موجود نہیں۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ نبیل نے اپنا سر پیٹ لیا۔

امیرا تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہی اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد عیاد دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے یوسف بھی چلا آیا۔

"کیا ہوا ہے؟ کیا کہہ رہی تھی وہ لڑکی اور تم اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟" یوسف، عیاد کے ماتھے پر پسینے کے قطرے دیکھ کر فکر مند ہوا۔ اس کے سامنے پہلے عیاد تیزی سے کمرے سے باہر نکلا تھا اور پھر وہ لڑکی نہایت غصے سے داخلی دروازے کو دھڑام سے بند کر کے باہر نکل گئی تھی۔

"کچھ نہیں۔ مجھے ایک گلاس پانی پلاؤ۔" عیاد کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

یوسف نے جلدی سے ایک طرف رکھے جگ سے پانی نکالا اور گلاس عیاد کی طرف بڑھا دیا۔

"آخر تم ہی بتاؤ، یہاں کیا گفتگو ہوئی ہے؟" وہ نبیل سے مخاطب ہوا۔

"وہ عیاد سے اظہارِ محبت کر کے گئی ہے۔" نبیل سنجیدگی اور افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ عیاد نے بے اختیار ہی سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا ضرورت ہے بچے کے سامنے یہ بات کرنے کی؟" وہ ناراض ہوا۔

"بچہ نہیں ہوں میں...... اور تم یہ بتاؤ کہ تم نے اسے کیا جواب دیا؟" یوسف کو بھی شدید تجسس ہوا۔

"کیا جواب دیتا۔ یہ تو بغیر کوئی جواب دیے کمرے سے باہر نکل گیا تھا اور اس کی حالت تم دیکھ تو رہے ہو۔" نبیل نے کندھے اچکائے۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، مجھے کیا جواب دینا چاہیے تھا؟ اچانک کوئی آ کر مجھے کہے کہ اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے تو کیا میں اسے گلے لگا لوں؟" عیاد ناراضگی سے بولا۔

"پاگل...... اور تم نے اسے دیکھا بھی تو نہیں...... نہ جانے وہ کیسی ہو۔ ہو سکتا ہے اس کے چہرے پر کوئی داغ ہو یا ایسا کوئی نقص جس کی وجہ سے وہ تم سے اظہارِ محبت کرنے پر مجبور ہو گئی ہو۔" یوسف نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا اور اس کی اس بات پر نبیل کا قہقہہ گونج گیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ مجھے صرف وہی لڑکی پسند کر سکتی ہے جس میں کوئی نقص ہو؟" عیاد برا مان گیا۔

"نہیں، نہیں...... میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس طرح کون خود سے اظہار کرتا ہے۔ میرا مطلب، اسے اتنی جلدی کیا ہے؟" یوسف بولا۔

"اور بتاؤ تم اسے ساری باتیں۔ اب ان سوالات کے جوابات خود ہی دو۔" عیاد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے ناراض کیوں ہوتے ہو۔ میں سمجھاتا ہوں اسے۔ دراصل اس لڑکی نے جس مضمون میں داخلہ لیا تھا، اس کا نصاب بہ مشکل دو ہفتے میں مکمل ہونے والا ہے لہٰذا اس نے سوچا ہوگا کہ وہ خود ہی اپنے دل کا حال کہہ دے۔" نبیل نے معنی خیز لہجے میں یوسف کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"خود ہی مطلب؟ یعنی عیاد بھی اسے پسند کرتا ہے؟" یوسف کو اپنی بے خبری پر حیرت ہوئی تھی۔

عیاد سر پکڑ کر دوبارہ بیٹھ گیا۔

"جو بھی ہو لیکن عیاد! تمہیں اسے جواب ضرور دینا چاہیے تھا۔ وہ یقیناً ناراض ہو کر گئی ہے۔ تم بھی اپنے دل میں اس کے لیے جذبات رکھنے لگے ہو، میں محسوس کر سکتا ہوں۔ تم دونوں کو صاف صاف بات کرنا چاہیے۔" نبیل نے اسے دوستانہ مشورہ دیا۔

"کیا تم بھی اسے پسند کرنے لگے ہو؟" یوسف پر آج حیرت کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔

"تم دونوں تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں ہو سکتے؟" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے، ہو جاتے ہیں خاموش۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ میں چلتا ہوں۔" نبیل یہ کہہ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

یوسف نے بھی خاموشی سے باہر کی راہ لی مگر کچھ سوچ کر دوبارہ کمرے میں جھانکنے لگا۔

digest.library.com

''کیا ہوا؟'' عیاد اسے جھانکتے دیکھ کر بولا۔

''عیاد! اس لڑکی کا نام المیرا ہے۔ میں نے سوچا تمہیں بتادوں۔'' وہ یہ کہہ کر چھپاک سے غائب ہوگیا۔ عیاد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

یہ سچ تھا کہ وہ المیرا کے اچانک اظہار پر بری طرح بوکھلا گیا تھا مگر اب اسے احساس ہورہا تھا کہ المیرا کے منہ سے اقرار سن کر اس کے دل کو عجیب سا اطمینان ملا تھا۔ وہ شاید چاہ کر بھی ساری عمر محبت کا اقرار نہ کرپاتا۔ اس کے مزاج میں ایک جھجک تھی جو اسے ہمیشہ سے صنفِ نازک سے بات کرنے سے روکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے والد کا دواخانہ چھوڑنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

اس کی عمر علم حاصل کرنے میں گزری تھی۔ والدہ کے انتقال کے بعد اس نے خود کو مصروف کرلیا تھا اور شاید وہ اس کی زندگی کی واحد خاتون تھیں جن سے وہ بلا جھجک اپنے دل کا حال کہہ دیتا تھا مگر ان کے بعد اس نے اپنے دل اور زبان کو تالا لگا دیا تھا۔ اس کی طرف سے پہل ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ وہ پہل کرنے کو برا نہیں سمجھتا تھا۔ بس اس کی محتاط طبیعت اسے کبھی یہ اجازت نہ دیتی۔

لیکن قدرت نے اسے المیرا سے ملا دیا۔ وہ اظہار کے معاملے میں فراخ دل نکلی۔ اس نے یہ پڑاؤ پار کرکے آگے کا راستہ اس کے لیے نہایت آسان کردیا تھا اور جب راستہ صاف نظر آنے لگے تو عیاد ادیب کے لیے منزل تک پہنچنا کبھی مشکل نہیں رہا تھا۔ اس رات جب وہ بستر پر لیٹا تو المیرا کی ناراض آنکھوں کے تصور نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

کوئی اسے چاہنے لگا تھا۔ وہ کسی کی سوچوں کا محور بن چکا تھا اور وہ خود بھی تو انہی کیفیات سے گزر رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بھی المیرا سے اپنے دل کا حال کہہ دے گا۔ اسے بتادے گا کہ وہ اس کے لیے اچانک ہی کتنی اہم ہوگئی تھی۔ بنا دیکھے، بنا اسے جانے وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوچکا تھا۔

''کیوں مسکرا رہے ہو عیاد؟'' اسے نیل کی آواز سنائی دی اور وہ جو المیرا کی سوچوں میں گم تھا، اچانک اچھل پڑا۔

نیل قہقہے لگانے لگا۔

''کیا ہوا، ڈر گئے؟ اب تم مجھ سے بھی ڈرنے لگے۔ عشق اچھے اچھوں کے حواس گم کردیتا ہے۔'' نیل ہنستے ہوئے بولا۔

''حد کرتے ہو تم...... اور کوئی عشق نہیں ہوا مجھے۔''

اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔

''تمہارے ماتھے پر صاف اور بڑے حروف میں ''عاشق'' لکھا نظر آرہا ہے۔ مجھ سے تم کچھ بھی نہیں چھپا سکتے عیاد!'' نیل نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

عیاد بے چارگی سے اسے دیکھنے لگا۔

''پریشان کیوں ہوتے ہو؟ کل جب وہ آئے تو اقرار کرکے اسے منا لینا۔ وہ بھی تمہاری طرح اداس ہے۔'' نیل نے اس کی مشکل کا حل پیش کیا۔

''تم اسے اداس دیکھ کر آئے ہو؟'' عیاد کو اپنے رویے پر افسوس ہورہا تھا۔

''ہاں۔ وہ بھی اپنے محل کی کھڑکی میں اداس اور خاموش کھڑی ہے۔'' نیل نے مزید معلومات اس کے گوش گزار کیں۔

''محل......؟ کیا وہ محل میں رہتی ہے؟'' عیاد کو حیرت نے گھیرا۔

''ہاں، وہ مصر کے امیر زبیر بن وسام کی اکلوتی بیٹی ہے۔ مصر کا ہر امیر اس سے نکاح کا خواہشمند ہے مگر اس کا دل تم پر مہربان ہوا ہے۔'' نیل نے جان بوجھ کر اس کی یونس سے نسبت کی بات چھپائی۔ وہ شام سے المیرا کے ساتھ سائے کی طرح گھوم رہا تھا۔ المیرا کے دل میں عیاد کے لیے محبت کے جذبات تھے۔ وہ اداس تھی اور مسلسل عیاد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ باقی ساری باتیں نیل کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔

عیاد سوچ میں پڑ گیا۔

''زیادہ مت سوچو۔ اپنے دل کی سنو۔ وہ صنفِ نازک ہو کر اپنا ہاتھ تم سے پہلے آگے بڑھا رہی ہے۔ تمہیں مردوں کی طرح اس کا ہاتھ تھام لینا چاہیے۔ اس کی محبت کی قدر کرو اور اسے کھلے دل سے قبول کرو۔'' نیل اسے کشمکش کا شکار دیکھ کر بولا۔

''مگر یہ حیثیت کا فرق......!'' عیاد بولا۔

''یہ سب باتیں اہمیت نہیں رکھتیں۔ تم بھی کوئی عام آدمی نہیں، عیاد ادیب ہو۔ یہ مت بھولو کہ تم نے بہت کم وقت میں مصر کی سرزمین پر اپنے قدم جما لیے ہیں۔ دولت اور شہرت سے زیادہ عزت کمانا اہم ہے...... اور تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ وہ خود تمہاری طرف بڑھی ہے۔ اس نے بھی یہ قدم سوچ کر ہی اٹھایا ہوگا۔ ورنہ اس کے لیے تو رشتوں کا انبار موجود ہے۔'' نیل سنجیدگی سے بولا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے اتنا نہیں سوچنا



Scanned with CamScanner

چاہیے۔'' عیاد نے خود کو تسلی دی۔

''کیا تم اس کا چہرہ دیکھنا چاہو گے؟'' نبیل مسکرایا۔

''نہیں، بالکل نہیں۔ جب تک وہ خود نہیں چاہے گی، تب تک میں بھی اس حجاب کو قائم رکھنا چاہوں گا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔ اب مجھے اجازت دو، کل ملاقات ہوگی۔'' نبیل یہ کہہ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ عیاد دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا اور نبیل کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ یہ سب سوچتے ہوئے اسے نیند آ گئی۔

اس کی آنکھ دستک کی آواز سے کھلی۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ وہ حیرانی سے دروازے کو تکنے لگا۔

''کون ہے؟'' اس نے اپنے بستر پر لیٹے ہوئے ہی آواز لگائی مگر اسے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ دستک دوبارہ ہوئی اور اس بار دستک دینے والا عجلت میں لگ رہا تھا۔

''کون ہے؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دستک دینے والا جواب ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

اسے دروازے پر ایک آدمی کھڑا نظر آیا جو لمبا چوغا اور سر پر عمامہ پہنے ہوئے تھا۔ گلی میں گھپ اندھیرا تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ اتنی رات کو یہ شخص اس کے دروازے پر کھڑا آخر کیا کر رہا تھا؟ عیاد چند لمحے سوچتا رہا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''کون ہیں آپ اور کیوں اس طرح دروازہ بجا کر رات کے اس پہر سب کی نیند خراب کر رہے ہیں؟'' وہ بغیر سلام کیے ناگواری سے بولا۔

جواباً اس شخص نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس سے پہلے کہ عیاد اس کی اس حرکت کا کوئی جواب دیتا، اس کی نظر اس شخص کی آنکھوں پر پڑی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے چلیوں کے اندر کسی نے چراغ رکھ دیے ہوں۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے ایک طرف کو دوڑنا شروع ہو گیا۔

عیاد اسے روکتا ہی رہ گیا۔ وہ اس اچانک افتاد پر بوکھلا اٹھا تھا۔ وہ شخص بغیر کچھ کہے عیاد کا ہاتھ تھامے تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ نتیجتاً عیاد کو بھی اس کے ساتھ ساتھ دوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ عیاد نے بہت بار اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر اس کی گرفت سے آزاد ہونا ناممکن لگ رہا تھا۔ اچانک اس آدمی کے قدم زمین سے اوپر ہونا شروع ہوئے۔ عیاد کو احساس ہوا کہ وہ ہوا میں معلق ہے۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ اس شخص کے ساتھ پرواز کر رہا تھا۔ ان کا رخ اہرامِ مصر کی طرف تھا۔ عیاد اب بغیر کچھ کہے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا جسم ساکت مگر ہوا کے دوش پر معلق تھا۔ عجیب سی کیفیت تھی۔

وہ کافی بلندی پر پرواز کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد عیاد کو اپنا جسم زمین کی طرف آتا محسوس ہوا۔ وہ شخص ابھی تک اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ چند لمحوں بعد ان کے پیروں نے زمین کو چھوا۔ عیاد نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اہرامِ مصر کا وہ دیو قامت عجوبہ اس کے سامنے تھا۔

''کون ہو تم اور مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہو؟'' عیاد نے ایک بار پھر اس سے سوال کرنے کی کوشش کی مگر اس شخص کی زبان کو تو جیسے تالا لگا ہوا تھا۔ وہ بغیر جواب دیے اہرام کی طرف بڑھا۔ مجبوراً عیاد کو بھی اس کی پیروی کرنا پڑی تھی کیونکہ وہ شخص اس کا ہاتھ چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ وہ شخص اہرام کی ایک اینٹ کے پاس رکا اور اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اہرام کی وہ اینٹ ایک دروازے کی طرح کھلنا شروع ہوئی۔ عیاد حیرت سے گنگ رہ گیا۔ سامنے ایک راستہ تھا جو اندر کی طرف جا رہا تھا اور اس راستے پر تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی جیسے ہزاروں چراغ روشن ہوں۔

اس شخص نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ عیاد اس بار بغیر کوئی سوال اور احتجاج کیے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر اس سفر کا مقصد کیا ہے۔ اندر کون سی دنیا آباد ہے۔

ان کے اندر داخل ہوتے ہی اہرام کی وہ اینٹ دوبارہ برابر ہو گئی تھی۔ وہ مختلف راہداریوں سے ہوتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ بالآخر اس راستے کا اختتام ایک بہت بڑے کمرے میں ہوا۔ کمرا کنوئیں کی صورت بنا ہوا تھا اور نیچے اترنے کے لیے چاروں طرف سیڑھیوں کی قطاریں تھیں۔

اس شخص کے منہ سے کسی انجان زبان میں کچھ الفاظ ادا ہوئے۔ وہ کنوئیں نما کمرا اچانک ہی روشنی سے بھر گیا۔ عیاد جہاں کھڑا تھا، وہیں جم گیا۔ وہ کمرا خزانے سے بھرا ہوا تھا۔ چاروں طرف سونا اور ہیرے جواہرات بکھرے پڑے تھے۔ اس کی آنکھیں ہیروں کی روشنی سے خیرہ ہو رہی تھیں۔ خزانہ اتنا زیادہ تھا کہ وہ ساری دنیا خرید سکتا تھا۔

''آؤ عیاد! ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔'' اچانک ایک آواز گونجی۔ عیاد نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ خزانے کے بیچوں بیچ ایک بزرگ کھڑے تھے جن کی سفید داڑھی

ان کے پیروں تک آ رہی تھی۔ عیاد کے ساتھ کھڑے شخص نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"کون ہیں آپ اور مجھے یہاں اس طرح کیوں لایا گیا ہے؟" عیاد نے اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے ان سے سوال کیا۔

"عہدہ سونپنے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عہدیدار کو اس مقام تک لایا جاتا ہے، اس کی نگرانی کی جاتی ہے، اس کا امتحان لیا جاتا ہے اور اگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جائے تو اسے وہ عہدہ سونپ دیا جاتا ہے۔" بزرگ مسکرائے۔

عیاد نے ان کی بات سن کر اپنے ساتھ کھڑے شخص پر نظر ڈالی مگر وہ آدمی وہاں موجود نہیں تھا جبکہ چند لمحوں پہلے وہ وہیں کھڑا تھا۔ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرنا بیکار تھا۔ عیاد سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا آیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی گیا تھا کہ وہ جنات سے ہم کلام ہے مگر ان بزرگ کے سراپا سے پھوٹنے والی وہ سفید روشنی انہیں نیک اور پرہیزگار جن ثابت کر رہی تھی۔

"آپ کس عہدے کی بات کر رہے ہیں اور یہ کس امتحان کا ذکر ہے؟ مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس بارے میں کوئی معلومات نہیں۔" اس کا لہجہ خود ہی مؤدبانہ ہو گیا۔

"وہ باتیں ہم بعد میں کریں گے۔ پہلے میں تمہیں کچھ تحائف دینا چاہتا ہوں۔ تم یہاں سے جو چاہو، جتنا چاہو لے جا سکتے ہو۔ یہ خالی صندوق پڑے ہیں۔ تم انہیں اپنی مرضی سے بھر لو۔ ہمارے لوگ ان صندوقوں کو تمہارے کمرے میں پہنچا آئیں گے۔" وہ بزرگ شفقت سے مسکرائے۔

"مجھے یہاں سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ آپ کا شکریہ۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"میں جانتا ہوں اس وقت تمہیں ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ تم بلا جھجک یہاں سے اپنے لیے خزانہ جمع کر لو۔ یہ ہم تمہیں تحفے کے طور پر دے رہے ہیں۔" ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"بہت شکریہ...... مگر مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ مجھے اللہ رب العزت نے بہت نوازا ہے۔ یہ خزانے اس دولت کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔

وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔

"ہم جانتے تھے، ہمارا انتخاب بہترین ہے۔ آؤ، ہمارے ساتھ۔" وہ ایک طرف کو چل دیے۔ عیاد بھی ان کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ قدرے اندھیرے کونے میں رکھے ایک صندوق کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

"عیاد! تمہیں ایک اہم ذمے داری سونپی جا رہی ہے۔ ایک اہم منصب عطا کیا جا رہا ہے۔ تم یہاں لائے ہی اس لیے گئے تھے اور اب جبکہ تم نے امتحان بھی پار کر لیا تو تمہیں یہ خزانہ عطا کیے جانے کا وقت آ چکا ہے۔" انہوں نے صندوق کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا ہے اس صندوق میں؟ میں نے آپ سے کہا نا، مجھے کوئی خزانہ نہیں چاہیے۔ آپ کون سے منصب کی بات کر رہے ہیں؟" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم صندوق کھولو۔ تمہیں سارے جوابات مل جائیں گے۔" وہ مسکرائے۔

عیاد چند لمحے سوچتا رہا اور پھر اس نے صندوق کا ڈھکن کھول دیا۔

صندوق کے اندر کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کتابوں کے قدیم نسخے ہیں۔ عیاد نے نہ سمجھنے والے انداز میں دوبارہ انہی بزرگ کی طرف دیکھا۔

وہ صندوق پر جھکے اور چند کتابیں ہٹانے کے بعد ایک کتاب نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔

"یہ ہے وہ عظیم ذمے داری جس کی وجہ سے تم یہاں تک لائے گئے ہو۔ تم نیکی کے پہرے دار ہو۔ ہمارا پچھلا پہرے دار اب رخصت لینے والا ہے۔ اس کی جگہ تم یہاں پہرا دو گے۔ تمہیں کیا کرنا ہے، وہ ہمارا پہرے دار تمہیں صحیح وقت پر خود سمجھائے گا۔ تم اس کا انتظار کرنا اور اس کتاب کی حفاظت کرنا۔" وہ جو بھی باتیں کر رہے تھے عیاد کے سر پر سے گزر رہی تھیں۔

اس نے کتاب پر نظر ڈالی۔ جلد پر کچھ تحریر تھا۔ وہ قدرے اندھیرے والی جگہ کھڑا تھا لہٰذا چند قدم آگے بڑھ کر روشنی میں کتاب کا نام پڑھنے کی کوشش کی۔

"شمس المعارف ولطائف العوارف...... شیخ ابو العباس احمد بن علی البونی۔" نام پڑھتے ہی اس کے ہاتھ کانپنا شروع ہو گئے۔ اس نے سر اٹھا کر ان بزرگ کو دیکھا مگر وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ کتاب ہاتھ میں تھامے انہیں چاروں طرف ڈھونڈنے اور پکارنے لگا مگر اسے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

اس نے دوبارہ شمس المعارف پر نظر ڈالی۔ آخر یہ کتاب اسے کیوں دی گئی تھی؟ یہ کون سی ذمے داری تھی جو اسے سونپی جا رہی تھی؟ کس پہرے دار کی بات ہو رہی تھی؟ بہت سارے سوال تھے جن کے جواب نامکمل تھے اور وہ بزرگ اس کے سوالوں کے جواب دیے بغیر ہی وہاں سے



Scanned with CamScanner

سجا چکے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کتاب کو کھولا۔ وہ کتاب کا اصلی نسخہ تھا۔

اسے شدید بے چینی شروع ہو گئی۔ وہ یہ کتاب اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے کتاب کو دوبارہ اسی صندوق میں رکھ کر صندوق کو بند کر دیا۔ اب اس کے ذہن پر بھی سوچ سوار تھی کہ وہ یہاں سے باہر کیسے نکلے گا؟ اس نے تیزی سے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے مگر وہ ٹھوکر کھا کر سیڑھیوں سے نیچے گر گیا اور اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔

ٹھوکر لگنے کا احساس اتنا شدید تھا کہ اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر جگہ کا تعین کرنے لگا۔ وہ تو اپنے بستر پر موجود تھا۔ تو کیا یہ سب ایک خواب تھا؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ آج کل اسے کچھ زیادہ ہی عجیب و غریب خواب آنے لگے تھے۔

اس آدمی کی دستک، ہوا میں معلق ہونے والا وہ سفر، وہ خزانہ اور وہ کتاب۔ اس خواب کی جزئیات ابھی تک تازہ تھیں۔

وہ سر جھٹک کر اپنے بستر سے اتر آیا اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ گلی میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا یعنی ابھی فجر کا وقت نہیں ہوا تھا۔

عیاد نے کھڑکی بند کی اور تہجد کی نیت کر کے وضو کرنے چل دیا۔ اس نے وضو کرتے ہوئے اپنے پیروں پر نظر ڈالی۔ اس کے پیروں پر کسی قسم کی مٹی یا گرد نہیں لگی تھی۔ جیسا کہ پہلے اس کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اس نے شکر ادا کیا۔ وہ وضو کر کے باہر نکل آیا اور تہجد پڑھنے لگا مگر سلام پھیرتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

شمس المعارف کا وہ نسخہ اس کی میز پر موجود تھا۔ وہ کتاب اس تک پہنچا دی گئی تھی اور پہرے دار اسے اس کی ذمے داریاں سونپنے جلد آنے والا تھا۔

☆☆☆

فجر کی اذانیں ہوئیں تو یوسف کی آنکھ فوراً ہی کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر وضو کیا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ جب سے اس نے عیاد کے مددگار کے طور پر اس کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تھا، اسے نماز کی پابندی کی عادت ہو گئی تھی اور یہ عادت اسے عیاد سے ہی لگی تھی۔ وہ خود بھی وقت پر عبادت کرتا تھا اور یوسف کو بھی نماز پڑھنے کی نصیحت کرتا تھا۔

شروع میں تو یوسف ایک دو نمازیں چھوڑ دیتا تھا اور زیادہ تر کتب میں ہی نماز ادا کرتا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ اسے بھی عیاد کی طرح مسجد جا کر نماز ادا کرنے میں سکون ملنے لگا۔ عیاد نے اسے کہا تھا کہ حاضری ضرور لگواؤ، بھلے کام مکمل ہو یا نہ ہو۔ روز جماعت میں نظر آؤ گے تو اللہ کے پسندیدہ بن جاؤ گے اور وہ اسی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔

وہ درود و سلام پڑھتے ہوئے مسجد کی گلی میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ گلی میں گو کہ اندھیرا تھا مگر وہ اس سراپا کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

وہاں دجال کھڑا تھا۔

یوسف کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ اس سے سب ہی خوف کھاتے تھے۔ لوگ تو دن کے وقت اسے دیکھ کر راستہ بدل لیتے تھے اور یہاں وہ اکیلا رات کے اس پہر اس کے سامنے موجود تھا۔

"گھرر ر...... گھرر ر......" اس کے لاٹھی گھسیٹنے سے دوبارہ وہی آواز ابھری جو اکثر ڈراؤنے خوابوں میں یوسف کو سنائی دیتی تھی جہاں یہ دجال اس کا پیچھا کر رہا ہوتا تھا۔ آج وہ خواب حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ وہ یوسف کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

یوسف نے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر اس کے سراپا کی دہشت اتنی زیادہ تھی کہ وہ ہل بھی نہیں سکا۔

وہ بالآخر اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ یوسف نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس کے خوفناک سراپا کو اس قدر قریب سے دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

"یوسف! عیاد کو کہہ دینا کہ اس لڑکی سے دور رہے۔ اس کے لیے یہی بہتر ہے۔" وہ اس کے قریب پہنچ کر بولا اور آگے بڑھ گیا۔

یوسف نے لاٹھی کی آواز سنائی دینے تک کوئی حرکت نہیں کی اور نہ ہی اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ اب تک اس کی بھاری آواز کی دہشت میں مبتلا تھا۔ چند لمحوں بعد گلی میں دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ یوسف نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور اپنے ماتھے پر آئے پسینے کے قطروں کو ہتھیلی سے صاف کیا۔ اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو چکی تھی۔

اچانک اسے دجال کی بات یاد آئی۔ تو کیا دجال اب عیاد کو نقصان پہنچانے والا تھا؟ یہ سوچ ہی اتنی روح فرسا تھی کہ وہ تیزی سے پلٹا اور اب اس کے دوڑتے ہوئے قدم عیاد کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان کے باقی واقعات آئندہ ماہ



Scanned with CamScanner

# قصۂ ناتمام

نعمان اسحاق

وقت اور حالات انسان کو اس نہج پر لے آتے ہیں کہ اس کے لیے ناپسندیدہ اور عزت نفس کو مجروح کردینے والا کام بھی بحالتِ مجبوری کرنا پڑجاتا ہے... کوئی راہ، کوئی روشنی نظر نہیں آتی... زندگی جس ڈگر پر چل رہی ہوتی ہے، اس پر تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوتی ہے۔ہاں... بس ایک امید ہی ہوتی ہے کہ جانے کب... یہ گھور اندھیرا چھٹے گا اور اجالا ہر چیز کو روشن کردے گا... مگر وہ وقت کب آئے گا؟ یہ سوال حل طلب ہی رہتا ہے۔

معاش کی خاطر دست طلب کرنے والے نوجوان

کی بے بسی

digestlibrary.com

جب عادل کراچی اسٹیشن پر اترا تو موسلا دھار بارش اس کے استقبال میں پہلے سے آن موجود تھی۔ برستی بارش کو کوفت سے دیکھتے ہوئے وہ مسافروں کے لیے بنی انتظار گاہ میں بارش تھمنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین سے اترنے اور انتظار گاہ تک پہنچنے میں ہی اس کے کپڑے اچھے خاصے گیلے ہوچکے تھے۔ قسمت تو اس کی خراب تھی ہی اور اب تو کئی سالوں سے موڈ بھی مستقل خراب رہتا۔ یوں ہی لمحاتی فرار کی خاطر اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ اس سگریٹ کا

Scanned with CamScanner

بڑا ہی بکواس ذائقہ تھا مگر اب وہ مہنگے سگریٹ افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔

"آپ کو نظر نہیں آتا یہاں لیڈیز بھی ہیں۔" ایک عورت نے ناگواری کا اظہار کیا تو وہ کچھ دور ہو کر دھواں پھونکنے لگا۔ سامنے ہی "سگریٹ نوشی منع ہے" کی تختی لگی تھی مگر کسے پروا تھی۔ دھوئیں کے مرغولے بناتا وہ برستی بارش کو دیکھنے لگا اور جب دھواں بارش کے پانی میں ملا تو جو منظر تحلیل ہو کر ابھرا، وہ آج کا نہیں بلکہ چودہ سال پہلے کا تھا جب وہ چھتیس سال کا آدھا گنجا جوان نہیں بلکہ بائیس سال کا کھلنڈرا کالج اسٹوڈنٹ تھا۔

چائے کے ڈسپوزیبل کپ تھامے وہ لان میں ایک سنگی بنچ پر بیٹھے عمر بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کررہے تھے جب بارش کے چند قطرے گرے اور پھر جل تھل ہوگیا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں ہمیشہ ساتھ نبھاؤں گی۔" بارش سے بچتے وہ کوریڈور میں آگئے اور ہادیہ نے وہاں آکر تجدید کی۔ ہادیہ کالج کے دنوں میں اس کی جان تھی مگر یہ تو پرانی بلکہ پرانی سے بھی زیادہ پرانی بات تھی۔ نہ کالج رہا اور نہ ہی جان۔ سگریٹ کا دھواں کچھ زیادہ ہی کڑوا محسوس ہوا اور جیسے گلے میں اٹک گیا۔ کھانسی کا ایک دورہ اٹھا اور عادل دیوار کا سہارا لے کر حال سے بے حال ہونے لگا۔

"کورونا نہ پھیلاؤ۔" منچلے لڑکوں کا ٹولا گزرا تو ایک نے آواز کسی۔ عادل کو تاؤ تو آیا مگر اس نے نظر انداز کرنے میں ہی عافیت جانی۔ بارش کے تھمنے تک وہ سگریٹ ہی پھونکتا رہا اور جیسے ہی یہ آزمائش تھمی، اس نے اپنے روٹ کی بس پکڑی۔ کراچی کی بسیں بھی کبھی آرام دہ رہی ہیں۔ یوں کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں جیسے ہٹلر کے ایما پر یہودیوں کو ہولوکاسٹ کے لیے لے جارہی ہیں، مگر یہاں تو کوئی ہٹلر نہیں تھا اور نہ ہی وہ یہودی، پھر بھی ایک مسلسل سا ہولوکاسٹ ہے جو ختم ہی نہیں ہوتا۔ عادل ایک آہ بھر رہ گیا۔ کالج کے دنوں سے ہی چاہے پوائنٹ ہو یا لوکل بھی ہوئی بسیں، اسے ان میں سفر کرنا ناگوار ہی رہا تھا۔

"جب میرا پہلا ناول ہٹ ہوگا تو اس کی رائلٹی سے گاڑی لوں گا۔" اپنے اس مستقبل کے ارادے سے وہ دوستوں اور ہادیہ کو آگاہ کرتا رہتا مگر اس نے ناولوں کے ناول لکھ ڈالے مگر وہ تو ان بددماغ ایڈیٹر کو ہی نہ پسند آئے۔ بہ مشکل چند ہی اخباروں اور ڈائجسٹوں کی زینت بنے مگر انہیں بھی کتابی شکل نصیب نہ ہوئی...... ہائے ری قسمت۔

بس ہلکورے کھاتی کراچی کی بڑی بڑی شاہراؤں سے گزرتی رہی اور عادل کو آدھے سفر کے لیے ہی سیٹ پر بیٹھنا نصیب ہوا۔ بالآخر اس کی منزل آگئی اور وہ وہاں سے آدھے گھنٹے کی واک کے بعد گل زیب کے گھر پہنچ ہی گیا۔ اس وقت گل زیب دکان پر ہوتا تھا مگر اس نے عادل کو پھر بھی گھر آنے کا کہا کہ دکان پر رش کی وجہ سے کوئی بات نہ ہو پاتی اور کچھ گل زیب اپنے بھائی کی وجہ سے جو اس کے ساتھ دکان پر ہوتا، کے سامنے عادل سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں اس نے پہلے سے بتادیا تھا کہ اندرونِ ملک سے اس کا دوست آرہا ہے جو قیام بھی کرے گا۔ اس لیے انہوں نے بیٹھک کھول دی اور چائے پانی بھی پیش کردیا۔ گل زیب شام ڈھلے آیا، تب تک عادل موبائل استعمال کرکر کے اکتا چکا تھا۔ درمیان میں آدھ پون گھنٹے کے لیے اس کی آنکھ بھی لگی تھی۔

"دکان کھولنے کا سوچا ہے۔" عادل نے گل زیب کو بتایا۔ تو گویا دیر آید درست آید۔ کالج کے دنوں میں گل زیب سب سے زیادہ عادل کے ناولوں کی پذیرائی کرتا تھا۔

"تم پاکستان کے دوستوفیسکی ہو۔" تب عادل کو بھی یہ مبالغہ نہ لگتا۔

"بہت کوشش کرلی مگر قلم نے ساتھ ہی نہیں دیا۔ اب چھتیس کا ہوگیا ہوں، کوئی روزگار ہو تو کوئی اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے۔" تلخ سہی مگر کئی سالوں بعد عادل شکست خوردہ ہو کر تسلیم کرنے لگا تھا۔ گل زیب بس اسے دیکھتا رہ گیا۔

"سرمایہ کچھ بھی نہیں ہے، موبائل اسیسریز کی دکان کا سوچا ہے۔ کیا تم کچھ مدد کرسکتے ہو؟"

گل زیب کو اسی کی توقع تھی۔ عادل کو پیسے دینا کنوئیں میں ڈالنے جیسا تھا۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور جب سے اس کا تیسرا بیٹا ہوا تھا، خرچے بھی بہت بڑھ گئے تھے مگر عادل بھی تو لڑکپن اور جوانی کے دنوں کا جگر تھا۔ ان چائے کے کپوں کا بھی ادھار تھا جن پر وہ کئی کئی گھنٹے لایعنی گفتگو کرتے گزار دیتے۔

حساب کتاب کرنے کے بعد گل زیب نے تیس ہزار عادل کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"چھوٹے بیٹے کے بعد خرچے بہت بڑھ گئے ہیں، ان پیسوں کو ہی سونا بنا کر دکھاؤ اور آئندہ میں کچھ نہیں کرپاؤں گا۔" اتنی بڑی رقم دینے پر دل بھاری تو تھا اس

لے لہجہ گھمبیر ہو گیا۔
”کب کی واپسی ہے؟“
”صبح۔“
گل زیب سر ہلانے لگا۔
”کسی اور سے بھی مدد کا کہا ہے؟“
”اور کس سے کہہ سکتا ہوں۔ ایک تو ہی ہے جو......“
آگے یقیناً عادل افسانوی زبان میں دوستی کا قصیدہ پڑھتا مگر گل زیب نے ٹوک دیا۔
”ہادیہ!“
عادل کا دل لمحے بھر کو رک گیا اور وہ سوالیہ نظروں سے گل زیب کو دیکھنے لگا۔
”اور نہیں تو کیا۔ کالج کے زمانے میں تمہاری کتنی اچھی دوست تھی۔ اب جب اتنے امیر بندے کی بیگم ہے تو کیا تمہاری مدد نہیں کر سکتی؟“
عادل دیکھتا رہ گیا۔ وہ دوست نہیں، محبوبہ تھی۔ عادل کس منہ سے اسے یہ حقیقت سمجھاتا۔

☆☆☆

صبح نماز کے لیے گل زیب اسے اٹھانے آ گیا۔ وہ نہا کر آیا تھا۔ مطلب، رات ایک ازدواجی رات تھی اور ایک عادل تھا جو چھتیس سال کا گنجا اور توند نکلا ہونے کو تھا اور پتا نہیں تھا ازدواجی لذت کیا چیز ہے۔ یہ ناول لکھنے کا خبط اس کی جوانی کھا گیا۔ نماز میں بھی ذہن میں یہی تکرار ہوتی رہی۔
”اب ہادیہ کے گھر جانا۔ زیادہ عزت نفس کے چکروں میں نہ آ جانا۔“ دکان پر جانے سے پہلے گل زیب نے تاکید کی اور عادل بھی عزت نفس کے چکروں میں نہ آیا اور اس بس پر بیٹھ گیا جو ہادیہ کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ بس کے ہر ہچکولے کے ساتھ یاد کا ایک اور ہی پہر سامنے آن کھڑا ہوتا، جب آنکھوں میں ناول نگاری اور پھر ناول نگاری سے ڈراما نگاری کی چمک روشن رہتی تھی۔ جب ہادیہ اس کے پہلو میں ہوتی تھی۔ لوگ کتنا کہتے، یہ مضامین نہ لو، کوئی ملازمت نہیں ملے گی مگر ملازمت کس نے کرنا تھی۔ اس نے تو اردو زبان کا لازوال ادیب بننا تھا مگر یہاں تو ”لا“ کہیں درمیان میں ہی رہ گیا اور صرف ”زوال“ رہ گیا۔
کالج کے بعد جب چند سال کچھ نہ بن پایا تو ایک دن ہادیہ نے اسے پارک میں بلایا اور روتے ہوئے بتایا۔ ابو نے اس کا رشتہ پھوپو کے بیٹے سے کر دیا ہے۔ محبت کا اندھا عادل جذباتی ہو کر ہادیہ کے والد سے رشتہ مانگنے چلا بھی گیا۔ اندرون سندھ کے گاؤں کا اجڈ لڑکا جو کچھ نہیں کماتا، ہاں


گھر بھر کے لیے
ماہنامہ پاکیزہ کے باذوق قارئین کے لیے خوشخبری
کون خوابوں کے پار رہتا ہے
خوابوں، خیالوں اور تخیلات کی دنیا ہمیشہ ہی مسحور کن لگتی ہے۔ سنہرے اور روپہلے خوابوں پر نہ کسی کو اختیار ہے اور نہ ہی کوئی قدغن لگا سکتا ہے۔ امنگوں، آرزوؤں کی تکمیل میں تخیلاتی دنیا کبھی معاون ہوتی ہے تو کبھی انسان مایوس بھی ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں مایوسی بھی آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہو تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔
حسیں داستاں اور خوابوں کی تعبیر ...... ایسے ہی تو بنتی ہے ایک دلکش تحریر
مایہ ناز قلمکار، ہر دلعزیز ناول نگار محترمہ
افشاں آفریدی
کے ماہرانہ اندازِ بیان کا ایک اور دلکش، حسین و پُرلطف قسط وار ناول
ان شاء اللہ اکتوبر 2025ء سے پاکیزہ کے صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے





Scanned with CamScanner

البتہ باتیں اچھی کر لیتا ہے۔ ذات کا لکھاری...... ہونہہ۔

عادل جب وہاں سے نکلا تو ٹیس پھٹی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے وہ اکیلا تھا اور دوسری طرف ہادیہ کے دو بھائی اور والد تھے۔ ہاتھا پائی میں جو نا قابلِ تلافی بات ہو گئی، وہ یہ کہ عادل نے ہادیہ کے والد پر ہاتھ اٹھا لیا۔ کئی دنوں تک اس کے پیر میں سخت درد رہا۔ یہ تو ایکسرے پر پتا چلا کہ پاؤں کی ایک چھوٹی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اسے ٹھیک ہونے میں چھ مہینے لگ گئے۔ تب تک ہادیہ کی پھوپو کے بیٹے سے شادی ہو چکی تھی۔

گزرتے سالوں کے باوجود اس کے پاس ہادیہ کا نمبر محفوظ تھا مگر سوال یہ تھا کہ کیا وہ اب بھی یہی نمبر استعمال کرتی ہے؟ اس نے جانے سے قبل نمبر ملایا اور وہ اس کے "ہیلو" کہنے پر ہی پہچان گئی۔

"کیسے ہو عادل؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ آج بھی اس کی آواز دل کی دھڑکن تیز کر رہی تھی۔

"میں کراچی آیا ہوا ہوں۔"

"واہ! تو ملنے آؤ نا۔" ہادیہ نے اس کے لیے آسانی پیدا کر دی۔

"اپنے خاوند سے کیا کہو گی؟"

"وہ بہت ماڈرن ہیں، تم فکر نہ کرو۔" وہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں آج بھی جلترنگ سی تھی۔ چنانچہ وہ بس پکڑ کر ہادیہ کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ سارے راستے یہ سوچتا رہا کہ ہادیہ سے کیا باتیں کرے گا اور اس سوچ پر غالب ہوتی ایک اور سوچ تھی، کیسے اس سے پیسے مانگے گا؟ مانگنا مشکل لگ رہا تھا۔ میسج کر دیتا ہوں۔ وہ میسج ٹائپ کرنے لگا۔

"ڈیئر ہادیہ!" پھر اس نے ڈیئر ڈیلیٹ کر دیا اور آگے لکھنے لگا۔

"آخرکار تسلیم کر چکا ہوں کہ میں ایک ناکام مصنف ہوں۔ موبائل اسیسریز کی دکان کھولنا چاہتا ہوں، سرمائے کی کمی ہے۔ اگر تم کچھ مدد کر سکو تو......" اس نے میسج بھیج دیا مگر پھر دل ایک الگ لے پر دھڑکنے لگا۔ یہ تو بے غیرتی سے بھی کچھ اوپر چیز تھی۔ اس نے موبائل اسکرین دیکھی، میسج ابھی ڈیلیور نہیں ہوا تھا۔ وہ گھر گرہستی والی کہاں موبائل لے کر بیٹھی ہو گی۔ جلدی سے اس نے میسج ڈیلیٹ کر دیا۔

"وہاں جا کر اس سے مل لوں، ان آنکھوں کی دیدار کی خواہش تو پوری ہو اور اگر حالات سازگار ہوئے تو مالی مدد کا بھی کہہ دوں گا۔" کہتے ہیں غربت کیا کیا نہیں کرواتی ہے۔ سچ ہی تو کہتے ہیں۔ آپ اپنی سابقہ محبوبہ سے مالی مدد تک مانگ لیتے ہیں۔

بس سے اترنے کے بعد اس نے پان مسالا کھا لیا کہ منہ سے سگریٹ کی بو ختم ہو۔ آتے ہوئے دل تو کیا کہ گل زیب سے پرفیوم مانگ لے مگر شرم آڑے آ گئی۔

ہادیہ کے دروازے پر پہنچ کر عادل نے بیل بجائی۔ بیل خراب تھی، دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بارہ تیرہ سال کی لڑکی نمودار ہوئی۔ وہی ہادیہ کے نین نقش۔ دل میں ایک کثافت سی چھانے لگی۔ ہادیہ کے بچے جوانی کی سرحد کو چھونے لگے تھے اور وہ اپنا غم چھپانے کی کوششیں کرتا رہ گیا۔ ناول نگار تو نہیں بن سکا، ہاں البتہ کنگلا اور کنوارا رہ گیا۔ بچی سے اپنا تعارف کیسے کروائے اسے سمجھ نہ آیا۔ بچی نے خود ہی آسانی کر دی۔

"آپ عادل ماموں ہیں؟" لو جی، محبوبہ کے بچوں کا...ماموں بننا نصیب تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بچی اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ ڈرائنگ روم کا باہر سے دروازہ نہیں تھا۔ اسے گھر کے اندر سے گزر کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ گل زیب نے ناحق ہی امارت کے مبالغہ آمیز قصے سنائے تھے۔ یہ تو کسی مڈل کلاس بلکہ لوئر مڈل کلاس کا گھر تھا اور عادل کو دیکھو، مالی مدد کے لیے آ پہنچا تھا۔

ہادیہ ڈرائنگ روم میں آئی۔ پینتیس سال کی عمر میں وہ خوبصورتی تو نہیں رہتی کہ سانس رک جائے اور وہ کوئی ایکٹریس بھی نہیں تھی جس کا کام اپنے آپ کو ہی میٹین کرنا تھا۔ مگر چاہے وہ جس وضع میں تھی، تھی تو ہادیہ نا، جو بھی اس کی ہادیہ ہوتی تھی۔ آج بھی عادل اسے دیکھ کر پگھلنے لگا۔

"اتنے سالوں بعد......"

"ہاں، اتنے سالوں بعد۔" اور عادل کیا جواب دیتا۔

"کیسے ہو؟"

"تمہارے سامنے ہوں۔"

"بال کم ہو گئے ہیں۔"

"تم بھی تو موٹی ہو گئی ہو۔"

"چار بچوں کے بعد تو موٹا ہونا عورت کا حق ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

"جاوید عمرے پر گئے ہوئے ہیں ورنہ تم سے ملاقات ہو جاتی۔" ہادیہ شوہر کے بارے میں بتانے لگی۔ عادل نے اس کے عمرے پر جانے میں ہی عافیت جانی ورنہ کیا پتا کس حوالے سے ملنا پڑ جاتا۔

"کچھ گرمی ہو رہی ہے۔" ہادیہ اٹھی اور کھڑکی کھول دی۔

"گھر کے حلیے پر مت جانا۔ یہ جاوید صاحب ہیں جو

کہتے ہیں نظر لگ جائے گی، اس لیے یوں غریبوں کی طرح رہتے ہیں، ورنہ اللہ نے اتنا دیا ہے کہ سنبھلتا نہیں۔''

عادل کو تو جھوٹ ہی لگا۔

''کیا کھاؤ گے؟''

''کچھ نہیں، بس دل کیا کہ تم سے مل لوں۔ اب چلتا ہوں۔''

''ارے، ایسے کیسے...... تم بیٹھو، میں کچھ لاتی ہوں۔ یہ بچے میرے بڑے نکمے ہیں۔ مجھے خود جانا پڑے گا۔ یہ نکڑ کے سموسے بڑے بہترین ہیں، بس پانچ منٹ میں آئی۔''

وہ نہ نہ کرتا رہ گیا اور ہادیہ اٹھ کر چلی گئی۔

عادل بیٹھا کچھ دیر یوں ہی در و دیوار کو دیکھتا رہا پھر گل زیب کو کال ملائی۔

''تم تو کہتے تھے بڑی امیر ہے۔''

''ہاں ہے، بس رکھ رکھاؤ ایسا ہے۔ اب پیسوں کے لیے کہہ دیتا اور اگر خود سے دے تو خودداری نہ دکھانے لگ جاتا۔''

عادل جواب میں کیا کہتا۔

تبھی کھڑکی سے ایک چھ سات سال کی لڑکی کا سر نمودار ہوا۔

''انکل! آنٹی سے کہیں، امی پرسوں والے دو سو روپے مانگ رہی ہیں۔'' عادل دیکھ کر رہ گیا۔

''بیٹا! آنٹی بازار گئی ہیں۔''

''آپ کہہ دینا۔'' بچی اچھلتی کودتی چلی گئی۔

یہ غربت چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ یوں ہی خیال آیا تو اس نے صوفے کا پوش اتار کر دیکھا۔ بدرنگ صوفہ جس کا فوم بھی جھانک رہا تھا۔ جاوید عرصے پہلے مر گیا ہوا ہے، یہ بھی جھوٹ تھا۔ ایسا جھوٹ جس کے پاؤں بھی واضح تھے۔ گل زیب کے دیے تیس ہزار اس کے بٹوے میں تھے۔ پرانی بلکہ قدیم سہی، تھی تو محبت نا۔ اسی محبت کے صدقے اس نے دو ہزار نکال لیے اور اٹھائیس ہزار صوفے کے پوش کے نیچے رکھ دیے۔

ہادیہ سموسوں کے ساتھ بوتل بھی لائی تھی۔

''تمہارے امی ابو کیسے ہیں؟'' عادل نے سموسے کھاتے ہوئے بات برائے بات پوچھا۔

''ابو کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''تم اگر ابو پہ ہاتھ نہ اٹھاتے تو شاید......'' الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

اب عادل کیا صفائی دیتا۔ وہ تو اس کے بھائی کے مارنے پر بھائی کو ہی مار رہا تھا، جانے کیسے انکل کو لگ گیا۔ اب کیا فائدہ ان باتوں کا۔

سموسے کھا کر اس نے واش روم جانے کی خواہش کی۔ ڈرائنگ روم سے ملحق واش روم دو دروازوں والا تھا۔ مطلب واش روم ڈرائنگ روم کے ساتھ بھی ملحق تھا اور دوسرے دروازے سے گھر کے مکین استعمال کر سکتے تھے۔ ہاتھ دھونے کے بعد عادل نے یونہی جائزہ لیا۔ کوئی خوشبودار لو کوالٹی صابن پڑا تھا اور شیمپو کی بوتل محض ایک زینت تھی کیونکہ وہ خالی تھی۔ ہادیہ تو کالج کے دنوں میں جلد اور بالوں کی پروڈکٹ کی ایسی رسیا تھی کہ کتنے پیسے لٹا دیتی اور اب بھرم رکھنے کو کہہ رہی تھی کہ خود سادگی سے رہتے ہیں کہ نظر نہ لگے۔

واپسی سے پہلے عادل نے ہادیہ کو ایک نظر جی بھر کر دیکھا، بعد میں شاید موقع ملے نہ ملے۔ بس میں بیٹھ کر وہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ کراچی خالی جیب آیا تھا اور خالی جیب ہی جا رہا تھا۔ اب کیسے دکان کے لیے سرمائے کا انتظام ہو گا؟ تھک کر اس نے سوچنا چھوڑ دیا۔ تبھی موبائل کی بیپ بجی۔ ہادیہ کا وائس میسج تھا۔

''گل زیب نے تمہارے آنے کا مقصد بتایا تھا۔ تم کچھ اتنے اچانک آئے اور دوسرا جاوید بھی عرصے مر گئے ہوئے ہیں، رقم تو میرے پاس کوئی نہیں پڑی تھی اور تمہیں براہِ راست دیتے ہوئے شرم آئی اس لیے جب تم واش روم گئے تو تمہارے بیگ کی جیب میں رکھ دیا۔ یہ سونے کا لاکٹ ہے۔ اب تو سونا اتنا مہنگا ہے کہ اچھی قیمت لگ جائے گی۔ ان پیسوں کو دکان میں ڈالنا اور ہاں، جب شادی کرو تو تصویریں ضرور شیئر کرنا۔''

عادل نے بیگ کی زپ کھول کر دیکھا۔ یہ تو وہی سونے کا لاکٹ تھا جو کالج کے دنوں میں ہادیہ کی گردن کی زینت ہوتا تھا۔ ایک اداسی سی چاروں اور پھیل گئی۔

''تمہارے بچوں کے لیے کچھ پیسے صوفہ پوش کے نیچے رکھ دیے ہیں۔ خود سے دیتے ہوئے شرم آئی۔ اپنا خیال رکھنا۔'' اس نے بھی میسج ٹائپ کر کے بھیج دیا۔

جب بس اسٹیشن پر رکی تو ویسی ہی بارش ہو رہی تھی جیسی کل اس کے یہاں آتے وقت ہو رہی تھی۔

چارلی چپلن نے کہا تھا، بارش میں رونے کا فائدہ ہے کہ کوئی آپ کے آنسو سے واقف نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ عادل نے بھی بارش کا فائدہ اٹھایا اور چند آنسو بہا لیے...... باوجود اس کے کہ وہ جانتا تھا کہ انسانوں کے اس سمندر میں کسی کو اس کے آنسوؤں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

✻✻✻



digestlibrary.com
Scanned with CamScanner

# چیرہ دست

ملک صفدر حیات

**بعض دفعہ انسان کی ذرا سی غلطی اسے موت کے منہ میں پہنچادیتی ہے... اور آن کی آن میں سب ختم ہو جاتا ہے... اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا... وہ رات کے اندھیرے میں گھر سے نکلا تھا... اور کسی سفاک قاتل نے بڑی بیدردی سے اس کی زندگی کا چراغ گل کردیا... شواہد ناپید تھے... کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا... مگر جب ملک صفدر حیات جیسا ذہین اور فرض شناس پولیس افسر سامنے ہو تو... مجرم سات پردوں میں بھی چھپا ہو، وہ اس کی گردن دبوچ ہی لیتے ہیں۔**

## ایک نوجوان کے قتل کی لرزہ خیز واردات کا معما

digest library.com

موضع نظام کوٹ کے تھانے میں میری تعیناتی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اپنے عملے کی زبانی مجھے چودھری نظام دین کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا لیکن ابھی اس سے میری بالشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق چودھری نظام دین زرعی اراضی کی حرص و ہوس کا مارا ہوا ایک ظالم و جابر حکمراں تھا۔ جب وہ من مانی پر اتر آتا تو کوئی اس کے سامنے ٹھہرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ بہرکیف، سو بزدلوں میں کوئی ایک آدھ بہادر بھی نکل ہی آتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی معاملہ تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ ماہ اکتوبر کی ایک خنک اور خوشگوار صبح تھی۔ میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ دو دیہاتی مجھ سے ملنے آگئے۔ میں نے انہیں فوراً اندر بلالیا۔ ان میں سے ایک کی عمر چوبیس سال اور دوسرا لگ بھگ تیس سال کا تھا۔

”تھانیدار صاحب! میرا نام محسن ہے۔“ چوبیس سالہ نوجوان نے اپنا تعارف کراتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”کسی نے میرے چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش کھیتوں میں بیری والے کھوہ (کنوئیں) کے نزدیک پڑی ہے۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور محسن سے استفسار کیا۔



Scanned with CamScanner

''تمہارے چھوٹے بھائی کا نام کیا ہے؟''
''متین!'' اس نے بتایا۔ ''متین کی عمر بائیس سال ہے...... میرا مطلب ہے، تھی۔ اب تو وہ اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔''
سیتن کے ساتھ آنے والے دوسرے بندے کا نام اعجاز تھا۔ وہ سیتن کا پڑوسی تھا۔ میں نے چند ضروری سوالات پوچھنے کے بعد انہیں باہر برآمدے میں بیٹھنے کے لیے کہا اور خود جائے وقوعہ پر جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔
موضع نظام کوٹ میرے تھانے سے لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے کانسٹیبل آفتاب کو اپنے ساتھ لیا اور موقع واردات پر پہنچ گیا۔
وہ چاول کی فصل کی کٹائی کا موسم تھا۔ زیادہ تر کھیتوں میں کٹائی کا عمل مکمل ہو چکا تھا اور بعض جگہ یہ کام جاری تھا۔ میں سیتن کی راہنمائی میں اس کنوئیں پر پہنچ گیا جس کے قریب متین نامی اس نوجوان کی لاش پڑی تھی۔ لاش کے اردگرد نصف درجن کے نزدیک لوگ جمع تھے۔ میں نے ان سب کو ایک طرف ہٹایا اور اکڑوں بیٹھ کر بغور لاش کا معائنہ کرنے لگا۔
مقتول متین کی عمر بائیس کے اریب قریب تھی اور بلاشبہ وہ ایک گبرو جوان تھا۔ میں نے الٹ پلٹ کر اس کے بدن کے ایک ایک حصے کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ سوائے سر کے عقبی حصے کے، مجھے اس کے جسم پر چوٹ کا کوئی نشان دکھائی نہ دیا۔ اس کی کھوپڑی کا پیچھے والا حصہ بری طرح گھائل تھا۔ قاتل نے کسی وزنی لٹھ یا پھر کسی آہنی سلاخ کی مدد سے مقتول کے سر کے عقبی حصے کو نشانہ بنایا تھا جس کے نتیجے میں متاثرہ مقام سے کھوپڑی چٹخ گئی تھی اور یہی کاری ضرب مقتول کی موت کا سبب بھی بنی تھی۔
انسان کے وجود کا سب سے اہم حصہ اس کا دماغ ہوتا ہے۔ قدرت نے اسی لیے دماغ کی حفاظت کے لیے اسے کھوپڑی کے اندر رکھا ہوا ہے۔ کھوپڑی کی ہڈی جسم میں پائی جانے والی دوسری ہڈیوں کی بہ نسبت زیادہ مضبوط اور محفوظ ہوتی ہے۔ مقتول کی کھوپڑی کا بری طرح چٹخ جانا ظاہر کرتا تھا کہ قاتل نے پوری قوت کے ساتھ وار کیا تھا۔
مقتول متین کے سر کے عقبی حصے سے نکلنے والا خون اس کی قمیص کے کالر تک پہنچا تھا اور وہ جم چکا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ مقتول کو دنیا سے رخصت ہوئے آٹھ سے دس گھنٹے گزر چکے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ اسے رات کے درمیانی حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔
جب میں مقتول کی لاش کو پلٹ کر دیکھ رہا تھا تو میرے ذہن میں روشنی کا تیز جھماکا ہوا تھا۔ مقتول کا مردہ جسم جس جگہ پڑا تھا، وہاں زمین پر خون کا کوئی چھوٹا سا دھبا بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک انسان کی پھٹی ہوئی کھوپڑی میں سے خون خارج ہو اور زمین پر اس کے آثار دکھائی نہ دیں۔ مقتول سر پر چوٹ کھانے کے بعد زمین پر گرا تھا تو اس کی کھلی ہوئی کھوپڑی میں سے نکلنے والے خون کو نیچے زمین پر بھی گرنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس انجھی ہوئی صورتِ حال نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا۔
''متین کو کہیں اور قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو یہاں لا کر پھینکا گیا ہے۔''
میں جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کر چکا تھا لیکن اس سنسنی خیز خیال کے تحت میں نے تفتیش کے دائرے کو وسیع کیا اور مزید آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد میں نے اصل جائے وقوعہ کا سراغ پا لیا۔ اس کنوئیں سے کم و بیش ایک فرلانگ (دو سو بیس گز) کے فاصلے پر ایک نہر تھی۔ میں نے مذکورہ نہر کے کنارے پر ایک جگہ خون کے نشانات ڈھونڈ لیے۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ مقتول کو نہر کے کنارے قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو بیری والے کھوہ کے نزدیک ڈال دیا گیا تھا۔ شاطر مجرم عموماً تفتیش کا رخ موڑنے کے لیے اس نوعیت کی چالیں چلتے ہیں۔
میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس خون آلود مٹی کو اٹھا کر ایک برتن میں ڈالا۔ مذکورہ برتن وہاں موجود لوگوں میں سے ایک نے مجھے دیا تھا۔ یہ ایک طرح کا ''بلڈ سیمپل'' تھا جو لیبارٹری اسٹاف کے کام آسکتا تھا۔ اس نمونے سے یہ پتا لگایا جاسکتا تھا کہ آیا وہ مقتول متین ہی کا خون تھا۔
میں نے کانسٹیبل آفتاب کی نگرانی میں متین کی لاش کو ضلعی اسپتال بھجوانے کا بندوبست کیا پھر وہاں موجود لوگوں سے پوچھ تاچھ کرنے لگا۔ سب سے پہلے میں نے مقتول کے بڑے بھائی سیتن سے سوال کیا۔
''اس زمین کا مالک کون ہے؟''
''یہ ہماری زمین ہے تھانیدار صاحب!'' اس نے بتایا۔ ''یہاں سے وہاں تک......!'' وہ انگلی سے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''نہر کے کنارے سے لگی ہوئی یہ چودہ ایکڑ زرعی اراضی ہماری ملکیت ہے۔''
''تمہیں کب پتا چلا کہ تمہارے بھائی کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟''



Scanned with CamScanner

"آج صبح جناب!" اس نے جواب دیا۔ "مجھے لیاقت نے گھر آ کر بتایا تھا کہ متین کی لاش بیری والے کھوہ کے پاس پڑی ہے۔ اس وقت میں اپنی زمین کی طرف آنے کے لیے گھر سے نکلنے ہی والا تھا۔"

"کیا لیاقت یہاں موجود ہے؟" میں نے سوالیہ نظر سے سب کی طرف دیکھا۔

پکے رنگ کا ایک میانہ قد بندہ آگے آیا اور کہا۔ "تھانیدار صاحب! میرا نام لیاقت ہے۔"

"مجھے بتاؤ، تم نے لاش کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟" میں نے لیاقت سے پوچھا۔

"یہ آج ہی صبح کی بات ہے سرکار!" لیاقت نے رسان بھرے لہجے میں بتایا۔ "میں حسبِ معمول کھیتوں کی طرف آیا تو میں نے کھوہ کے پاس کسی کو سوئے ہوئے دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی صبح یہاں کون سو رہا ہے لیکن جب میں کھوہ کے نزدیک آیا تو صورتِ حال مجھ پر کھل گئی۔ متین یہاں مرا پڑا تھا۔"

میں نے لیاقت کے چہرے پر نگاہ جما کر استفسار کیا۔ "متین کی لاش کو دیکھنے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟"

"میں نے 'لاش...... لاش' کی دہائی دینا شروع کر دی۔" اس نے اضطراری انداز میں بتایا۔ "آس پاس کے کھیتوں میں چند لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ میرے شور مچانے پر وہ ادھر آ گئے۔ بس جی پھر میں......" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر ان الفاظ میں بات مکمل کر دی۔

"میں سیدھا مبین کے گھر گیا اور اسے متین کی لاش کے بارے میں بتایا۔ یہ میرے ساتھ ہی یہاں آ گیا تھا۔"

"اپنے چھوٹے بھائی کی لاش دیکھ کر میرا تو دماغ ہی گھوم گیا تھا، تھانیدار صاحب!" مبین نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "پھر کسی سیانے نے مجھے مشورہ دیا کہ فوراً تھانے جا کر اس واقعے کی رپورٹ درج کرانا چاہیے۔ میں نے اپنے پڑوسی اعجاز کو ساتھ لیا اور آپ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے بعد کا حال تو آپ کو پتا ہی ہے۔"

"ہاں، پتا ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "لیکن میں اس سے پہلے کا حال بھی جاننا چاہتا ہوں۔"

میری بات مبین کے پلے نہ پڑی اور وہ الجھن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھا نہیں تھانیدار صاحب!"

وہاں موجود افراد سے میں فرداً فرداً پوچھ تاچھ کر چکا تھا اور اس سعی میں مجھے ایک بھی ایسی بات پتا نہیں چلی تھی جو متین کو پیش آنے والے اس جان لیوا واقعے پر روشنی ڈال سکے۔ میں نے مبین کی الجھن کے جواب میں کہا۔

"کیا تمہاری نظر میں ایسی کوئی جگہ ہے جہاں ہم آرام سے بیٹھ کر بات کر سکیں؟"

"ادھر نزدیک ہی میرا گھر ہے۔" اس نے بتایا۔ "آپ میرے ساتھ آ جائیں اور جو بھی پوچھنا ہے، پوچھ لیں۔ آپ کو دیکھ کر اماں کی بھی تسلی ہو جائے گی۔ جب سے اماں نے متین کی موت کا سنا ہے، اس کا برا حال ہے۔ میں اسے گھر میں روتا دھوتا چھوڑ کر ادھر آ گیا تھا۔"

مبین کی تجویز نما پیشکش معقول اور برمحل تھی لہٰذا میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

☆☆☆

وہ پندرہ مرلے (ساڑھے چار سو مربع گز) قطعہ زمین پر بنا ہوا ایک کشادہ اور ہوادار مکان تھا جس کے عقبی حصے میں پہلو بہ پہلو دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ دوسرے کمرے کے اختتام پر لمبائی کے رخ تیسرا قدرے بڑا کمرا تھا۔ ان تین کمروں کو اگر اوپر سے دیکھا جائے تو وہ انگریزی کے ایل (L) کی طرح نظر آتے تھے۔ تینوں کمروں کے آگے آٹھ فٹ چوڑا برآمدہ تھا، اس کے بعد کشادہ صحن تھا جس کے عین وسط میں برگد (بڑ) کا ایک عمر رسیدہ درخت استادہ تھا۔

مکان کے سامنے والے حصے میں بھی داخلی دروازے کے ساتھ مناسب سائز کا ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ پال مویشیوں کے لیے ایک شیڈ سے مشابہ جگہ تھی جہاں پر میں نے ایک بھینس، دو بکریاں اور ایک گدھا بندھا دیکھا۔ اس گدھے کے نزدیک ہی اس کی گاڑی بھی موجود تھی تاہم مذکورہ گدھا، گاڑی میں جتا ہوا نہیں تھا۔

برگد کے گھنے سایہ درخت کے نیچے ایک چارپائی پہلے سے بچھی ہوئی تھی۔ مبین میرے لیے ایک کرسی لے آیا۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"مبین! اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے بھائی کے قاتل کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دلواؤں تو تمہیں میرے ہر سوال کا کھرا اور سچا جواب دینا ہوگا۔"

"میں دوں گا۔" وہ دلگرفتہ لہجے میں بولا۔ "متین مجھے بہت عزیز تھا جناب! پتا نہیں کس ظالم نے میرے بھائی

کی زندگی چھین لی ہے۔"

"وہ ظالم جو کوئی بھی ہے، بچے گا نہیں۔" میں نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔ "تم نے متین کے سر کا زخم دیکھا ہے، اس کی چٹخی ہوئی کھوپڑی میں سے خارج ہونے والا خون جم چکا تھا اور خون کے اس جماؤ کو دیکھ کر میں اپنے پیشہ ورانہ تجربے کی روشنی میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی موت رات کے درمیانی حصے میں واقع ہوئی ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ مقتول متین آدھی رات کے وقت وہاں کیا کرنے گیا تھا؟"

"مجھے خود اس بات پر حیرت ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

میں نے ترنت پوچھا۔ "کس بات پر؟"

"یہی کہ وہ پچھلی رات کھیتوں میں کیوں گیا تھا؟"

اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جب تک ابا جی زندہ تھے، وہ اور ہم دونوں بھائی مل کر کاشت کاری کیا کرتے تھے۔ ایک سال پہلے ابا جی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ایک زہریلے سانپ کے ڈس لینے سے ان کی موت واقع ہوئی تھی۔ اس افسوسناک واقعے کے بعد میں اور متین کھیتوں میں کام کرنے لگے۔ متین روزانہ صبح مجھ سے پہلے زمینوں کی طرف چلا جاتا تھا، میں بعد میں گھر سے نکلتا تھا۔ میں تو آج بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ کام کے لیے کھیتوں میں جا چکا ہوگا۔ جب میں یہاں سے روانہ ہونے لگا تو لیاقت نے آ کر بتایا۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔ "مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ......!" وہ اچانک چپ ہو گیا۔

مبین کی خاموشی کے پیچھے کوئی ایسا راز چھپا ہوا نہیں تھا جس کے افشا کے ڈر سے وہ بولتے بولتے رک گیا ہو بلکہ یہ اس کے دل کا بوجھ تھا جس نے قوتِ گویائی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

"متین کو بڑی بے رحمی اور سنگ دلی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کسی سفاک آدمی سے اس نے دشمنی پال رکھی تھی۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"تھانیدار صاحب! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ متین کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔" وہ روہانسی آواز میں بولا پھر ایک خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ متین راہزنوں کے ہتھے چڑھ گیا ہو۔ جب انہیں متین کے پاس زیادہ مال پانی نہیں ملا تو ان بدبختوں نے اس کی جان لے لی۔"

"مبین! تمہارا یہ خیال موجودہ صورتِ حال میں فٹ نہیں بیٹھتا۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "راہزن صرف اسی وقت کسی شکار کو موت کے گھاٹ اتارتے ہیں جب وہ ان کے سامنے مزاحمت پیش کر رہا ہو۔ متین کے بدن پر ایسے نشانات نظر نہیں آئے جن کی بنا پر یہ کہا جائے کہ مقتول کی ان راہزنوں سے ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں راہزن اپنے شکار کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے بعد اس کی لاش کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پھینکنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ......اور سب سے بڑا سوال یہ کہ متین آدھی رات کو کھیتوں کی طرف کیوں گیا تھا؟" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

"میری بات دھیان سے سنو مبین! تمہارے بھائی کے سر پر پیچھے سے وار کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا دشمن تعاقب کرتے ہوئے جائے وقوعہ پر پہنچا تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بندے تھے جنہیں پتا تھا کہ مقتول کہاں ملے گا۔ انہوں نے نہر کے کنارے پر اسے قتل کیا پھر اس کی لاش کو اٹھا کر بیری والے کھوہ کے قریب ڈال دیا۔ میں سمجھتا ہوں تمہارے بھائی کی موت کا بیری والے کھوہ سے بھی کوئی ناتا ہے۔ قاتل نے اپنی کارروائی کو بیری والے کھوہ کے ساتھ جوڑ کر کچھ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"تھانیدار صاحب! میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بڑے کرب سے بولا۔ "میں متین کے کسی ایسے دشمن سے واقف نہیں ہوں بلکہ اس کا تو کوئی دشمن تھا ہی نہیں۔"

"ٹھیک ہے، متین کے دشمن یعنی اس کے قاتل کو میں خود ڈھونڈ نکالوں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس گھر میں تمہارے علاوہ اور کون کون رہتا ہے؟"

"میری اماں جی اور سلمیٰ۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"سلمیٰ میری بیوی ہے تھانیدار صاحب!" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ہماری شادی کو ڈیڑھ سال ہو گیا ہے مگر ابھی تک ہمارے بچے نہیں ہوئے۔"

"شادی ہو گئی ہے تو بچے بھی ضرور ہوں گے، بس اللہ سے اُمید لگائے رکھو۔ اولاد دینے اور اس نعمت سے محروم رکھنے کا اختیار صرف اسی ذاتِ پاک کو ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا مقتول کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔



digest library.com

Scanned with CamScanner

میں نے استفسار کیا۔ ''کیا اس کی کہیں منگنی وغیرہ ہو چکی تھی؟''

''نہیں جناب!'' مبین نے بتایا۔ ''شادی کے ذکر کو وہ ہمیشہ مذاق میں اڑا دیتا تھا حالانکہ اماں جی کی شدید خواہش تھی کہ متین کی جلد از جلد شادی ہو جائے مگر وہ اس معاملے پر سنجیدہ نہیں ہوتا تھا۔''

''میں متین کا کمرا دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

مبین مجھے مکان کے عقبی حصے میں بنے ہوئے ایک پندرہ بائی پندرہ فٹ کے کمرے میں لے گیا اور کہا۔ ''چند ماہ پہلے تک یہ کمرا متین کے استعمال میں تھا۔''

''اور اب؟'' میں نے استفساریہ نظر سے اسے دیکھا۔

''ان دنوں وہ داخلی دروازے کے ساتھ بنے ہوئے چھوٹے کمرے میں رہ رہا تھا۔'' مبین نے جواب دیا۔ ''اماں نے بہت ضد کی کہ وہ واپس اپنے پہلے والے کمرے میں آ جائے لیکن متین نہیں مانا۔ میں نے بھی اسے قائل کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بات دراصل یہ ہے جناب......!'' لحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''آپ دیکھ رہے ہیں نا، اس کمرے کے برابر میں بھی اسی کے سائز کا کمرا ہے۔ اس کمرے میں اماں جی رہتی ہیں اسی لیے وہ چاہتی تھیں کہ متین ان کے بہت زیادہ قریب رہے لیکن یہ ہو نہیں سکا۔ ابا جی کے انتقال کے بعد اماں خود کو تنہا سمجھنے لگی ہیں حالانکہ ان کے پہلو میں یہ مستطیل کمرا میرے اور سلمٰی کے استعمال میں ہے مگر اماں کا زیادہ دھیان متین میں ہی لگا رہتا تھا۔''

''ایسا ہوتا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''والدین عموماً سب سے چھوٹے بچے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔''

مبین والے کمرے کی پیمائش بارہ بائی پندرہ فٹ تھی اور یہی کمرا باقی دو کمروں کے ساتھ مل کر ایل (L) بناتا تھا۔ اس دوران میں مبین اور مقتول متین کی ''اماں جی'' بھی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس روایتی دیہاتی عورت کا نام رسول بی بی تھا۔ رسول بی بی کی عمر کا اندازہ میں نے بیالیس کے آس پاس لگایا۔ بیٹے کی الم ناک موت نے رسول بی بی کو حد درجہ ملول اور پژمردہ کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا اس اندوہناک واقعے نے اس کے بدن کا سارا خون نچوڑ ڈالا ہو۔

میں نے اس دکھیاری ماں سے اظہار ہمدردی کیا تو اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ ''تھانیدار صاحب!'' وہ نمناک لہجے میں بولی۔ ''میرے متین کا آخر قصور کیا تھا۔ اسے کس گناہ کی سزا دی گئی ہے؟ اس نے تو کبھی کسی کو ''اوئے'' تک نہیں کہا تھا۔''

''مجھے تم سے اور اس گھر کے ہر فرد سے دلی ہمدردی ہے رسول بی بی!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم لوگوں سے میرا وعدہ ہے کہ میں جلد از جلد متین کے قاتل کو گرفتار کر کے اسے ایسی عبرت ناک سزا دلواؤں گا کہ آئندہ کسی مجرم کو انسانی جان سے کھیلنے کی جرأت نہیں ہو گی۔''

''کیا قاتل کو سزا مل جانے سے میرا متین واپس آ جائے گا تھانیدار صاحب؟'' رسول بی بی نے زخمی لہجے میں استفسار کیا۔

اس سوال کا مبنی برحقائق سفاک جواب تو ''نہیں'' ہی تھا لیکن میں سچ بول کر رسول بی بی کو مزید دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو، میں نے پہلو تہی سے کام لیتے ہوئے مبین سے کہا۔

''مبین! اماں جی کا خیال رکھنا تم دونوں میاں بیوی کی ذمے داری ہے۔ مجھے امید ہے تم لوگ اس کام میں کسی غفلت یا کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کرو گے۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

''جی تھانیدار صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے فرض کو اچھے سے ادا کروں گا اور اپنی بیوی سلمٰی کو بھی اماں جی کا خیال رکھنے کی تلقین کروں گا۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے مبین کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''مجھے تم سے یہی امید ہے۔''

''ساری غلطی میری ہے تھانیدار صاحب!'' رسول بی بی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''شاہ جی نے مجھے تاکید بھی کی تھی کہ متین دوسرے جوانوں سے الگ اور منفرد لڑکا ہے۔ اس کا حد سے زیادہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے لیکن افسوس، کہ میں ایسا نہ کر سکی اور متین مارا گیا......آہ!''

''کون شاہ جی؟'' رسول بی بی کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھ لیا۔

''اپنے کرامت علی شاہ صاحب!'' رسول بی بی نے جواب دیا۔

''پیر کرامت علی عرف شاہ جی ادھر نظام کوٹ ہی میں رہتے ہیں تھانیدار صاحب!'' مبین نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''وہ ایک پہنچے ہوئے روحانی انسان ہیں۔ اس گاؤں کے لوگ ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ آپ نے ان کا نام نہیں سنا؟''

مبین کے آخری جملے سے حیرت جھلکتی تھی۔ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس علاقے میں



Scanned with CamScanner

آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے ان شاہ جی کا نام آج پہلی بار سنا ہے۔"

"شاہ جی بہت ہی کرنی والے بزرگ ہیں تھانیدار صاحب!" رسول بی بی نے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔ "انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ میرے متین پر کسی شیطانی قوت کی نظر ہے اس لیے مجھے متین کی بہت زیادہ حفاظت کرنا چاہیے لیکن میں ایسا نہ کرسکی۔" وہ ندامت آمیز انداز میں متوقف ہوئی پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"مجھے اس بات کا ہمیشہ پچھتاوا رہے گا کہ میں متین کا اتنا زیادہ خیال نہ رکھ سکی جیسا کہ شاہ جی نے مجھے ہدایت کی تھی۔ وہ میرے ساتھ والے کمرے میں رہتا تھا تو میں نے اس پر بھرپور نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ وہ جب سے سامنے والے کمرے میں منتقل ہوا ہے، مجھے پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کب سویا، کب جاگا اور کب گھر سے نکلا۔ اگر مجھے خبر ہو جاتی کہ وہ آدھی رات کو کھیتوں کی طرف جارہا ہے تو میں اسے روک لیتی...... ایسا لگتا ہے، اسی شیطانی قوت نے میرے متین کی جان لی ہے۔"

رسول بی بی غم سے نڈھال اعصاب کے ساتھ جو کچھ بھی کہہ رہی تھی، میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تاہم میں نے اس زخمی دل عورت کو روکا اور ٹوکا بھی نہیں۔ جب وہ اپنی بات مکمل کرچکی تو میں نے اس کی سوچ کی روشنی میں رہتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

"رسول بی بی! متین کی موت کی ذمے دار کوئی شیطانی قوت ہے یا یہ اس کے کسی دشمن کا یعنی کسی انسان کا کام ہے، میں جلد یا بہ دیر اس کا پتا لگالوں گا۔ متین کا قاتل میرے ہاتھ سے بچ نہیں پائے گا۔"

وہ مجھے ایسی نظر سے تکنے لگی جیسے میں نے اسے کوئی ناممکن کام کرنے کی یقین دہانی کرائی ہو۔

گھر کے سامنے والے حصے میں بنا ہوا کمرا بارہ بائی بارہ فٹ کا تھا۔ ان دنوں وہی کمرا مقتول متین کے استعمال میں تھا۔ میں نے مذکورہ کمرے کی اچھی طرح چھان پھٹک کی لیکن مجھے وہاں سے کوئی بھی ایسی شے یا اشارہ نہ ملا جو اس کے قتل کی گتھی کو سلجھانے میں میری مدد کرسکتا۔

دوپہر کے وقت میں واپس اپنے تھانے آگیا۔

☆☆☆

آئندہ روز سہ پہر کے بعد ضلعی اسپتال سے متین کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش تھانے پہنچادی گئی۔ لاش کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی آگئی تھی۔ مذکورہ رپورٹ کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

مقتول متین کی موت گیارہ اور بارہ اکتوبر کی رات دس اور بارہ بجے کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی تھی اور اس موت کا سبب سر کے عقبی حصے میں لگنے والی وہی چوٹ تھی جس نے اس کی کھوپڑی کو بری طرح چٹخا دیا تھا۔ علاوہ ازیں میں نے خون کا جو نمونہ لاش کے ساتھ اسپتال بھجوایا تھا، وہ مقتول کے خون سے میچ کرگیا تھا۔ گویا میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ مقتول متین کو نہر کے کنارے پر قتل کیا گیا تھا، بعد ازاں اس کی لاش کو اٹھا کر بیری والے کھوہ کے نزدیک پھینک دیا گیا تھا۔

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اسپتال سے جو لیبارٹری رپورٹس آئی تھیں، ان میں سے ایک کیمیکل ایگزامنر کی جاری کردہ تھی اور مذکورہ رپورٹ کے مطابق مقتول متین کے معدے میں کسی زہریلی اور نشہ آور شے کے اثرات بھی پائے گئے تھے۔ میرے لیے یہ پوائنٹ کسی سنسنی خیز انکشاف سے کم نہیں تھا۔

مقتول کا بڑا بھائی مبین لاش لینے تھانے آیا تو میں نے اس سے کہا۔ "تدفین کا کیا پروگرام ہے؟"

"یہ کام آج ہی کرنے کا ارادہ ہے۔" اس نے اداس لہجے میں بتایا۔ "میرا خیال ہے، شام تک سب نمٹ جائے گا۔"

"اللہ تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔" میں نے صدقِ دل سے کہا اور پوچھا۔ "جس رات متین کی موت واقع ہوئی، کیا اس شام تم سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا تھا؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "رات کا کھانا ہم سب ایک ساتھ بیٹھ کر ہی کھاتے ہیں تھانیدار صاحب!"

"گیارہ اکتوبر کی شام آپ لوگوں نے کیا کھایا تھا؟"

"آلو اور گوبھی کا سالن تھا اور تنور کی روٹیاں۔"

"تم سب نے یہی کھانا کھایا تھا نا؟" میں نے تصدیق طلب انداز میں استفسار کیا۔

"جی ہاں۔" مبین کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ "تھانیدار صاحب! آپ اس رات والے کھانے پر اتنا زور کیوں دے رہے ہیں؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"تمہارے گھر میں کھانا کون بناتا ہے؟" میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"میری بیوی سلمٰی!"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ایک گہری سانس خارج



Scanned with CamScanner

کرتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے بھائی کی لاش لے جاؤ۔ میں کل دن میں تمہارے گھر آؤں گا پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔"

"کس موضوع پر تھانیدار صاحب؟" وہ منت ریز لہجے میں مستفسر ہوا۔ "میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ آپ نے مجھے اور مشکل میں ڈال دیا ہے۔ کچھ بتائیں تو سہی آخر اس کھانے کا متین کی موت کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

"متین کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ مقتول کے معدے میں خواب آور زہریلا مواد پایا گیا ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔ "تم چاروں نے ایک ساتھ بیٹھ کر آلو گوبھی کے سالن کے ساتھ روٹی کھائی تھی۔ اس کا مطلب ہے، اس کھانے میں کوئی نشہ آور زہریلی چیز شامل نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو تم لوگ بھی زہر خورانی کا شکار ہو جاتے۔ بادی النظر میں یہی لگ رہا ہے کہ متین نے رات کے کھانے کے بعد کوئی ایسی شے کھائی تھی یا کسی اور نے اسے کھلائی تھی جس کے اندر زہر ملا ہوا تھا۔"

"متین خود اپنی جان لینے کی کوشش کیوں کرے گا تھانیدار صاحب؟" مبین نے لاچاری بھرے لہجے میں پوچھا۔ "اور پھر آپ نے دیکھا ہے، اس کی موت سر کے عقبی حصے میں لگنے والی خطرناک چوٹ کے باعث واقع ہوئی ہے۔"

"اس امر میں تو کوئی شک نہیں کہ متین کی موت کا سبب وہی مہلک چوٹ ہے جس نے اس کی کھوپڑی کو چٹخا دیا تھا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "لیکن ڈاکٹر کی رپورٹ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عین ممکن ہے کہ قاتل نے متین کی جان لینے سے پہلے اسے کوئی ایسی مضر صحت چیز کھلا دی ہو جس کے زیر اثر وہ مزاحمت کرنے کے قابل نہ رہا ہو۔ بہرکیف.....!" میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"دن ڈھلنے میں زیادہ وقت نہیں ہے۔ تم متین کی لاش کو لے کر گھر پہنچو۔ اس حوالے سے ہم کل تفصیلی بات چیت کریں گے۔"

اس کے بعد مبین نے کوئی سوال نہیں کیا۔

اس رات سونے سے پہلے میں کافی دیر تک متین کی موت پر غور و فکر کرتا رہا۔ پوسٹ مارٹم اور دیگر لیبارٹری رپورٹس کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو کئی ایک چیزیں آپس میں خلط ملط نظر آتی تھیں۔ یہ بات تو طے ہو گئی تھی کہ سر کے عقبی حصے پر کیے جانے والے کاری وار نے متین کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا لیکن موت کے منہ میں جانے سے پہلے مقتول کے ساتھ جو ہوا تھا، وہ سنسنی خیز اور فکر انگیز تھا جس کے نتیجے میں کئی ایک سوالات جنم لیتے تھے۔ جیسا کہ.....!

متین نے کوئی نشہ آور شے کیوں استعمال کی؟ اگر یہ اس کا اپنا فعل نہیں تھا تو پھر وہ کون شخص تھا جس نے اسے ایسا کچھ کھلایا تھا؟ وہ آدھی رات کو کھیتوں کی طرف کیوں گیا تھا؟ کیا وہاں وہ کسی سے ملاقات کرنے والا تھا؟ کیا اسی ملاقاتی نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا تھا؟..... وغیرہم۔

میں اس حوالے سے جس قدر سوچ رہا تھا، میرا دماغ اتنا ہی زیادہ الجھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی رسول بی بی کی کہی ہوئی باتیں بھی مجھے یاد آ رہی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ کسی شیطانی قوت نے متین پر بری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ رسول بی بی کے مطابق، متین کی موت میں اسی شیطانی قوت کا ہاتھ ہو سکتا تھا لیکن میں ایسی لایعنی باتوں پر بالکل یقین نہیں رکھتا۔

میں اس دنیا میں رحمانی اور شیطانی قوتوں کی موجودگی، اثر انگیزی اور عملداری سے انکاری نہیں مگر متین کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ کسی شیطانی قوت کو ایک انسان کی جان لینے کے لیے اتنا لمبا چوڑا کھٹ راگ پھیلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ سیدھی سیدھی قتل کی ایک لرزہ خیز واردات تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل، مقتول کے لیے اپنے دل میں بہت زیادہ عناد رکھتا تھا۔

شیطانی قوت والی کہانی پیر کرامت شاہ نے رسول بی بی کے ذہن میں ڈالی تھی۔ میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں درجنوں ڈبا پیروں اور ان کی جعلی بزرگی کو بے نقاب کیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ پیر کرامت علی عرف "شاہ جی" کس کھیت کی مولی تھا۔ رسول بی بی نے مجھے بتایا تھا کہ شاہ جی موضع نظام کوٹ ہی کا رہنے والا تھا۔

کرامت شاہ کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے ذہن میں کانسٹیبل آفتاب احمد کا نام چمکا۔ آفتاب احمد موضع جمال پور کا رہنے والا تھا۔ جمال پور میرے تھانے سے دو میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق جمال پور کی آبادی پانچ سو نفوس پر مشتمل تھی، یعنی اس دیہات میں کم و بیش سو مکانات تھے۔ آفتاب روزانہ اپنی سائیکل پر تھانے آتا اور واپس اپنے گھر جاتا تھا۔ یہاں پر آفتاب کی یاد مجھے اس کی بیوی فریدہ کی وجہ سے آئی تھی۔

فریدہ کا میکا موضع نظام کوٹ میں تھا۔ آفتاب نے

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

مجھے بتا رکھا تھا کہ پانچ سال پہلے فریدہ سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ ان کے دو بچے تھے۔ آفتاب کے مطابق فریدہ مزاج کی بہت تیز اور قبضہ مافیا ٹائپ کی عورت تھی۔ آفتاب اس کے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔

میں اس علاقے میں نیا تھا چنانچہ نظام کوٹ کے اندرونی حالات و معاملات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے میں نے آفتاب کی بیوی فریدہ سے کام لینے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

چودہ اکتوبر کی صبح آفتاب اپنی ڈیوٹی پر آیا تو میں تھانے میں اس کا منتظر تھا۔ جب مجھے اس کی آمد کا پتا چلا تو میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

آفتاب احمد جب اندر داخل ہوا تو اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس نے اپنے سر پر دیسی طرز کی ایک پٹی باندھ رکھی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا تو میں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''آفتاب! اپنے سر کے ساتھ کیا کر بیٹھے ہو؟''

''ملک صاحب! چوٹ لگ گئی ہے۔'' اس نے نگاہ چُراتے ہوئے جواب دیا۔ ''کوئی خاص بات نہیں، معمولی سا زخم ہے۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔''

''معمولی سی چوٹ کے لیے کوئی اتنا بڑا پگڑ نہیں باندھتا آفتاب!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بتاؤ، تم نے کون سا نیا تجربہ کیا ہے؟ کیا فریدہ سے پٹ کر آ رہے ہو؟''

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''آپ کو کس نے بتایا؟''

''کسی کو کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے چہرے پر مظلومیت کی داستان رقم ہے۔ بتاؤ اب کی بار کس بات پر تم فریدہ کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے ہو؟ میں سچ سننا چاہتا ہوں۔''

''میں وہ سچ آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں ملک صاحب!'' وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

آفتاب نے اپنی جیب کے اندر سے چاندی کی ایک پازیب نکال کر میرے سامنے میز پر رکھنے کے بعد یقین بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس پائل کی وجہ سے فریدہ نے ڈنڈا مار کر میرا سر پھاڑ دیا ہے۔''

''کیا وہ تم سے پاؤں کا ایسا ہی زیور لا کر دینے کو کہہ رہی ہے؟'' میں نے چاندی کی اس پائل کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد آفتاب سے پوچھا۔ ''یہ کوئی ایسا مطالبہ نہیں ہے جسے پورا کرنا تمہارے بس میں نہ ہو۔''

''بات مطالبے یا فرمائش کی نہیں ہے ملک صاحب!'' وہ حد درجہ کڑوے لہجے میں بولا۔ ''وہ سیدھا سیدھا مجھ پر شک کر رہی ہے۔''

''کیسا شک؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''اسے شک ہے کہ میں نے یہ چھا نجھر کسی اور عورت کو دینے کے لیے خریدی ہے۔'' اس نے مسکینیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی طرف سے سو صفائیاں پیش کر چکا ہوں مگر اسے یقین نہیں آیا۔ جب بات زیادہ بڑھ گئی تو اس نے ڈنڈا اٹھا کر میری کھوپڑی کے پچھلے حصے پر مارا اور مجھے لہولہان کر دیا۔''

''شکر کرو کہ تم ابھی تک زندہ نظر آ رہے ہو ورنہ کھوپڑی پر لٹھ یا ڈنڈا کھانے سے انسان ''انا للہ'' بھی ہو جاتا ہے۔'' میں نے شرارت آمیز انداز میں کہا۔ ''تم نے متین کا حشر تو دیکھا ہے نا۔''

''آپ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں ملک صاحب!'' اس نے شاکی نظر سے مجھے دیکھا۔

''یہ مذاق اس وقت تک اُڑتا رہے گا جب تک تم مجھے اس پائل کی حقیقت نہیں بتاؤ گے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم نے اس حوالے سے فریدہ کے سامنے کیا وضاحت دی ہے؟''

''ملک صاحب! یہ پازیب مجھے بارہ اکتوبر کی صبح جائے وقوعہ سے ملی تھی۔'' اس نے معتدل انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''جب آپ مقتول متین کی لاش کا معائنہ کر رہے تھے تو میں اِدھر اُدھر گھوم کر کوئی اہم سراغ تلاش کرنے کی کوشش میں تھا اور اسی وقت بیری والے کھوہ کے نزدیک مجھے یہ پازیب پڑی ملی تھی۔ میں نے اس خیال سے پازیب کو اپنی جیب میں رکھ لیا تھا کہ جب آپ موقع کی کارروائی سے فارغ ہوں گے تو میں آپ کو اس کے بارے میں بتاؤں گا۔ پھر یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی اور آپ نے مجھے لاش کے ساتھ سرکاری اسپتال بھیج دیا۔ یہ میرے دماغ کی غلطی ہے کہ اس پازیب کا مجھے بالکل خیال نہیں رہا۔ رات کو میں ڈیوٹی سے چھٹی کر کے اپنے گھر چلا گیا۔ اگلے روز فریدہ میرے کپڑے دھونے لگی تو وردی کی ایک جیب سے اسے یہ پازیب مل گئی۔ اس کے بعد جو ہوا ہوگا، وہ اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس

نے دو تین گہری سانسیں لیں پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

"پچھلی رات میں گھر گیا تو فریدہ غصے سے بھری بیٹھی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے جھگڑا شروع کر دیا جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔" اس نے اپنے پٹی بردار سر کی جانب اشارہ کیا اور عجیب سے لہجے میں بولا۔ "میں نے واضح الفاظ میں اس سے کہہ دیا ہے کہ اگر میری بات کا یقین نہیں تو تھانے جا کر ملک صاحب سے تصدیق کر لو۔"

"یہ بات تم نے ڈنڈا کھانے سے پہلے کی تھی یا بعد میں؟"

"بعد میں۔"

"اگر پہلے کرتے تو شاید فریدہ کے عتاب سے محفوظ رہتے۔" میں نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ "ویسے میں بھلا کیسے اس بات کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ یہ پازیب تمہیں بیری والے کھوہ کے پاس سے ملی تھی۔ تم نے اس بارے میں مجھے کب بتایا تھا؟"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

کانسٹیبل آفتاب احمد کے چہرے سے فکرمندی جھلکنے لگی۔ "نہ کریں ملک صاحب......" اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ "فریدہ نے میرا سر پھاڑ دیا ہے۔ اگر آپ نے میرے بیان کی تصدیق نہ کی تو ہمارا گھر میدانِ جنگ بن جائے گا۔"

میں نے تفریح لینے والے انداز میں پوچھا۔ "زیادہ سے زیادہ وہ کیا کر سکتی ہے؟"

"فریدہ دونوں بچوں کو اٹھائے گی اور جا کر اپنے میکے میں ڈیرا جا لے گی۔" اس نے جواب دیا۔ "اور میں بے چارہ رہ جاؤں گا بے یار و مددگار۔"

"تو ٹھیک ہے، میں فریدہ کی، میکے میں جا بیٹھنے کی تمنا پوری کر دیتا ہوں۔" میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اس طرح تمہیں بھی ایک، دو دن آرام کا موقع مل جائے گا۔"

"میں سمجھا نہیں ملک صاحب!" وہ پُرتشویش انداز میں پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "آخر آپ کرنا کیا چاہ رہے ہیں؟"

"آفتاب! میری بات دھیان سے سنو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تفریح بہت ہو چکی۔ اب کچھ سنجیدہ باتیں ہو جائیں۔"

وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے اسے رسول بی بی کے خدشات، شاہ جی کے فرمودات، اپنے تحفظات اور اس کے انکشافات پر ایک سیر حاصل لیکچر دینے کے بعد معتدل انداز میں کہا۔

"میں نے تمہیں جو کچھ سمجھایا ہے، یہ سب فریدہ کے گوش گزار کرنے کے بعد تم لوگ دو دن کے لیے نظام کوٹ کی طرف "ایم بی بی ایس" ہو جاؤ۔"

"ایم بی بی ایس......!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور کہا۔ "یہ تو ڈاکٹری کی ڈگری ہوتی ہے نا؟"

"بالکل ہوتی ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"مگر ہم چاروں میں سے تو کوئی بھی ڈاکٹر نہیں ہے؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا آفتاب۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "یہاں پر میں نے ایم بی بی ایس کا استعمال دراصل "میاں بیوی بچوں سمیت" کے لیے کیا ہے۔ تم آج ہی فریدہ اور دونوں بچوں کو لے کر موضع نظام کوٹ روانہ ہو جاؤ۔ میں نے تمہیں جو تفصیلات بتائی ہیں، ان کی روشنی میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ اگر یہ پتا چل جائے کہ چاندی کی پازیب کس لڑکی یا عورت کی ہے تو ہم یہ جاننے میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ وقوعہ کی رات مقتول متین کھیتوں کی طرف کیوں گیا تھا۔"

"تو آپ کو یہ پیار محبت والا معاملہ لگتا ہے؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور میز پر رکھی چاندی کی پائل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جائے وقوعہ پر اس زیور کی موجودگی مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ عشق کے معاملات بڑے عجیب اور خوف ناک ہوتے ہیں آفتاب۔" میں نے ذرا دیر کو رک کر ایک طویل اور گہری سانس خارج کی پھر پُرخیال انداز میں اضافہ کر دیا۔

"اگر مقتول متین کا، نظام کوٹ کی کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ کوئی چکر چل رہا تھا تو عین ممکن ہے، کسی نے اس لڑکی کا تعاقب کیا ہو اور موقع ملتے ہی اس نے متین کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔ وہ اس لڑکی کا کوئی طلب گار بھی ہو سکتا ہے جس کی نظر میں مقتول کباب میں ہڈی کی حیثیت کا حامل ہو یا پھر قاتل اس لڑکی کا بھائی، باپ یا کوئی چاچا، ماما بھی ہو سکتا ہے جس نے غیرت کے نام پر متین کا کام تمام کر دیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں، تمہاری تیز و طرار بیوی، نظام کوٹ میں پازیب کی مالک کو بہ آسانی ڈھونڈ سکتی ہے۔ وہ فریدہ کا آبائی گاؤں ہے۔ کئی ایک مردوں اور عورتوں کے معاشقوں کے بارے میں وہ جانتی ہوگی۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔" وہ



Scanned with CamScanner

تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''سچ پوچھیں تو آپ بہت دور کی کوڑی لائے ہیں جناب...... مجھے یقین ہے، ہم بہت جلد متین کے قاتل کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔''

میں نے پورے تیقن کے ساتھ کہا۔ ''ان شاء اللہ۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں ابھی اس مشن پر روانہ ہوجاتا ہوں۔'' اس نے پُرعزم لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا میں یہ جھانجھر اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں؟''

''ہاں، ضرور۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس پازیب کی مالک کو تلاش کرنے کے لیے یہ تم لوگوں کے پاس ہونا چاہیے لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا کہ یہ پازیب کہیں اِدھر اُدھر نہ ہوجائے۔ قاتل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے فی الوقت ہمارے پاس یہی پائل واحد ذریعہ ہے۔''

''میں آپ کی بات سمجھ گیا ملک صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں اپنی جان سے بڑھ کر اس کی حفاظت کروں گا۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اگر تمہارے سر کا زخم زیادہ گہرا اور خطرناک نہیں ہے تو سُسرال کا رخ کرنے سے پہلے اس پٹے کو اتار دینا ورنہ وہاں کے لوگوں کو وضاحتیں دیتے دیتے تمہاری حالت خراب ہوجائے گی۔''

آفتاب نے اپنے سر پر صافے کے انداز میں، ایک کنگ سائز پٹی باندھ رکھی تھی اسی لیے میں نے اس ڈریسنگ کے لیے ''پٹے'' کا لفظ استعمال کیا تھا یعنی پٹی کا باپ پٹا!

''خون کا رساؤ تو رات ہی کو رک گیا تھا جناب!'' اس نے معتدل انداز میں بتایا۔ ''البتہ چوٹ والی جگہ پر کافی درد محسوس ہورہا ہے۔ خیر، آپ فکر نہ کریں، میں نظام کوٹ جاتے ہوئے اس پٹی کو کھول دوں گا۔''

''یہی عقل مندی ہوگی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''تھانے کے عملے کو تم نے اس چوٹ کے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''بس، بہانہ کردیا۔'' وہ شرمندگی بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے انہیں بتایا ہے کہ چکی پر گندم پسوانے گیا ہوا تھا۔ جب میں اچانک اٹھا تو مشین کا ایک دھاتی حصہ میرے سر میں لگ گیا۔ سب کو میری اس بات پر یقین آگیا اور کسی نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔''

میں نے ضروری ہدایات دینے کے بعد کانسٹیبل آفتاب کو روانہ کردیا۔ اس کے بعد میں نے حوالدار قادر بخش کو اپنے پاس بلالیا۔

قادر بخش کی عمر پینتیس کے آس پاس تھی۔ وہ ایک دراز قد اور دبنگ پولیس اہلکار تھا۔ میرے بعد اس تھانے کے اسٹاف میں، قادر بخش سب سے سینئر تھا۔ اس کے علاوہ تھانے کے عملے میں چار کانسٹیبلز آفتاب احمد، منظور الٰہی، اشفاق علی اور محمد ادریس شامل تھے۔ میں نے قادر بخش کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔

''میں مقتول متین کے گھر جارہا ہوں۔ کل وہ لوگ مقتول کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے اس لیے میں نے اُدھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ مقتول کے گھر والوں کے تعاون کے بغیر اس کیس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ویسے آپ نے کانسٹیبل آفتاب کو بھی تو نظام کوٹ بھیجا ہے۔''

''قادر بخش! ہم دونوں کے کام کی نوعیت الگ ہے!'' میں نے معتدل انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آفتاب ایک خاص مقصد سے ایک، دو روز اُدھر ہی رہے گا اور میں......!'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں یوں گیا اور یوں آیا۔ میری غیر موجودگی میں تھانہ پوری طرح تمہارے حوالے ہے۔''

''آپ بے فکر ہوکر جائیں ملک صاحب!'' وہ توانا لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

میں نے کانسٹیبل منظور الٰہی کو اپنے ساتھ لیا اور ہم دونوں موضع نظام کوٹ کی جانب روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

قتل کا یہ کیس بارہ اکتوبر کی صبح میرے پاس آیا تھا اور آج چودہ اکتوبر کا دن تھا۔ ان ڈیڑھ دو دنوں میں، میں نے جو تفتیش کی تھی، اس کا ابھی تک کوئی ٹھوس اور کارآمد نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ مجھے یہ بتانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہورہی کہ تاحال میں قاتل اور قتل کے محرک تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا تاہم اس بات کا مجھے اطمینان تھا کہ میں درست سمت میں پیش قدمی جاری رکھے ہوئے تھا۔

موضع نظام کوٹ میرے تھانے سے محض نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ لہٰذا ہم پیدل چلتے ہوئے چند منٹ میں مقتول کے گھر پہنچ گئے۔ میری دستک کے جواب میں

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

دروازہ رسول بی بی نے کھولا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے بے تابی سے سوال کیا۔

''تھانے دار صاحب! کیا آپ نے پتا چلا لیا ہے کہ میرے بیٹے کی موت میں کس کا ہاتھ ہے؟''

''میں یہی پتا لگانے کی کوشش کررہا ہوں رسول بی بی!'' میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''کیا تمہارا بڑا بیٹا مبین گھر میں ہے؟ میں اس سے اہم باتیں کرنے آیا ہوں۔''

''مبین اور سلمیٰ قبرستان گئے ہوئے ہیں۔'' سلمیٰ کی ساس رسول بی بی نے بتایا۔ ''آپ اندر آجائیں تھانے دار صاحب۔ مجھے بھی آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ مبین تو کہتا ہے، میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ میں اس کے سامنے وہ باتیں نہیں کرسکتی۔''

رسول بی بی کا انداز اتنا پراسرار اور سنسنی خیز تھا کہ میں نے کانسٹیبل کے ساتھ گھر کے اندر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے منظور الٰہی سے کہا کہ وہ صحن میں چہل قدمی کرے اور خود میں رسول بی بی کے سامنے، برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا اور کہا۔

''ہاں تو رسول بی بی! تم مجھ سے کون سی خاص باتیں کرنا چاہتی ہو؟''

''پہلے وعدہ کریں، آپ مبین اور سلمیٰ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔'' وہ کسی بچے کے جیسے ضدی مگر معصومیت بھرے لہجے میں بولی۔

میں نے اس کا دل رکھنے کی خاطر کہہ دیا۔ ''ٹھیک ہے، میں تم سے ہونے والی گفتگو کا ان سے ذکر نہیں کروں گا۔''

میری وعدہ نما تسلی سے رسول بی بی کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ اس نے محتاط نظر سے گھر کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا اور رازدارانہ انداز میں کہا۔

''اپنے شاہ جی بہت ہی پہنچے ہوئے انسان ہیں۔ انہوں نے جو کچھ بتایا تھا بالکل ویسے ہی ہوا ہے۔ پہلے مرغی، پھر بکری اور آخر میں انسان۔''

''اس کا کیا مطلب ہے رسول بی بی؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''شاہ جی نے کہا تھا کہ ایک چھل پیری متین کے پیچھے پڑ گئی ہے!'' اس نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔ ''سب سے پہلے ایک مرغی جان سے جائے گی۔ اس کے بعد بکری کا نمبر ہے اور آخر میں ایک انسان کی موت واقع ہوگی۔''

میں نے توجہ سے اس کی بات سنی۔ اس کے بیان میں کوئی وزن تھا اور نہ ہی منطق، تاہم وہ ایک عظیم صدمے سے گزر رہی تھی لہٰذا میں نے اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کہا۔

''رسول بی بی! چھل پیری، ڈائن اور چڑیل، یہ سب فرضی کردار ہیں۔ انسان کی حقیقی زندگی میں ان کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ شاہ جی نے تم سے جو بھی کہا، وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ مجھے بتاؤ مرغی، بکری اور کسی انسان کی کیا کہانی ہے؟''

''دیکھیں جی......!'' وہ بیرونی دروازے کی جانب دیکھنے کے بعد بولی۔ ''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ شاہ جی نے بڑے وثوق سے کہا تھا، میرے متین کے پیچھے ایک شیطانی قوت ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہے۔ شاہ جی نے اس کا نام 'چھل پیری' بتایا تھا۔ آپ نے چھل پیری کے بارے میں تو سن رکھا ہوگا؟''

اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''ہاں، میں نے اس فرضی کردار کا نام سن رکھا ہے۔'' میں نے رسانیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''دیو مالائی کہانیوں کے مطابق، چھل پیری الٹے پاؤں والی ایک خوبصورت عورت ہوتی ہے جو اپنے حسن و جمال سے مردوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ مرد یہی سمجھتا ہے کہ ایک پُرشباب عورت اس پر مرمٹی ہے۔ مرد اپنی عقل پر پتھر ڈال کر اس کے بہت قریب ہوجاتا ہے اور چھل پیری موقع دیکھ کر اس مرد کا کلیجا نکال کر کھا جاتی ہے اور وہ مرد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے...... وغیرہ۔''

''ہاں، ہاں...... بالکل۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''شاہ جی نے بھی مجھے چھل پیری کے بارے میں یہی سب بتایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، پہلے ایک مرغی مرے گی، پھر بکری اور آخر میں ایک انسان موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ متین والے واقعے سے تین چار دن پہلے ہماری ایک بھلی چنگی مرغی بیٹھے بیٹھے مرگئی۔ اس کے ایک روز بعد ہماری ایک بکری کی موت واقع ہوگئی اور پھر میرے متین کو اس نامراد چھل پیری نے ختم کردیا۔''

''رسول بی بی!'' میں نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ ''نامعلوم قاتل نے تمہارے بیٹے کے سر کے پچھلے حصے پر کسی ڈانگ کا خطرناک وار کرکے اس کی کھوپڑی چٹخا دی تھی اور اسی سبب وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اگر اس کی موت میں کسی چھل پیری کا ہاتھ ہوتا تو وہ متین کا کلیجا نکال کر ضرور کھاتی۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔



Scanned with CamScanner

"پچھل پیری کے حوالے سے میں نے جو کچھ کہا، وہ سنی سنائی کہانیوں کا خلاصہ ہے۔ میں تمہیں واضح الفاظ میں بتا چکا ہوں کہ میں ایسی خرافات کہانیوں پر بالکل یقین نہیں رکھتا۔ تمہارے بیٹے کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا ہے۔ جب میں متین کے قاتل کو پکڑ کر تمہارے سامنے لاؤں گا، تب تمہیں میری بات پر اعتبار آجائے گا۔"

وہ چند لمحات تک شاکی نظر سے مجھے گھورتی رہی پھر عجیب سے لہجے میں بولی۔ "تھانیدار صاحب! آپ چاہے پچھل پیری کا یقین نہ کریں لیکن میں نے تو اپنے گھر کے ویہڑے (صحن) میں جھانجھر کی جھنکار بھی سنی ہے۔"

"جھانجھر کی جھنکار......!" میں نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تمہارا مطلب ہے، کسی پائل کے بجنے کی مخصوص آواز؟"

اگرچہ "جھانجھر کی جھنکار" کا مطلب مجھے اچھی طرح معلوم تھا لیکن رسول بی بی کے منہ سے یہ ذکر سن کر میرا دھیان آپوں آپ اس پازیب کی طرف چلا گیا تھا جو کانسٹیبل آفتاب کو بیری والے کھوہ کے قریب پڑی ملی تھی، اسی لیے بے اختیار میں نے رسول بی بی سے وہ سوال پوچھ لیا تھا۔

"جی تھانیدار صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں نے کئی بار اپنے کمرے سے باہر نکل کر بھی دیکھا مگر صحن میں مجھے کوئی نظر نہیں آیا جس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ پچھل پیری ہی تھی جو متین کو ورغلانے اور پھنسانے کے لیے یہاں آتی تھی۔ آپ وہ جگہ دیکھ رہے ہیں نا......!" اس نے برگد کے پیڑ کے تنے کی جانب اشارہ کیا۔

"ہاں، دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ایک دو بار میں نے اس جگہ پر متین کو کھڑے دیکھا تھا۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ "مجھے لگتا ہے، متین بھی اس کمینی کی جھانجھر کی جھنکار سن کر ہی اپنے کمرے سے باہر نکلا ہوگا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب متین میرے برابر والے کمرے میں سویا کرتا تھا۔"

اس امر میں کسی شک کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ رسول بی بی کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا اسی لیے وہ اپنے ایسے تجربات پورے یقین کے ساتھ بیان کررہی تھی جو ماورائے عقل فضولیات کا پلندا تھے۔ بہرحال، میں نے اس کے جذبات کو مجروح کیے بغیر استفسار کیا۔

"تو تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کررہی ہو کہ پچھل پیری جھانجھریں بھی پہنتی ہے؟"

اگرچہ میرا یہ سوال طنز میں ڈوبا ہوا تھا مگر رسول بی بی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "کیوں نہیں پہن سکتی؟ آخر وہ بھی تو ایک عورت ہی ہوتی ہے۔"

میں نے رسول بی بی کی وضاحت پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے ایک اہم سوال کیا۔ "کیا تم نے بھی متین سے اس بارے میں پوچھا تھا؟"

"کس بارے میں؟" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

"اس بارے میں کہ......!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "تم جب پچھل پیری کی پازیب کی جھنکار سن کر صحن میں آئی تھیں اور تم نے اس درخت کے نیچے متین کو کھڑے دیکھا تھا تو کیا تم نے متین سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ رات کے وقت وہاں کیا کررہا تھا؟"

"ہاں، ایک آدھ مرتبہ میں نے اس سے پوچھا تھا۔"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "وہ بولا، نیند نہیں آرہی اس لیے ٹہلنے کی غرض سے وہ کمرے سے باہر نکل آیا ہے۔"

"اور جھانجھر کی جھنکار......!" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "کیا اس حوالے سے تم نے یا اس نے کوئی بات کی تھی؟"

"نہیں۔" وہ پوری شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟" میں نے زور دے کر پوچھا۔

"اگر وہ خود کوئی بات کرتا تو میں بھی کچھ کہتی۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "میں خوامخواہ پچھل پیری کا ذکر کرکے متین کو ڈرانا نہیں چاہتی تھی۔"

ہمارے درمیان اس بے سروپا گفتگو کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ امین اور اس کی بیوی سلمٰی قبرستان سے لوٹ آئے۔ سلمٰی ایک خوش شکل، دراز قامت اور دبلی پتلی عورت تھی۔ عورت کے بجائے اسے لڑکی کہنا زیادہ مناسب لگتا تھا۔ اس کی عمر محض بیس سال تھی لیکن چونکہ وہ شادی شدہ تھی لہٰذا تکنیکی اعتبار سے وہ بہرحال ایک عورت ہی تھی۔

بیٹے اور بہو کو گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھا تو رسول بی بی یہ کہتے ہوئے فوراً میرے پاس سے اٹھ گئی۔ "تھانیدار صاحب! امین اور اس کی بیوی مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ انہیں پچھل پیری کے بارے میں نہیں بتانا ورنہ وہ میرا مذاق اڑائیں گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا مگر دل میں کہا۔ "رسول بی بی! تمہارے پاگل پن نے مجھے ایک نئی راہ دکھادی ہے۔"



Scanned with CamScanner

مبین سیدھا میری طرف آ گیا جبکہ اس کی بیوی سلمٰی نے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اسی وقت میں نے آواز دے کر اسے اپنے پاس بلا لیا۔

''سلمٰی! تم بھی آ جاؤ۔ مجھے تم سے بھی کچھ پوچھنا ہے۔''

کانسٹیبل منظور الٰہی میری ہدایت کے مطابق مقتول کے گھر کے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ گھر سے باہر چلا جائے۔ اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

سلمٰی اور اس کا خاوند مبین میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ صرف ایک منٹ پہلے رسول بی بی اسی چارپائی سے اٹھ کر گئی تھی۔ رسمی دعا سلام کے بعد مبین نے مجھ سے کہا۔

''میں نے سلمٰی کو بتایا تھا کہ آج آپ ہمارے گھر آئیں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ جب آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے تو میں یہاں موجود نہیں تھا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رُکا پھر معنی خیز انداز میں مستفسر ہوا۔

''اماں جی آپ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہیں کہ سامنے والے کا دماغ ہی گھوم جائے۔ انہوں نے آپ کو زیادہ تنگ تو نہیں کیا؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے رسول بی بی سے کیے ہوئے خاموش وعدے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''بس وہ اپنا ہی دکھڑا رو رہی تھیں۔ متین کی موت نے ان کے ذہن پر بڑا گہرا اور برا اثر کیا ہے۔''

''چاچی کا دماغ تو پہلے ہی ٹھکانے پر نہیں تھا۔'' سلمٰی نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اس واقعے نے تو ان کی ذہنی حالت کو اور بھی خراب کر دیا ہے تھانیدار صاحب!''

''تدفین کے معاملات ٹھیک رہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے مبین کی طرف دیکھا۔

''جی تھانیدار صاحب! سب آسانی سے نمٹ گیا۔'' وہ ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا اور پوچھا۔ ''آپ نے کھانے میں زہر والی جو بات بتائی تھی، میں نے اس کا ذکر سلمٰی سے بھی کیا ہے۔ ہم دونوں ہی حیران بلکہ پریشان ہیں کہ متین نے بھی وہی کھانا کھایا تھا جو ہم سب نے۔ اگر آلو گوبھی کے سالن میں یا ان تنوری روٹیوں میں کوئی زہریلی شے موجود ہوتی تو اس کا اثر ہم تینوں پر بھی ہونا چاہیے تھا۔''

''میں نے لیبارٹری رپورٹ کے حوالے سے نشہ آور زہریلی چیز کا ذکر کیا تھا۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''بعض ایسی زہریلی اشیا انسان کو ہلاک کرنے کے بجائے اسے غنودگی میں لے جاتی ہیں جیسا کہ نشے کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ دو باتیں واضح ہو چکی ہیں۔ نمبر ایک...... متین کی موت کا سبب اس کے سر کے عقبی حصے میں لگنے والی وہ کاری ضرب ہی ہے۔ نمبر دو...... وقوعہ کی رات والے کھانے میں کوئی زہر یا خواب آور شے ملی ہوئی نہیں تھی۔ مقتول کے معدے سے ملنے والے مواد کے اندر جو کچھ بھی پایا گیا ہے، وہ گھر سے نکل جانے کے بعد متین کے اندر پہنچایا گیا تھا اور اب تو معاملہ کسی اور ہی سمت نکل گیا ہے۔''

''کس سمت تھانیدار صاحب؟'' مبین نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''پہلے میں نے تم سے پوچھا تھا کہ وقوعہ کی رات متین کھیتوں کی طرف کیوں گیا تھا؟ اب میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ وہاں کس سے خفیہ ملاقات کرنے گیا تھا؟'' میں نے مبین کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ''اور یہی وہ سمت ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔''

''تھانیدار صاحب! خفیہ ملاقات والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' وہ سماجت آمیز لہجے میں بولا۔ ''تھوڑی وضاحت کر دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔''

''مبین! میں نے جب تم سے متین کی شادی یا منگنی کے بارے میں سوال کیا تھا تو تم نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ابھی منگنی اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ وہ شادی سے خائف تھا۔ مطلب یہ کہ وہ شادی کے معاملے کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ اس موضوع پر آپ لوگوں نے جب بھی اس سے بات کی تو اس نے اس قصے ہی کو مذاق میں اڑا دیا۔'' میں نے مقتول کے بڑے بھائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ میرے بیان کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ کو یہی بتایا تھا کیونکہ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ سلمٰی سے تصدیق کر لیں۔''

میں نے سوالیہ نظر سے سلمٰی کی طرف دیکھا۔

وہ پوری توجہ سے ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ میرے خاموش استفسار کا جواب دینے کے ساتھ ہی اس نے مجھ سے ایک اہم سوال بھی پوچھ لیا۔ اس موقع پر سلمٰی کی کوئی مخصوص نسوانی حس یکایک انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی۔

''مبین نے متین کے بارے میں آپ کو سولہ آنے سچ بتایا ہے تھانیدار صاحب!'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کیا آپ ''خفیہ ملاقات'' کا ذکر کر کے ہمیں یہ بتانا چاہ

digestlibrary.com

رہے ہیں کہ متین کا کسی لڑکی کے ساتھ عشق پیچا چل رہا تھا؟''

''سلمیٰ! تمہیں تو پولیس میں ہونا چاہیے۔'' میں نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''تم ٹھیک ٹھیک میرے مقصد کی تہ میں پہنچ گئی ہو۔ میں آپ لوگوں سے یہی کہہ رہا ہوں کہ وقوعہ کی رات متین کسی لڑکی سے ملنے ادھر کھیتوں میں گیا تھا۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانیدار صاحب!'' مبین نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''متین کے اندر اتنا حوصلہ اور ہمت تھی ہی نہیں کہ وہ کسی لڑکی سے ملنے آدھی رات کو گھر سے نکل جائے۔ یقیناً آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''مبین! میں مفروضوں اور غلط فہمیوں کی بنیاد پر اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کا عادی نہیں ہوں۔'' میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''میرے پاس اس امر کا ٹھوس ثبوت ہے کہ اس رات بیری والے کھوہ پر متین کے ساتھ اس گاؤں کی کوئی لڑکی یا کوئی عورت بھی موجود تھی۔''

''تھانیدار صاحب! پہلے آپ مجھے اس ٹھوس ثبوت کے بارے میں بتائیں۔'' سلمیٰ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پھر میں آپ سے بات کرتی ہوں۔''

سلمیٰ کے اس فوری ردِعمل نے مجھے تسلی دی کہ وہ کوئی ایسی اہم بات بتانے والی ہے جو اس کیس کو حل کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوگی۔ سو، میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پراعتماد لہجے میں کہا۔

''سلمیٰ! جب یہ دونوں بھائی ادھر کھیتوں میں دن بھر کھیتی باڑی میں مصروف ہوتے تھے تو ان کے لیے دوپہر کا کھانا کون لے کر جاتا تھا؟''

''جب تک چاچا یٰسین (مقتول کا مرحوم باپ) زندہ تھا تو زیادہ تر چاچی رسولاں (رسول بی بی) اور کبھی کبھار میں باپ بیٹوں کے لیے کھانا لے کر جاتی تھی۔'' اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''لیکن چاچے یٰسین کی وفات کے بعد چاچی تو بجھ کر رہ گئی ہے۔ پچھلے ایک سال سے میں ہی مبین اور متین کو دوپہر کا کھانا پہنچانے جا رہی ہوں۔ جب یہ دونوں کھانا کھا لیتے تو میں خالی برتن اٹھا کر واپس آجاتی۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت مبین سے کہا۔

''میں تمہاری بیوی کے گٹے (ٹخنے) دیکھنا چاہتا ہوں، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں جناب!'' اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا پھر اپنی بیوی سے کہا۔ ''سلمیٰ! تھانیدار صاحب کو اپنے گٹے دکھاؤ۔''

سلمیٰ نے فوراً اپنے خاوند کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لاچا (لنگی) تھوڑا سا اوپر اٹھا دیا۔ میں نے دیکھا، اس کے پاؤں میں کسی قسم کا زیور موجود نہیں تھا۔

''اپنا لاچا نیچے کرلو سلمیٰ!'' میں نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا تمہیں پازیب وغیرہ پہننے کا شوق نہیں ہے؟''

''نہیں تھانیدار صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے حتمی لہجے میں بولی۔ ''میں نے کبھی اپنے پاؤں میں پائل نہیں پہنی۔''

میں ایک آسودہ اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ سارا عجیب وغریب تجربہ اور مشاہدہ میں نے اس لیے کیا تھا تاکہ اس بات کا پتا چلایا جاسکے کہ گیارہ اکتوبر کی دوپہر کہیں سلمیٰ کی پازیب تو بیری والے کھوہ کے نزدیک نہیں گر گئی تھی۔

''اب تمہارے سوال کا جواب۔'' میں نے سلمیٰ کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔ ''مجھے بیری والے کھوہ کے قریب چاندی کی ایک پازیب پڑی ملی ہے۔ اس قسم کے زیورات مرد تو اپنے پاؤں میں پہننا پسند نہیں کرتے اسی لیے مجھے یقین ہے کہ وقوعہ کی رات متین جس عورت یا لڑکی سے ملنے کھیتوں میں گیا تھا، وہ پازیب اسی عورت یا لڑکی کی ہے۔''

''کیا آپ وہ پائل مجھے دکھا سکتے ہیں؟'' سلمیٰ نے سرسراتی ہوئی آواز میں مجھ سے استفسار کیا۔ ''تاکہ میں کوئی اندازہ لگا سکوں۔''

''وہ پازیب اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''بہرکیف، میں ایک دو روز میں تمہاری یہ خواہش پوری کردوں گا۔''

''سلمیٰ! تم اس جھانجھر کو دیکھ کر کس قسم کا اندازہ لگانا چاہتی ہو؟'' مبین نے الجھن زدہ لہجے میں اپنی بیوی سے پوچھا۔

''تھانیدار صاحب!'' سلمیٰ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ میں نے دو تین مرتبہ متین کو گوگی سے بات کرتے دیکھا تھا۔''

''گوگی......!'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''یہ گوگی کون ہے؟''

''اس لڑکی کا اصل نام صغریٰ ہے تھانیدار صاحب لیکن سب اسے گوگی کہتے ہیں۔'' سلمیٰ نے بتایا۔ ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، گوگی بھی پائل پہنتی ہے۔''

''میں اس گوگی کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے یکے بعد دیگرے ان میاں بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''ابھی اور اسی وقت۔''

آئندہ پندرہ منٹ میں سلمیٰ نے صغریٰ عرف گوگی کے



Scanned with CamScanner

بارے میں مجھے تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ میں فاتحانہ احساس کے ساتھ وہاں سے اٹھا اور منظور الٰہی کی معیت میں تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

پندرہ اکتوبر کی دوپہر کانسٹیبل آفتاب احمد مجھ سے ملنے آ گیا۔ وہ خاصا پُرجوش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

''ملک صاحب! سمجھ لیں کہ فریدہ نے آپ کا دیا ہوا کام تقریباً نمٹا دیا ہے۔''

''یہ تقریباً کیا ہوتا ہے اللہ کے بندے؟'' میں نے اسے گھورا۔ ''بجھارتیں نہیں ڈالو اور کھل کر مجھے بتاؤ کہ تمہاری بیوی نے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے؟''

میرے استفسار کے جواب میں آفتاب نے اپنی اور اپنی بیوی کی کارکردگی کی جو تفصیل بیان کی، اس میں سے کافی باتیں سلمٰی کی زبانی مجھے معلوم ہو چکی تھیں تاہم آفتاب، سلمٰی سے بڑھ کر اور سنسنی خیز خبریں لے کر آیا تھا۔ فریدہ نے واقعتاً اپنے تیز وطرار ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ میں سلمٰی اور آفتاب کے بیان کا مشترکہ خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

موضع نظام کوٹ، جمال پور کی بہ نسبت ایک بڑا گاؤں تھا۔ وہاں ساڑھے تین سو کے قریب مکانات تھے جن میں کم وبیش ڈیڑھ ہزار مرد وزن اور بوڑھے و بچے آباد تھے۔ انہی انسانوں میں ایک شخص کا نام تھا، رحم دین!

رحم دین گاؤں کے وسط میں کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان چلاتا تھا۔ اس کی عمر پچاس سے متجاوز تھی اور پرچون کی یہ دکان اس نے اپنے گھر کے اندر ہی کھول رکھی تھی۔ رحم دین کی بیوی بشیراں کی نگاہ خطرناک حد تک کمزور ہو چکی تھی۔ اسے بس چیزوں کے سائے اور ہیولے سے نظر آتے تھے۔ وہ رحم دین سے لگ بھگ پانچ سال چھوٹی تھی مگر کسی اندرونی بیماری نے اس کی بینائی کے ساتھ بڑا بھیانک مذاق کر دیا تھا۔ بحیثیت مجموعی بشیراں بی بی کی صحت بہت اچھی تھی مگر بصارت کے ضعف نے اسے مجبور اور کسی حد تک بے نور بنا دیا تھا۔

رحم دین اور بشیراں بی بی کی دو اولادیں تھیں۔ نمبر ایک...... پچیس سالہ خورشید عرف جھلا۔ خورشید مضبوط بدن کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا مگر اس کا ذہنی توازن درست نہیں تھا، اسی لیے لوگ اسے جھلا (دیوانہ) کہا کرتے تھے۔ اس کی زبان میں لکنت پائی جاتی تھی جس کے باعث اسے بولنے میں کافی دقت محسوس ہوتی تھی۔ لوگ اس کے ہکلے پن کا مذاق اڑاتے تھے۔ جھلا خاصا غصہ ور اور اجڈ قسم کا لاابالی انسان تھا۔ وہ جلدی طیش میں آ جاتا تھا اور سامنے والے پر ہاتھ اٹھانے میں کسی تردد سے کام نہیں لیتا تھا۔ اکثر و بیشتر گاؤں کے لوگوں سے اس کا جھگڑا ہوتا رہتا تھا...... وغیرہا۔

خورشید جھلا سے سات سال چھوٹی صغریٰ تھی جو اپنی گول مٹول جسامت کی وجہ سے ''گوگی'' کہلاتی تھی۔ گوگی ایک پستہ قامت اور خوبصورت اٹھارہ سالہ لڑکی تھی اور یہی گوگی اس پازیب کی مالک تھی جو وقوعہ کے روز آفتاب کو بیری والے کھوہ کے پاس پڑی ملی تھی۔

آفتاب نے مذکورہ پازیب مجھے واپس دیتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! مجھے تو لگتا ہے متین کا قتل جھلا ہی نے کیا ہے۔''

''اور تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟'' میں نے اس کا مؤقف جاننے کی غرض سے پوچھا۔

''جھلا کو غصہ بہت جلدی آ جاتا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''گوگی اور متین والا معاملہ اگرچہ نظام کوٹ میں زیادہ مشہور نہیں ہے لیکن عین ممکن ہے کہ کسی طرح جھلا کو ان دونوں کے خفیہ تعلقات کی بھنک پڑ گئی ہو۔ وقوعہ کی رات اس نے گوگی کا تعاقب کیا اور اس کے بعد جائے وقوعہ پر جو ہوا ہوگا، اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔''

''آفتاب! بادی النظر میں تمہاری یہ تھیوری درست معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت کی تہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے متعلقہ افراد سے کڑی تفتیش کرنا پڑے گی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا اور سوال کیا۔ ''کیا اس سلسلے میں تم نے وہاں کسی قسم کی پوچھ تاچھ تو نہیں کی؟''

''نہیں ملک صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بھلا آپ کے حکم سے اِدھر اُدھر کیسے جا سکتا ہوں۔ میں تو گھر میں بڑا آرام کر رہا ہوں۔ یہ ساری تحقیق فریدہ نے خود کی ہے اور وہ بھی ہاتھ پاؤں بچا کر۔ کسی کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ فریدہ پولیس کی طرف سے کسی خاص الخاص مشن پر ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''جب سے آپ نے فریدہ کو اس کام پر لگایا ہے، اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں۔ وہ خود کو پولیس اہلکار سمجھنے لگی ہے۔''

''تمہاری بیوی وہاں پولیس کے لیے آسانیاں تلاش کرنے گئی ہے۔ اس نسبت سے وہ ہمارے محکمے کا حصہ ہے

digest library.com



Scanned with CamScanner

لہٰذا وہ خود کو پولیس اہلکار سمجھنے میں حق بجانب ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا فریدہ کے ایسا سمجھنے سے تمہیں کسی قسم کا عدم تحفظ محسوس ہو رہا ہے؟''

''میرے لیے تو پہلے ہی گھر میں وہ کسی پولیس والی سے کم نہیں ہے۔'' وہ اپنے سر کے عقبی حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اوپر سے آپ نے اسے شہ دے دی ہے۔ اب تو وہ مجھے پکی لیڈی کانسٹیبل بن کر دکھائے گی۔''

''چلو، یہ بھی اچھا ہے۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اب تھانہ تمہارے گھر کا ہو گیا۔ خوب مزے کرنا۔''

''جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ شاکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے میں حوالات اور تفتیشی کمرا نام کی دو جگہیں بھی ہوتی ہیں ملک صاحب! مجھے مزہ چکھانے کے لیے فریدہ کو تو بیٹھے بٹھائے مفت میں آپ نے لاک اپ اور ٹرائل روم عطا کر دیا ہے۔ اب میرا تو اللہ ہی حافظ ہے۔''

''زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے آفتاب!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں فریدہ کو سمجھا دوں گا، وہ تم پر ہاتھ ہولا رکھے گی۔''

''جی، آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

اس کے بعد میں نے آفتاب کو سلمٰی، مبین اور رسول بی بی سے ہونے والی اپنی گزشتہ روز کی ملاقات کے بارے میں مختصراً بتایا اور کہا۔

''یہ تو معلوم ہو گیا کہ گوگی اور مقتول کے درمیان پیار و محبت کے معاملات چل رہے تھے اور اس پازیب کا تعلق بھی گوگی ہی سے ہے جو تمہیں بیری والی کھوہ کے نزدیک پڑی ملی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے تمہیں پیر کرامت علی عرف ''شاہ جی'' کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھی کہا تھا، اس کام کا کیا ہوا؟''

''میں نے کرامت علی کے حوالے سے تھوڑی چھان بین کی ہے ملک صاحب!'' اس نے بتایا۔ ''وہ بھی پکا نوے فیصد پیروں کی طرح دغاباز ہے۔ وہ لوگوں کو فیض پہنچانے کی اہلیت تو نہیں رکھتا البتہ وہ انہیں اُلو بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ گاؤں کے لوگ شاہ جی کا احترام کرنے پر مجبور ہیں اور اس کا بھی ایک خاص سبب ہے۔''

''گاؤں والوں کی ایسی بھی کون سی مجبوری ہے؟'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے پوچھ لیا۔

''میں اسی طرف آ رہا تھا جنابِ عالی!'' کانسٹیبل آفتاب ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے ملک صاحب کہ اس گاؤں کا چودھری نظام دین، شاہ جی کے عقیدت مندوں میں شامل ہے۔ وہ اکثر حاضری کے لیے شاہ جی کے آستانے پر جاتا رہتا ہے۔''

''اوہ، اچھا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''شاہ جی کا آستانہ گاؤں میں کس طرف ہے؟''

''مسجد والی گلی میں، مسجد سے دو گھر چھوڑ کر۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ نظام کوٹ میں کسی سے بھی پوچھیں گے تو وہ آپ کو کرامت علی کے آستانے پر پہنچا دے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے پوچھا۔ ''کیا آپ کرامت شاہ سے ملاقات کا ارادہ رکھتے ہیں ملک صاحب؟''

''اگر ضرورت پڑی تو میں ضرور کرامت علی کے آستانے پر جاؤں گا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن پہلے گوگی کو چیک کرنا ہو گا اور اس کے سودائی بھائی خورشید جھلاّ سے بھی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری تھیوری درست ہے تو پھر وقوعہ کی رات گوگی نے جھلاّ کو ضرور کھیتوں میں دیکھا ہو گا۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''تم واپس جاؤ اپنے بیوی بچوں کے پاس۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''کل صبح سے تمہیں ڈیوٹی پر آنا ہے۔ فریدہ اور دونوں بچے مزید کتنے دن نظام کوٹ میں رہیں گے، اس کا فیصلہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔''

''جو حکم ملک صاحب!'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا۔ ''تو پھر مجھے اجازت دیں۔''

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

آفتاب کے جانے کے بعد میں نے حوالدار قادر بخش کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ قادر بخش اس کیس کی پل پل بدلتی صورت حال سے آگاہ تھا۔ آفتاب نے ابھی گوگی کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا تھا، وہ سب سلمٰی کے بیان سے لگا کھاتا تھا اور یہ تمام تر معلومات قادر بخش سے چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ چند منٹ تک ہمارے درمیان تازہ ترین حالات پر بات ہوتی رہی پھر قادر بخش نے کہا۔

''ملک صاحب! اگر وہ چاندی کی پازیب واقعی گوگی کی ہے تو پھر آپ کو فوراً اس کا انٹرویو کرنا چاہیے۔ وہ پازیب



Scanned with CamScanner

جائے وقوعہ پر پڑی ملی ہے، اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ گوگی وقوعہ کی رات وہاں گئی تھی۔"

"میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں قادر بخش!" میں نے کہا۔ "میں تھوڑی دیر میں کسی کانسٹیبل کو ساتھ لے کر نظام کوٹ جا رہا ہوں۔"

"آپ نے کرامت علی کی پیش گوئی کو بھی ذہن میں رکھنا ہے جو اس نے مقتول کی ماں رسول بی بی کے سامنے کی تھی۔" حوالدار نے یاددہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ "وہی...... پہلے مرغی، اس کے بعد بکری اور آخر میں ایک انسان اپنی جان سے جائے گا۔"

"مجھے سب یاد ہے قادر بخش!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور یہ بھی کہ گوگی کی پچھل پیری مقتول کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔"

"یہ آستانوں والے پیر اور بابے معصوم اور سادہ لوح لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے عجیب و غریب اور لایعنی کہانیاں گھڑ کر انہیں سناتے ہیں تاکہ وہ ان کے رعب میں آجائیں اور انہیں کوئی بہت ہی پہنچی ہوئی ہستی سمجھنے لگیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن یہاں پر ایک سوال کا جواب حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔" میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ "اور وہ جواب میں بہت جلد حاصل کرلوں گا، اس بات کا مجھے یقین ہے۔"

"آپ کس سوال اور جواب کی بات کر رہے ہیں ملک صاحب؟" حوالدار نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

"ایک لمحے کے لیے مان لیتے ہیں کہ کرامت علی نے رسول بی بی کو بیوقوف بنانے کے لیے وہ ساری باتیں کی تھیں۔" میں نے قادر بخش کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ "یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ جی کو ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ وہ رسول بی بی کو ڈرا کر اس سے اپنا کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا؟ اور اسی گمبھیر سوال کا جواب......!" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک طویل اور بوجھل سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کردی۔

"اس سوال کا جواب صرف اور صرف کرامت علی ہی دے سکتا ہے۔ میں گوگی سے فارغ ہونے کے بعد شاہ جی کے آستانے کا چکر بھی لگاؤں گا۔ آج اس کیس کو کسی کنارے لگانا ضروری ہے قادر بخش!"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ایک نوجوان کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ اس خون کا حساب تو ہونا ہی چاہیے۔ اگر مظلوم کو انصاف نہیں ملے گا تو پھر ہمارے اس تھانے کا کوئی مقصد اور مصرف باقی نہیں رہ جاتا۔"

قادر بخش کی بات سولہ آنے درست تھی۔ میں نے اس سے کامل اتفاق کیا اور ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد ایک بار پھر موضع نظام کوٹ روانہ ہوگیا۔ اس مرتبہ کانسٹیبل محمد ادریس میرے ساتھ تھا۔

☆☆☆

گوگی کے باپ رحم دین کی کریانے کی دکان موضع نظام کوٹ کے قلب میں واقع تھی۔ مجھے وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لگ بھگ تین بجے سہ پہر میں رحم دین کے سامنے کھڑا تھا۔

رحم دین اپنی دکان میں موجود تھا۔ میں اور کانسٹیبل ادریس یونیفارم میں تھے اس لیے ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بڑے ادب سے بولا۔

"ست بسم اللہ تھانیدار صاحب!" اس نے اپنی دکان کے اندر سے ایک چھوٹی سی چوبی بینچ نکال کر ہمارے سامنے بچھادی۔ "آپ تشریف رکھیں سرکار۔" مذکورہ بینچ کو ایک کپڑے سے صاف کرنے کے بعد اس نے کہا۔ "میں آپ کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"مجھے چائے پانی یا کھانے کی ضرورت نہیں رحم دین!" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "میں اس وقت ایک اہم کام سے یہاں آیا ہوں۔"

اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ "آپ حکم کریں جی۔" اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "بتائیں، میں آپ کی کیا خدمت کروں، ویسے سب خیریت تو ہے نا؟"

رحم دین کی عمر پچاس سے نکلتی ہوئی تھی۔ وہ متناسب خدوخال کا مالک ایک عام سا دیہاتی تھا۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

"چاچا رحم دین! جب پولیس، ڈاکٹر یا کوئی وکیل کسی کے دروازے پر آجائے تو اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ خیریت بالکل بھی نہیں ہے۔"

"سوہنا رب خیر کرے۔" وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا پھر مجھ سے پوچھا۔ "سرکار! آخر معاملہ کیا ہے؟"

"تین دن پہلے اس گاؤں کے کھیتوں میں ایک نوجوان حسین کا قتل ہوگیا تھا۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز



digest library.com

Scanned with CamScanner

میں کہا۔ ''میں اسی سلسلے میں پوچھ پرتیت کرنے تمہارے پاس آیا ہوں۔''

''جی، اس واقعے کا مجھے پتا ہے۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن متین کے قتل سے میرا کیا تعلق؟''

''تمہارا تعلق نہ سہی مگر تمہاری اولاد کا تو ہے۔''

وہ گھبرا گیا اور کہا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب؟''

''گوگی اور جھلا کہاں ہیں؟'' میں نے قدرے خشک لہجے میں استفسار کیا۔

''گوگی تو گھر کے اندر ہی ہے اور جھلا کا مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔ وہ بھی اسی پنڈ میں کہیں ہوگا۔'' اس نے اضطرابی لہجے میں جواب دیا اور فکرمندی سے بولا۔

''جناب! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''سب سمجھ میں آجائے گا رحم دین!'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''تم فوراً مجھے گوگی سے ملواؤ اور اس کے ساتھ ہی کسی کو بھیجو کہ وہ جھلا کو ڈھونڈ کر یہاں لے آئے۔''

رحم دین کے چہرے پر فکر اور اندیشے کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کی بے بسی اور لاچاری کو دیکھ کر میری تجربہ کار نگاہ نے فوراً سے پیشتر یہ اندازہ قائم کر لیا کہ متین کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں تھا اور اسے یہ یقین تھا کہ اس کی اولاد بھی اس معاملے میں ملوث نہیں ہوگی لیکن میرے حکم کی تعمیل کے سوا اس کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ سو، اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

''آپ میرے ساتھ اندر آجائیں سرکار! میں گوگی سے آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔''

میں نے کانسٹیبل ادریس کو باہر چوبی بینچ پر بیٹھنے کو کہا اور خود رحم دین کی معیت میں گھر کے اندر چلا گیا۔

وہ پانچ مرلے کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ مختصر سے صحن میں ایک ادھیڑ عمر عورت چارپائی پر بیٹھی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ وہ یقیناً بشیراں بی بی تھی جس کی دیکھنے کی صلاحیت نہ ہونے کے برابر تھی تاہم اس کی قوت سماعت خاصی تیز تھی۔ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان کے حواس خمسہ (دیکھنا، بولنا، سننا، سونگھنا اور چھونا) میں سے اگر کوئی ایک کسی وجہ سے متاثر ہو جائے تو اس کی کسی دوسری حس زیادہ توانا ہو جاتی ہے۔

بشیراں بی بی نے میری اور رحم دین کی باہمی دھیمی گفتگو کو سن لیا تھا۔ ''رحم دینا!'' اس نے اپنے خاوند کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟''

''ہمارے علاقے کے تھانیدار صاحب ہیں۔'' رحم دین نے بتایا۔

''تھانیدار کا ہمارے گھر میں کیا کام، رحم دینا؟''

''بشیراں! یہ گوگی سے کچھ پوچھنے آئے ہیں۔''

''گوگی اتنی اہم کب سے ہو گئی کہ تھانیدار اس سے ملنے ہمارے گھر آگیا ہے؟'' بشیراں نے عجب سے لہجے میں کہا۔ ''رحم دینا! سب خیر خیریت ہے نا؟''

''مجھے نہیں پتا۔'' رحم دین نے گول مول جواب دیا۔

اسی وقت ایک اندرونی کمرے میں سے ایک فربہ اور گول مٹول سی لڑکی برآمد ہوئی۔ میرے حافظے میں موجود معلومات کی روشنی میں مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ صغریٰ عرف گوگی تھی۔ گوگی ایک پرکشش اور خوبصورت لڑکی تھی۔

''دھی رانی!'' رحم دین نے میرے اندازے کی تصدیق کرتے ہوئے گوگی سے کہا۔ ''تھانیدار صاحب تم سے چند باتیں کرنے آئے ہیں۔'' پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

''سرکار! کیا میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟''

''نہیں رحم دین!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں گوگی سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں بلا لوں گا۔ تم اُدھر اپنی گھر والی کے پاس چلے جاؤ اور وہاں بیٹھ کر ہمیں دیکھتے رہو۔''

رحم دین نے میری تجویز پر صاد کیا اور چپ چاپ جا کر بشیراں بی بی کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں اور گوگی برآمدے میں ایک دوسرے کے سامنے براجمان ہو گئے۔ برآمدے اور صحن میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا چنانچہ میں نے دھیمی آواز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''گوگی! مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے مہربان لہجے میں کہا۔ ''میں نے پتا چلا لیا ہے کہ متین کی موت میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں ہے، تم تو بس اس سے پیار کرتی تھیں...... ہیں نا؟''

وہ چند لمحات تک سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے دھیرے سے بولی۔ ''جی۔''

''متین کی موت کا جتنا دکھ تمہیں ہے، اتنا مجھے بھی ہے اور میں جلد از جلد اس کے قاتل کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیجنا چاہتا ہوں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا تمہاری بھی یہی خواہش ہے گوگی؟''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولی، بس سر کو اثبات میں جنبش دینے پر اکتفا کیا اور اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کو گھورنے لگی۔



Scanned with CamScanner

"شاباش!" میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم چاہتی ہو کہ متین کے قاتل کو عبرتناک سزا ملے تو تمہیں میری مدد کرنا ہوگی...... میری مدد کرو گی نا؟"

چند لمحات تک تذبذب کا شکار رہنے کے بعد اس نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "اس سلسلے میں بھلا میں کیا کرسکتی ہوں تھانیدار صاحب!"

"تمہیں کسی پہاڑ پر نہیں چڑھنا گوگی اور نہ ہی دریا میں چھلانگ لگانا ہے۔" میں نے آواز کو نیچا رکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "بس، میں تم سے جو بھی پوچھوں، اس کا کھرا اور سچا جواب دینا ہے۔ میں جھوٹ بولنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور انہیں سخت سزا بھی دیتا ہوں لیکن تم تو بہت اچھی لڑکی ہو۔ مجھے امید ہے تم مجھ پر بھروسا کرو گی...... میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا؟"

"جی، میں سمجھ رہی ہوں۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "آپ مجھ سے جو پوچھیں گے، میں اس کا سیدھا جواب دوں گی۔"

"شاباش!" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے تعریفی انداز میں کہا۔ "تو پھر بتاؤ، وقوعہ کی رات متین کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھانیدار صاحب!" اس نے میری توقع کے برعکس جواب دیا تھا۔

"تم نے کچھ نہ کچھ عجیب اور خلافِ معمول تو ضرور دیکھا ہوگا؟" میں نے اس کے چہرے پر نظر گاڑ کر سوال کیا۔ "بیری والے کھوہ کی طرف جاتے ہوئے یا وہاں سے آتے ہوئے..... تم دونوں چوری چوری وہیں ملتے تھے نا؟"

"جی..... جی، یہ سچ ہے۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولی۔ "لیکن جس رات متین کا قتل ہوا، میں کھیتوں کی طرف نہیں گئی تھی۔"

"مجھے جھوٹ سے نفرت ہے گوگی!" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "اور یہ بات میں تم پر واضح کرچکا ہوں۔"

ہم دونوں رحم دین سے اتنے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ ہمیں بہ آسانی دیکھ پا رہا تھا تاہم ہماری آواز اتنی نیچی تھی کہ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے مابین کیا باتیں ہو رہی تھیں۔

"میں اللہ پاک کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس رات میں متین سے ملنے بیری والے کھوہ کی طرف نہیں گئی تھی۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "آپ کو کیسے یقین دلاؤں، یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھانیدار صاحب!"

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا اور پوچھا۔ "کیا تم اس بات سے انکار کرتی ہو کہ تم چاندی کی پازیب پہنتی ہو؟"

"نہیں جی، میں انکار نہیں کرسکتی۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "چاندی کی پازیب پہننا مجھے بہت پسند ہے۔"

"کیا اس وقت بھی تم نے پازیب پہنی ہوئی ہے؟"

"نن..... نہیں جی۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں؟"

"وہ جی بس..... کوئی خاص وجہ نہیں۔" گوگی نے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے آج ہی اسے اتارا ہے۔"

میں نے گوگی کی آنکھوں کی کیفیت سے بھانپ لیا کہ وہ مجھ سے دروغ گوئی کر رہی تھی تاہم اس مرتبہ میں نے اسے کوئی دھمکی وغیرہ نہیں دی اور سرسری انداز میں کہا۔

"تم نے پازیب کو اتار کر کہاں رکھا ہے گوگی؟"

"ادھر ہی..... کمرے کے اندر۔" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

"ٹھیک ہے، تم کمرے میں جاؤ اور وہ پازیب لا کر مجھے دکھاؤ۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ بہانہ بناتے ہوئے بولی۔ "م..... مجھے یاد نہیں آرہا...... کہ...... میں نے اپنی پازیب...... کہاں رکھ دیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں تم نے چاندی کی اس پازیب کو کہاں رکھا تھا۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ "مگر یہ آج کا نہیں، تین دن پہلے کا واقعہ ہے گوگی!"

گوگی کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے میں نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ وہ سہمی ہوئی مگر مضطرب نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے اپنی جیب میں سے چاندی کی پائل نکال کر گوگی کو دکھاتے ہوئے استفسار کیا۔ "یہ تمہاری ہی پازیب ہے نا؟"

"یہ...... یہ آپ کے پاس کیسے...... پہنچ گئی؟" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بے یقینی سے بولی۔ "یہ پازیب تو میں نے شاہ جی کو دی تھی۔"

میں بے ساختہ مسکرانے لگا۔

☆☆☆



digestlibrary.com
Scanned with CamScanner

میری معلومات کے مطابق پیر کرامت علی کا آستانہ مسجد والی گلی میں دو گھر چھوڑ کر تھا لہٰذا وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

صغریٰ عرف گوگی سے ملاقات خاصی سودمند ثابت ہوئی تھی۔ اس کے سنسنی خیز انکشاف کے بعد خورشید جملا سے پوچھ تاچھ کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی چنانچہ میں رحم دین کے گھر سے نکل کر سیدھا کرامت شاہ کے آستانے پر پہنچ گیا۔ گوگی سے میری جو اہم بات چیت ہوئی تھی، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

گوگی کو متین سے عشق ہو گیا تھا۔ متین اس سے بات تو کر لیتا تھا مگر اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے رہا تھا اور گوگی ہر قیمت پر متین کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ جو لوگ اپنے خالق اور نبی آخرالزماں آقا علیہ السلام کی تعلیمات سے دور ہوتے ہیں، وہ زندگی کے ایسے مشکل مقامات سے گزرنے کے لیے عامل کامل نام نہاد پیروں کی خدمت میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر میرا اشارہ اللہ کے سچے دوستوں یعنی اولیائے کرام کی جانب نہیں ہے۔ میں ان ڈبا پیروں کا ذکر کر رہا ہوں جو جعلی آستانوں میں بیٹھ کر دو نمبری کا ہر کام ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔ جو نیک اور پرہیزگار صوفیائے کرام اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہوتے ہیں، وہ محض مخلوقِ خدا کی راہنمائی کرتے ہیں تاکہ ان کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں۔

بہرکیف، گوگی اپنی بگڑی بنانے کے لیے پیر کرامت علی عرف شاہ جی کے آستانے پر پہنچ گئی تھی۔ شاہ جی نے گوگی کی بپتا پوری توجہ سے سنی اور اسے یقین دلایا کہ اگر اس نے شاہ جی کی ہدایات پر عمل کیا تو متین ساری دنیا کو بھول کر اس کا ہو جائے گا۔ گوگی تو یہ چاہتی تھی۔ سو، اس نے شاہ جی کے احکامات کی تعمیل کرنے کا وعدہ کر لیا۔ شاہ جی نے کوئی مجرب عمل کرنے کے لیے گوگی سے اس کی پازیب مانگ لی اور اسے تاکید کی کہ وہ کسی طرح متین کو گیارہ اور بارہ اکتوبر کی درمیانی رات بیری والے کھوہ پر آنے کے لیے آمادہ کر لے۔ وہ متین سے یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہوگی۔ گوگی سے جان چھوٹ جانے کا سوچ کر وہ ضرور اس سے ملنے کھیتوں میں جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی شاہ جی نے گوگی کو اس بات کا پابند بھی کر دیا تھا کہ وہ مذکورہ رات بیری والے کھوہ کی طرف نہیں جائے گی۔ گوگی پر متین کو حاصل کرنے کا جنون سوار تھا لہٰذا وہ بیوقوف بلا سوچے سمجھے شاہ جی کے احکامات کی تعمیل کرتی چلی گئی۔ وقوعہ کی رات وہ اپنے گھر میں موجود رہی۔ اسے یقین تھا کہ شاہ جی کا عمل متین کو اس کی طرف مائل کر دے گا...... وغیرہ، وغیرہ۔

گوگی کے سنجیدہ بیان نے میرے دماغ کے کئی ایک بند در کھول دیے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی کہ متین کے قتل کی سازش شاہ جی کے شیطانی ذہن کا مذموم کارنامہ تھا۔ اس پلید انسان نے متین کو موت کے گھاٹ اتارنے یا اتروانے کے بعد گوگی کو اس سنگین جرم میں پھنسانے کی کوشش کیوں کی تھی؟ اس اہم سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے میں شاہ جی کے آستانے پر پہنچ گیا تھا۔

شاہ جی نے خوشدلی سے میرا پُرتپاک استقبال کیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں اس کے ساتھ کون سا ہاتھ کرنے وہاں آیا تھا۔ لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے لہٰذا کسی عیار اور مکار شخص کو چالبازی ہی سے اپنے دام میں لایا جا سکتا ہے۔ میں نے بھی کرامت شاہ پر یہی ترکیب آزمانے کا فیصلہ کیا تھا۔

''شاہ جی! اس تھانے میں میری تقرری کو تین چار ماہ ہو گئے ہیں لیکن میری یہ کوتاہی ہے کہ ابھی تک آپ کی خدمت میں حاضری نہ دے سکا۔'' میں نے ندامت بھرے لہجے میں اس پیرِ فرتوت سے کہا۔ ''لیکن وہی بات کہ جب تک انسان کسی پریشانی میں نہ گھر جائے، اسے کسی بزرگ کی قدم بوسی کا خیال ہی نہیں آتا۔''

میں اس علاقے کے تھانے کا انچارج تھا اور صرف تین روز پہلے میرے تھانے کی حدود میں قتل کی ایک لرزہ خیز واردات ہوئی تھی۔ اصولی طور پر مجھے کرامت علی سے اسی موضوع پر بات کرنا چاہیے تھی لیکن میں اس کے سامنے کوئی اور ہی قصہ لے بیٹھا تھا۔

''کیا ہوا ملک صاحب!'' وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟ آپ مجھے خاصے الجھے ہوئے اور فکرمند نظر آ رہے ہیں۔''

''بات فکرمندی والی ہی ہے شاہ جی!'' میں نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''میرے ہوتے ہوئے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ملک صاحب!'' اس نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔ ''بتائیں، معاملہ کیا ہے؟ میں چٹکیوں میں آپ کا مسئلہ حل کر دوں گا۔'' بات کے اختتام پر اس نے باقاعدہ چٹکی بجا کر بھی دکھائی۔

''سب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا شاہ جی!'' میں نے



Scanned with CamScanner

وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن پچھلے چند روز سے میرے ساتھ عجیب و غریب واقعات رونما ہونے لگے ہیں!“

اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔ ”مثلاً کس قسم کے واقعات؟“

”جب رات کو میں اپنے کمرے میں سو رہا ہوتا ہوں تو صحن میں مجھے کسی کے چلنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں جب کمرے سے نکل کر باہر دیکھتا ہوں تو صحن میں مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ایسا تین، چار مرتبہ ہو چکا ہے۔ پچھلی رات تو حد ہی ہو گئی شاہ جی!“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سہمے ہوئے لہجے میں اضافہ کر دیا۔

”صحن میں کسی انسان کے قدموں کی مخصوص آواز تو میں چھ روز سے سن ہی رہا تھا لیکن گزشتہ رات میں نے چوڑیوں کے کھنکنے کی بڑی واضح آواز بھی سنی ہے۔ مجھے لگتا ہے۔“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”آپ کو کیا لگتا ہے ملک صاحب؟“

”میں محسوس کر رہا ہوں کہ کوئی گندی مخلوق میرے پیچھے پڑ گئی ہے جو مجھے نظر نہیں آتی مگر میرے کوارٹر کے صحن میں ہر رات آتی ہے۔“ میں نے شاہ جی کو اپنے شیشے میں اتارتے ہوئے ڈرے سہمے لہجے میں کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ آپ ابھی میرے ساتھ چل کر کوارٹر کو اپنی روحانی نظر سے دیکھیں۔ وہ نادیدہ مخلوق آپ کی نگاہ سے نہیں چھپ سکے گی۔ ویسے آپ کے خیال میں وہ کیا شے ہے؟“

”وہ سو فیصد کوئی چھل پیری ہے ملک صاحب!“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں فتویٰ صادر کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسا ہی معاملہ اس گاؤں کے ایک نوجوان کے ساتھ بھی تھا لیکن اس کے گھر والوں نے میری بات پر توجہ نہیں دی اور وہ نوجوان مارا گیا لیکن آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کے ہمراہ جا کر دیکھ لیتا ہوں کہ اس کوارٹر کے ساتھ کیا چل رہا ہے۔“

کرامت علی نے متین کو پیش آنے والے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے دانستہ اس کا نام نہیں لیا تھا۔ بہر حال، وہ میرے کوارٹر کو چیک کرنے کی غرض سے میری معیت میں تھانے پہنچ گیا۔ میں نے اسے اپنے کوارٹر کا راستہ دکھانے کے بجائے حوالات میں بند کر دیا کیونکہ میں تو اسے ”چیک“ کرنے کے خیال سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

اس صورت حال نے پہلے تو کرامت علی کو بوکھلا کر رکھ دیا پھر وہ قدرے سنبھلا اور مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ حتیٰ کہ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اگر میں نے اسے آزاد کر کے اپنے رویے کی معافی نہیں مانگی تو وہ مجھے جلا کر خاکستر کر دے گا۔ میں نے اس کی شیطانی بکواس کو جوتے کی نوک پر مارا اور ”خاطر تواضع“ کے لیے اسے حوالدار قادر بخش کے سپرد کر دیا۔

قادر بخش تو پہلے ہی کرامت علی کے لیے اپنے دل و دماغ میں نفرت اور ناپسندیدگی کا ایک طوفان چھپائے بیٹھا تھا۔ اس نے صرف ایک گھنٹے میں ”پیر صاحب“ کی ایسی دُھلائی اور ٹھکائی کی کہ وہ اپنا بیان حلفی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ کرامت علی کا یہ بیان بڑا سنسنی خیز اور افسوسناک تھا۔ میں یہاں پر اس کا خلاصہ آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔

چودھری نظام دین زرعی اراضی کی ہوس میں اندھا ہو چکا تھا۔ موضع نظام کوٹ اور اس کے آس پاس والے کی سیکڑوں ایکڑ زمین اس کی تھی، سوائے چودہ ایکڑ کے ایک ٹکڑے کے اور وہ ننھا سا قطعہ اراضی مقتول متین اور اس کے بھائی مبین کی ملکیت تھا۔ نظام دین نے وہ زمین خریدنے کے لیے ان بھائیوں کو بڑی سے بڑی پیشکش کی۔ مبین کسی حد تک چودھری کے جھانسے میں آ گیا تھا مگر مقتول کسی بھی صورت میں وہ آبائی اراضی بیچنے کو تیار نہیں تھا چنانچہ اس معاملے کو اپنے حق میں کرنے کے لیے چودھری نے اپنے مرشد کرامت شاہ کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

شاہ جی نے اس گھر کے سب سے کمزور فرد یعنی رسول بی بی کو چھل پیری کی فرضی کہانی سے ڈرانے کی کوشش کی تاکہ وہ لوگ موضع نظام کوٹ کو خیر باد کہہ کر کہیں اور چلے جائیں۔ اس کہانی کا رسول بی بی پر تو خاصا اثر ہوا لیکن وہ دونوں بھائی، خصوصاً مقتول متین نے اس معاملے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اسی دوران میں کوئی اپنا کیس لے کر شاہ جی کے پاس پہنچ گئی۔ شاہ جی نے نظام دین کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا پھر ان دونوں فرزندانِ ابلیس نے متین کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا منصوبہ بنا لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے سمجھنے کے لیے آپ کا سائنس دان ہونا ضروری نہیں۔

میں یہ بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا کہ آئندہ روز میں نے اس چیرہ دست چودھری نظام دین کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں کرامت علی کا اقبالی بیان حلفی بہت مفید ثابت ہوا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

غیور احمد کالج میں لیکچرار تھا۔ حال ہی میں اس کی مقامی کالج میں تعیناتی ہوئی تھی۔ وہ بہت اچھا پڑھاتا تھا، ایم اے انگریزی تھا اور خاصا ہینڈسم اور اسمارٹ بھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر ایک دوسرا انسان بھی چھپا بیٹھا ہو۔ یوں تو ہر ایک کے اندر دوسرا انسان ہوتا ہے لیکن فردا کو تو کم از کم ایسا ہی لگتا تھا جیسے سر غیور احمد کی شخصیت کا دوسرا پہلو بھی ہے جو اس سے زیادہ اہم ہے۔ تاہم وہ ''اہمیت'' کس طرح کی تھی، یہ فردا سمیت کوئی نہیں

# زندگی

اے آر راجپوت

زندگی کے حسین ترکش میں بڑے بے رحم تیر ہوتے ہیں... کب کوئی ان کا نشانہ بن جائے، کچھ پتا نہیں چلتا... جاگتی آنکھوں کے خواب جب چکنا چُور ہوتے ہیں تو دل تو ٹوٹتا ہی ہے... مگر اس کے ٹکڑے ایسے بکھرتے ہیں کہ انہیں سمیٹنا ناممکن ہو جاتا ہے... اور ایسے میں اگر نصیب کی خرابی بھی ساتھ ہو تو پھر... وہاں سے ٹھوکر ملتی ہے جہاں انسان کا گمان بھی نہیں ہوتا... بس ایک کسک ہی رہ جاتی ہے جو مقدر ٹھہرتی ہے۔

سچی محبت کی تلاش میں سرگرداں ایک لڑکی کا ماجرا

digest library.com

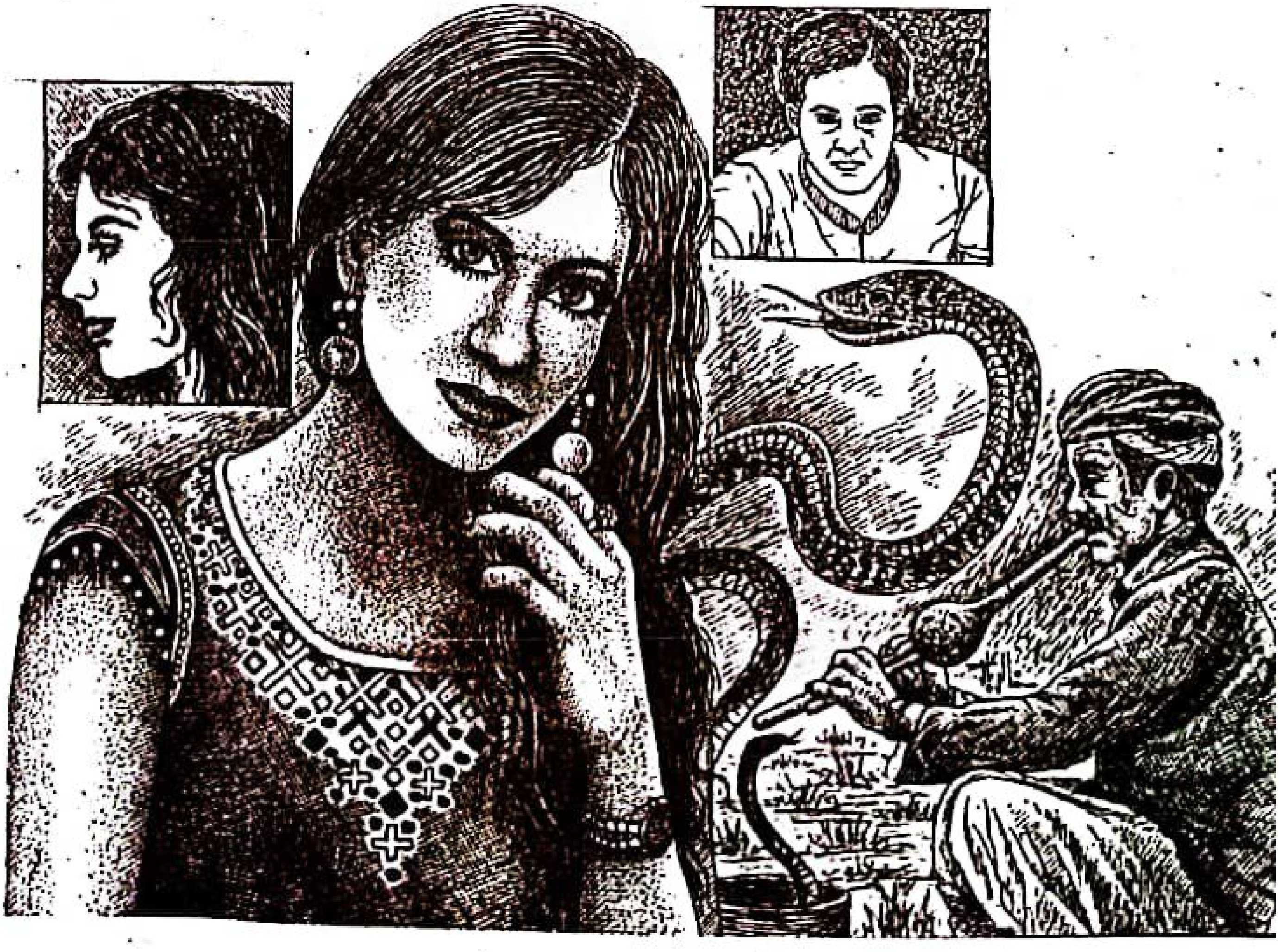

Scanned with CamScanner

جاتا تھا۔

یوں فروا کو جانے کیوں خوامخواہ کی ہی کھد بد لگی رہتی۔ غیور احمد جب بھی لیکچر دیا کرتا، سب طلبہ وطالبات بڑے غور سے اس کا لیکچر سنتے تھے، بالخصوص فروا تو کھو ہی جاتی۔ سر غیور کے لیے کبھی بھی نہیں سنا گیا کہ کسی اسٹوڈنٹ نے دوران کلاس لیکچر میں کوئی ذرا سی بھی شرارت کرنے کی کوشش کی ہو جیسا کہ عموماً سابقہ آنے والے لیکچرار کے ساتھ ہو چکا تھا اور یہی غیور احمد کا آج تک ''پلس پوائنٹ'' بھی رہا تھا۔ ان کے پڑھانے کا انداز ہی ایسا تھا کہ بس بندہ کھو ہی جائے اور سنتا رہے۔

لیکچر کے بعد اکثر لڑکیاں کوریڈور یا پھر ماربل کے چکنے صاف زینے کے اسٹیپ پر بیٹھی آپس میں اسی کے متعلق باتیں کرتی رہتیں۔ اپنی سہیلیوں کی زبانی فروا کو سر غیور سے متعلق یہ تبصرے اچھے لگتے تھے۔ فروا اتنی زیادہ حسین تو نہ تھی لیکن اس کی بڑی خوبی اس کی وہ کشش تھی جو پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کو اسی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ یہی وہ خصوصیت تھی جس نے اس کی سادہ سی شخصیت کو نمایاں ہی نہیں بلکہ سدا بہار رنگ عطا کیا تھا۔

بہرکیف، غیور احمد کالج کا وہ واحد استاد بن چکا تھا جسے طلبہ وطالبات دونوں میں یکساں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شروع شروع میں اس کی وجاہت اور جواں عمری کے باعث طلبہ میں اس سے حسد سا پایا جاتا تھا لیکن کچھ عرصے کے بعد جب اس کی ذات کو کالج کی حدود میں اچھی طرح پرکھ لیا گیا تو وہ بھی اس کے گرویدہ ہو گئے۔

فروا کو آج بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ سر غیور کالج کی حدود میں ایک عظیم استاد ہی نہیں، ایک مکمل انسان بھی تھے لیکن کالج کے باہر...... تب فروا بے اختیار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ کاش! اس کا اور سر غیور کا واسطہ ہی نہ پڑا ہوتا۔

☆☆☆

''واسطہ......!'' ہاں، یہی تو ایک ''گیٹ وے'' ہوتا ہے جہاں سے انسان کو انسان کا پتا چلتا ہے، تلخ حقیقتوں کا پتا چلتا ہے اور ان راہوں کا بھی جن پر چلنے کا انسان نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو اور پھر......

اس روز فروا اپنی بڑی بہن مغفرا کے ساتھ سپر اسٹور سے کچھ گھریلو شاپنگ کر کے لوٹ رہی تھی کہ اچانک مغفرا نے ڈرائیور سے ٹیکسی کا رخ جمشید روڈ کی طرف موڑنے کا کہا۔

''کیوں باجی! خیریت تو ہے، کیا وہاں سے بھی کچھ لینا ہے؟'' فروا نے بڑی بہن سے پوچھ لیا۔

''ہاں، مجھے آج اپنی ایک پرانی سہیلی کا خیال آ گیا۔'' مغفرا بولی۔ ''حال ہی میں فیس بک کی وجہ سے اتنے سالوں بعد اس سے کانٹیکٹ ہوا تھا اور پھر فون نمبر کا تبادلہ ہوا۔ سوچا تھا اس بار سپر اسٹور گئی تو اس سے بھی ملتی جاؤں گی۔ بیچاری بہت بلاتی رہتی ہے۔ بس، زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ پندرہ بیس منٹ ہی سہی، ٹیکسی کو باہر کھڑا رکھیں گے۔''

فروا خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ رفعت کے ہاں پہنچ گئے۔ دونوں اسکول کے زمانے کی سہیلیاں تھیں۔ بڑی محبت سے ملیں، باتیں ہوئیں۔ رفعت نے بتایا کہ اب وہ پرانے دوستوں کے واٹس ایپ میں ''ری یونین'' گروپ بھی بنانا چاہتی ہے۔

اسی وقت باہر کار کے ہارن کی آواز ابھری۔ فروا نے مغفرا سے کہا۔ ''باجی! شاید ٹیکسی ڈرائیور بیچارہ اکتا گیا ہے ہمارے انتظار میں۔''

''ارے نہیں، یہ کار میرے بھائی غیور احمد کی ہے۔ میں اس کی کار کے ہارن کو پہچانتی ہوں۔'' رفعت نے مسکرا کر کہا تو یکلخت فروا کا دل غیور احمد کے نام پر یکبارگی زور سے دھڑکا۔

''سر غیور......؟ لیکن نہیں، بھلا یہ کیا اتفاق ہوا، اس نام کے تو اور بھی لوگ ہو سکتے ہیں۔'' اس نے سوچا۔

لیکن ہوا وہی جس کے سبب اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ وہی نکلا جس کی جھلک ذرا دیر بعد فروا نے نشست گاہ کی کھڑکی سے دیکھ لی تھی۔ وہ اندر ہی آ رہا تھا۔

''ارے...... یہ تو وہی ہیں۔'' بے اختیاری کے عالم میں فروا کے منہ سے نکل گیا۔

''کون وہی ہیں بھئی؟'' معاً ہی مغفرا نے چونک کر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میرے استاد......!''

''اوہ...... اچھا۔'' رفعت بھی مسکرائی۔ اثنائے راہ غیور احمد اندر داخل ہوا۔

''ارے، فروا......! تم یہاں؟'' غیور احمد نے خوشدلی سے کہا۔

''جی سر!'' فروا تھوڑا گڑبڑائی۔ ''یہ میری بڑی آپی ہیں۔ آپ کی بہن کی پرانی سہیلی، ان سے ملنے کو آئیں تو میں

بھی چلی آئی تھی۔"

"اچھا، تو یہ بات ہے۔ بھئی بجیا جی! ہماری لائق فائق اسٹوڈنٹ آئی ہیں، ان کی کچھ خاطر مدارت بھی کی یا صرف باتیں ہی ہورہی ہیں۔" غیور نے مسکرا کر بہن سے کہا۔

"خاطر بھی ہوجائے گی، تم فکر مت کرو۔ میں نے جمیلہ سے کہہ دیا ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں فروا کو اپنا اسٹوڈیو دکھادوں؟"

"جاؤ، لے جاؤ، دکھالاؤ اپنی الٹی سیدھی لکیریں۔" رفعت نے کہا۔

"چلیں، الٹی سیدھی لکیریں ہی سہی..... آؤ فروا!"

"اسٹوڈیو..... کیسا اسٹوڈیو؟"

"ارے بھئی، آؤ تو۔ دراصل مابدولت کو تھوڑا بہت فنِ مصوری کا بھی شوق ہے۔"

"اوہ، اچھا..... اچھا تو سر! آپ مصور بھی ہیں۔ واہ سر! آپ نے تو....."

"آپ نے تو کیا؟"

"میرا مطلب ہے کہ..... کہ....."

"اچھا چھوڑو مطلب وطلب، تم یہ بتاؤ کہ کیا کبھی تمہیں یہ خیال..... اچھا چھوڑو اس خیال کو بھی..... پہلے تم میرا اسٹوڈیو دیکھ لو۔"

وہ دونوں ہال نما ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کی چاروں دیواروں پر چھوٹی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔ فرش پر بھی جگہ جگہ مکمل اور نامکمل تصویریں رکھی ہوئی تھیں جبکہ کمرے کے عین درمیان میں ایک بڑی سی میز پر فنِ مصوری کا سامان موجود تھا۔

فروا نے ایک ایک تصویر کو بڑے غور سے دیکھا۔ کچھ واجبی سی لگیں اسے، کچھ اچھی بھی تھیں اور کچھ تو بہت ہی اچھی تھیں۔ تمام تصویریں دیکھ چکی تو غیور احمد کی طرف ستائشی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"سر! آپ واقعی باکمال آدمی ہیں۔"

غیور احمد اس وقت سر جھکائے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ اس کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا، بدستور سر جھکائے کھڑا رہا۔

"کیا بات ہے سر! کوئی مسئلہ ہوا ہے؟" فروا نے قدرے چونک کر پوچھ لیا۔

"ہاں، تم صحیح سمجھیں۔ ایک مسئلہ ہے، بہت ہی خاص مسئلہ۔ آؤ، میں تمہیں وہ مسئلہ دکھاؤں۔" کہتے ہوئے غیور احمد نے ایک جانب قدم اٹھادیے۔ فروا کچھ نہ سمجھ میں آنے والے انداز سے اس کے پیچھے ہولی۔ غیور احمد نے ایک بڑی سی الماری کے اوپری خانے سے اخبار میں لپٹا ہوا ایک تین بائی دو کا فریم نکالا اور اسے فروا کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولا۔

"فروا! تم آرام سے بیٹھو اور اطمینان سے اسے کھول کر دیکھو کہ یہ کیا ہے۔"

فروا حیران حیران سی اس کے ہاتھوں سے فریم لے کر قریب موجود کرسی پر بیٹھ گئی۔ دھڑکتے دل سے فریم پر لپٹے ہوئے کاغذ کو کھولا۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی حیرت کے سبب ایک مرتبہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

تصویر اس کی تھی اور اسے آئل کلر سے بنایا گیا تھا اور یہ تصویر اپنے بنانے والے کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اس نے ایک لمحے کو پلکیں اٹھا کر غیور احمد کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ باندھے اسی کی طرف تکے جارہا تھا، بولا۔

"اب ذرا اسے پلٹ کر بھی دیکھو، اس کے پیچھے بھی کچھ ہے۔"

فروا نے تصویر کو پلٹا۔ اس کے پیچھے نہایت خوبصورت انداز کی تحریر میں ایک خوبصورت سی نظم بھی لکھی تھی۔

کھرچ رہا ہوں
کریدتا ہوں
تباہ دل کو
سیاہ دل کو
جو خاک سا ہے
جو آگ سا ہے
جواب محض
راکھ، راکھ سا ہے

نظم یہاں سے شروع ہوکر گویا فروا کو کیفیتوں کی نئی صورتِ حال سے دوچار کرکے ایسی جگہ ختم ہوئی جہاں تشنگی کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ نظم ختم کی ہی تھی کہ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے تصویر پر دوبارہ کاغذ لپیٹ دیا۔ ملازمہ ان کی چائے اندر ہی لے آئی تھی۔ فروا نے بڑی عجلت میں چائے ختم کی پھر اٹھتے ہوئے نہایت آہستگی سے بولی۔

"سر! اب میں جاؤں گی، آپی منتظر ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے، جاؤ۔"

فروا نے قدم آگے بڑھائے۔

"ایک منٹ۔" غیور احمد کی آواز آئی۔ فروا کے قدم رک گئے۔ "کیا تم اس تصویر کو اس قابل بھی نہیں سمجھتیں کہ



Scanned with CamScanner

اسے میری طرف سے تحفتاً ہی قبول کرلو؟“

”جی...... جی نہیں سرا آپ غلط سمجھے۔ میرے ساتھ اس وقت آئی ہیں...... پھر کبھی سہی۔“

”پھر کب......؟“ وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ چند لمحے فرش پر نگاہیں جمائے چپ چاپ کھڑی رہی، بالآخر ہمت کر کے بولی:

”جب آپ کہیں۔“

”اوہ، شکریہ فروا! بہت، بہت شکریہ۔ تم...... تم اگر کل چار سے پانچ بجے کے درمیان آسکو تو......“

”ٹھیک ہے، میں آجاؤں گی۔“ فروا نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اگرچہ اس کا دل بڑی طرح دھڑکنا شروع ہو چکا تھا۔ اس نے سرغیور کی بے پناہ خوشی محسوس کر لی تھی۔

☆☆☆

اور پھر کل کا دن بھی آ گیا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ فروا کو سرغیور کے اس طرح اظہارِ محبت کے انداز نے بہت متاثر کیا تھا۔ اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اس کے جواب میں ”نہ“ کرنا اس کے نزدیک کفر سے کم نہ تھا جبکہ سرغیور تھے بھی اس قابل کہ دنیا کی کوئی بھی لڑکی انہیں پا کر خود پر ناز کر سکتی تھی۔

وہ تمام تر تیاریوں کے ساتھ گھر سے نکلنے ہی والی تھی کہ بینا آ گئی۔ بینا اس کی بہت گہری سہیلی تھی اور رازداں بھی۔ ہلکی نیلی آنکھوں والی بینا سنجیدہ مزاج کی لڑکی تھی۔

”یہ تم کہاں چلیں؟“ اس نے فروا کے سراپا پر نظریں دوڑاتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

”سرغیور سے ملنے۔“ اس نے صاف صاف بتا دیا۔ شاید اس سے خوشی سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔

”کیا......؟“ بینا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ہاں تو، اس میں اتنی حیرانی والی کیا بات ہوگئی؟“

”وہ تمہارے ساتھ کوئی چکر وکر تو نہیں چلا رہا؟“

”کیا چکر؟ تم ذرا تہذیب کے دائرے میں بات کرو۔“

”تہذیب......! خیر چھوڑو۔ تم ذرا ایک منٹ کے لیے میرے گھر چلو۔“

”تمہارے گھر...... میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ میں اس وقت سرغیور کے گھر جا رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے، چلی جانا، میں تمہیں روک تو نہیں رہی۔ اس وقت صرف چند منٹ کے لیے میرے گھر چلی چلو پھر وہاں سے سرغیور کے گھر بھی چلی جانا۔“

فروا نے چند لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر بولی: ”ٹھیک ہے، چلو۔“

فروا، بینا کے ساتھ اس کے گھر پہنچی۔ وہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک فریم شدہ تصویر تھی۔

”یہ ذرا لو اور اسے دیکھو بھی۔“ کہتے ہوئے بینا نے تصویری فریم اسے تھما دیا۔ وہ لمحہ فروا کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ تصویر بینا کی تھی اور اسے یقیناً سرغیور نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ نیچے ان کے سائن بھی موجود تھے۔

فروا کو جواب مل چکا تھا، حقیقت دکھائی دے گئی تھی۔ دھوکا ہونے سے پہلے فریب کا پردہ چاک ہو چکا تھا۔ اب اس کے پاس کچھ کہنے کے لیے کیا بچا تھا، بجز اس کے کہ وہ سرغیور کے گھر جانے کے بجائے الٹے پاؤں اپنے گھر کا رخ کرتی۔

ابھی کہاں، ابھی تو گویا پینڈورا بکس کھلا تھا۔ فروا کو بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسی ہی تصویر سے سرغیور نے سونیا کو بھی نوازا تھا۔ تب ہی بینا اور فروا نے اور تحقیق کی تو کچھ اور لڑکیاں بھی ”عنایت یافتہ“ نکلیں۔ ان کا جی تو چاہا کہ سرغیور کے خوب لتے لیے جائیں پھر یہ سوچ کر خاموش رہیں کہ ہمارے معاشرے میں مردوں کا تو کچھ نہیں، البتہ عورت ذات جو پہلے ہی بیچاری کچے گھڑے کی مثل ہوتی ہیں، ان کا ضرور بگڑ جائے گا۔

فروا نے اس کے بعد سے سرغیور سے صرف کلاس ٹیچر اور اسٹوڈنٹ کی حد تک تعلق رکھا اور بس۔ اگرچہ غیور احمد بھی اس کی اچانک تبدیلی پر حیران ہوا تھا اور اس نے کچھ یاد دلانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن فروا نے سختی اور قدرے درشتی سے اسے جھٹلا دیا۔ غیور احمد کو بھی پھر عجیب سی چپ لگ گئی۔

☆☆☆

انہی دنوں فرحان نامی ایک نئے طالب علم کا اضافہ ہوا۔ وہ لمبا سا مگر خوبرو لڑکا تھا۔ شریف لگتا تھا اور اپنے غیر معمولی لمبے قد کی وجہ سے جھینپا جھینپا ہی رہتا تھا۔ کسی سے کم ہی بات کرتا اور لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے تو اس کی جان ہی نکلتی تھی۔ البتہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا بھی انکشاف ہوتا گیا۔ وہ ہرفن مولا تھا، شعلہ بیان، تقریر میں ید طولیٰ رکھتا۔ حیرت کی بات بھی یہی تھی کہ اس قدر شرمیلا بھلا تقریروں میں اس قدر شعلہ بیان کیونکر تھا۔ خیر، کچھ عجیب ہی سا لڑکا تھا۔ تاہم سب کی متفقہ رائے اس کے بارے میں یہی تھی کہ وہ ایک اچھا لڑکا تھا۔



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

بہرکیف، یہ کچھ روز بعد کا ذکر تھا۔ کالج ٹور پر بس پوائنٹ میں سارے طلبہ وطالبات اندرونِ سندھ کے تفریحی مقام پر تقریباً پچیس کلومیٹر مطالعاتی دورے پر گئے۔ فروا اور ہینا بھی ساتھ تھیں۔ گھومتے گھومتے وہ سب ایک وسیع میدان میں جا نکلے۔ پورے میدان میں کہیں گھاس کا ایک تنکا تک نہ تھا۔ میدان میں جگہ جگہ اونچی نیچی لاتعداد پہاڑیاں تھیں۔ ان میں سے بہت سی پہاڑیوں پر بڑے چھوٹے پتھر کچھ اس ترتیب سے رکھے تھے کہ ان پر کمروں کا گمان ہوتا تھا۔

دوپہر کے دو بجے انہوں نے کھانا کھانے کے لیے ایک بڑی سی پہاڑی منتخب کی۔ اس پہاڑی پر بھی ایک بے چھت کا کمرا موجود تھا۔ تین جانب کی دیواریں تقریباً چار چار فٹ کی تھیں جبکہ سامنے والی دیوار پورے سات فٹ لمبی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا کہ اچانک بین کی ایک انتہائی خوشگوار دھن فضا میں گونجنے لگی۔ سب اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ تب ہی فرحان نے اپنی چائے کا کپ ایک دو لمبے لمبے گھونٹ لے کر ختم کیا اور پھر دوڑتے ہوئے اس پہاڑی سے اتر کر شمال کی جانب بنی ایک کافی بلند پہاڑی پر چڑھ گیا۔ سب اسی کی جانب ہی دیکھ رہے تھے۔

پھر کچھ دیر بعد اس نے تیزی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں کو لہراتے ہوئے باقیوں کو بھی اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب جب دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچے تو اس نے انہیں دائیں جانب نیچے کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا۔

سامنے ایک عجیب وغریب منظر ان کا منتظر تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ستر، اسی سالہ بوڑھا سپیرا جس کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں، بین کو ہونٹوں سے لگائے بیٹھا تھا اور اس کے چاروں طرف سانپوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر کچھ لڑکیوں کے منہ سے تو چیخیں نکل گئیں۔

بابا سپیرے نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پھر بین اپنے ہونٹوں سے جدا کرلی۔ اس کے ساتھ ہی سارے کے سارے سانپ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔

سانپوں کے جانے کے بعد بابا جی نے انہیں اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب اس کے قریب جا پہنچے۔ اس نے ان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اسے بتایا کہ وہ سب طالب علم ہیں اور یہاں کے تفریحی اور مطالعاتی دورے پر آئے ہوئے تھے۔

بابا جی نے اس علاقے کے بارے میں بہت سی باتیں انہیں بتائیں اور آخر میں کہا۔ ''اس علاقے میں سانپوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ تم لوگوں کو اس زمین پر کھڑے ہوئے ہمہ وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ کوئی زہریلا سانپ تم میں سے کسی کو ڈس لے۔''

اس کے بعد سپیرے بابا نے ان کے مزید استفسار پر آگے بتایا۔ ''بچو! میری ساری عمر سانپوں کی ہمراہی میں گزری ہے۔ میرے پاس تقریباً ہر نسل کا سانپ موجود ہے۔ البتہ ایک انتہائی کمیاب نسل کا سانپ ایسا ہے جو اب تک میرے قابو میں نہیں آسکا۔'' بابا جی نے اس سانپ کا نام ''سکراری'' بتایا تھا۔

سانپ کا نام سنتے ہی فرحان نے مسکراتی ہوئی نظروں سے بابا جی کی طرف دیکھا اور کہا۔

''بابا جی! کیا آپ اسی سانپ کی تو بات نہیں کر رہے ہو جو سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور اس کے سارے بدن پر سفید سفید ستارے (چکتے) بنے ہوتے ہیں جس سے ہمہ وقت دودھیا سی روشنی پھوٹتی رہتی ہے؟''

''ہاں، ہاں...... وہی۔'' بابا ایک دم چونک سے گئے۔ وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولے۔ ''اس کا مطلب ہے تم سانپوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو؟''

''جی ہاں، مجھے سانپوں کے بارے میں خاصی معلومات ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسے پکڑنے کی ایک کوشش میں بھی کر دیکھوں۔''

''تم......؟ سوچ لو، وہ انتہائی برق رفتار، شیطان صفت اور نہایت زہریلا سانپ ہے۔''

''جی، بابا جی! میں جانتا ہوں۔ آپ فکر مت کریں۔'' فرحان پورے یقین اور اعتماد سے بولا۔ ''آپ کے پاس سفید زیرہ، نوشادر، سفرا اور دو پیرا تو یقیناً ہوں گے۔''

''ہوں ں......!'' جواب میں بابا جی نے ایک گہری سانس لی۔ کچھ دیر تک وہ فرحان کی آنکھوں میں دیکھتے رہے پھر مطلوبہ چیزیں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''ٹھیک ہے بچہ! تو کوشش کر ڈال۔''

''شکریہ بابا جی!'' پھر فرحان نے ایک بڑے سے پیالے میں ان سب چیزوں کو کوٹا اور ایک ساتھی فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے پاس الائچیاں ہوں گی؟''

فیروز نے اپنی جیب سے الائچیاں نکال کر اس کی طرف بڑھائیں۔ فرحان نے پانچ الائچیاں اس میں ڈال



Scanned with CamScanner

کر کے تیس پھر پھلوں کی ٹوکری سے تین سنگترے نکال کر ان کا عرق اس میں نچوڑا۔ اس کے بعد اپنی انگلی سے چاندی کی انگوٹھی اتاری، اسے اس مشروب میں تین مرتبہ ڈبو کر نکالا، کچھ پڑھ کر تین بار اس پر پھونکا اور سات قدم آگے بڑھ کر ایک بڑا سا دائرہ بنایا اور اپنے بنائے ہوئے عرق کو دائرے کے چاروں طرف چھڑک دیا، بابا کی بین کے سوراخوں میں بھی ٹپکا دیا پھر بابا سے بولا۔

"بابا جی! اب برائے مہربانی ان سب لوگوں کو لے کر پہاڑی پر چلے جائیں۔"

بابا جی نے خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ یہ سب لوگ بابا کے پیچھے تھے۔

وہ سب جیسے ہی پہاڑی پر پہنچے، فرحان نے بین ہونٹوں سے لگائی اور پھر اس کی بین سے نکلنے والی دھن ان سب کو مبہوت کر گئی، بالخصوص فروا کو یوں لگا جیسے اس پر غنیند سی طاری ہونے لگی ہو۔ "یقیناً دوسروں کا بھی یہی حال ہو رہا ہوگا۔" اس نے سوچا۔

چند لمحے کے اندر اندر فرحان کے اردگرد سانپوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے اب سے تھوڑی دیر قبل بابا جی کے اردگرد لگا ہوا تھا۔ وہ سب سانپ فرحان کے بنائے ہوئے دائرے سے باہر تھے پھر فروا نے دیکھا کہ فرحان نے ایک مٹھی مٹی اٹھا کر بچے ہوئے عرق میں ڈالی اور اس مٹی کو پوری طاقت کے ساتھ اپنے چاروں طرف بکھیر دیا۔ اس کے بعد اپنے مٹی سے لتھڑے ہوئے ہاتھ کو بین کے سوراخوں پر پھیرا۔ اب بین کی دھن ناقابلِ بیان حد تک سریلی ہوگئی تھی۔ فروا کی آنکھیں مدہوشی کے عالم میں بند ہوتی چلی جا رہی تھیں، پھر اسی مدہوشی کی کیفیت میں اس نے دیکھا کہ "سنگراری"...... ہاں، وہ یقیناً سنگراری ہی تھا۔ سرخ رنگت والا، اس کے جسم پر سفید رنگ کے ستارے بنے ہوئے تھے اور ان ستاروں سے دودھیا رنگ کی روشنی پھوٹتی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز بھی بڑا عجیب و غریب تھا۔ وہ چند قدم چل کر اپنی دم پر بالکل سیدھا کھڑا ہو جاتا اور پھر زوردار انداز میں اپنے جسم کو زمین پر پٹخ دیتا۔ جیسے ہی دوسرے سانپوں کو اس کی آمد کا احساس ہوا، وہ سب خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔

سنگراری اب بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور فرحان کے بنائے ہوئے دائرے کو کراس کر گیا۔ فروا اور دیگر میں سے اکثر لڑکے لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ فروا نے تو مارے دہشت کے اپنی آنکھیں ہی بند کرلی تھیں۔

"زندہ باد......!" یہ کسی لڑکے کی آواز تھی۔ یہ فرحان ہی تھا۔ تب ہی فروا نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو اب منظر ہی اور تھا۔ فرحان بڑے فخریہ انداز میں پٹاری اٹھائے انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اس نے سنگراری پر فتح پالی ہے۔

پھر تو سب ہی تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس کے پاس پہنچے تو اس نے پٹاری بابا جی کے ہاتھوں پر رکھ دی۔ بابا جی نے جذبات سے بے قابو ہو کر اس کی پیشانی کو چوم لیا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں کوئی بہت بڑا انعام دوں لیکن افسوس، میرے پاس سوائے سانپوں کے کچھ اور نہیں۔"

جواباً فرحان نے کہا۔ "بابا جی! سانپ بذاتِ خود بہت بڑی دولت ہوتے ہیں۔ اگر آپ مجھے کچھ دینا ہی چاہتے ہیں تو "دمڑ" ہی دے دیں۔ وہ یقیناً آپ کے پاس ہوگا ہی۔"

"ہاں، ہے تو سہی۔" بابا جواب میں بولے۔ "مگر یہ بتاؤ کہ تمہیں نر چاہیے یا مادہ؟"

"کوئی بھی دے دیجیے۔"

"ہوں۔" بابا جی مسکرائے۔ "تو اس کا مطلب ہوا کہ تمہاری "دمڑ" سے متعلق معلومات ادھوری ہیں کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی جدائی برداشت نہیں کرتے اور ان کی جدائی کا مطلب موت ہے۔ ہماری برادری میں اس جوڑے کو محبتوں کی جوڑی کہتے ہیں۔"

اس کے بعد بابا جی انہیں وہاں سے کچھ دور اپنے ڈیرے پر لے گئے اور دمڑ کا جوڑا فرحان کے حوالے کر دیا۔ دمڑ کو پا کر فرحان کے رویے سے یوں لگا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

☆☆☆

اس واقعے کے تیسرے روز کی بات ہے۔ فروا یونیورسٹی کی لائبریری کی طرف جا رہی تھی کہ راہداری میں اس کا فرحان کے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔

"ارے، فروا! یہ تمہیں کیا ہوا؟" وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔

"مجھے......؟ مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔"

"کچھ نہیں ہوا...... کمال ہے۔" کہتے ہوئے فرحان نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو چھوا پھر پیچھے ہٹ کر تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ "فروا! میرا خیال ہے تمہیں بخار ہے۔ تم چھٹی لے کر گھر چلی جاؤ۔"

فروا نے ہنس کر اس کی بات ٹال دی اور لائبریری میں چلی آئی لیکن ابھی اسے بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اسے اپنا ذہن بوجھل بوجھل سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے دو تین مرتبہ گردن کو جھٹکا لیکن کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تو ایک دم آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کینٹین میں آئی۔ چائے منگوا کر پی تو بے ذائقہ محسوس ہوئی۔ اس نے فوری طور پر گھر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ کتابیں اٹھا کر باہر نکلی ہی تھی کہ ایک مرتبہ پھر فرحان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اسے دیکھتے ہی فروا مسکرا کر بولی۔

"فرحان! آج تمہاری صلاحیتوں میں سے ایک اور صلاحیت کا انکشاف ہوا ہے۔ میری طبیعت واقعی خراب ہے، میں گھر جارہی ہوں۔"

فروا گھر آکر بستر پر لیٹی تو سارا دن اس کے دل و دماغ میں فرحان کی شخصیت چکراتی رہی۔ اس نے پہلے کبھی فرحان کے بارے میں اس انداز میں نہ سوچا تھا لیکن آج اس کی ہر سوچ فرحان کے لیے تھی اور پھر وہ اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے سوگئی۔

دن کے آخری پہر میں اس نے خواب میں دیکھا کہ فرحان گہری نیند سو رہا ہے اور اس کے بستر پر "دمڑ" نامی سانپ کا جوڑا چڑھ آیا ہے اور آہستہ آہستہ اس کے چہرے کی طرف سرک رہا ہے۔ فروا آواز دے کر فرحان کو جگا دینا چاہتی تھی لیکن باوصف کوشش کے اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلتی۔ یہاں تک کہ دمڑ کا جوڑا فرحان کی پیشانی پر ڈس لیتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی ایک چیخ کے ساتھ فروا کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

اس نے گھڑی دیکھی، رات کے پونے چار بج رہے تھے۔ وہ اضطرابی کیفیت میں بستر سے نیچے اتر آئی۔ فون اٹھایا اور فرحان کے سیل کا نمبر پنچ کیا۔

"ففف...... فرحان! تم خیریت سے تو ہو نا؟ سس...... سانپ نے تمہیں ڈس تو نہیں لیا؟"

"تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا۔"

"ہاں، ہاں۔ مم...... میں نے...... میں نے خواب میں ہی تو دیکھا ہے مگر......" وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

"پھر تمہارا خواب ٹھیک ہی ہے۔"

"اوہ...... میرے خدا! کیا مطلب؟ مم...... میں فوری طور پر تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"اس وقت......؟" فرحان کو حیرانی ہوئی۔ "بھئی ابھی تو رات ہے، صبح کا انتظار کرلو۔"

"نہیں، رات وات کوئی نہیں۔ آپ صبح ہونے میں چند ہی گھڑیاں باقی ہیں۔ میں آرہی ہوں۔ کیا آجاؤں؟"

"ٹھیک ہے، آجاؤ۔ اس سے اچھی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ اس وقت گھر میں اور کوئی ہے بھی نہیں۔ سب شادی میں لاہور گئے ہوئے ہیں۔"

"اوہ...... تو پھر تمہیں تو میری اور زیادہ ضرورت ہے۔ میرا انتظار کرو۔"

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ فرحان کے گھر کے سامنے رکشے والے کو کرایہ ادا کررہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"بچہ! رکشا خالی ہے کیا؟" فروا چونکی کیونکہ اسے یہ آواز شناسا سی لگی تھی۔ اس نے گردن گھمائی، یہ سانپوں والے بابا تھے۔ اس نے بابا کو سلام کیا تو جواب میں بابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کہاں جانا ہے بابا جی؟" اس دوران رکشے والے نے ان سے پوچھا۔

"محمود آباد جانا ہے بچہ! چلے گا؟"

"ہاں، بابا! ضرور۔ آپ بیٹھیں۔"

"اچھا بیٹی! خدا حافظ۔" بابا جی نے ایک مرتبہ پھر فروا کے سر پر ہاتھ رکھا لیکن اب کے ہاتھ رکھتے ہی وہ بری طرح چونک گئے اور یکدم گہری گہری سانس لینے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کررہے ہوں۔ اس دوران ان کی نظریں فروا کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ تب ہی وہ رکشے والے کی طرف پلٹے اور اس سے بولے۔

"بچہ! تم جاؤ، اب میں نہیں جاسکتا۔" رکشے والا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا پھر ایک جھٹکے سے رکشا اسٹارٹ کرکے آگے بڑھ گیا۔

"تم اس وقت کہاں جارہی ہو؟" بابا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رکھی تھیں۔

"ففف...... فرحان...... مم...... میں......" اس سے بات پوری نہ ہو پارہی تھی۔ اس نے گردن جھکا دی۔

"فرحان؟ یہ وہی لڑکا تو نہیں جو مجھ سے دمڑ لے کر آیا تھا؟"

"جی...... جی ہاں۔" فروا نے بدستور اپنی گردن جھکا رکھی تھی۔

"گردن اٹھاؤ۔" بابا جی کی آواز میں تحکم سا تھا۔ اس نے گھبرا کر گردن اٹھادی۔ بابا جی نے اپنے چوغے کی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اس میں ایک سبز رنگ کا روغن تھا۔ اسے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی پر ملا پھر تھوڑی دیر تک آنکھوں کو بند کرکے کچھ پڑھتے رہے، اس



Scanned with CamScanner

کے بعد بسم اللہ کہتے ہوئے انگلی کو اس کی پیشانی پر مل دیا۔

اس کے ساتھ ہی فروا کو یوں لگا جیسے اس کا ذہن کھل سا گیا ہو۔ اس کی بوجھل بوجھل سی طبیعت ایک دم سے بحال ہو گئی۔

"جاؤ، اگر اب بھی تم فرحان سے ملنا چاہتی ہو تو چلی جاؤ اس کے گھر۔"

فروا سوچ میں پڑ گئی۔ گھڑی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"نہیں بابا جی! میں اب کہیں نہیں جانا چاہتی، مجھے کسی سے نہیں ملنا۔ میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ میرے گھر والے اٹھ گئے ہوں گے اور وہ میرے لیے پریشان ہوں گے۔"

اس کے بعد بابا خود فروا کو اس کے گھر تک چھوڑنے آئے۔ راستے میں فروا نے بابا جی کو پوری بات بتا دی۔

"بابا جی! آخر یہ سب کیا ہے؟ میں فرحان کے لیے اپنے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں رکھتی تھی۔"

"بیٹی! یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں نے اسے دمڑ کا جوڑا دے کر انتہائی غلطی کی تھی۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ دمڑ کو اس غلیظ مقصد کے لیے استعمال کرے گا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ اس دن میں نے کہا تھا کہ اس جوڑے کو ہماری برادری میں محبتوں کے خدا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ایک انتہائی سیدھا سادہ، معصوم اور آپس میں ناقابل یقین حد تک محبت رکھنے والا سانپ ہے۔ اس کمبخت فرحان کے بچے نے اس معصوم سے جوڑے کو ہلاک کر ڈالا ہے اور ان کے جسموں کو کچل کر ایک ایسا عرق تیار کیا ہے جس کو اگر کسی کی پیشانی پر لگا دیا جائے تو وہ اسی کا ہو کر رہ جائے گا۔ میرا خیال ہے تم اس کا پہلا شکار ہو۔ خدا کا شکر ہے میں عین وقت پر پہنچ گیا ورنہ...... بہرحال، تم گھر جاؤ اب اور شکرانے کے نفل ادا کرو۔ میں اس خبیث کے گھر جاؤں گا اور ہر حالت میں اس کے بنائے ہوئے عرق کو ضائع کر دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے بابا آگے بڑھ گئے۔

کچھ دن بعد ہی فروا کو معلوم ہو گیا کہ بابا جی نے وہ عرق ضائع کر دیا تھا۔

☆☆☆

فروا کا اب محبت سے ہی نہیں، مردوں سے بھی اعتبار اٹھ گیا تھا۔ وہ اب اپنی پوری توجہ تعلیم پر دینے لگی۔ تاہم اسی دوران گھر میں اس کے رشتے وغیرہ کی بھی باتیں چلنے لگیں۔ اس کی منگنی ہو گئی۔ فروا یوں بھی فیصلہ کر چکی تھی کہ شادی وہ اپنے گھر والوں کی مرضی سے کرے گی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ شاہ جہاں سے منگنی اور پھر فوراً شادی بھی ہو گئی۔

وجہ اس کی یہی تھی کہ فروا کی ماں بہت بیمار رہنے لگی تھی اور وہ اپنی زندگی میں ہی اپنی بیٹی کو رخصت کر دینا چاہتی تھی۔

شاہ جہاں ایک اچھا شوہر ہی نہیں بلکہ ایک اچھا انسان بھی ثابت ہوا تھا۔ وہ فروا کا بہت خیال رکھتا تھا۔ فروا کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرے گی اور اس نے اس کی خواہش کا تہہ دل سے احترام کیا تھا۔ شاہ جہاں ایک پرائیویٹ فرم میں اچھی ملازمت کرتا تھا۔ یوں بھی وہ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ان کے ابو یعنی فروا کے سسر ایک اچھے سرکاری عہدے پر فائز تھے اور شاہ جہاں ان کی اکلوتی اولاد تھا۔

اسی دوران کالج میں ایک اور اسٹوڈنٹ کا اضافہ ہوا۔ یہ ایک لڑکی تھی، بہت ہی حسین اور خوبصورت۔ اس کا نام آرزو تھا۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ آرزو کالج کی حسین ترین لڑکی ہے۔ بڑی بڑی آنکھوں پر لانبی لانبی گھنیری پلکیں، دلکش سے ہاتھ اور متناسب سراپا۔ تھی بھی بڑی شوخ۔ اس کا سب سے بڑا مشغلہ لڑکوں کو بے وقوف بنانا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ دنیا کے کسی بھی مرد کو اپنے قدموں میں جھکا سکتی ہے۔

فروا سمیت جب اور لڑکیاں اس سے کہتیں کہ آرزو! کہیں اس کھیل میں کبھی تم خود ہی بے وقوف بن کر خود کو لٹا نہ بیٹھنا' تو وہ گردن جھٹک کر بڑے فخریہ انداز میں کہتی۔

"اونہہ...... کوئی مجھے ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔ میں نے جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ حاصل کر رکھی ہے۔ میں ہاتھ توڑ ڈالنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ مجھے آرزو کہتے ہیں...... آرزو حیدر۔"

کچھ روز بعد فروا اور آرزو آپس میں دوست بن گئیں۔ تب ہی فروا اس کے سامنے اپنے شوہر شاہ جہاں کی تعریفوں کے پل باندھنے لگی۔ پہلے تو سکون سے آرزو سنتی رہی پھر بڑے طنزیہ لہجے میں بولی۔

"مجھے تو پھر تمہارا شوہر چھپا رستم لگتا ہے۔ اس بے اعتبار زمانے میں کوئی اس قدر محبت نچھاور کرے تو کچھ تو دال میں کچھ کالا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس بیچارے نے تم سے زیادہ آج تک کوئی حسین لڑکی دیکھی ہی نہیں ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ ایک سے ایک حسین لڑکی خود ان کے اپنے خاندان میں موجود ہے اور پھر آج صبح انہوں نے تمہیں بھی تو دیکھا ہے۔ تم نے کون سے ان کی آنکھوں میں جھنڈے گاڑ دیے۔ وہ اس قسم کے مردوں میں سے نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کی میں ہی ابتدا ہوں اور میں ہی انتہا۔"



Scanned with CamScanner

''اوہو...... اتنا اعتماد'' کہتے ہوئے آرزو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''چیلنج؟''

''چلو چیلنج ہی سہی۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا، فروا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ دے مارا۔

اگلے دن اس نے شاہ جہاں سے کہا۔ ''شاہ جہاں! میں نے جمعے کے دن آرزو کو بلایا ہے۔ وہ جمعے کا سارا دن ہمارے ساتھ گزارے گی۔ میری بہت پیاری سہیلی ہے۔ اتفاق سے چند دنوں کے لیے اس شہر میں آئی ہوئی ہے۔ پلیز! تم جمعے کے دن کہیں مت جانا۔ وہ بڑی شوخ قسم کی لڑکی ہے، ایک منٹ کو نچلا نہیں بیٹھتی۔ مجھے کھانا وغیرہ بنانا ہوگا۔ اس عرصے میں آپ کیرم یا اسکریبل کھیل کر اس کا دل بہلائے رکھیے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ ایک خوشگوار دن گزارے۔''

''ٹھیک ہے صاحب! اگر آپ کا حکم ہے تو ایسا ہی سہی۔ ہم آپ کی سہیلی کو قطعی بور نہیں ہونے دیں گے اور پوری کمپنی دیں گے۔''

پھر جمعے کا دن بھی آ گیا۔ فروا نے دن کا آغاز اس دعا سے کیا کہ اے خدا! تو میرے میاں کو ثابت قدم رکھنا۔ آرزو صبح نو بجے ان کے گھر آ گئی اور رات نو بجے واپس گئی۔ اس دوران اس نے تقریباً ڈھائی گھنٹے شاہ جہاں کے ساتھ مکمل تنہائی میں گزارے۔ پروگرام کے مطابق فروا دس سے گیارہ بجے تک گھر سے باہر بھی رہی۔ یہ ایک گھنٹا فروا پر بہت بھاری گزرا۔ اس دوران اس نے سوچا تھا کہ کیا اس قسم کی آزمائش کسی مرد کے لیے مناسب ہے؟ جب اس نے سنجیدگی سے اس پر غور کیا تو اسے بڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔ مکمل تنہائی اور ایک ترغیب دیتی ہوئی حسین ترین لڑکی...... فروا کو خود اپنے آپ پر غصہ آنے لگا اور اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر فروا اپنے چیلنج میں کامیاب ہوئی تب بھی وہ شاہ جہاں کو مورد الزام نہیں ٹھہرائے گی کیونکہ اس میں بھلا شاہ جہاں کا کیا قصور ہوتا۔ یہ تو صرف اور صرف اس کی اپنی غلطی ہے لیکن جب وہ گھر پہنچی تو شاہ جہاں اور آرزو کو بالکل نارمل انداز میں باتیں کرتے پایا۔

اس نے شاہ جہاں کے چہرے کو پڑھا، آرزو کی آنکھوں میں دیکھا اور واضح طور پر جان لیا کہ اب تک کوئی کہانی نہیں ہوئی، کوئی افسانہ نہیں بنا۔

اس کے بعد رات کو جب آرزو ان سے رخصت ہونے لگی تو انتہائی جذباتی ہو رہی تھی۔ بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ رہے تھے۔ بالکل آخری لمحات میں آرزو نے فروا کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''فروا...... میں چیلنج ہار گئی۔ آج زندگی میں پہلی بار مجھے شکست ہوئی ہے۔ میں اپنی اس پہلی شکست پر بہت خوش ہوں...... بہت خوش۔ وہ یقیناً تیرا اور صرف تیرا ہے۔ وہ ناقابل تسخیر ہے...... تم یقین کرو، تم اس روئے زمین کی سب سے خوش نصیب لڑکی ہو۔ مجھے آج تم پر بے پناہ رشک آ رہا ہے۔ تم بڑی بھاگوان لڑکی ہو۔ تم میرے لیے بھی دعا کرو کہ کاش! مجھے بھی کوئی تمہارے شاہ جہاں جیسا مضبوط کردار کا شخص مل جائے۔''

آرزو کے کہے ہوئے یہ الفاظ فروا کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھے لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ جب کچھ ''غیر متوقع'' ہونا ہو تو دل کو عجیب اور نامعلوم سی بے چینی کھانے لگتی ہے۔ یہی حال اس روز کے بعد فروا کے ساتھ ہوا۔ اس واقعے کے بعد تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن اس کی خوشی کو جیسے گھن لگ گیا۔ بار بار ایک ہول سا اس کے اندر اٹھتا تھا۔

اس روز جب آرزو رخصت ہو گئی تو شاہ جہاں نے رات کو فروا سے کوئی بات نہ کی۔ وہ چپ چپ سا رہا۔ فروا لامحال یہی سمجھی کہ شاید شاہ جہاں تھک گیا ہے، وہ بھی چپ رہی اور خاموشی سے سو گئی۔

صبح جاگی تو شاہ جہاں کو بستر پر نہیں پایا لیکن بیڈ سائڈ ٹیبل پر ایک خط ضرور پڑا نظر آیا۔ اس نے دھڑکتے دل سے وہ خط اٹھایا۔ وہ شاہ جہاں نے ہی لکھا تھا اس کے لیے۔

''فروا...... تم ہی میری پہلی اور آخری محبت تھیں لیکن افسوس تم نے مجھے اس طرح آزما کر میرا اندر مجروح کر ڈالا۔ کاش! تم مجھے کسی اور طریقے سے آزما لیتیں۔ بہت کوشش کی میں نے کہ ایسا نہ کروں پر شاید میری مردانہ انا کو، میرے اعتماد کو کہیں ٹھیس ضرور پہنچی۔ افسوس کہ اب میں تم سے پہلی جیسی محبت نہیں کر سکتا تو سوچا کیوں خود کو اور تمہیں دھوکا دوں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے راستے الگ ہو جانے چاہئیں۔ بعض رشتے بہت نازک ہوتے ہیں، کچے دھاگے جیسے۔ وہ آزمائش کی ذرا سی تپش میں خاکستر ہو جایا کرتے ہیں۔ طلاق کے کاغذات تمہیں بذریعہ رجسٹری مل جائیں گے...... خدا حافظ...... بدنصیب شاہ جہاں!''

فروا یہ رقعہ پڑھ کر بت بن کر رہ گئی تھی۔

✤✤✤

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

# محفلِ شعر و سخن

❁ عبدالقادر ...... کراچی

وہ کب کا بھول چکا ہوگا پیار کا قصہ
بچھڑ کے کس کو کسی کا خیال رہتا ہے

❁ شکیل خان...... کوئٹہ

کوئی آہٹ کوئی دستک درِ دل پر نہ ہوئی
منتظر ہی رہے ہم ایک خبر کی خاطر
ایک دن دیکھنا بجھ جائیں گے منظر سارے
خواب رہ جائیں گے تسکینِ نظر کی خاطر

❁ ؟......؟

❁ ظفر مرزا...... خانیوال

اب بھی اوجھل ہے نگاہوں سے نشانِ منزل
زندگی تو ہی بتا ، کتنا سفر باقی ہے

❁ عرفان شیخ...... لاڑکانہ

ہم چھین لیں گے تم سے یہ شانِ بے نیازی
تم مانگتے پھرو گے ہم سے غرور اپنا

❁ تمکین تبسم ناز...... فیصل آباد

گماں نہ کر کہ مجھے جرأتِ سوال نہیں
فقط یہ ڈر ہے تجھے لاجواب کردوں گا

❁ اعجاز حسین...... ہزارہ

ضبط غم نے اب تو پتھر کردیا ورنہ فراز
دیکھتا کوئی کہ دل کے زخم جب آنکھوں میں تھے

❁ ارشد خان...... سیالکوٹ

ذرا سی دھول بھی جس کو کبھی لگنے نہ دی میں نے
وہی اب خاک کا پہنے ہوئے ہے پیرہن دیکھو

❁ مسرت جعفری...... دھدیال

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی، اسی کا مشتاق ہے زمانہ

❁ نازیہ وہاب...... گوجرانوالہ

کبھی کبھی تو وہ اتنا خیال رکھتا ہے
ذرا ذرا سی تمنا سنبھال رکھتا ہے

❁ سمیرا ناز...... نوشہرہ

تیرے بغیر بھی تو غنیمت ہے زندگی
خود کو گنوائے کون تیری جستجو میں اب

❁ ناہید یوسف...... اسلام آباد

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

❁ مہوش خان...... پشاور

اسی عشق سے، اسی چاہ سے، اسی پیار سے، اسی مان سے
مرے ہاتھ میں اک گلاب لا، میں بہت دنوں سے اداس ہوں

❁ ہما نواب...... جہلم

بستی میں بے سکوں ہیں بیاباں میں بے قرار
اب دیکھیے کہ جا کے بناتے ہیں گھر کہاں
وہ دن گئے کہ کوئی کہیں بولتا نہ تھا
اب چپ رہیں گے شہر میں دیوار و در کہاں

❁ اسما ممتاز...... کراچی

ممکن ہے کائنات کے کہنہ نظام میں
جو انتظام لگتا ہے وہ انتشار ہو



Scanned with CamScanner

⊛ بابر زمان۔۔۔۔لیہ

دوستو ان کے چھلکنے کی توقع نہ کرو
صاحب ظرف بھی ہوتی ہیں سمندر آنکھیں

⊛ احمد ضیاء۔۔۔۔لاہور

کوٹھے اجاڑ ، کھڑکیاں چپ ، راستے اداس
جاتے ہی ان کے کچھ نہ رہا زندگی کے پاس

⊛ زاہد حسین۔۔۔۔سوات

گئے دنوں کی پرانی سی ڈائری دیکھو
کسی ورق پہ مرا نام بھی لکھا ہوگا

⊛ اعجاز بٹ۔۔۔۔واہ کینٹ

بار الم اٹھایا رنگ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے

⊛ رانا ادیب۔۔۔۔رحیم یار خان

اک وہ کہ جنہیں چاند کی دنیا کا تجسس
اک ہم کہ ابھی زلف کا خم ڈھونڈ رہے ہیں

⊛ حرا اطہر۔۔۔۔کراچی

یاد آئیں گے تجھے اب وہ پرانے قصے
زندگی کے یونہی اوراق پلٹتے رہنا

⊛ غلام مرتضی۔۔۔۔خان پور

آئے جنون و عشق میں ایسے مقام بھی
لوگوں سے پوچھتے رہے ہم اپنا نام بھی
یہ روز و شب بھی ساتھ کہاں تک نبھائیں گے
ہوتی تو ہے کہیں پہ کسی روز شام بھی

⊛ چودھری ادریس۔۔۔۔مڈھ رانجھا

مدت کے بعد اذن تبسم ملا مجھے
وہ بھی کچھ اتنا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

⊛ محمد عامر۔۔۔۔ملتان

یہ بھی تو اک مقام ہے کچھ لوگ عمر بھر
نظارگی کے شوق میں منظر بنے رہے

⊛ ڈاکٹر فیض خان۔۔۔۔تونسہ شریف

آپ کہتے تھے کہ رونے سے نہ بدلیں گے نصیب
عمر بھر آپ کی اس بات نے رونے نہ دیا

⊛ کنزہ ناز۔۔۔۔حیدرآباد

جو تم بدلے جہاں بدلا نظر بدلی زمانے کی
یہ آنسو چار باقی ہیں نشانی دل لگانے کی

⊛ شاہینہ مہتاب۔۔۔۔چنیوٹ

بارہا خواب میں پاکر مجھے پیاسا محسن
اس کی زلفوں نے کیا رقص گھٹاؤں جیسا

⊛ شاہدہ جنید۔۔۔۔کراچی

باقی ہے ایک عمر اندھیروں سے روشنی
ہم نے بھی کب ثبوت دیا ہے شعور کا

⊛ کشور بانو۔۔۔۔کمالیہ

بے رحم آسماں کی نوازش بہت ہوئی
گھر جل چکا تو شہر میں بارش بہت ہوئی

⊛ طوبیٰ زبیر۔۔۔۔فیصل آباد

نہ ملا نقد جاں دے کر بھی اک لمحہ محبت کا
گراں تھا اس قدر سودا کہ ہم بازار چھوڑ آئے

⊛ نبیلہ ثاقب۔۔۔۔کراچی

مجھے خاک میں ملا کر میری خاک بھی اڑا دے
تیرے نام پہ مٹا ہوں مجھے کیا غرض نشاں سے

⊛ حورین شاہد۔۔۔۔اسلام آباد

اپنوں نے غم دیے تو مجھے یاد آگیا
اک اجنبی جو غیر تھا اور غمگسار تھا

⊛ سعدیہ وہاب۔۔۔۔حافظ آباد

اور کچھ بھی نہیں ہوتا تو بھری بارش میں
تجھ سے بچھڑے ہوئے رستوں پہ سفر کرتا ہوں

⊛ غفور خٹک۔۔۔۔اٹک

ایسا لگتا ہے ہر امتحاں کے لیے
زندگی کو ہمارا پتا یاد ہے

⊛ انیلا خان۔۔۔۔مظفرآباد

ایسے رہا کرو کہ کریں لوگ آرزو
ایسے چلن چلو کہ زمانہ مثال دے

⊛ علی اکبر ڈوگر۔۔۔۔گجرات

ابھی سے میرے رفوگر کے ہاتھ تھکنے لگے
ابھی تو چاک میرے زخم کے سلے بھی نہیں

⊛ احسان اللہ۔۔۔۔گوجرانوالہ

ویراں ہے مے کدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

⊛ ظہور احمد۔۔۔۔پشاور

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

⊛ فیاض احمد۔۔۔۔اوکاڑہ

روشن چراغ یاد بھی کرتا نہ تھا کوئی
قبضہ ہمارے شہر پہ ایسی ہوا کا تھا

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

❁ نوید میو ...... خیر پور

غم یہ نہیں کہ ہم کو زمانہ برا ملا
افسوس ہے کہ ایسے زمانے کو ہم ملے

❁ رانا عمران ...... نواب شاہ

ہم کو شاہوں کی عدالت سے توقع تو نہیں
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

❁ رب نواز بھٹی ...... سرگودھا

خدا کرے تیرے دامن پہ گردِ غم نہ پڑے
تجھے نہ دشتِ مصائب میں زندگی لائے

❁ سیف الرحمن ...... کنڈہ کوٹ

تمہارا نام لکھنے کی اجازت چھن گئی جب سے
کوئی بھی لفظ لکھتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

❁ ارشد حسین ...... مری

تمہیں خبر ہی نہیں ہے کہ کوئی ٹوٹ گیا
محبتوں کو بہت پائیدار کرتے ہوئے

❁ عالیہ نواز ...... ضلع بھکر

کبھی نہ ٹوٹنے والا حصار بن جاؤں
وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

❁ وقاص احمد ...... کراچی

لوٹ آتی ہے میری شب کی عبادت خالی
جانے کس عرش پہ رہتا ہے خدا شام کے بعد

❁ جنید ملک ...... روہڑی

نہ پوچھو کچھ شبِ وعدہ بلا کی انتظاری ہے
صدا پر کان، در پر آنکھ، دل میں بے قراری ہے

❁ شکیل عباس ...... خانیوال

جو قربتوں کے نشے تھے وہ اب اترنے لگے
ہوا چلی ہے تو جھونکے اداس کرنے لگے

❁ نثار احمد ...... خوشاب

اخلاص، خلوص و مہر و وفا سب جھوٹی سچی باتیں ہیں
ہر شخص خودی کی مستی میں بس اپنی خاطر جیتا ہے

❁ اشرف صدیقی ...... منڈی بہاالدین

بہت نازک مگر جب توڑیے تو توڑنا مشکل
یہ زنجیرِ محبت بھی عجب زنجیر ہوتی ہے

❁ شہباز حسین ...... مظفر گڑھ

اس سے کیا خاک میرے دل کی حفاظت ہوگی
جس سے آنچل بھی دوپٹے کا سنبھالا نہ گیا

❁ اختر سحر ...... ہری پور

کون ہوں، کیا ہوں میں اور خواب ہیں کیا کیا مرے
اس کو ہر تفصیل، مجھ کو مختصر معلوم ہے

❁ سید ذوالفقار علی ...... بہاولنگر

اچھے ہیں یا برے ہیں خود اپنے لیے ہیں
ہم خود کو نہیں دیکھتے اوروں کی نظر سے

❁ کلیم اللہ ...... آزاد کشمیر

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس مختصر سی عمر میں کیا کیا کرے کوئی

❁ ریاض احمد خان ...... صوابی

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

❁ زعفران بٹ ...... پنڈی گھیب

تیرے لیے سب چھوڑ کے تیرا نہ رہا میں
دنیا بھی گئی عشق میں، تجھ سے بھی گیا میں

❁ طیبہ گلزار، پنڈی گھیب

کچھ ہوش نہیں رہتا، کچھ دھیان نہیں رہتا
انسان محبت میں انسان نہیں رہتا

❁ طارق خان ...... شیخوپورہ

تیرا حصہ ہوں مگر پھر بھی جدا ہوں تجھ سے
اے خدا بخش مجھے تابِ نظر شب کے پہر

❁ عابد گجر ...... خوشاب

دیکھ کر تجھ کو سجے تھے حیرتوں کے آئینے
ہم فقیروں کے نگر میں چشمِ بد کوئی نہ تھی

❁ ساجد اقبال ...... سرائے عالمگیر

دل کے ٹوٹ جانے پر اب ملال کیا کرنا
پتھروں کی بستی میں آئینے تو ٹوٹیں گے

❁ کائنات حیدر ...... ساہیوال

احساس اگر ہو تو وفا پھولے پھلے گی
دستور محبت کے سکھائے نہیں جاتے

کوپن برائے شمارہ دسمبر 2025

## محفلِ شعر و سخن

نام: ----------------------------------------

پتا: ----------------------------------------



Scanned with CamScanner

گدھا ریڑھیوں، بیل گاڑیوں، تانگوں اور سائیکلوں پر مشتمل یہ قافلہ عجیب لگتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ستا کر پھر سے سفر کا آغاز کرتا اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ منزل کچھ زیادہ دور نہیں تھی۔ چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد ایک گھنا جنگل اور اس جنگل میں خالی عمارت اس قافلے کی منزل تھی۔

یہ سفر ایک نامعلوم شخص کا... خط موصول ہونے پر شروع ہوا تھا۔ خط بستی کے ایک بزرگ کو ملا تھا جن کا پوری بستی بہت احترام کرتی تھی۔ وہ خود تو پڑھنا نہیں جانتے تھے اس لیے اپنے گھر سے چند گھر چھوڑ کر اپنے ایک دوست کے ہاں گئے اور اس کے بیٹے اکرام سے خط پڑھوایا۔ وہ خط جو انہیں صبح اپنے گھر کے دروازے کے اندرونی جانب گرا ملا تھا۔ خط کچھ اس طرح تھا۔

”بستی والو! تمہارے دن پھرنے والے ہیں۔ ایک بہت بڑا خزانہ جو سونے، چاندی، ہیرے، جواہرات پر مشتمل ہے، تمہارا منتظر ہے۔ تم سب اس خزانے کو اپنے لیے

**بلاغرض بھلائی کرنے والے ایک نوجوان کی خودداری**

صحت مند جسم اور تمام اعضا کا ٹھیک ہونا نعمتِ خداوندی ہے... مگر ایسا نہیں کہ انسان کا ایک عضو بھی معطل ہو تو وہ کوئی کام کرنے کا اہل نہیں ہے... دوسرے بھلے اسے بیکار سمجھیں مگر بعض دفعہ وہی نقص اس کے لیے فخر کا باعث بن جاتا ہے... وہ بھی ایک ہاتھ سے معذور تھا لیکن عقل و شعور اور جذبۂ انسانیت سے مالا مال تھا... ایک نیک کام نے اسے دولت مند بننے کا موقع دے دیا... مگر سفید پوشی آڑے آگئی اور اس نے دولت کو ٹھکرا دیا... لیکن اس انکار کا بہت بڑا فائدہ تھا جس سے وہ انجان تھا۔

# دائیں ہاتھ کا کھیل

عتیق بخاری

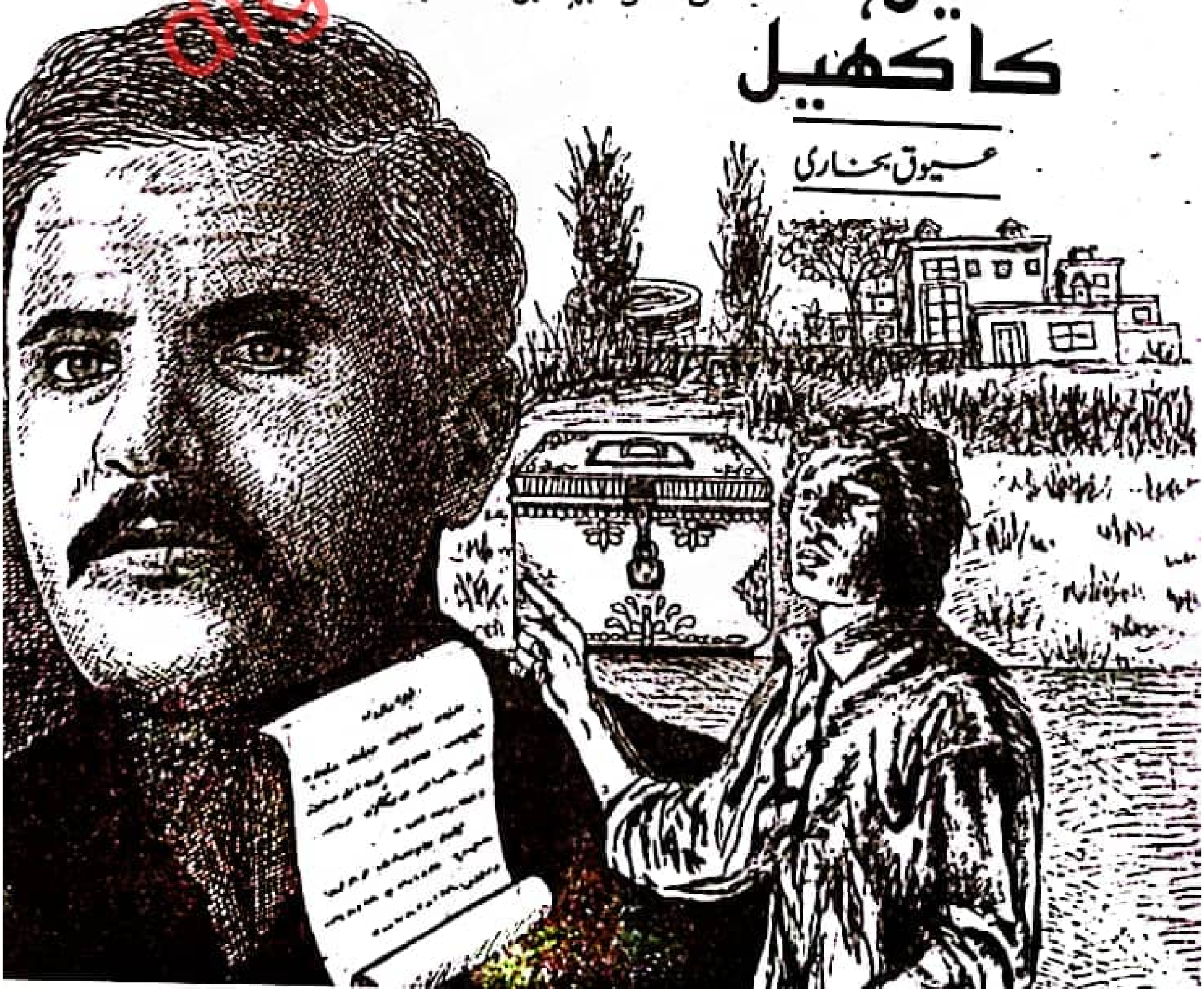

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

ڈھونڈ سکتے ہو۔ خزانہ نکالنا، ڈھونڈنا اکیلے آدمی کا کام نہیں اس لیے بستی کے چند لوگوں کو ساتھ مل کر کام کرنا ہوگا۔ یاد رکھنا کہ خزانہ ڈھونڈنے اور پالینے کے دوران اتفاق و محبت سے رہنا اور لڑائی جھگڑے، قتل و غارت سے سختی سے پرہیز کرنا۔ اگر ان باتوں پر مکمل طور پر عمل نہ ہوا تو نہ صرف خزانے سے ہاتھ دھونا پڑیں گے بلکہ اس کے ساتھ منفی کارروائی کرنے والے یا کرنے والوں کو سخت سزا کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ جاؤ اور ڈھونڈلو اپنا خزانہ...... اور سنوار لو اپنی قسمت...... تمہارا خیر خواہ۔''

اس خط کے ساتھ سادہ کاغذ پر اس جگہ کا نقشہ بھی بنا ہوا تھا جہاں پر خزانہ موجود تھا۔ اکرام نے خط ختم کرتے ہی بڑی تیزی سے کہا۔ ''چاچا! زیادہ لوگوں کی ضرورت نہیں۔ آپ اور ہم بس دو گھر ہی مل کر یہ خزانہ لے آتے ہیں۔ اگر زیادہ لوگوں کو معلوم ہوگیا تو......''

بزرگ نے قدرے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اکرام کی بات کاٹی اور کہنے لگے۔ ''اتنی جلدی بے وقوفی کی ہے۔ پہلے اس خط کے سچا ہونے کا تو یقین کرلیں۔ کیا پتا کسی نے مذاق کیا ہو اور بیٹا غور سے سنو کہ اگر یہ خط سچا ہوا تو ہم چند نہیں، بستی کے سارے مرد مل کر جائیں گے اور خزانہ پوری بستی میں برابر تقسیم ہوگا۔''

''لیکن چاچا......!'' اکرام کی بات ایک پھر ادھوری رہ گئی۔

''لیکن کیا؟'' چاچا بولے۔ ''تم نے پڑھا نہیں کہ یہ کام چند لوگوں کی مدد سے ہی ممکن ہے تو پھر ہم سالوں سے اکٹھے رہنے والے مل کر کیوں نہ جائیں اور تمہارا تو دایاں ہاتھ کام نہیں کرسکتا۔ تم تو یہ بات کرو ہی نہ۔''

اکرام کا دایاں ہاتھ پیدائشی طور پر ٹیڑھا اور جسامت میں دوسرے ہاتھ سے قدرے چھوٹا تھا جس کی وجہ سے وہ تمام کام بشمول لکھائی بائیں ہاتھ ہی سے کرتا تھا۔ ظاہر ہے کسی خزانے کی تلاش میں وہ کوئی خاص مدد کرنے سے قاصر تھا۔

''بیٹا! لالچ میں نہیں، اتفاق میں برکت ہے۔ ابھی میں جارہا ہوں، شام کو سارے بستی کے مردوں کو بٹھا کر بات ہوگی۔'' یہ کہہ کر بزرگ جن کا نام دین محمد تھا، اپنے گھر واپس چلے گئے۔

شام ہوئی، بستی کے سارے مردوں سے بات ہوئی اور پھر صبح تک اس چھوٹی سی بستی کے بچوں، عورتوں تک یہ بات پھیل گئی۔ کچھ لوگ اسے مذاق قرار دے رہے تھے۔ کسی نے کہا لگتا ہے کوئی ان سے خزانہ تلاش کروا کر خود لینا چاہتا ہے اور ہوسکتا ہے وہ انہیں کوئی نقصان بھی پہنچادے اور کچھ لوگ تو اس خط کو بالکل سچا سمجھ کر خزانے والی جگہ پر چلنے کو تیار تھے۔ اسی میں ایک ہفتہ گزر گیا کہ دوسرا خط آگیا۔

یہ دوسرا خط اکرام کے گھر آیا تھا۔ اکرام نے خط اپنے گھر والوں کو دکھایا۔ یہ ایک چھوٹی سی چٹ تھی جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''لگتا ہے تم لوگوں کو امیر ہونے کا شوق نہیں۔ مذاق مت سمجھو اور خزانہ لے آؤ۔ تمہارا خیر خواہ۔''

اس چٹ نے ان بستی والوں کو جو پہلے خط کو سچا سمجھتے تھے، مزید پُرجوش کردیا اور وہ باقی لوگوں پر دباؤ ڈالنے لگے کہ آخر چند گھنٹوں کی مسافت پر اس گھنے جنگل میں جانے اور خالی عمارت کو چیک کرلینے میں کیا حرج ہے۔ ان لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر یہ سب مذاق بھی ہوا تو کوئی بات نہیں۔ چلو، سیر ہی ہوجائے گی۔

ایک دو دن میں ہی بستی والوں میں اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ خزانے کی تلاش کے لیے جانا چاہیے۔ جن لوگوں کو یہ سب کچھ مذاق لگ رہا تھا، انہوں نے اپنے بیوی بچے بھی ساتھ لے لیے تاکہ سب سیر و تفریح کرسکیں۔ کچھ مردوں نے اپنی خواتین کو اس خیال سے ساتھ لے جانے کا ارادہ کرلیا کیونکہ جنگل میں کچھ روز لگ سکتے ہیں۔ خواتین وہاں کھانا وغیرہ بنالیں گی۔

سفر کا آغاز ہوا۔ گاؤں میں تین تانگے تھے۔ اس کے علاوہ ریڑھے، ریڑھیاں، سائیکل تو تقریباً ہر گھر میں تھے۔ کسی بس وغیرہ کا انتظام کرنے کے بجائے انہوں نے انہی چیزوں پر سفر کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ہفتے بھر کا راشن، کچھ برتن، بستر، کدالیں، کسیاں، کچھ ڈنڈے چاقو وغیرہ ساتھ رکھ لیے گئے۔

سفر شروع ہوا تو تقریباً آدھے گھنٹے بعد اکرام نے شور مچادیا۔ ''ارے دیکھو، میری جیب میں ''خیر خواہ'' کی چٹ ہے۔ نہ جانے کیسے میری جیب میں آگئی۔''

قافلہ رک گیا۔ سب ایک جگہ جمع ہوگئے۔ چٹ پڑھی گئی جس پر لکھا تھا۔ ''تمہارے پاس صرف تین دن ہیں۔ تین دن کے بعد تمہیں ہر صورت واپس آنا ہوگا۔''

اکرام شدید گھبرایا ہوا تھا کہ چٹ جیب میں کیسے آئی۔ باقی لوگوں نے سمجھایا کہ جو تمہارے گھر خط پھینک سکتا ہے، وہ تمہارے گھر آکر تمہاری جیب میں بھی کوئی چیز ڈال سکتا ہے۔ اکرام کی گھبراہٹ کم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس بات پر مصر تھا کہ گھر سے چلتے وقت اس کی جیب میں کچھ نہیں تھا۔

خزانہ پانے کی امید میں سب تھوڑی ہی دیر میں اپنا



Scanned with CamScanner

اور اکرام کا ڈر دور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک دوسرے سے باتیں کرتے، خزانے کے بارے میں اندازے لگاتے سفر جاری رہا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ سب رک گئے۔ جہاں قافلہ رکا تھا، وہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ریت کے اونچے نیچے ٹیلے اور چند درخت تھے۔

جونہی گاؤں والوں نے وہاں عارضی ڈیرا ڈالا، رونق سی لگ گئی۔ ساتھ لائے ہوئے کھانے کے ڈبے کھول لیے گئے۔ دوپہر کا کھانا خواتین پکا کر ساتھ لائی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں اس خالی جگہ پر کھانوں کی خوشبو پھیل گئی۔

کھانے کے بعد سب تھوڑی دیر کے لیے آرام کی غرض سے رک کے رہے۔ اکرام ایک ریڑھے پر لیٹا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد سب اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے تانگوں ریڑھوں پر سوار ہونے لگے۔ اچانک ایک بچہ بولا۔

”یہ میرے پاس ایک کاغذ آ کر گرا ہے۔“

وہ کاغذ کا گولا سا تھا جو اس بچے کے پاس اس وقت آ کر گرا جب سب چلنے والے تھے۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور کاغذ کا گولا کھولا گیا۔ حسبِ معمول ”خیر خواہ“ کا خط تھا۔ لکھا تھا۔

”تم میں سے آدھے لوگ واپس چلے جائیں کیونکہ جتنے لوگ تم ہو اس طرح تو سب کے حصے میں خزانہ بہت تھوڑا تھوڑا آئے گا۔“ مزید لکھا تھا۔ ”تم لوگ کسی طرح قرعہ اندازی کر لو کہ کس نے واپس جانا ہے اور کون منزل کی جانب بڑھے گا۔ خیال رکھنا معاملات زبانی کلامی طے کرنے ہیں۔ مار پیٹ یا ایک دوسرے کو گزند پہنچانے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔“

خط پڑھنے والا لڑکا جونہی چپ ہوا، سب بیک وقت بول اٹھے۔ ”نہیں، نہیں۔ ہم سب اکٹھے رہیں گے اور کوئی واپس نہیں جائے گا۔ چاہے خزانے میں سے ایک ایک سکہ ہی حصے میں آئے۔“ سب کا اس بات پر اتفاق تھا چنانچہ آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اچانک ایک بولا۔ ”ارے، اس بات پر دھیان دو کہ یہاں خط کون پھینک کر گیا ہے؟ یہاں تو دور دور تک کوئی ہمارے علاوہ ہے ہی نہیں۔“ یہ سنتے ہی قافلہ خوفزدہ ہو گیا کہ آخر یہ ”خیر خواہ“ ہے کون جو اس جگہ بھی خط پھینک گیا۔ خواتین نے تو فوراً ہی اسے جنات کی کارستانی قرار دیتے ہوئے واپس چلنے کا کہا۔

واقعی بات ڈرنے والی ہی تھی۔ سب اپنوں میں کوئی اور تھا جو آتا اور پرچہ پھینک کر چلا جاتا لیکن تھا کون؟ یہ معلوم نہ تھا اور اب بچے کے پاس سے کاغذ ملنا بہت خوفزدہ کر دینے والا تھا۔ مرد بھی ڈر گئے کہ ہم اپنی خواتین اور بچوں کو لے کر نہ جانے کس خطرناک سفر پر نکل پڑے ہیں۔

واپسی کا فیصلہ ہونے لگا۔ اچانک اکرام نے سب کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

”جب میں ڈرا تھا تو تم لوگ کہہ رہے تھے کوئی بات نہیں۔ کوئی تمہارے گھر میں آ کر تمہارے کپڑوں میں چٹ رکھ گیا ہوگا۔ اب کیوں نہیں سوچ رہے کہ جب ہم کھانا کھانے، آرام کرنے کے دوران اپنے اپنے دھیان میں تھے، اس وقت کوئی یہ پرچہ بچے کے قریب پھینک کر چلا گیا ہوگا۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“

سب سے پہلے اکرام کی ماں نے بیٹے کی بات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بیٹا! ہو ہی نہیں سکتا۔ یہاں پر کوئی ایک بھی گھر ہوتا تو ہم تمہاری بات کا یقین کر لیتے لیکن یہاں تو سوائے ہمارے کوئی ہے ہی نہیں۔ یقیناً یہ بھوت پریت کا ہی کام ہے اسی لیے زیادہ سوچنے کے بجائے فوراً واپس چلو۔“

اکرام کی ماں کی یہ بات سن کر بھی آدھے سے زیادہ لوگ اکرام کے کہے کا یقین کر کے آگے بڑھنے پر اصرار کرنے لگے۔ پھر ان زیادہ نے کم لوگوں کو آمادہ کر ہی لیا۔

شام ڈھل رہی تھی جب یہ قافلہ اپنی منزل کے پہلے حصے یعنی جنگل کے پاس جا پہنچا۔ اب نقشے کے مطابق آگے بڑھنا اور خالی عمارت تلاش کر کے اس میں کھدائی کر کے خزانہ نکالنا تھا۔ قافلہ کچے راستے پر چلتے ہوئے جنگل میں داخل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ٹارچیں، لالٹینیں روشن کرنا پڑیں کیونکہ جنگل بہت گھنا تھا اور سر شام ہی اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ جنگل کی خاموشی میں اب قافلے والوں کی بھی خاموشی شامل ہو گئی تھی۔ وہ جو سارے راستے باتیں کرتے آئے تھے، اب منزل کے قریب اندھیرے جنگل میں پہنچ کر چپ سے ہو گئے تھے۔ صرف ٹائروں اور پتوں کے چرچرانے کی آواز آ رہی تھی۔ ماحول پراسرار ہو گیا تھا۔ چند میل کچے راستے پر چلنے کے بعد انہیں وہ عمارت نظر آ گئی جس میں انہیں پہنچنا تھا۔

قافلہ رک گیا۔ عمارت کافی پرانی اور وسیع و عریض تھی۔ اس کی منزلیں واضح نظر آ رہی تھیں۔ ٹارچوں کی روشنی میں وہ بڑی سی خالی حویلی پراسرار اور قدرے ہیبت ناک منظر پیش کر رہی تھی۔ اس کا بہت بڑا زنگ آلود گیٹ آدھا کھلا

ہوا تھا اور ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ ایسا ہوا چلنے کی وجہ سے تھا لیکن بستی والوں کو شام کے گہرے اندھیرے میں حویلی کے اس بڑے گیٹ کی یہ حرکت بھی پراسرار لگ رہی تھی۔

ایک نوجوان آگے بڑھا اور سکوت توڑتے ہوئے بولا۔ ”چلو، اب اندر چلیں۔ کیا کوئی خزانہ لیے گیٹ کے پاس ہماری راہ دیکھ رہا ہے؟“ اس نوجوان نے اپنا جملہ مکمل کرتے ہی ادھ کھلے گیٹ کو مکمل کھول دیا اور خزانہ پانے کی امید لیے بستی والے اندر داخل ہوئے۔

حویلی سنسان پڑی تھی۔ بہت سے پتے گرے ہوئے تھے۔ مٹی دھول کا تو ٹھکانا ہی نہ تھا۔ نچلی منزل پر آٹھ دس بڑے بڑے کمرے تھے جبکہ اوپر کی منزل پر صرف ایک کمرا تھا جو بہت زیادہ بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ اس میں بیک وقت بہت سے لوگ ٹھہر سکتے تھے۔ اس غیر معمولی بڑے سے ہال نما کمرے کے آگے برآمدہ تھا۔ برآمدہ انگریزی کے حرف ایل (L) کی طرح تھا یعنی کمرے کے سامنے سے ہوتا ہوا سائڈ پر مڑ گیا تھا۔

سب لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ چکے تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ اردگرد سے کوئی جانور، درندہ حویلی کی ٹوٹی دیواروں سے اندر آکر نقصان پہنچا سکتا ہے اس لیے سب اس کمرے اور برآمدے میں ٹھہریں گے اور سیڑھیوں کا دروازہ بند کرلیں گے۔

کمرے میں آتے ہی خواتین نے کھانے پینے کا سامان نکالنا شروع کردیا۔ رات کے اندھیرے اور کچن کی سہولت نہ ہونے کے باعث فیصلہ کیا گیا کہ دوپہر کے کھانے میں سے جو چیزیں بچی ہیں، وہ اور ساتھ لائے ہوئے السی کے لڈو، گاجر کا حلوا وغیرہ کھا کر گزارہ کرلیا جائے۔ صبح کی روشنی میں چولہے وغیرہ بن جائیں گے تو پھر تازہ کھانا بنالیا جائے گا۔

خالی حویلی کی ویران چھت انسانوں کے آجانے سے آباد لگنے لگی۔ کھانا پینا شروع ہوگیا۔ باہر مرد اگلے دن کے کام کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ کس ٹولی نے پہلے کھدائی کرنی ہے، کون سی دوسرے نمبر پر کام کرے گی، وغیرہ۔

نقشے پر پانچ جگہوں پر دائرہ لگا ہوا تھا۔ ”خیر خواہ“ کے مطابق ان پانچ جگہوں میں سے کسی ایک جگہ پر خزانہ دبایا گیا تھا۔ سوتے، جاگتے، باتیں کرتے بستی والوں نے رات گزاری۔ عارضی طور پر گھر داری کا سارا انتظام کیا گیا۔ اگلی صبح لڑکے باہر جاکر لکڑیاں لے آئے، ناشتا بننا شروع ہوگیا۔ دوسری جانب مردوں نے ناشتا کرنے سے پہلے ہی کھدائی کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک گروپ جس نے سب سے پہلے کھدائی کرنا تھی، نے ناشتے سے قبل اچھا خاصا کام کرلیا تھا۔ ابھی تک کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ ناشتے کے بعد دوسری باری والوں نے مزید گہرائی تک کھدائی کرنا تھی۔ ”خیر خواہ“ نے ایک خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ نشان زدہ جگہوں کو ایک مخصوص حد تک ہی کھودا جائے گا اور خزانہ نہ ملنے کی صورت میں دوسری اور دیگر جگہوں پر کوشش کی جائے گی۔ کھدائی کے لیے جو حد مخصوص کی گئی تھی، وہ کوئی خاص تھکا دینے والی نہ تھی۔

حویلی میں بڑی چہل پہل ہوگئی تھی۔ بڑی سی آسیب زدہ لگنے والی عمارت آباد ہوگئی تھی۔ وہ بستی والے جو رات کو سناٹے اور جانوروں کے خوف سے ڈھنگ سے سو نہ پائے تھے، اب بالکل سکون محسوس کر رہے تھے۔

ناشتے کے بعد بتائی گئی حد تک کھدائی کی گئی لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ طے کیا گیا کہ جو تین دن طے ہیں، ان میں سے پہلے دن تین اور دوسرے دن (خزانہ نہ ملنے کی صورت میں) باقی کی دو جگہوں پر کھدائی کی جائے گی۔ دو دن میں خزانہ حاصل کرکے تیسرے دن جنگل کی سیر کی جائے گی اور پھر واپسی ہوگی۔ شام تک تین جگہوں پر کھدائی مکمل ہوگئی۔ مردوں کا تھکن سے برا حال تھا اس لیے اگلے دن کے لیے تازہ دم ہونے کے لیے وہ رات کا کھانا کھا کر جلد سو گئے۔ خواتین ابھی جاگ رہی تھیں۔ اچانک رات کا سکوت ایک آواز سے ٹوٹ گیا۔ یہ چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز تھی۔ جو خواتین جاگ رہی تھیں، وہ چونک اٹھیں۔

”ارے یہ کس کی چوڑیوں کی آواز باہر سے آئی ہے؟“ ایک نے ڈری ڈری آواز میں دوسری خواتین سے پوچھا۔ سب ڈر گئیں اور ٹارچوں کی روشنی کرکے ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ اچانک ایک لڑکی کو صرف چوڑیاں نظر آئیں۔ کس نے پہنی ہوئی تھیں، یہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے چیخ مارتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ مرد بھی رات کے سناٹے میں چیخ سن کر بیدار ہوگئے۔ چوڑیاں دیکھنے والی لڑکی سے مارے خوف کے بولا نہیں جارہا تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بمشکل بتایا کہ اسے وہاں چوڑیاں نظر آئی تھیں۔ بات کرتے ہی وہ یوں خاموش ہوکر بیٹھ گئی جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔

ٹارچوں کا رخ کھڑکی کی جانب کیا گیا لیکن وہاں کسی چیز کا نام و نشان تک نہ تھا۔ مردوں نے ہنستے ہوئے اسے وہم قرار دیا جبکہ خواتین کہہ رہی تھیں کہ انھوں نے بتائی

ہوش و حواس چوڑیوں کی آواز سنی ہے جبکہ چوڑیاں دیکھنے والی لڑکی ڈری ڈری نظروں سے بار بار کھڑکی کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ سوتے جاگتے رات گزر گئی۔

پہلے دن کی طرح ناشتے سے پہلے ہی کھدائی شروع کردی گئی۔ آج دوسرا دن تھا اور وہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ آج ہی خزانہ ڈھونڈ لینے کا کام مکمل کرلیں گے۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ٹارچوں، لالٹینوں کی روشنی میں کھدائی کا کام جاری تھا۔ محض دو ہی دنوں میں وہ ویران جگہ ہنستا بستا گھر لگنے لگی تھی جس میں کئی خاندان رہائش پذیر ہوں۔ انسانوں کی آواز سے خوب رونق ہوگئی تھی لیکن وہ لڑکی جس نے رات چوڑیاں دیکھی تھیں، وہ خاموش بیٹھی تھی۔ ربیعہ نامی وہ لڑکی اپنی سوچوں میں گم تھی کہ اکرام نے آکر اس کی خاموشی توڑی۔

''ربیعہ بہن! ابھی تک ڈری ہوئی ہو؟''

''نہیں، نہیں اکرام بھیا! بس ایسے ہی.....!'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر چپ ہوگئی۔ ان کا گھرانہ اکرام کے گھر کے ساتھ تھا۔ دونوں گھرانوں میں رشتے داروں جیسا تعلق اور بہن بھائیوں جیسا پیار تھا۔ اچانک ربیعہ کھڑی ہوگئی اور اکرام سے کہنے لگی۔

''بھائی! میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے چوڑیاں دیکھی تھیں۔ آخر کیوں میرا یقین نہیں کیا جارہا؟ خزانے کے شوق میں سب مجھے جھٹلا رہے ہیں۔ اب پھر رات ہو رہی ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

اکرام نے مسکرا کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''آؤ ذرا چہل قدمی کرتے ہیں۔ میری باتوں سے تمہارا ڈر دور ہوجائے گا۔''

دونوں حویلی کے پچھلے حصے کی طرف باتیں کرتے ہوئے جانے لگے۔ اکرام اس سے باتیں کرتے ہوئے اس کے چوڑیوں کو دیکھنے کو وہم قرار دیتے ہوئے ڈر دور کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اچانک اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی۔

''اکرام! ادھر آؤ۔'' اکرام کو باپ کی آواز جھنجلائی ہوئی اور غصہ بھری لگی۔

اکرام تیزی سے باپ کی جانب گیا۔ لالٹینوں، ٹارچوں کی روشنی میں کھدائی مکمل ہوگئی تھی اور خزانے کا نام و نشان تک نہ ملا تھا۔ سب مختلف انداز میں ناکامی کا ذکر کرنے لگے۔

بیٹے کی جگہ کام کرنے والا اکرام کا باپ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''دیکھو، اس ''خیر خواہ'' نے ہمیں بے وقوف بنایا ہے۔ دو دن میں پانچوں جگہیں دیکھ لیں۔ تنکا تک نہیں ملا۔''

بستی والے شدید غصے میں تھے اور اس نامعلوم شخص کو کوس رہے تھے جس کی چٹھیوں کو پڑھ کر وہ اس ویران حویلی میں مشقت کرنے آگئے تھے۔ خواتین بھی افسردہ تھیں کہ ان کے مردوں کی محنت اکارت گئی۔ نامعلوم ''خیر خواہ'' کو کوستے ہوئے وہ رات کا کھانا کھانے لگے۔ فیصلہ ہوا کہ فجر کی نماز پڑھتے ہی واپس روانہ ہوجائیں گے اور ناشتا راستے میں کریں گے۔

اکرام نے کہا۔ ''ناشتا کرنے کے بعد ہی روانہ ہوں گے۔ جلدی کی کیا ضرورت ہے؟''

سب خاموش تھے سوائے اکرام اور اس کے دو قریبی دوستوں سیف اور شہزاد کے۔ یہ تینوں سرگوشیوں میں نہ جانے کیا باتیں کررہے تھے۔ یہ تینوں بستی کے ان نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے قریبی شہر جاکر تعلیم حاصل کی تھی۔ پہلے گاؤں کے پرائمری اسکول میں اکٹھے پڑھے پھر ساتھ والے گاؤں میں اکٹھے مڈل کیا اور بعد میں شہر جاکر میٹرک اور پھر ماسٹرز کیا اور وہیں پرائیویٹ اداروں میں مختلف ملازمتیں کرنے لگے۔ چند روز سے تینوں اپنی اپنی جاب سے آرام کرنے کی غرض سے ہفتہ بھر کی چھٹی لے کر آئے تھے۔ ان کی چھٹی کے منظور ہونے کے اگلے ہی روز ''خیر خواہ'' کا خط آگیا تھا۔ اس کے خطوط کے بعد ان تینوں کو مزید چھٹی لینا پڑی اور وہ چھٹیاں اب اس ویران حویلی میں گزر رہی تھیں۔

باتیں کرتے اور اپنی عقل پر ماتم کرتے ہوئے سب سوگئے۔ شاید ناکامی یا مشقت کی وجہ سے تھکن اتنی بڑھ گئی کہ صبح کو جلد بیدار ہونے والے صبح دیر تک سوئے رہے۔

صرف اکرام، سیف اور شہزاد اٹھے تھے اور حویلی کے صحن میں کھڑے باتیں کررہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے اکرام نے اوپر کی منزل کی جانب دیکھا اور پھر چند سیکنڈز کے بعد وہ حویلی کی چھت پر تھا۔ وہاں اس کی بہن سائرہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ جاگ چکی تھی۔

اکرام نے سائرہ کو اپنی طرف متوجہ کیا اور منہ پر انگلی رکھ کر اپنی طرف آنے کا کہا۔ سائرہ اس کے پاس آئی تو اس نے اسے کہا کہ وہ جاکر ربیعہ کو بھی لے آئے اور دونوں عمارت کی ایک سائیڈ پر موجود درختوں کے پاس آجائیں۔

دونوں بہت حیرانی اور ذہن میں کئی سوال لیے جب تینوں لڑکوں کے پاس پہنچیں تو اچانک اکرام نے اپنا دایاں ہاتھ جو پیدائشی خراب اور قدرے چھوٹا تھا، آگے بڑھایا اور

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

بولا۔ "ربیعہ! یہ تھیں وہ چوڑیاں جو تم نے دیکھی تھیں۔"
ربیعہ اور سائرہ دونوں کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ "جی بھائی..... لیکن آپ کے پاس.....؟" ربیعہ سے تو سوال بھی پورا نہ ہو سکا جبکہ سائرہ گنگ سی کھڑی تھی۔
شہزاد بولا۔ "لڑکیو! آؤ تمہیں ساری بات بتا دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے جو کچھ بتایا وہ سن کر ان کا ڈر تو دور ہوا ہی، ساتھ ہی چہرے حیرت آمیز مسرت سے کھل اٹھے۔ بات مکمل کر کے انہوں نے دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیا اور حویلی کے پچھلے حصے کے درختوں کے پاس لے آئے۔ لڑکیوں کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ ان کے سامنے خزانے سے بھرا بڑا سا صندوق پڑا تھا۔

☆☆☆

نواب سمیع اللہ بے پناہ دولت کے مالک تھے۔ آباؤ اجداد کی طرف سے بے تحاشا جائداد وراثت میں ملی تھی۔ حویلیاں، زمینیں، زیورات ان کی ملکیت میں تھے۔ دولت کے لحاظ سے بے حد امیر نواب صاحب، رشتوں کے لحاظ سے انتہائی مفلس تھے۔ ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ بہن بھائی تو کوئی تھا نہیں۔ رشتے دار بھی دور پار کے تھے جنہوں نے والدین کی وفات کے بعد نواب سمیع سے کچھ خاص تعلق نہ رکھا۔ شادی کی تو بیوی شادی کے محض تین برس بعد ان کے پاس ڈیڑھ سالہ بیٹے کو چھوڑ کر خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ نواب صاحب پھر تنہا رہ گئے۔ کچھ عرصہ سنبھلنے میں لگا پھر انہوں نے اپنی ساری توجہ بیوی کی آخری نشانی اکلوتے بیٹے زین پر مرکوز کر دی جو ان کا واحد رشتے دار بھی تھا۔ ناز و نعم، لاڈ پیار میں نوابزادہ زین تھوڑا سا ضدی ہو گیا تھا۔
چند دنوں سے زین کو گھڑ سواری کا شوق ہوا تھا۔ نواب صاحب نے سمجھایا کہ ابھی تم کم عمر ہو۔ کچھ عرصے بعد گھڑ سواری سکھا دیں گے۔ زین چپ ہو گیا۔ چند دن بعد نواب صاحب اپنی زمینیں دیکھنے کے لیے گئے تو زین کو موقع مل گیا۔ ملازمین کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ایک گھوڑے پر سوار ہو ہی گیا۔ بیٹھنے کے چند منٹ بعد ہی گھوڑے نے اچانک ہی تیز بھاگنا شروع کر دیا اور بھاگتے ہوئے اسے کہیں سے کہیں لے گیا۔
زین کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ گھوڑا اس سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ مدد کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا لیکن دور دور تک کوئی مدد کرنے والا نظر نہ آیا۔ بے قابو گھوڑا بھاگے جا رہا تھا۔ ایک اونچی نیچی سی جگہ پہ جا کر گھوڑے کا توازن ذرا سا خراب ہوا اور نوابزادہ زین نے بری طرح سے زمین پر گرتے ہوئے دھندلائی سی آنکھوں سے ایک لڑکے کو اپنی جانب تیزی سے دوڑ کر آتے دیکھا۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

نواب صاحب جونہی سفر پر روانہ ہوئے تو انہیں اچانک بے چینی سی ہونے لگی۔ یہ بے چینی اتنی بڑھی کہ انہوں نے تھوڑی ہی دیر بعد زمینوں پر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ڈرائیور سے گاڑی واپس موڑنے کا کہا۔
گھر پہنچے تو ملازم گھبرائے ہوئے نظر آئے۔ ان کی شکلیں دیکھتے ہی نواب صاحب کا دل ہول گیا۔ "کیا ہوا، سب گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" نواب صاحب نے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔ جواب میں انہوں نے جو کچھ سنا، وہ اوسان خطا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ قریب تھا کہ وہ گر پڑتے کہ ملازموں نے بھاگ کر سہارا دیا اور تسلی دی کہ کچھ ملازم نوابزادے کو ڈھونڈنے گئے ہیں۔ وہ جلد انہیں لے کر آ جائیں گے مگر وہ یہ سن کر ڈھے سے گئے کہ نوابزادے کا کچھ پتا نہیں چلا۔
اس قیامت خیز وقت کے چند منٹ گزرے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ملازم نے فون اٹھایا اور دوسری طرف کی بات سن کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے ریسیور رکھ کر تیزی سے نواب صاحب کو بتایا کہ اسپتال سے فون تھا۔ نوابزادہ زین زخمی حالت میں وہاں ہیں۔
نواب صاحب کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ جلدی سے اسپتال پہنچے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ زین گرنے کی وجہ سے شدید زخمی ہوا ہے۔ خون کافی بہہ چکا تھا۔ بچے کی حالت بہت نازک تھی۔
نواب صاحب سجدے میں گر کر بلک بلک کر رو دیے۔ "یااللہ! میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اسے زندگی دے۔" وہ رو رو کر خالقِ کائنات سے التجائیں کر رہے تھے کہ انہیں اپنے کندھے پر ایک ہاتھ کا احساس ہوا۔
"بات سنیں۔" یہ آواز سن کر نواب صاحب نے سجدے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے پاس ایک نوجوان کھڑا تھا۔ ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ خالی خالی نظروں سے نوجوان کو دیکھنے لگے۔
نوجوان نے انہیں پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور بڑے میٹھے اور اپنائیت بھرے انداز میں بولا۔ "نواب صاحب! گھبرائیں نہیں۔ آپ کا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کے بیٹے اور میرا بلڈ گروپ ایک ہی ہے۔ میں گاؤں کے دودھ مکھن کا پلا ہوا خوب



Scanned with CamScanner

صحت مند نوجوان ہوں، بہ آسانی خون دے سکتا ہوں۔"

نواب صاحب کی آنکھوں میں امید کے دیے جگمگانے لگے۔ نوجوان نے خون دیا۔ زین کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ ڈاکٹرز نے جونہی حالت خطرے سے باہر ہونے کا بتایا، نواب صاحب بے اختیار سجدے میں گر گئے۔

نوجوان جو خزانہ تلاش کرنے کے لیے جانے والی بستی کا اکرام تھا، نے بتایا کہ جب زین گھوڑے سے گرا تو اتفاق سے وہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ جلدی سے ایمبولینس منگوائی اور یہاں لے آیا۔ یہاں آکر پتا چلا کہ یہ یہاں کے مشہور نواب کا اکلوتا بیٹا ہے۔ نواب صاحب اس کے قدموں میں بیٹھنے لگے۔ اکرام نے جلدی سے انہیں تھام لیا۔

"جناب! آپ بڑے ہیں۔ مجھے شرمندہ مت کریں۔ یہ تو خدا نے اسے زندگی دی ہے ورنہ میری کیا مجال کہ میں کوئی بڑا کام کرسکوں۔"

نواب صاحب نے اس کے ٹیڑھے ہاتھ کو غور سے دیکھا اور اسی ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر گویا عقیدت بھرے انداز میں بولے۔ "بیٹا! میں تمہیں بہت کچھ دینا چاہتا ہوں بلکہ اگر تم کہو تو میں اپنے خرچ پر تمہارا مصنوعی ہاتھ لگوا سکتا ہوں۔"

اکرام جواب میں مسکرایا اور بولا۔ "نواب صاحب! براہ کرم میری نیکی کی قیمت نہ لگائیں۔ میں کوئی پیسا نہیں لوں گا۔ رہی ہاتھ کی بات تو آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے اس ٹیڑھے ہاتھ سے لکھنا اور چھوٹے موٹے کام کرنا شروع کردیے ہیں۔ گھر والوں کو ابھی نہیں بتایا۔ میں انہیں کچھ عرصے بعد سرپرائز دوں گا۔"

نواب صاحب نے بڑی احترام بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ زین کے صحت یاب ہوتے ہی انہوں نے اکرام کو اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ کھانے کے بعد نواب صاحب اسے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گئے اور ایک پرانے سے زنگ آلود صندوق کا ڈھکن کھول دیا۔ اکرام یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صندوق میں بیش قیمت ہیرے، جواہرات اور سونے کے زیورات تھے۔

"یہ مجھے کیوں دکھا رہے ہیں؟" اکرام نے حیرانی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

نواب صاحب بولے۔ "یہ بہت قیمتی زیورات ہیں۔ میرا خاندانی ورثہ ہے اور یہ میں تمہیں دینا چاہتا....."

بات ادھوری رہ گئی۔ بات کاٹتے ہوئے اکرام بولا۔ "نواب صاحب! میں نے نیکی اللہ کی راہ میں کی ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں کچھ نہیں لوں گا۔"

نواب صاحب بولے۔ "جانتا ہوں کہ تم نہیں لوگے۔ تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ میں تمہیں نہیں بلکہ تمہاری پوری بستی کو دینا چاہتا ہوں۔ باتوں باتوں میں تم نے وہاں کے لوگوں کی حالت زار کا ذکر کیا تھا۔ سب بانٹ لو۔ یہ تمہارا کوئی معاوضہ نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں میرا شکرانہ ہے۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ میری یہ بات ضرور مان لو۔"

اکرام بولا۔ "جناب! آپ نے خدا کا واسطہ دے کر مجھے یہ صندوق لینے پر مجبور کردیا ہے۔ میں چند دن بعد اپنے دو دوستوں سیف اور شہزاد کے ساتھ آکر احتیاط سے یہ صندوق لے جاؤں گا اور پھر ہم بستی میں بانٹ لیں گے لیکن ایک شرط ہے کہ سامان بانٹتے وقت آپ بھی ہمارے ساتھ موجود ہوں گے تاکہ آپ کی تسلی ہوجائے کہ حق، حق داروں میں برابر تقسیم ہوگیا ہے۔"

نواب صاحب نے بات مان لی۔

☆☆☆

تینوں دوستوں نے منصوبہ بنایا کہ اتنے بڑے خزانے کے ملنے کی خوشی ذرا ہٹ کر منائی جائے۔ ذرا الگ انداز میں خزانہ بستی کے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اکرام کو یہ معلوم تھا کہ نواب صاحب کی ایک حویلی خالی پڑی تھی جو اس کی بستی سے چند گھنٹوں کی مسافت پر تھی۔ تینوں نواب صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچے اور ان سے کہا کہ یہ صندوق اپنے ملازموں کے ذریعے اپنی خالی حویلی میں رکھوا دیں، ہم وہاں سے اٹھالیں گے۔

"یہ کیوں؟" نواب سمیع اللہ نے حیرت سے پوچھا۔

جواب میں تینوں نے جو منصوبہ انہیں بتایا، اسے سن کر وہ مسکرا دیے اور اپنے دو ملازموں کو بھیج کر صندوق کو حویلی میں ایک طرف تھوڑا سا گہرا گڑھا کھود کر دبا دیا گیا۔ پھر بستی میں "خیرخواہ" کی چٹوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بستی والے قطعی بے خبر تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جس ہاتھ کو وہ نہ ہونے کے برابر سمجھتے ہیں، اسی ہاتھ کے لکھے خط، بنائے نقشے پر چل کر وہ امیر ہونے والے ہیں۔ انہیں پتا تھا کہ بستی کے جس گھر میں خط جائے گا، وہ ہرگز اسے دوسرے گھروں سے نہیں چھپائے گا۔ وہ لوگ برسوں سے بڑی محبت، اتفاق سے اکٹھے رہ رہے تھے۔ قلیل سی آبادی والا یہ گاؤں ایک ہی بڑے سے کنبے کا گھر لگتا تھا۔ سب اکٹھے ہوکر خزانہ ڈھونڈیں گے، اس بات کا



digest.library.com

Scanned with CamScanner

انہیں پکا یقین تھا۔ پلان کے مطابق ایک نقشہ تیار کر کے اس پر پانچ جگہوں پر نشان لگائے گئے جن کی کھدائی کرنا تھی جبکہ حقیقت میں خزانہ ان پانچ جگہوں کے بجائے کہیں اور رکھا گیا تھا۔ یہ منصوبہ بنانے کا مقصد یہ تھا کہ سیر و تفریح کی جائے اور کسی نظم کے انداز میں خزانہ ڈھونڈا جائے۔

☆☆☆

بستی والے بیدار ہو چکے تھے۔ واپس تو انہوں نے جلد جانا تھا لیکن دیر سے بیدار ہونے کی وجہ سے ناشتے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا گیا۔

اکرام کہنے لگا۔ ''میں تو خود آپ کو روکنے والا تھا کہ ناشتے سے بھی ایک دو گھنٹے بعد چلیں گے۔ آپ کو ایک بات بتانی ہے۔''

ایک بستی والا جلے بھنے انداز میں بولا۔ ''ایسی کون سی بات ہے جس کے لیے اس منحوس حویلی میں ٹھہرا جائے۔ کیا کرنا ہے ٹھہر کر؟''

اکرام بولا۔ ''مجھے ''خیر خواہ'' کی ایک اور چٹ ملی ہے۔''

سب غصے سے بیک وقت چلا اٹھے۔ ''بس کرو، بہت ہو گئی خیر خواہی۔ اب ہم بے وقوف نہیں بنیں گے۔'' کوئی کچھ بول رہا تھا، کوئی کچھ۔

اکرام نے بڑی مشکل سے انہیں چپ کرواتے ہوئے کہا۔ ''چلو خط سن تو لو۔ اس پر عمل کرنا یا جھوٹ سچ سمجھنا ہماری اپنی مرضی ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے بلند آواز میں پڑھنا شروع کیا۔ ''میں تم لوگوں کا امتحان لینا چاہتا تھا کہ تم خزانے کی خاطر لالچی ہو کر ایک دوسرے کے دشمن بنتے ہو یا پہلے کی طرح اتفاق قائم رہتا ہے۔ دوسرا یہ کہ تم کتنی محنت کر سکتے ہو۔ بغیر تھکے تم لوگوں نے محنت کی اور کسی بھی درندے یا آسیب کے خوف سے بے نیاز ہو کر کام کیا۔ بس اب تمہیں خزانہ ملنے ہی والا ہے کیونکہ تم لوگ میرے لیے گئے امتحان میں پاس ہو گئے ہو۔''

ایک بولا۔ ''اب یہ چٹ یہاں کون دے کر گیا ہے؟ کوئی ہم میں سے ہی تو یہ گھٹیا شرارت نہیں کر رہا ہے؟''

اکرام نے سوال کرنے والے کو غور سے دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ ''میں بتاتا ہوں یہ خط اور اس سے پہلے والے کون دیتا تھا۔''

''ہیں..... تمہیں پتا ہے؟'' اکرام کے والد نے شدید حیرت سے پوچھا۔

''جی ابا! میں جانتا ہوں۔'' وہ چند سیکنڈ رکا اور بات کرنے لگا۔ ''بستی والو! آپ کو جو تکلیف ہوئی اس کے لیے معذرت چاہتے ہوئے اب آپ کو آپ کے ''خیر خواہ'' سے ملواتا ہوں۔ اس سے مل کر آپ کو بہ آسانی سمجھ آ جائے گی کہ خط کس طرح آپ کے پاس آتے تھے اور نامعلوم ''خیر خواہ'' نامعلوم ہی رہتا تھا۔'' سب حیرت سے اور عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''جی، تو چلیے اپنے ''خیر خواہ'' سے.....'' ذرا سا سر جھکاتے ہوئے اکرام نے کہا۔ ''اس کا نام ہے اکرام..... جی، وہی اکرام جو آپ کے سامنے کھڑا بات کر رہا ہے۔'' سب ششدر رہ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے کچھ بول نہیں پا رہے تھے پھر اکرام کے والد نے ہی پہل کی۔

''نالائق انسان! کیا ملا تمہیں ہمیں بے وقوف بنا کر؟ تین دن سے خوار ہو رہے ہیں۔ گھر سے دور لا بٹھایا..... اور اب تم کہہ رہے ہو کہ امتحان میں پاس ہو گئے، خزانہ مل جائے گا۔ کملے انسان! کہاں سے دو گے خزانہ.....؟'' ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ حویلی کے گیٹ سے ایک شاندار گاڑی اندر داخل ہوئی اور ان لوگوں کے قریب آ کر رک گئی۔ بستی والوں نے دیکھا گاڑی میں سے ایک بارعب سا شخص اور ایک لڑکا اترے اور ان کی جانب بڑھے۔ گاؤں والے حیران ہو کر ان کو دیکھ رہے تھے جو بڑی خوش کن مسکراہٹ چہرے پر سجائے ان کی طرف آ رہے تھے۔ آنے والی شخصیت جو کہ نواب سمیع اللہ تھے، نے بلند آواز میں السلام علیکم کہتے ہوئے اکرام کو گرمجوشی سے گلے لگایا پھر سیف اور شہزاد سے ملے۔

تینوں سے ملنے کے بعد نواب صاحب بستی والوں کی جانب مڑے اور اپنا مختصر سا تعارف کروایا پھر بولے۔ ''بھئی تم سب لوگوں کو مبارک ہو کہ اکرام جیسا بیٹا تمہارے گاؤں کا ہے۔ اس کے والدین کو خصوصی مبارکباد کہ انہوں نے ایسا نیک دل، رحم دل بیٹا پیدا کیا ہے۔'' بستی والوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اکرام کی تعریف اور یہ مبارک کس لیے۔

نواب صاحب نے جواباً اپنے بیٹے کے گھوڑے سے گرنے سے لے کر اسے اسپتال لے جانے، خون دینے تک کا سارا احوال سنایا۔ جب انہوں نے بتایا کہ کس طرح اکرام نے زیورات کا صندوق لینے سے انکار کر دیا تو سب اکرام کو احترام بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ کچھ توقف کے بعد نواب سمیع اللہ نے خزانے کی حقیقت بھی بتا دی کہ کس طرح وہ بھی اس ڈرامے میں شامل ہیں۔

ساری بات سن کر بستی کے ایک بزرگ بولے۔ ''جناب! آپ کو مبارک ہو۔ آپ کا بیٹا زندہ سلامت ہے۔ جو کچھ ہمارے بیٹے نے کیا، وہ تو بطور انسان اس کا فرض تھا۔



Scanned with CamScanner

ہمارے بیٹے نے جو کہا تھا، ہم بھی وہی کہیں گے۔ براہِ مہربانی یہ خزانہ آپ واپس لے جائیں۔ ہمیں اپنے گاؤں کے بیٹے کی نیکی کا معاوضہ نہیں لینا۔''

غربت کے عالم میں ایسی خودداری، نیک دلی دیکھ کر نواب صاحب بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے۔ ''آپ پانچ جگہوں پر کھدائی کر چکے ہیں۔ اب تو آپ کی محنت کی وجہ سے اس پر آپ کا حق ہو چکا ہے۔''

نواب صاحب کے بار بار اصرار کرنے پر بھی وہ انتہائی غریب، معاشی بدحالی کا شکار، سہولیات سے محروم لوگ خزانہ لینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ قناعت کی دولت سے مالا مال لوگوں کی ضد کے سامنے ہار مانتے ہوئے نواب سمیع اللہ نے صندوق اپنی گاڑی میں رکھوایا اور ان سے کہا۔ ''آپ چند دن سیر و تفریح کی غرض سے اس حویلی میں ان کے مہمان بن کر رہیں۔''

☆☆☆

کہاں تو اکرام کو جوتے پڑنے والے تھے اور کہاں اب سب اس کے صدقے واری جا رہے تھے۔ اس کے الو کے پلان، اس کی نیکی کی تعریف کر رہے تھے۔ نہ صرف یہ جانے سے پہلے خواتین نے حویلی کی صفائی کر کے ایسا چمکا دیا تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔

نواب سمیع اللہ حیرت و خوشی سے حویلی کو دیکھ رہے تھے۔ ملازم نے گاؤں والوں کی ہدایت کے مطابق انہیں حویلی چل کر دیکھنے کا کہا۔

''کیوں، کیا کام ہے وہاں؟'' ان کے جواب میں ملازم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں نے بستی والوں سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ بس آپ کو چل کر دیکھنا ہوگا۔''

حویلی کے قریب پہنچتے ہی نواب صاحب حیران رہ گئے۔ بڑے سے زنگ آلود گیٹ کی جگہ سبز پینٹ کیا ہوا گیٹ انتہائی خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو ان کی خوشی میں اضافہ ہو گیا۔ ساری حویلی صاف ستھری ہو چکی تھی۔ حویلی کی ساری کچی زمین چھوٹی بڑی کیاریوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مختلف پھولوں کی قلمیں، سبزیوں کی پنیری وغیرہ لگی ہوئی تھی۔

مہمان نوازی کے جواب میں اتنا خوبصورت کام دیکھ کر نواب صاحب ان بستی والوں کی اچھائی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔

☆☆☆

بستی والوں نے واپس آ کر اپنی معمول کی زندگی شروع کر دی تھی۔ چند دن گزرے تھے کہ گاؤں میں ریت، سیمنٹ، بجری، اینٹوں کے ٹرک، ٹرالیاں آنے لگے۔ شہر سے گاؤں کو ملانے والی چند کلومیٹر کی سڑک پکی ہو گئی۔ حیرانی اور خوشی کی بات یہ ہوئی کہ سڑک کے بننے کے بعد لڑکے لڑکیوں کے لیے میٹرک تک کے اسکولز بھی منظور ہو گئے۔ گاؤں والے اپنی اس ترقی پر خوش ہو رہے تھے کہ آخر حکومت کو ان کا خیال آ ہی گیا۔ چند مزید سہولیات جیسے صحت، صاف پانی وغیرہ کی بھی سہولیات دے دی گئیں۔

یہ کام مکمل ہوئے کچھ عرصہ ہوا تھا کہ نواب صاحب، اکرام کے گھر اس سے ملنے آ پہنچے۔ مٹھائی کا ٹوکرا اکرام کے والد کو تھماتے ہوئے نواب سمیع اللہ بولے۔ ''بھئی میں تو آپ کی بستی کی ترقی دیکھ کر حیران ہوں۔ بہت مبارک ہو آپ کو۔ میں مبارک دینے ہی حاضر ہوا تھا۔''

اکرام نے بڑی گہری مسکراہٹ سے انہیں دیکھا اور کہا۔ ''ہم نے زیورات کا صندوق لینے سے انکار کر دیا تو نواب صاحب! آپ نے یہ سب کام کروا کر زیورات سے بھی بڑھ کر کام کر دیا ہے۔''

نواب صاحب اور اکرام کے والد دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''جی ابو! نواب صاحب نے اپنے خصوصی تعلقات استعمال کرتے ہوئے اسکولز منظور کروائے اور یہاں کے ترقیاتی کاموں پر اپنی طرف سے بڑی رقم دی ہے۔'' اکرام نے بتایا۔ اس نے مزید کہا۔ ''میں نے بڑے طریقے سے معلوم کر لیا تھا کہ یہ کام اچانک کیسے ہونے لگے ہیں؟ کون کروا رہا ہے؟'' اکرام نے جذباتی انداز میں بات مکمل کی۔

''تم نے میرے اکلوتے بچے کو اسپتال لے جا کر اور خون دے کر جو کیا، اس کے سامنے تو اس کام کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔'' نواب صاحب نے جواب میں کہا۔

''میں ٹیڑھے ہاتھ والا کس قابل نواب صاحب! یہ تو خدا کا کرم ہے جس نے مجھے آج کسی لائق کر دیا ہے۔'' اکرام نے کہا۔

نواب صاحب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بیٹا! واقعی اللہ نے تمہیں زین کی زندگی بچانے اور اپنی بستی کی حالت سنوارنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اب تو ویسے کہہ سکتے ہو یہ تو تمہارے دائیں ہاتھ کا کمال ہے۔'' اس پر ایک بھرپور قہقہہ گونجا۔

×××



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

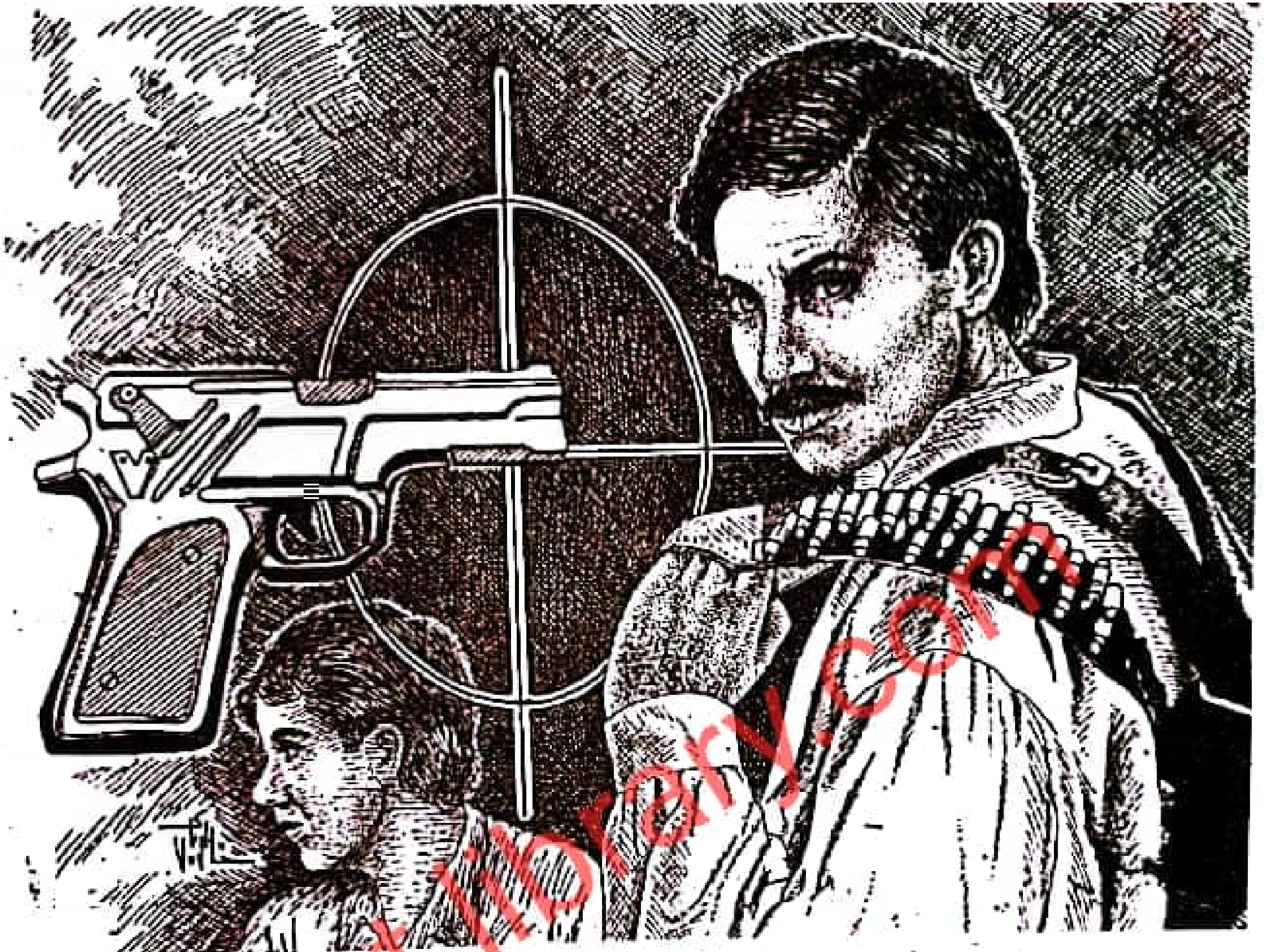

# جنگباز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

پچاسویں قسط

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہوجاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم

زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

روشنیوں کا شہر کراچی..... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے۔ ان گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان۔ یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب گھلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ راحیلہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی "نگاہ" سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن میں اب بھی اسے ایک "بہن" کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس "سنبھلنے" کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے گلے ٹی ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجا اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا "باس" کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے "باس" اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتادیں۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری "نمک حلالی" سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر کا سالا سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب تھا۔ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر ہوئی تھی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاک اپ ہوا تاہم رہا ہو گیا۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو پوری میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بااثر "چودھری جی برادران" کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالا جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن گیا۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی تھی۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا تھا۔ ایک خفیہ گروہ "کالی لہر" سے میرا ٹاکرا ہو گیا۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ تھا۔ عدیل جو کہ جگنو نامی شخص کا بھائی تھا ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلۂ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن گیا۔ کالی لہر کے مانگا بابا اور میڈم جی سے میری دشمنی عروج پر تھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آ کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن گئی جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی تھی۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی..... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری تھی۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے مانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آیا۔ مانگا نے منتر پڑھنا شروع کر دیے۔ مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ پھر مجھے حالت بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ انہوں نے کچھ کھلا کر میرے جسم کو مفلوج کر دیا تھا۔ وہاں بچو نے حملہ کیا اور تب ہی بیبی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے دربدر کر دیا تھا۔ وہاں کے چودھری کا بیٹا صمد یار چنبیلی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اماں میرے علاج کی غرض سے خاص بوٹی لینے سرحد پار نکل گئی۔ اماں خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کر لیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادوئی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ جنگل میں ایک تیندوا عورت کو دبوچے ہوئے تھا۔ میں نے درندے کو ٹھکانے لگا دیا۔ زخمی عورت صمد یار کی ماں شمیلہ خانم تھی۔ صمد یار کے گماشتوں نے اماں کی مڑھی کو آگ لگا دی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی لاک اپ کر دیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرا دیا۔ ڈاکٹر ہمیں پھنسانا چاہتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو گرفت میں لیا۔ دھینگا مشتی میں ڈاکٹر جان سے چلا گیا اور میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں استاد جوجی کے ٹھکانے پر آ گیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور ساؤں کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہاں سے میں ایک قصائی صورت بدمعاش کو اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس پر تشدد کر کے ہم معلومات لے رہے تھے کہ وہاں ہانڈیوں کی بارش ہو گئی۔ ہم نے دشمنوں کو مار بھگایا۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں میرا مانگا سے ٹاکرا ہوا۔ مانگا نے استاد جوجی کو شدید زخمی کر دیا۔ میں نے مانگا کی ایک ٹانگ کاٹ

ڈالی تاہم راناتاج نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں دشمن کے ایک اور ٹھکانے پر پہنچا تاہم انہوں نے مجھے قابو کرلیا۔ میں زخمی بھی ہوگیا۔ اچانک وہاں سلیم نے حملہ کردیا۔ مجھے وہاں سے نکال لیا گیا۔ سلیم اور چودھری برادران نے مجھ سے مفاہمت کرلی تاہم اس کے پیچھے ان کا کوئی خاص مقصد تھا۔ راحیلہ بھی انہی لوگوں کے پاس تھی۔ سلیم اور میں نے راجا تیمور کو چھاپنے کی کوشش کی تاہم ہمیں ناکامی ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک جگہ ایمبولینس اور پولیس نظر آئی۔ جگنو کو مار دیا گیا تھا۔ میں نے تیمور کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی فیکٹری پہنچ گیا۔ وہ لوگ کوئی "شے" لے کر کہیں جارہے تھے۔ میں نے ان کا تعاقب شروع کردیا۔ میں نے پیدل ہی ان کا تعاقب شروع کردیا۔ اچانک دوڑتے ہوئے سر پر چوٹ لگنے سے میں بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا راجا تیمور اور ڈرائیور ہلاک ہوچکے تھے اور کیوبس سے وہ شے غائب تھی۔ راجا تیمور کا ایک ساتھی زندہ میرے ہاتھ چڑھ گیا۔ معلومات پر پتا چلا کہ کسی گروہ نے انہیں ہلاک کیا تھا اور بوبورگا نامی قدیم مجسمہ لے اڑے تھے۔ میں نے میڈم جی تک پہنچنے کے لیے ان کا پیچھا کیا اور ان کے ساتھیوں کی کشتی میں سوار ہوگیا۔ ہم انڈین حدود میں داخل ہوگئے۔ بوبورگا کا مجسمہ بھی انہی کے پاس تھا۔ کشتی ایک جگہ رکی تو بھیڑیوں نے حملہ کردیا تاہم بھیڑیوں سے نمٹ لیا گیا۔ آگے چل کر ایک مگرمچھ نے ہم پر حملہ کیا اور کشتی میں صرف دو افراد بچے۔ ایک میں اور دوسری شینا۔ میں نے شینا کو اپنی سیدھی کہانی سنا کر اسے اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ ہماری کشتی ندی کی طغیانی کے باعث تباہ ہوگئی۔ ہم ایک جگہ پہنچ گئے۔ شینا زخمی ہوگئی۔ وہاں موجود میاں بیوی نے ہماری مدد کی۔ ہم ان کے گھر آگئے تاہم وہاں مخالف گروہ کے لوگ آگئے۔ انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ میں واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو وہاں مخالف گروہ کا باس اور ایک لڑکی سے ملاقات ہوگئی۔ باس البرٹ رمنڈو اور اس کی ساتھی بوبورگا کے مجسمے کے چکر میں تھے۔ میں اور شینا انہیں چکمہ دے کر نکل گئے۔ ایک جگہ جنگل میں باس کے ساتھی مارے گئے اور وہ ہمیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ میں اور شینا ایک بستی میں پہنچ گئے۔ وہاں شینا کے ساتھی میری طرف سے مشکوک ہوگئے۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ راستے میں مجھے کچھ انگریز ملے۔ کوہا پارٹی ایک سرکس کمپنی سے تعلق رکھتی تھی اور وہ وہاں ایک گوریلا کو پکڑنے آئے تھے۔ وحشی قبیلہ ان کا دشمن ہوگیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مدد کا کہا۔ میں ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ دشمنوں کی تحویل سے گاڑیاں نکالنے کے چکر میں ماریا کا باپ مارا گیا۔ ماریا نے گرینڈوا کو قابو کرلیا اور ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم ماریا کے سرکس والی جگہ پر پہنچ گئے۔ وہاں میری ماریا کے منیجر سے لڑائی ہوگئی اور وہ میرا دشمن ہوگیا۔ منیجر سیڈی غیرقانونی دھندے میں ملوث تھا۔ منیجر سیڈی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ میں وہاں سے ناگامائی روانہ ہوگیا۔ میں ایک آبادی میں پہنچ گیا۔ میرا وہاں دشمن کے گروہ سے ٹکراؤ ہوگیا۔ میں نے انہیں زیر کردیا۔ دشمن کے علاقے میں رمنڈو سے میرا سامنا ہوگیا۔ وہ بوبورگا کے مجسمے کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شینا کو بھی اغوا کرلیا تھا۔ رمنڈو کو مجسمہ چاہیے تھا اس لیے اس نے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ میں اس مشن میں زخمی ہوگیا اور جھی کے جنگل میں پھنس گیا۔ اچانک وہاں کسی گروہ نے حملہ کردیا اور [illegible] فرار ہوگئی۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا تاہم میرے کہنے پر فوزیہ کو رہا کردیا گیا۔ ہم رمنڈو کے پیچھے گئے۔ گروہ کے کچھ ساتھیوں کو رمنڈو نے ہلاک کردیا۔ رمنڈو کی گاڑی تباہ ہوگئی۔ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تاہم میں فوزیہ کے ہمراہ بچ نکلا۔ بوبورگا کے حوالے سے میں ایک صحافی جمیلہ سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا مگر جمیلہ کو قتل کردیا گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک لبنانی رپورٹر ملی۔ میں مائرہ کے ساتھ بوبورگا کے مجسمے کو تباہ کرنے نکلا۔ مائرہ ماری گئی۔ واپسی پر مجھے مچھیروں نے پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے نکل بھاگا اور واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ ہم کراچی آگئے۔ میری ایک خاتون سے ملاقات ہوگئی۔ وہ مشہور اداکارہ روبی تھی جو خود کو جگنو کی بہن بتاتی تھی۔ اسے اپنے بھائی کا کچھ ذاتی سامان حاصل کرنا تھا اور میری مددگار تھی۔ ہم نورپور روانہ ہوگئے۔ راحیلہ کسی نوید نامی شخص کی آلۂ کار بن گئی تھی۔ میں راحیلہ کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا تاہم مجھے دھر لیا گیا۔ میں راحیلہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ تاہم راحیلہ میرے پاس نہیں رکی۔ میں نے نادو کو کچھ لوگوں کی تحویل میں دیکھا۔ وہ چودھری کے گماشتے تھے اور انہوں نے نادو کو اختیار سے طلاق دلوا دی تھی۔ میں نے نادو کو آزاد کرالیا تاہم وہ خود چودھری کے پاس چلی گئی۔ سدرہ کو کچھ لوگوں نے اغوا کرلیا۔ میں نے تعاقب کیا۔ اسے سجاد بیگ نے اغوا کرایا تھا۔ میں نے سدرہ کو اس کے چنگل سے نکال لیا۔ میں نے سلیم چھالیا کا پیچھا کیا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ روبی کو بازیاب کرانے جارہا تھا۔ ہم نظام شاہ کے فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ وہاں کچھ لوگ آگئے اور مار ماری ہوئی۔ دلاور شاہ مارا گیا جبکہ وہ لوگ روبی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دلاور شاہ کے قتل کا الزام مجھ پر آیا اور مجھے لاک اپ کردیا گیا۔ نظام شاہ کے داماد خود انسپکٹر نے مجھے حوالات میں ختم کرانے کی کوشش کی۔ تاہم میں بچ گیا۔ میں نے نئے SHO کو اعتماد میں لے لیا۔ مجھے بری کردیا گیا۔ فوزیہ اور میری شادی ہوگئی۔ روبی زخمی حالت میں سدرہ کے گھر پہنچ گئی۔ میں روبی سے ملنے پہنچا۔ روبی نے بتایا کہ جگنو کو نظام شاہ اور لاکھا نے مارا تھا۔ میں نے انہیں عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کا عہد کرلیا۔ میں نوید کے گھر اکے ولا میں پہنچ گیا۔ میں نے نوید کو زخمی کردیا اور اس سے بیچ گرامیں کی فائل پر دستخط کرالیے۔ میں وہاں سے نکل پڑا۔ راستے میں راحیلہ سے سامنا ہوا تاہم نوید کے آدمیوں نے راحیلہ پر گولی چلادی۔ گولی اس کے شانے میں لگی تھی۔ میں نے نوید کے گماشتوں کو ختم کردیا۔ میں راحیلہ کو جوجی کے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ میں نظام شاہ اور لاکھا سے حساب چکتا کرنے کے لیے نورپور فارم ہاؤس پر پہنچ گیا۔ لاکھا وہاں پہنچا تو فوزیہ اس کے قبضے میں تھی۔ اس نے مجھے زخمی کردیا۔ وہاں زبیر پہنچا اور ہماری مدد کی۔ میں نے لاکھا سمیت اس کے کئی ساتھیوں کو جہنم واصل کردیا۔ شگفتہ آنٹی کو ان لوگوں نے ختم کردیا تھا۔ فوزیہ کی حالت بری تھی۔ ہمارا بچہ اب نہیں رہا تھا۔ میں دفتر جارہا تھا۔ میں نے جگنی کو دیکھا۔ میں اس کا پیچھا کرتا ہوا ان کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہاں نگہت سے میری ملاقات ہوگئی۔ بھانڈیل سائیں کے گماشتوں نے ہمیں دیکھ لیا اور وہ ہمیں ڈھونڈنے لگے۔ ہم وہاں سے نکل کر ایک ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں بوبورگا کے حصول کے لیے بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس کے کارندے موجود تھے۔ وہاں دھینگا مشتی ہوئی اور ہم دونوں کارندوں کو اپنے ٹھکانے پر لے آئے۔ ان کے ساتھ وسیم بھی تھا۔ ہم نے انہیں ڈرایا تو وسیم نے اندر کی باتیں بتانا شروع کردیں۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

میں الٹے پاؤں پلٹا تھا۔ زہریلی مسکراہٹ اب میرے ہونٹوں سے غائب تھی، اس کی جگہ سرد مہری اور ایک غضب ناکی نے لے لی۔ دیکھا تو سریتا اور آؤن ڈیوڈ بڑی غضبناک نظروں سے وسیم کو گھور رہے تھے۔

دو دوست دشمنوں کو آپس میں لڑوا کر اپنا الو سیدھا کرنا میرا پرانا حربہ تھا اور وہ کامیاب گیا۔ یہی بات یہی تھی میری چال کی کہ میں کوئی ایسا موقع نکالوں جس سے میں ان پر جرح کی ٹھوس وجہ نکال پاؤں تاکہ مجھ پر انہیں (کم از کم سریتا کو) اس بات کا شبہ نہ ہو کہ میں ان کی باتوں سے بیوقوف بننے والا تھا، وغیرہ۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے مس سریتا؟'' میں نے سرد مہری سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بک...... بکواس...... کر رہا ہے یہ۔'' سریتا کا لہجہ بوکھلایا ہوا تھا حالانکہ یہ ایک کھاگ ایجنٹ کی تربیت کے منافی تھا کہ وہ ایسے مواقع پر اپنے چہرے کے تاثرات یا لہجے کو ظاہر نہ ہونے دے جس کا صاف مطلب عیاں تھا کہ وسیم نے جو کہا تھا ان کے بارے میں، وہ غلط نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ مجھے خود بھی اس کا اندازہ تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں سہراب!'' دفعتاً ایک لحظے کی خاموشی کے بعد وسیم دوبارہ ہانپتی ہوئی آواز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ درحقیقت اس پر میری دہشت ہی ایسی طاری تھی کہ وہ اب میری ''مدد'' کرکے مجھ سے کچھ ''فیور'' لینا چاہتا تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ میں دوبارہ اس کی گردن دبوچ کر یہ تہدید کر چکا تھا کہ اگر پھر دوبارہ میں نے اسے اپنی راہ میں آتے دیکھا تو برا حشر کروں گا۔ لہٰذا یوں اب وہ برا پھنسا تھا اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اسے دی جانے والی اپنی دھمکیوں کو آج اس اچھے موقعے پر زیادہ سے زیادہ ''کیش'' کروں۔

''یہ جھوٹ......'' سریتا نے پھر درمیان میں کہنا چاہا لیکن میں نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی اور کھا جانے والی نگاہوں سے گردن گھما کر وسیم کی طرف گھورنے لگی۔

''بولو، کیا کہہ رہے تھے تم؟'' میں نے وسیم کی طرف دیکھ کر سرد مہری سے کہا۔ ''مگر یہ بات ذہن میں رکھنا کہ آج میں اپنی ان دھمکیوں پر عمل ضرور کروں گا، بجز اس کے کہ تم مجھے ان لوگوں کے بارے میں کیا سودمند معلومات فراہم کرتے ہو۔'' میں نے اسے اکسایا تو وہ فرفر بولنے لگا۔

''یہ سچ ہے کہ میں تم سے ایک پرانا انتقام لینے کی خاطر ان لوگوں کے ساتھ جا ملا تھا، بلکہ ملا گیا تھا، اپنے باپ تیمور کے سبب ہی میں لامحالہ ان کے رابطے میں آگیا تھا کیونکہ ڈیڈی کی زندگی میں ہی خود میں بھی میڈم چھپی اور کالی لہر والوں میں شامل ہوچکا تھا، پھر جب تم نے رانگا بابا کو موت کے گھاٹ اتار نے سمیت ان سب کا قلع قمع کر ڈالا تو میں بھی ان سے دور ہوگیا لیکن پھر ایک روز اچانک میڈم چھپی نے یہاں بھانڈیل سائیں سے خفیہ رابطہ کیا اور اپنی تباہ حالی سمیت ساری کتھا بیان کردی کہ بنگالا میں ان کا بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس کے ہاتھوں کیا حشر ہوا۔ اس کا بھی ذمے دار وہ تمہیں ہی ٹھہراتی تھی۔ اس کا سب کچھ تباہ ہوگیا لیکن وہ خود بچ نکلی اور یہی نہیں، بوبمبورگا کا مجسمہ بھی بعد میں میڈم چھپی نے اپنی کوششوں سے خلیج بنگالا کی تہوں سے...... برآمد......''

''ایک منٹ......!'' میں نے اسے بولنے سے روکا اور بھویں سکیڑ کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''چھپی کو کیسے معلوم ہوا کہ بوبمبورگا کے مجسمے کو میں نے خلیج بنگالا میں تہ آب کر ڈالا تھا؟''

وسیم نے ایک ذرا رک کر گہری سانس لی پھر جواب میں بتانے لگا۔ ''تم شاید ابھی تک میڈم چھپی جیسی بلا سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔ میں نے ڈیڈی (راجا تیمور) سے اکثر میڈم چھپی کے بارے میں سنا تھا، جس کے مطابق، کالی لہر کی بانی میڈم چھپی ہی تھی اور باقی اس کے حواری۔ یہ سارا گروہ ایک طرف اور میڈم چھپی ایک طرف۔ مطلب یہ کہ خواہ اس گروہ کے سب لوگ ہلاک بھی کر دیے جائیں اور اگر میڈم چھپی بچ جائے تو سمجھو گروہ کا وجود باقی ہے کیونکہ اس کے چاہنے والے گروہ کے اندر ہی نہیں، باہر بھی موجود رہتے ہیں جس کی ایک بڑی مثال بھانڈیل سائیں بھی ہے اور ایک حد تک میں خود بھی...... خیر، اس نے پہلے تو اس بات کا کھوج لگایا کہ اتنا بڑا حملہ اور وہ بھی ان کے ''گھر'' میں گھس کر کرنے والے کوئی معمولی لوگ نہیں ہوسکتے، پھر جلد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ یہ حرکت بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس کی ہے جنہیں بوبمبورگا کا مجسمہ درکار تھا اور جس کا نام اپنے مشن کے حوالے سے انہوں نے ''آپریشن بلیک اسٹون'' رکھا ہوا تھا۔ بوبمبورگا کا پتھر ان کے لیے بہت قیمتی تھا جس کی حقیقت سب سے پہلے اسرائیلی سائنس دانوں کو معلوم ہوئی تھی۔ ان کے مطابق یہ مخصوص ساخت کا پتھر دراصل پتھر نہیں ہے بلکہ کئی ہزار سال قبل خلا کی وسعتوں میں ٹکرانے یا گرنے والے شہاب ثاقب کے ٹکڑوں میں سے ایک ایسا ٹکڑا تھا جو اسرائیل کے صحرا ''دشت داؤد'' میں گرا تھا اور یہ اپنے اندر

ایٹمی تابکاری کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مزید تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یہ کسی خلا میں بھٹکنے والے گمنام ایٹمی سیارچے کا ٹکڑا ہے جس کے اندر کچھ ایسے سائنٹیفک عوامل عمل پذیر رہتے تھے جنہیں ہم جادو کا نام دیتے ہیں۔ کسی طرح یہ پتھر میڈم چھی کے ہتھے چڑھا، اس وقت میڈم چھی چھوٹے موٹے جادو ٹونے کرکے دیگر لوگوں کو اپنا ہمنوا بنائے ہوئے تھی لیکن اس کے پیروکاروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ پڑھی لکھی ضرور تھی، کسی طرح اسے اخبارات سے اس پتھر کے بارے میں معلوم ہوا اور وہ اپنے قریبی ساتھی رانگا بابا (رانگا لنگڑا) کے ہمراہ اس نایاب اور جادوئی (سائنسی اثرات) رکھنے والے پتھر کو حاصل کرنے کی مہم پر نکلی۔

"پتھر حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اسے کسی مصنوعی دیوتا کا نام دیا کیونکہ اس سے شعاعیں پھوٹتی رہتی تھیں اور ضعیف الاعتقاد لوگ اسے کرامات یا چمتکار سمجھنے لگے۔ سو، اس سے میڈم چھی کے گروہ کے افراد اور پیروکاروں کی تعداد ایک دم بڑھنے لگی۔

"اسرائیل، جو ہر وقت خود کو گریٹر اسرائیل بنانے کے خواب دیکھتا رہتا ہے، یہ لوگ اس پتھر کو حاصل کرکے اس پر ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کا کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ عرصہ دراز کی تلاش بسیار کے بعد ہی اس پتھر کی گمشدگی اور دستیابی کا پتا لگ سکا کہ اس جیسا کراماتی اثرات رکھنے والا پتھر انڈیا اور بعد میں بنگلا میں دیکھا گیا ہے۔ سو، ان لوگوں نے بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی مدد سے اس کی تلاش شروع کردی اور بالآخر کھوج نکالا کہ یہ کس گروہ کے پاس ہے۔

"اس کے بعد بلیک اسٹون آپریشن، را اور موساد کے اس کمانڈو گروپ کے مشترکہ ایکشن سے کامیاب ہوا لیکن تم نے راستے میں ہی ان کی اس کامیابی کو خاک میں ملا دیا اور پھر میڈم کو معلوم ہوا کہ بوہمورگا کو تم نے خلیج بنگالا میں غرقاب کرڈالا تھا۔ وہاں سے وہ اسے نکلوانے میں کامیاب رہی مگر اب را (بلیک کیٹس) کے ڈر سے وہ اسے انڈیا یا بنگلا میں نہیں رکھنا چاہتی تھی اور پھر اسے پاکستان آنے کا خیال سوجھا، ساتھ میں اس کا تم سے بھی انتقام لینے کا ایک مقصد تھا۔ اس نے بھانڈیل سائیں سے رابطہ کیا، پھر بھانڈیل سائیں ملے مجھ سے لیکن میڈم چھی کی مدد کے لیے نہیں بلکہ ان لوگوں کی مدد کے لیے۔"

آخر میں سانس لینے سمیت وہ سریتا اور آؤن ڈیوڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تھما تھا جو بڑی زہریلی اور خونی نظروں سے بدستور اسے گھورے جا رہے تھے۔

"بولتے رہو۔" میں نے پھر ٹوکا۔ "لیکن یہ بتاؤ کہ ان دونوں کا بھانڈیل سائیں سے رابطہ کیسے ہوا؟ کیا پہلے سے ان کا گٹھ جوڑ تھا؟"

"نہیں، پہلے سے تو نہیں تھا لیکن بھانڈیل سائیں جو حالات حاضرہ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا، اس نے اخبارات وغیرہ میں تمہارے بنگلا والے کارنامے سمیت سب پڑھ رکھا تھا۔ اسی میں مائرہ ماچی کی بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس کے سلسلے میں بھی رپورٹنگ کا متن بحوالہ موجود تھا۔ پس، اس کے شاطر اور لالچی ذہن نے فوراً اس منصوبے پر عمل کرنے کا ارادہ کیا، لہٰذا جیسے ہی میڈم چھی نے ٹرنک کال پر اس سے رابطہ کیا تو بھانڈیل سائیں کو اپنے نئے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا شاندار موقع مل گیا۔ یوں اس نے میڈم چھی کی بھرپور مدد کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے مجھے بھی "ذاتی" منصوبے میں شامل کرلیا۔

"منصوبہ یہی تھا کہ میڈم چھی کو بنگلا سے مجسمے سمیت بہ حفاظت نکال کر پاکستان لایا جائے اور پھر میڈم چھی کا خاتمہ کرنے کے بعد مجسمہ بھاری قیمت پر بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس والوں کو فروخت کردیا جائے، جن سے اس چالاک آدمی نے کسی طرح پہلے ہی خفیہ طور پر رابطہ کرلیا تھا جس کے بارے میں یہ دونوں ہی بتا سکتے ہیں یا پھر بھانڈیل سائیں۔"

اتنا بتا کر وسیم خاموش ہوگیا۔ میں نے دانت بھینچ کر جیسے خود کلامی کی۔ "مجھے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، ایسے کام بھانڈیل سائیں اور ان لوگوں کے لیے کیا مشکل ہیں لیکن اب جہاں تک میں یہ ساری اسٹوری سمجھ سکا ہوں، اس کے مطابق میڈم چھی کو تم نے آنے میں سپورٹ فراہم کی اور الگ سے بلیک اسٹون یعنی بوہمورگا کے مجسمے کو بہ حفاظت پاکستان اسمگل کرنے میں مدد دی ہوگی کیونکہ تمہارا کاروبار اپنی ہی ذاتی ٹرانسپورٹیشن پر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا ہے۔ اب مجسمہ تمہارے پاس ہے اور میڈم چھی مہمان بنی بھانڈیل سائیں کی حویلی میں اپنی موت کا انتظار کررہی ہے یا پھر اب تک اس کا قصہ بھی پاک کیا جا چکا ہوگا۔"

"بالکل...... ایسا ہی ہے۔" وسیم نے جوش تلے کہا۔

مجھے دل ہی دل میں بھانڈیل سائیں کی لالچی اور بد طینت فطرت پر بے حد طیش آیا۔ یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ بلیک اسٹون جیسا نایاب، خطرناک اور ایٹمی ہتھیار بنانے کے کام آنے والا پتھر محض چند ٹکوں کے عوض کن لوگوں کو فروخت کرنے پر آمادہ ہو چکا ہے۔

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

"را" اور "موساد" جو ملک دشمن عناصر ہی نہیں بلکہ پوری امتِ مسلمہ کے لیے ہر وقت خطرہ بنے رہنے والی ایسی بدنام زمانہ ایجنسیاں تھیں جو اپنے ملک کو "گریٹر" بنانے کے جنون اور بالخصوص مسلم ریاستوں کو زیرِدست رکھے رہنے کی قبیح سازشوں میں ہمہ وقت مصروف رہتی تھیں۔ پھر میرے ذہن میں ماریہ ماتھی اور جمیلہ کا بھی تصور اُبھرا۔ یہ وہ غیور خواتین تھیں جنھوں نے تن تنہا ان سازشی عناصر سے ٹکرا کر اپنی جانوں کے نذرانے تک پیش کر دیے اور میری غیرت اب یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ را اور موساد اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہوتے۔

لیکن ابھی میں نے ان کے سامنے خود کو ایسا "مجاہد" ظاہر نہیں کرنا تھا...... جب تک کہ ان کے اور ساتھیوں کی یہاں موجودگی کے بارے میں پوری طرح مجھے علم نہ ہو جاتا۔ اس سلسلے میں وسیم ایک چلا ہوا کارتوس سہی لیکن وہ کام کا مہرہ ثابت ہو رہا تھا۔ ایسا مہرہ جسے میں ان لوگوں سے منحرف کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ بومبورگا کا مجسمہ اس وقت تمہاری تحویل میں ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے وسیم کی طرف دیکھا تو اس نے فوراً اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔

"ان لوگوں کے اور ساتھی اس وقت کہاں چھپے بیٹھے ہیں؟ مجھے ان کی تفصیل بتاؤ، اسی وقت۔"

"ابھی بتاتا ہوں، سنو......!"

وسیم کی بات آرن ڈیوڈ کی غصیلی غراہٹ نے دبا دی۔

"ذلیل آدمی! اپنا منہ بند رکھو، یہ شخص ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" خبیث ڈیوڈ کی اس بات اور اس قدر زعم نے میرا دماغ ہی بھک کر دیا۔ اس مردود نے سیدھا میری مردانگی پر حملہ کیا تھا، گویا یہ مجھے کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ اس کے دماغ میں جو ازلی کیڑا گھسا بیٹھا تھا یعنی خود کو عظیم سمجھنے کا، اسے نکالنا اب میرے لیے ضروری ہو چکا تھا۔ میں نے پرویز سے انتہائی ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

"اس کے جکڑ بند کھول دو، اگر اس نے مجھے زیر کر دیا تو میں اسے یہاں سے صحیح سلامت جانے دوں گا، حتیٰ کہ مجھے زیر کر کے ہلاک بھی کر ڈالے، کوئی درمیان میں نہیں آئے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

میں نے دیکھا، میری اس بات نے ڈیوڈ کے چہرے پر طمانیت کی لہر دوڑا دی۔ نہ صرف اس کی مکار سی آنکھوں میں جارحانہ انداز کی خونی چمک ابھری تھی بلکہ اس کے بدہیت سیاہ ہونٹوں پر ایسی تھرتھراہٹ ابھری تھی جیسے وہ جلد از جلد اس سنہری موقعے سے فائدہ اٹھانے اور مجھ سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بھی بے تاب ہو۔ وہ خبیث ایک دم مکارانہ توصیف سے بولا۔

"واہ...... یہ ہوئی نا بہادری لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ تم اپنے وعدے سے منحرف نہیں ہو گے، نہ ہی تمہارے ساتھی...... اس لیے کہ یہ ایک مسلمان کا وعدہ ہے جس کی پاسداری وہ اپنا سر کٹوا کر بھی کرنے سے نہیں چوکتے۔"

"ہاں، یہ ایک مسلمان کا ہی وعدہ ہے اور نہ صرف وعدہ ہے بلکہ وصیت بھی کہ اگر میں تمہارے ہاتھوں ہلاک ہو جاؤں تو وہ تمہیں یہاں سے وعدے کے مطابق زندہ سلامت جانے دیں۔"

میرے مزید یہ کہنے کے بعد ڈیوڈ کے منحوس چہرے کی چمک بڑھتی جا رہی تھی، پھر میں کبیر اور پرویز کی طرف گھوما۔

"تم دونوں نے سن لیا سب کچھ؟"

جواب میں دونوں نے بیک وقت اپنے سروں کو اثباتی جنبش دی لیکن میں ان کے بشروں سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان اور فکرمند سے نظر آ رہے تھے۔ اس کی وجہ میں سمجھتا تھا۔

"تم دونوں باہر جاؤ...... اور میں دروازہ اندر سے بند کر لوں گا۔"

"سس...... سہراب...... یہ کوئی عام آدمی نہیں، ایک خطرناک اور تربیت یافتہ ایجنٹ ہے۔" کبیر نے جاتے جاتے بالآخر میرے کان میں ایک تشویش بھری لرزتی سی سرگوشی کی۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے ہولے سے جواب دیا۔

کبیر اور پرویز کے ڈارک روم سے نکل جانے کے بعد میں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا اور پھر اس کالے مکار یہودی کی جانب گھوما تو لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی وہ چمک جس میں میرے لیے نفرت، بغض اور غیظ کے طوفان مچل رہے تھے، دیکھ کر میرے اندر کا جنگ باز بھی اس کالے یہودی سے دو دو ہاتھ کرنے اور اس کا ازلی غرور توڑنے کو بے طرح مچلنے لگا تھا۔

میں نے جیسے ہی اس کے جکڑ بند کھولے، اس نے میرے سینے پر لات کی بھرپور ضرب رسید کر ڈالی۔ میں اس سے ابھی اس اچانک حملے کی توقع رکھے ہوئے نہیں تھا، نتیجے میں چند انچ اچھل کر میں عقب میں جا پڑا اور میرا سر بھی ڈارک روم کی سنگی دیوار سے بڑے زور سے ٹکرایا۔



Scanned with CamScanner

میری آنکھوں کے سامنے لمحہ بھر کے لیے تاریکی سی چھائی اور اسی دوران ہی میری سماعتوں میں اس کالے بیوڑے آڈن ڈیوڈ کی غراتی ہوئی آواز بھی سنائی دی۔

اس نے مجھے سنبھالا لینے کا موقع دیے بغیر ہی دوسرا حملہ بول دیا اور شاید اس نے قریب آکر فرش پر ایک ٹانگ سے پھرکی کی طرح گھوم کر قل ماسٹر کک کا استعمال کیا تھا جس کی ایک ہی ضرب انسان کو توڑ ڈالنے کے لیے کافی ہوتی ہے، بس شرط ہے کہ اسے مدمقابل کے دو نازک مقامات پر پڑنی چاہیے تو پھر وہ اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیتا ہے، ایک سینے اور پیٹ کے درمیان کی جگہ اور دوسرے کنپٹی پر۔

میرے اول الذکر مقام پر اس مردود کی کک لگی اور جیسا کہ یہ پوری طاقت سے لگائی جاتی ہے۔ کوئی اور میری جگہ ہوتا تو ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیتا تو ایک طرف وہ مر ہی جاتا۔ یہ جان کش ضرب لگتے ہی خود مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا کہ جیسے میری روح فنا ہوئی ہو۔ دوسری ضرب سنبھلتے ہی اس نے میری کنپٹی پر رسید کر ڈالی۔ مجھے بس اتنا ہی یاد رہا کہ میں قلابازی کھا کر ایک دیوار سے بری طرح جا ٹکرایا تھا اور میرے حلق سے چیخ بھی برآمد ہوئی تھی۔

درحقیقت اس بدمعاش نے ایک تو دھوکے سے مجھ پر اس وقت ہلا بول دیا تھا جب میں خود اس کے جکڑ بند کھول رہا تھا، دوسرے یہ کہ میرے لیے یہ غیر متوقع بھی تھا۔ اسی موقع سے وہ مردود فائدہ اٹھاتا چلا گیا۔

میرا سانس گھٹ رہا تھا اور دماغ سن ہونے کے قریب تھا کہ اس نے اچھل کر میرے دائیں پہلو پر کک سے وار کیا۔ میں تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ تب ہی اس نے اپنی دائیں کہنی سے میری ریڑھ کی ہڈی پر ضرب لگائی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری بیک بون کریک ہو گئی ہو۔ میں نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور فرش پر گویا بکھرنے کے انداز میں ڈھیر سا ہو گیا۔

☆☆☆

”آئی شاوشے......!“

اس روز استاد جوجی اپنے مخصوص لہجے میں مسکرا کر مجھ سے بولا تھا۔ ”یہ داؤ سیکھ لے میرے یار شہزادے! کام آوے گا نازک وقت پہ...... تو نہیں جانتا کہ اسی داؤ کے سبب میں آج سب کا ”استاذ“ کہلاتا ہوں۔ نام ہے اس کا...... تیتر پنکھ۔“

بس، عین آخری لمحات میں استاد جوجی کے ماضی میں کہے ہوئے یہی الفاظ کام کر گئے۔

ایک چالاکی بلکہ دھوکا ڈیوڈ نے کھیلا تھا، دوسرا اب جواب میں، میں کھیلنے والا تھا...... اور میں نے بھی داؤ ”تیتر پنکھ“ کھیلا تھا۔ تیتر جس طرح شکار ہوتے ہوئے موت کے آخری لمحات میں خود کو بے بس کر دیتا ہے اور پھر جیسے ہی شکاری ڈھیلا پڑتا ہے، یکدم پھڑ پھڑا کر اڑ جاتا ہے۔ میں اڑا تو نہیں تھا، البتہ تیتر پنکھ کی طرح میں نے اپنے دونوں ہاتھوں پیروں کو تیزی سے چلا کر یہ داؤ ضرور کھیلا تھا۔

آڈن ڈیوڈ نہیں جانتا تھا کہ درد میرے اندر کھلبلی گردش ضرور کرتا ہے مگر اسے ہوا ہونے میں چند ہی سیکنڈز درکار ہوتے ہیں۔ یہی اماں جی (چنبیلی کی ماں) کی بھاگی بوٹی کا وہ آزمودہ کرشمہ تھا جس سے میں اب تک خطرناک سے خطرناک دشمنوں کے آخری اور فیصلہ کن وار سے بچتا آیا تھا۔ یوں اماں جی کی بھاگی بوٹی نے جہاں مجھے یہ قوت بخشی تھی، وہیں استاد جوجی کے اس انوکھے داؤ ”تیتر پنکھ“ نے مجھے مہارت۔ دونوں نے گویا دو آتشہ کا کام کیا تھا۔

ادھر نابکار ڈیوڈ اسے اپنی فتح سمجھا اور تھم گیا۔ میں اسی طرح فرش پر پڑا رہا۔ تب ہی اس خبیث کی چیخ سنائی دی۔

”میں جیت گیا، اب وعدے کے مطابق مجھے یہاں سے جانے......“

اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی میں نے فرش پر یہ شرمناک چوٹ لگائی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا، شاید اسے اپنی مہلک ضربات کا بھی زعم رہا تھا کہ اب میں نہیں اٹھ سکتا۔ بس، یہی ایک لمحہ جو کچھ دیر پہلے اس کے لیے اہمیت کا حامل رہا، وہی مجھے بھی نصیب ہو گیا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے دونوں ہاتھ کے پنجوں کی مدد سے خود کو فرش پر پھرکی کے مانند گھمایا اور چلتے ہوئے پنکھ کی طرح اس کی ٹانگوں سے جا ٹکرایا۔ ”تیتر پنکھ“ کام کر گیا تھا۔

لہٰذا پنکھ کی طرح تیزی سے گھومتی ہوئی نچلے اوپر میری دونوں ٹانگوں کی ضربات اس کے پیروں سے ٹکرائی تھیں اور یوں اس کا ناپاک وجود چند انچ اوپر اچھلا اور پھر دھڑام سے میرے قریب آن گرا۔ تب ایک لحظہ بھی ضائع کیے بغیر میرے دائیں بازو کا فلائنگ کک اس کے سینے پر اس زور سے پڑا کہ اس کے حلق سے بھیانک چیخ برآمد ہوئی لیکن کمال قوت برداشت سے وہ اسے پی گیا اور تڑپ کر میری پہنچ سے دور ہونا چاہا تھا کہ میں اس پر دوبارہ شکاری باز کی طرح جھپٹا اور ہتھوڑے جیسی طاقت والا اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی کنپٹی پر جڑ دیا۔ وہ بل کر رہ گیا، درد اور کرب ناکی سے ڈیوڈ چیخا اور پھر سنبھلنے کی کوشش کی تھی کہ میرے دوسرے ہاتھ کے



digestlibrary.com
Scanned with CamScanner

چھٹکے نے اس کی گردن کی تواضع کر ڈالی۔ اس کے حلق سے ذبح ہوتے ہوئے جانور کی سی خرخراہٹ برآمد ہوئی۔ لیٹے لیٹے ہی میں نے تڑپ کر بائیں ٹانگ اس کے پیٹ پر اس زور سے رسید کی کہ اس کا منہ کھل گیا اور خون اُبل کر باہر اچھلا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا اور پھر اسی طرح چند لمحوں میں ختم ہو گیا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وسیم اور سریتا ہونقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے یہ جاں گسل منظر دیکھنے میں محو تھے، حتیٰ کہ میری طرف بھی اسی طرح تکتے رہے۔

میں نے پلٹ کر دروازہ کھول دیا۔ کبیر اور پرویز جن کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، یکدم اندر داخل ہوئے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہروں پر طمانیت کے آثار ابھرے اور پھر فرش پر آؤن ڈیوڈ کی لاش پر ان کی نگاہ پڑی۔

دونوں خاموش رہے۔ میں سریتا کی طرف آیا، اس کی آنکھوں سے اب دہشت اور تشویش کے سائے مترشح تھے۔ اس کی سانسیں بغیر دوڑے، تیز تیز چل رہی تھیں۔ البتہ وسیم کے چہرے پر اب کچھ بکھری بکھری سی سہی، طمانیت تھی۔ اسے بہرحال میری فتح عزیز ہوگی کیونکہ اب اس کا کردار سریتا وغیرہ کے سامنے کھل کر سامنے آچکا تھا۔ وہ ان سے نہیں بچ سکتا تھا۔

''سریتا!'' میں نے بہت ہی ٹھہرے ہوئے مگر سرد لہجے میں کہا۔

''اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارا حشر ایسا نہ ہو، مجھے اپنے اور ریڈ فاکس کے ساتھیوں کی یہاں موجودگی کے بارے میں سچ سچ بتادو، بلکہ نہیں، تم سچ ہی بولو گی کیونکہ جب تک تمہاری بات کی تصدیق نہ ہوگی، تم ادھر ہی مقید رہو گی۔ اس لیے جھوٹ بولنے کا تمہارے پاس کوئی آپشن نہیں بچا۔''

میں جانتا تھا کہ وسیم کو اس بارے میں علم نہیں ہوگا۔ بجز اس کے کہ ان کے ساتھی سیالکوٹ میں کسی مقام پر چھپے بیٹھے ہیں۔ کہاں......؟ البتہ یہ بات اس کے علم میں تھی کہ ان کے اور بھی ساتھی اسی شہر میں موجود ہیں۔

سریتا اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اس کا سانولا مگر پرکشش چہرہ تیزی سے نہ جانے کتنے رنگ بدل رہا تھا۔ جب بولی تو آواز میں ہلکا سا ارتعاش صاف محسوس ہونے لگا۔

''تت...... تم چاہتے کیا ہو؟ ہم تمہاری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہیں۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے مس سریتا!'' میں نے یکدم غرا کر کہا اور اپنا چہرہ بھی اس کے چہرے کے قریب، اس قدر قریب کر لیا کہ اس کی تیز تیز چلتی سانسیں میرے چہرے پر پڑنے لگی تھیں۔

''وہ...... کل...... لیکن تم تو ہمارے ساتھ......'' وہ پھر بتانے سے پہلوتہی کرنے لگی تو میں نے اس کی بات کاٹ دی اور خوفناک غراہٹ تلے قریب کھڑے پرویز سے تحکمانہ کہا۔

''پرویز! تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں، جب میں یہاں واپس لوٹوں تو اس کی زبان کھل جانی چاہیے۔''

کہتے ہی میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے باہر جانے لگا تو سریتا نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ میرے قدم رک گئے مگر میں اس کی جانب مڑے بغیر کھردرے لہجے میں بولا۔

''اب وقت ضائع مت کرنا سریتا! میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ سچ بولنے کے سوا تمہارے پاس اور کوئی آپشن نہیں بچا۔''

''میں سچ ہی بولوں گی۔'' سریتا نے کہا۔ تب میں اس کی جانب پلٹا اور چند قدم چلتا ہوا اس کے قریب جا رکا پھر مستفسرانہ نظروں سے اس کے سلونے چہرے کو گھورنے لگا۔

پھر اس نے مجھے اپنے ساتھیوں کا یہاں جو خفیہ ٹھکانا بتایا، اسے سن کر مجھے ایک لمحے کے لیے تو اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ میں ساکت سا ہو گیا کیونکہ جو مقام اس نے بتایا تھا، وہ میرے لیے غیر شناسا نہ تھا۔ ان لوگوں کے کام کرنے کا طریقہ کار یہی ہوتا ہے، بہت لمبی چین گھماتے ہیں اور جہاں، جس جگہ اپنے ناپاک پنجے گاڑتے ہیں، وہاں سب سے پہلے اپنے ''سہولت کار'' لوگوں کو شامل کر کے پھر انہی کی مدد سے اپنے ''مشن'' کو آگے بڑھاتے ہیں اور میں سمجھ سکتا تھا کہ جن لوگوں کے پروں میں ان کے باقی ساتھی چھپے بیٹھے ہیں، وہ ان کے مطلب کے ہی آدمی ہو سکتے تھے۔

باقی سریتا نے ان لوگوں کی تعداد پانچ بتائی تھی، دو ان کے اور تین ریڈ فاکس کے تھے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا، آپریشن بلیک اسٹون کے حصول کے لیے یہ لوگ مشترکہ ایکشن میں تھے اور یوں مفاد بھی ان کا ایک ہی تھا۔

''سوچ لو یا یاد کر لو ایک بار پھر، سریتا!'' میں نے تنبیہ آمیز لہجے میں اس سے کہا۔ ''ایسا نہ ہو کوئی بات تم سے اپنے مشترکہ ساتھیوں کی گنتی یا پھر ٹھکانے وغیرہ سے متعلق بتانا رہ گئی ہو بعد میں تمہارا کوئی عذر نہیں چلے گا اور اس کی بھیانک سزا کے لیے بھی تم تیار رہنا۔'' میری تہدید پر اس نے پورے اعتماد سے دوبارہ یہی بتایا تو میں نے پرویز کو سریتا سے محتاط رہنے کی تاکید کی، آؤن ڈیوڈ کی لاش کو



Scanned with CamScanner

ٹھکانے لگانے کا کام کبیر کو سونپا۔ اس کے بعد وسیم کے جکڑ بند کھول ڈالے اور اسے اپنے ساتھ لے کر ڈارک روم سے باہر آ گیا۔

میرے سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ سریتا نے جو ٹھکانا بتایا تھا، اس نے مجھے بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ ایک لمحے کو خیال بھی آیا کہ ممکن ہے سریتا نے جھوٹ بولا ہو لیکن اب اس کے جھوٹ بولنے کا امکان کب رہا تھا، وہ اپنے ساتھی آوَن ڈیوڈ کا میرے ہاتھوں حشر دیکھ چکی تھی پھر وہ خود بھی میری تحویل میں تھی اور یہ دھمکی بھی میں اسے واضح طور پر دے چکا تھا کہ اس کے پاس جھوٹ بولنے کی کوئی گنجائش اب نہیں رہی ہے کیونکہ میرے لیے اس کی تصدیق کرنا چنداں مشکل نہیں ہوگا۔ مجھے یقین کرنا پڑا۔

وسیم کو لے کر نشست گاہ میں آیا تو وہاں استاد جوجی خاصے بے فکرے انداز میں کچھ کھانے پینے میں مشغول تھا۔ اس کے ہمراہ راحیلہ اور زبیر بھی تھے۔ ہماری ''فیملی فزیشن'' یعنی چنبیلی کی ماں ''اماں جی'' کے نایاب جڑی بوٹیوں والے علاج معالجے نے دونوں کو بھلا چنگا کر دیا تھا۔ حالات کے پیش نظر جوجی نے فوزیہ کو بھی وہیں بلوا لیا تھا اور کرائے کے مکان کو سر دست مقفل کر دیا گیا تھا۔ فوزیہ اور نگہت بھی وہیں موجود تھیں۔ چنبیلی، خدمت گزار بیوی کی طرح استاد جوجی کے لیے کھانے پینے کی اشیا لانے میں مصروف نظر آئی۔ ہم سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گئے۔ میں نے سب سے پہلے زبیر اور راحیلہ کی خیریت پوچھی۔

''... آ گئی شارٹے! لگتا ہے لاڈلے یار کے ہاتھ آج کچھ اہم شکار آئے ہیں۔'' میری طرف دیکھتے ہی اس نے منہ چلاتے ہوئے کہا اور ایک نظر وسیم پر بھی ڈالی پھر اسے بھی اخلاقاً اپنے کھانے میں شامل ہونے کا کہا۔ وسیم نے شکریہ کہہ کر معذرت کر لی البتہ چائے کا کپ اسے تھما دیا گیا۔ اگرچہ جوجی کو بھی معلوم تھا کہ وسیم میرے لیے ایک ناپسندیدہ شخصیت رہا تھا لیکن چونکہ اس وقت وہ اس کی چھت تلے تھا اور جوجی کا یہ ظرف تھا کہ وہ گھر آئے دشمن کی بھی مہمان نوازی کرتا تھا جبکہ نگہت اور وسیم کی نگاہیں ایک لمحے کو ٹکرائی تھیں لیکن نگہت نے اس کی طرف سے اپنا منہ فوراً ہی پھیر لیا تھا۔

''کوئی خاص بات ہے، تو چپ چپ کیوں ہے لاڈلے یار؟'' جوجی نے میری طرف دیکھ کر دوبارہ کہا۔

''تم یہ کھانا پینا ختم کرو تو الگ چل کر بیٹھتے ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''معاملہ تھوڑا گمبھیر ہے، کچھ صلاح

## تاخیر

ایک انشورنس کمپنی نے ایک عمارت کا بیمہ کیا۔ صبح بجے کی کارروائی مکمل ہوئی، رات کو عمارت میں آگ لگ گئی اور تقریباً پوری عمارت جلے اور راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔ انشورنس کمپنی کو سازش کا شبہ ہوا لیکن تمام تر تحقیقات کے باوجود وہ کوئی ثبوت تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ بالآخر انہوں نے کمپنی کے مالکان کو صرف ایک خط لکھنے پر اکتفا کیا جو کچھ یوں تھا۔

''جس روز صبح گیارہ بجے آپ کی عمارت کا بیمہ کیا گیا، اسی روز رات کو گیارہ بجے عمارت میں آگ لگ گئی۔ کیا آپ اتنی تاخیر کی وجہ بیان کرنا پسند کریں گے؟''

## مشورہ

ایک خاتون نے گلوگیر آواز میں اپنی پڑوسن کو بتایا۔ ''میرا شوہر مجھ سے زیادہ اپنی ماں کو چاہتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اگر میں اور میری ساس دونوں ڈوب رہی ہوں تو وہ پہلے کسے بچائے گا؟ تو اس نے جواب دیا کہ وہ اپنی ماں کو پہلے بچائے گا کیونکہ ان کا زیادہ حق بنتا ہے۔ بتاؤ، ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''تمہیں تیراکی سیکھنی شروع کر دینی چاہیے۔'' پڑوسن نے مشورہ دیا۔

(مرسلہ: حنا حیات، سرگودھا)

## طلب

جج: میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ تم ایک اچھے عہدے پر ملازم تھے، بھاری تنخواہ لے رہے تھے، مستقبل میں مزید ترقی کے امکانات تھے۔ اس کے باوجود تم نے غبن کر لیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کوئی شخص اتنا احمق بھی ہو سکتا ہے۔

ملزم: جج صاحب! بات یہ ہے کہ انسان کو جتنا زیادہ ملتا جاتا ہے، اس کی ہوس اور طلب اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔

جج: ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پانچ سال کی سزائے قید دے رہا ہوں، زیادہ کی طلب ہو تو بتا دینا۔

(مرسلہ: راؤ لقمان، لاہور)



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

مشورہ کرنا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد صرف میں، جوجی اور وسیم دوسرے کمرے میں آ گئے۔ باقی لوگ نشست گاہ میں ہی بیٹھے رہے۔ البتہ تجسس کے سبب کبیر نے بھی ہمارے ساتھ اندر گھس بیٹھنا چاہا تھا مگر جوجی کے گھورنے پر وہ رک گیا۔

سریتا نے مجھے اپنے ساتھیوں کا جو ٹھکانا بتایا تھا، وہ چودھری دراب جی کا تھا، جہاں سلیم چھالیا بھی اس کے ہمراہ تھا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ آیا صرف سلیم چھالیا ہی ان کے لیے "سہولت کار" بنا ہوا تھا یا پھر لنگا چودھری دراب جی بھی اس میں شامل تھا، کیونکہ سریتا نے اپنے ساتھیوں کا جو ٹھکانا بتایا تھا، وہ جگہ تھی تو لنگے چودھری کی لیکن سلیم بھی اس کا دم چھلا بنا وہیں مقیم تھا۔

نادو والا معاملہ میرے مطابق بظاہر حل ہونے کے بعد لنگا چودھری (دراب جی) واپس صادق آباد لوٹ چکا تھا جبکہ سلیم وہیں تھا۔ وہ تھالی کا بینگن بن چکا تھا بلکہ دھوبی کا کتا بن چکا تھا، نہ گھر کا، نہ گھاٹ کا رہا تھا۔ آخر میں اس نے نوید چیچڑا کے پروں میں پناہ لینے کی کوشش کی تھی لیکن جب سے میں نے اس کا بھی تیا پانچا کر کے رکھ چھوڑا تھا، وہ ایک بار پھر لاوارث ہو گیا تھا۔

لیکن اب بقول سریتا کے، ان کے پانچ مشترکہ ساتھی وہاں خفیہ طور پر پناہ گزین تھے۔ سریتا سے یہ دریافت کرنے پر کہ سلیم چھالیا یا چودھری دراب جی کیسے ان کے "سہولت کار" بنے؟ تو اس نے اپنے جہنم واصل ساتھی آذن ڈیوڈ کا ہی ذکر کیا تھا کہ انہی کے ذریعے بات چیت ہوئی تھی ان کی...... وغیرہ۔ ممکن تھا سریتا نے اس بارے میں کچھ چھپانے کی کوشش کی ہو جس کی بہرحال میں اس سے کوئی جھوٹ سچ کی تصدیق کرانے پر وقت کا زیاں ہی سمجھتا تھا کیونکہ یہ بات خود ہی آشکار ہو جاتی۔

بہرکیف، میں نے اب تک کا سارا قصہ جوجی کو سنا ڈالا۔ یہ سب سن کر جوجی کے چہرے پر بھی چند ثانیے کے لیے گمبھیرتا طاری رہی پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

"معاملہ تو واقعی گمبھیر ہو پڑا ہے۔ یہ کالی، نیلی بلیاں، لومڑیاں تمہارے پیچھے بنگلا اور انڈیا سے یہاں تک آن پہنچی ہیں۔"

"میرے پیچھے نہیں، اس منحوس کالے پتھر کے پیچھے۔" میں نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے، تم بھی تو ان کے انتقامی نشانے پر ہو۔"

"ہم......!" میرے منہ سے برآمد ہوا۔ جوجی نے وسیم کی طرف دیکھا اور اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اوئے! تیرے دماغ سے ابھی تک سہراب سے انتقام لینے کا خناس اترا ہے یا نہیں؟"

جواب میں وسیم شرمسار لہجے میں ایک نگاہ مجھ پر ڈال کر جوجی سے بولا۔ "میں شرمندہ ہوں اپنے کیے پر اور اپنی سوچ پر بھی...... اور......"

"اوئے! تیرا دماغ خراب ہوا ہے؟" اچانک جوجی نے اس کی بات کاٹ کر گھرکنے کے انداز میں کہا تو وسیم گڑبڑا گیا۔ "تو اچھی طرح جانتا ہے کہ تیرے باپ نے جو بویا، وہی کاٹا بھی، اب تو، تو کم از کم اپنی زندگی اور عاقبت سنوار لے...... جھاویں! دیکھ، اس طرح تو بھی ان خطرناک لوگوں کے چکروں میں پڑ کر اپنے باپ کی طرح خوامخواہ ہی جان گنوا بیٹھے گا۔ اپنی جوانی پر رحم کھا، تجھے ضرورت کیا ہے ان خطرناک کھیلوں میں پڑنے کی؟ تیرے باپ کا اتنا بڑا بزنس ہے جسے اب تو سنبھال رہا ہے۔ کروڑوں کی جائداد کا بھی تو تن تنہا وارث ہے، کیا پڑی ہے تجھے آخر؟"

وسیم نے سر جھکایا ہوا تھا۔ نہ جانے اب اسے جوجی کی نصیحت سمجھ آ رہی تھی یا پھر وہ یونہی شریف بن رہا تھا، آخر بولا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہو استاد جوجی! مجھے تسلیم ہے کہ میرا باپ ایک غلط روش کا مسافر رہا اور میں بھی اسی رو میں بھٹکتا رہا ہوں۔ سچی بات یہی ہے کہ اب جبکہ میں نے بھانڈیل سمیت بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس والوں کے درمیان خود کو پھنسا ہوا دیکھا ہے تو میں خود ان سے خوفزدہ ہو گیا ہوں۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ ان لوگوں کو صرف اور صرف اپنے مفادات سے غرض ہوتی ہے اور اس کے لیے وہ اپنے پرانے سے پرانے اور وفادار حریفوں کی بھی پشت میں خنجر گھونپنے سے باز نہیں آتے۔ میڈم پھمی کی مثال میرے سامنے ہے۔ بھانڈیل سائیں اسے اپنی بہن کہتا تھا لیکن اب اپنی ہی پناہ میں رکھ کر اس کی موت کا سامان کیے بیٹھا ہے۔" یہ کہنے کے بعد وہ میری طرف دیکھ کر ممنون لہجے میں بولا۔

"سہراب! تم بھی مجھے معاف کر دینا لیکن جب تک یہ لوگ موجود ہیں یا بھانڈیل سائیں زندہ ہے، میری جان کو مزید خطرہ لاحق ہے، اس لیے کہ میں نے ان کے ساتھ اب غداری کر لی ہے۔"

"اوئے، جھاویں! تو اپنے کونے میں دبک کر بیٹھا رہ۔ اور شریفوں والی آئندہ زندگی گزارنے کا وعدہ کر، باقی



Scanned with CamScanner

ان لوگوں کو ہم سنبھال لیں گے۔'' جوجی نے کہا تو وسیم کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا۔

اب وسیم کتنا راہِ راست پر آنے والا تھا، یہ تو آگے وقت ہی بتاتا، لہٰذا میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس سے مطلب کی بات پر آگیا اور کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے بولا۔

''بومبورگا کا مجسمہ تمہارے پاس ہے نا؟''

''ہاں۔'' اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے، اسے ہمارے حوالے کردو، کبیر اور پپو کو اسی وقت میں تمہارے ساتھ روانہ کر رہا ہوں۔''

''میں تیار ہوں، ابھی چلیں میرے ساتھ۔'' اس نے فوراً کہا۔ تھوڑی دیر بعد کبیر اور پپو یعنی بشارت کو اس کے ہمراہ روانہ کر دیا گیا۔ میں نے جوجی کو ساتھ لیا، نگہت نے بھی ہامی بھری کہ وہ بھی ساتھ چلے گی۔ اس کی دیکھا دیکھی راحیلہ بھی تیار ہوگئی۔ زبیر پھر کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

ہمارا مشن معمولی نہ تھا۔ سریتا کے بقول دو بلیک کیٹس اور تین ریڈ فاکس کے خطرناک ترین ایجنٹس وہاں چھپے بیٹھے تھے۔ ایسے میں ان سب نے میرے اور استاد جوجی کے ساتھ جانے پر پُرزور اصرار کیا تھا۔ شاید حکمتِ عملی کا بھی تقاضا یہی تھا کہ حد سے زیادہ خود اعتمادی کے بجائے رل مل کر اور ایک دوسرے کی مدد سے اس اہم مشن کو جلد اور کامیابی سے ہمکنار کیا جاتا۔

ٹکے چودھری یا سلیم چھالیا کا ٹھکانا چونکہ اقبال چوک کے قریب قدرے شمال مشرقی مضافات میں تھا، اسی لیے نگہت نے سب سے پہلے وہیں چلنے کا مشورہ دیا اور اس پر ہم سب نے صاد کیا۔

اماں جی سے دعائیں لے کر ہم سب اللہ کا نام لے کر رخصت ہوئے۔ یہ ملک دشمن عناصر تھے، ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنا ان کا کام تھا اور یہ سب غیر قانونی طور پر یہاں آن وارد ہوئے تھے۔ یہ تو شکر رہا کہ قسمت نے یاوری کی اور میں ان سب کا سراغ لگانے میں کامیاب رہا اور ان کے کئی خطرناک منصوبے علم میں آئے جن میں سے ایک بومبورگا کا مجسمہ تھا جس کے حصول کے لیے بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے تھیں۔ بومبورگا یعنی بلیک اسٹون کا ان کے ہاتھ لگ جانا وطنِ عزیز کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری مسلم امّہ کے لیے مہلک اور خطرناک ہوتا، پھر پڑوسی ملک جن کے عرصہ دراز سے پاکستان کو نیچا دکھانے، اسے توڑنے کے لیے خفیہ طور پر ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں، انہیں بھی غیر معمولی برتری مل جاتی کیونکہ یہ بھارت اور اسرائیل کا مشترکہ منصوبہ تھا کہ وہ بلیک اسٹون کی تابکاری کو استعمال میں لا کر ایسے ایٹمی ہتھیار تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو دیگر ایٹمی طاقت کے حامل ممالک سے زیادہ خطرناک، مہلک اور کارآمد ہوتے۔

ہم پوری تیاری کے ساتھ روانہ ہوئے اور سب سے پہلے اقبال چوک پر واقع نگہت کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم نے مختلف النوع کے ہتھیاروں کو خفیہ طور پر اپنے جسموں کا حصہ بنایا اور تقریباً نصف گھنٹے بعد ہم پانچوں ایک ہی گاڑی میں پھر روانہ ہوگئے۔

مطلوبہ مقام تک پہنچنے میں ہمیں دس منٹ لگے اور یہاں سے چند گز دور ہی ہم نے گاڑی روک لی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اندر وہ پانچوں خطرناک ایجنٹ ہم سے بے خبر ہوں گے، اسی سبب میرا یہ اطمینان اپنی جگہ کہ وہ ''خبرداری'' کی حالت میں نہ سہی مگر فطری طور پر ''ہائی الرٹ'' ضرور ہوں گے، بایں وصف اس کے احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ازبس ضروری تھا۔ یہی تاکید میں نے سب کو کر ڈالی تھی۔

جوجی کے مشورے سے میں نے اپنے علاوہ تین گروپ بنائے۔ جوجی کے ساتھ نگہت تھی۔ زبیر اور راحیلہ کا جوڑا الگ کیا، خود میں تنہا رہا۔

جوجی وغیرہ کو میں نے عمارت کی جنوب مشرقی سمت روانہ کیا جبکہ زبیر اور راحیلہ کو میں نے عمارت کی عقبی سمت روانہ کر دیا۔ خود میں نے مرکزی دروازے کا رخ کیا اور انہیں تاکید کر دی کہ میرے اندر داخل ہونے کے دس منٹ بعد وہ بھی کسی طرح عمارت کے اندر خفیہ طور پر نقب لگا کر داخل ہوں۔

میں تو یہاں آتا جاتا رہتا ہی تھا۔ سلیم چھالیا اور ٹکے چودھری سے میری ملاقات ڈھکی چھپی نہ تھی لہٰذا میں دھڑکتے دل سے دروازے کے قریب پہنچا اور بے پروا انداز میں دروازے کی کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

ممکن تھا اندر سے باہر مجھ پر نظر رکھی جا رہی ہو۔ اس وقت چونکہ معاملہ کچھ اور تھا، اسی لیے میں نرتا پا محتاط اور ہر قسم کے اچانک ٹپک پڑنے والے خطرے سے بھی بے حد محتاط تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا، سامنے مجھے سلیم چھالیا دکھائی دیا اور اس کے چہرے کی الجھن آمیز پریشانی کو تاڑتے ہی میں سمجھ چکا تھا کہ اس نے اندر سے باہر مجھے دیکھ لیا تھا۔



Scanned with CamScanner

"تت...... تم ...... آ...... آجاؤ...... خیریت تو ہے نا؟" اس نے بظاہر خوشدلی کا مظاہرہ کیا تھا مگر ناکام تھا۔ یوں اس کا چہرہ ہی نہیں بلکہ لہجہ بھی چغلی کھا رہا تھا کہ وہ اس وقت میری آمد کو سراہنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا لیکن انکار کی بھی اس میں جرأت نہیں تھی۔

"ہاں، مجھے آنا تو بہرحال پڑتا ہی یہاں۔" ہلکی سی مسکراہٹ سے یہ کہتے ہوئے میں بے پروا انداز میں اندر داخل ہوا اور یہی نہیں، قدرے بلند آواز اور لہجے میں بے تکلفانہ خوشدلی بھی سموتے ہوئے آگے بولتا رہا۔

"لیکن...... کیا بات ہے یار! یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے؟ لگتا ہے چودھری دراب جی بھی نادو کے پیچھے ہی صادق آباد روانہ ہو چکے ہیں اور تم یہاں اکیلے مزے کر رہے ہو۔"

"ہیں...... ہاں...... ہاں...... کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔" سلیم نے قدرے لڑکھڑاتے اور گومگو سے لہجے میں کہا۔

"یہاں...... بیٹھو۔" اس نے نشست گاہ میں آ کر ایک صوفے کی جانب اشارہ کیا لیکن چونکہ میری عقابی نظریں نہ صرف اس کے چہرے بلکہ اندر کا بھی پُرغور جائزہ لینے میں محو رہیں، اسی سبب میں دانستہ صوفے کے بجائے سرکنڈوں کے اونچی پشت گاہ والے اس مونڈھے پر جا بیٹھا جس پر اکثر تکا چودھری یعنی دراب جی براجمان رہتا تھا لیکن وجہ میری یہاں بیٹھنے کی بہت خاص تھی۔ وہ اس طرح کہ یہاں میری متلاشی نظریں بیک وقت ان دونوں اندرونی کمروں کی طرف بھی پڑتی تھیں جن کے دروازے بند تھے۔ اگرچہ عموی طور پر سیدھے ہاتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا ہی رہا کرتا تھا۔ ان دونوں کمروں کی بغلی دیوار سے اوپر چھت کی طرف جاتے ہوئے زینے کے نصف حد تک قدِ آدم جھانک رہے تھے۔

"کیا بات ہے یار سلیم! تم کچھ گھبرائے ہوئے سے ہو؟" میں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔ "لگتا ہے نوید چھیرا کا میرے ہاتھوں حشر نشر تمہیں پسند نہیں آیا، تو کیا یہ خبر تکے چودھری کو بھی معلوم ہو گئی؟"

"کون سی خبر؟" سلیم سر کھجاتا ہوا میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہی کہ تم نے تکے چودھری صاحب کے دشمن، نوید چھیرا کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔" میں نے زہریلی مسکراہٹ تلے کہا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"چھوڑو یار! وہ کہانی تو تم نے اس بیچارے کا حشر نشر کر کے ختم ہی کر دی۔ اب یہ بتاؤ کہ خیریت سے آئے ہو نا؟"

"ہاں، خیریت ہی ہے۔" میں نے جواب دیا اور ترچھی نظروں سے اس الٹے ہاتھ والے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا جس کی بتی روشن ہو چکی تھی اور اس کی جھری سے مجھے مقدور بھر تاریکی کی جھپک اور روشنی کی کرن کا شائبہ ابھرتا ڈوبتا نظر آیا۔ صاف مطلب تھا کہ "اندر والوں" کو میری بھنک پڑ چکی تھی اور وہ شاید باری باری جھری سے لگ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"آؤ، اٹھو۔" وہ اچانک اور ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے مجھ سے بولا۔ "باہر چلتے ہیں، اندر بیٹھ بیٹھ کر میں بور ہو رہا ہوں۔ کہیں چل کر کچھ کھاتے پیتے ہیں اور جی بھر کر باتیں کرتے ہیں۔"

"بیٹھ جاؤ، سلیم!" دفعتاً ہی میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔

"اندر کون لوگ ہیں؟ کیا تکا چودھری اور اس کے آدمی؟" میں نے جان بوجھ کر سریتا وغیرہ کے ساتھیوں کا ذکر نہیں کیا۔

"وہ...... وہ......" ہکلاتے ہوئے اس نے ایک نظر اسی دروازے کی طرف دیکھا لیکن پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، اچانک دروازہ دھڑ سے کھلا اور چار پانچ چست لباس میں ملبوس گن بردار افراد میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید ہتھیار تھے جن کا رخ میری ہی طرف تھا۔

یکلخت میرے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں، مجھے ان کے یوں اچانک اور جلدی باہر آنے کی توقع کم ہی تھی۔ یہ سب غیر ملکی تھے اور ایک سانولا آدمی جو مجھے انڈین ہی لگا تھا، وہی شاید اس گروپ کو لیڈ بھی کرتا دکھائی دیا۔ وہ میری جانب بڑی زہرخند نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ ان میں ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ سریتا کے بعد یہ دوسری عورت مجھے ان میں نظر آئی تھی مگر یہ انڈین نہیں، اسرائیلی لگی مجھے۔

"یہ کیا...... کون لوگ ہیں یہ؟" میں نے سلیم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا لیکن سلیم میری بات کا جواب دینے کے بجائے یکدم اٹھ کھڑا ہوا اور ان سے خاصے برہم لہجے میں بولا، مخاطب وہی لیڈ کرنے والا سانولی رنگت کا انڈین شخص تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟ واپس جاؤ تم لوگ اپنے کمروں میں۔"

"یو شٹ اپ!" انڈین نے اسی درشتی سے سلیم کو جھڑک دیا۔



Scanned with CamScanner

"خبردار! تم اپنی جگہ سے حرکت بھی مت کرنا سہراب!" تب ہی اس انڈین نے جو یقیناً سریتا کا ساتھی اور "را" کے ونگ کا ایجنٹ تھا، مجھ سے تحکمانہ درشتی سے بولا۔

میں یک ٹک اس کی طرف گھورنے لگا۔

"تم بہت غلط کر رہے ہو، گوردن!" سلیم باز نہ آیا اور اسی وقت گوردن نامی اسی انڈین ایجنٹ نے اپنی گن سے سنگل شاٹ کھیلا۔ حیرت کی بات تھی، گولی چلنے کی آواز ایسی ہی آئی تھی جیسے بچوں کے کھیلنے والا کوئی پٹاخا چھوٹا ہو، لیکن سلیم گولی لگتے ہی کئی قدم پیچھے جا لڑکھڑایا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ سلیم عجیب دشمن تھا میرا، کبھی دوست لگتا اور کبھی دشمن...... میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ ابھی مرا نہیں تھا، فرش پر پڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ گولی اس کے دائیں شانے کے پار ہو گئی تھی اور بیرونی دروازے والی دیوار پر جا پیوست ہوئی تھی۔ البتہ اس کے شانے سے بھل بھل خون بہہ کر فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے دیکھا اوپر جانے والے زینے کی طرف سے کوئی دھواں اڑاتی ہوئی شے ان پانچوں کے عقب میں آن گری۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے، وہ شے ہلکے دھماکے سے پھٹی، چشم زدن میں دھواں پھیل گیا۔ اسی وقت ایک سے زائد افراد کی گنیں گرجیں۔ میں اس سے پہلے ہی اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر بہ سُرعت اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا، چہ جائیکہ وہ مردود انڈین ایجنٹ مجھے ہی نشانہ بنا ڈالتا۔

گولیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ ہی انسانی چیخوں کی آوازیں بھی اُبھری تھیں، اس کے بعد بری طرح کھانسنے کی۔ میں جب تک پھرتی سے اپنی جیب سے ماسک نکال کر اپنے منہ اور ناک پر چڑھا چکا تھا، ساتھ ہی پستول بھی ہاتھ میں لے لیا۔ وہ "شے" جو زینے سے لڑھکائی گئی تھی، یقیناً جوجی کا کارنامہ تھا۔ وہ اور نگہت کسی طرح نقب لگا کر چھت سے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے، پھر یہاں نیچے کی سن گن ملتے ہی جوجی نے گیس پھینکنے کی گیند نیچے لڑھکا دی تھی، کیونکہ گیس بال جوجی کی ایجاد تھی اور ایک ایسی گیند زبیر کے پاس بھی تھی، اسی سبب مشن کے لیے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے اپنی اپنی جیبوں میں ماسک ٹھونس لیے تھے۔

ایک محتاط اندازے سے میں نے بھی ان کی جانب تلے اوپر دو تین فائر جھونک مارے۔ ایک ہی چیخ سنائی دی، یہ نسوانی چیخ تھی۔ شاید وہی لڑکی میری گولیوں کا نشانہ بنی تھی جس کا تعلق اسرائیلی خفیہ ایجنسی "موساد" سے تھا۔

یہ فریضہ انجام دینے کے بعد میں اندازے سے فوراً ہی سلیم کی جانب لپکا اور اس کے فرش پر پڑے بے سدھ وجود سے ٹکراتے ہی میں نے اسے اُچک لیا۔

میں اسے اپنے کندھوں پر ڈالتے ہی دائیں جانب دوڑا تھا جبکہ زینے کی طرف سے مجھے قدموں کی تیز سی آوازیں سنائی دیں، میں رک گیا۔

دو افراد چلاتے ہوئے آپس میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ ایک آواز تو انڈین ایجنٹ گوردن کی تھی جبکہ دوسرے کا لہجہ نصرانی تھا۔ آپس میں ان دونوں نے انگریزی میں بات کی تھی اور میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

مشن نصف سے زیادہ کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا کیونکہ باقی یقیناً ان کے تین ساتھی ہلاک ہو چکے تھے۔ میں ابھی نہیں جانتا تھا کہ راحیلہ اور زبیر بھی اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوئے تھے یا نہیں لیکن میں نے پھر قدم تیزی سے بڑھائے اور دوسرے کمرے میں جا گھسا جو خالی پڑا تھا۔ میں نے زخمی سلیم کو یہاں ایک بستر پر ڈال دیا اور خود لپک کر لائٹ جلائی اور واش روم کا رخ کیا۔

میں تو یہاں آتا جاتا رہتا تھا اسی لیے مجھے معلوم تھا کہ یہاں اس کمرے کے واش روم کی ایک کیبنٹ میں فرسٹ ایڈ کا سامان رکھا تھا۔ یہاں دھواں کم پھیلا ہوا تھا، سلیم نیم بے ہوشی کے عالم میں بھی گیس کے دھوئیں کے سبب کھانس رہا تھا۔ میں نے فرسٹ ایڈ باکس کیبنٹ سے نکالا، چھوٹی پلاسٹک کی بالٹی میں پانی لیا اور لپک کر سلیم کی طرف آیا۔ چھت والا پنکھا میں نے فل اسپیڈ میں چلا دیا تاکہ دھواں جاتا رہے، یوں بھی اب وہ کم ہونے لگا تھا۔ باہر کی کیا صورت حال تھی، ابھی میں اس سے ناواقف تھا لیکن سلیم کی حالت نازک ہو رہی تھی۔ میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ باہر میرے ساتھی دشمنوں سے نبرد آزما تھے۔

میں نے سب سے پہلے پانی کی بالٹی نصف اس کے چہرے پر انڈیلی تاکہ دھوئیں کا اثر زائل ہوتا رہے اور وہ آسانی سے سانس لے سکے۔ اس کے بعد میں نے جلدی جلدی میں جیسے تیسے اس کے شانے کی مرہم پٹی کی۔

باہر اچانک مجھے پھر گولی چلنے کی آواز سنائی دی لیکن کوئی چیخ نہیں اُبھری۔ اس کے بعد باہر سے کچھ آوازیں

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

آنے لگیں، جیسے دو بدو کسی کے درمیان لڑائی ہو رہی ہو۔ سلیم کا جریانِ خون بند کرتے ہی میں لپک کر باہر آیا تو دھواں چھٹ چکا تھا اور وسیع و عریض نشست گاہ میں، میں نے دو بدو معرکہ ہوتے دیکھا۔ دو دشمنوں کی خون میں لت پت لاشیں پڑی تھیں جبکہ باقی تین، استاد جوجی، نگہت، راحیلہ اور زبیر سے نبرد آزما تھے۔ فقط ایک دشمن کے ہاتھ میں ہتھیار تھا، یہ گوردن تھا، وہ اسے فائر کرنے کی پوزیشن کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا لیکن استاد جوجی جو اس کے ساتھ نبرد آزما تھا، اسے ناکام بنائے ہوئے تھا۔

میں نے دوسری سمت دیکھا جدھر زبیر اور نگہت ایک دشمن کو بے بس کرنے میں مصروف تھے لیکن تیسری سمت میں راحیلہ مجھے ایک دشمن کے ہاتھوں بے بس سی دکھائی دی۔ یہ اسرائیلی ایجنٹ تھا جو مجھ سے گوردن کے بعد مخاطب ہوا تھا۔ میں نے اسی سمت میں جست بھری۔ وہ اپنی پنڈلی کی نیام سے ایک لمبے پھل والا چھرا نکال کر راحیلہ کی گردن پر پھیرنے والا تھا کہ میں اس یہودی پر قیامت بن کر کڑکا اور اسے راحیلہ کے اوپر سے رگیدتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ چھرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا لیکن میں نے اس کا سر زور سے سنگی دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس کے حلق سے وحشیانہ چیخ ابھری۔ میں اس قدر ان پر بھرا بیٹھا تھا کہ میں نے اسے پھر سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور ہونٹ بھینچ کر اس کا سر دوبارہ دیوار پر زور سے ٹکرایا۔ وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کا چھرا اٹھائے میں سیدھا ہوا ہی تھا کہ اچانک ایک دشمن کو میں نے اسی کمرے کی طرف بھاگتے دیکھا جدھر زخمی سلیم موجود تھا۔ وہ شاید نگہت اور زبیر کے نرغے سے نکل کر پناہ یا تھوڑی مہلت کے لیے اس کمرے میں گھسا تھا۔ زبیر اور نگہت اس کے تعاقب میں لپکے مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک کر جوجی کی مدد کو کہا اور خود ایک ہی جست بھر کے دروازہ دھکیلتا ہوا اندر جا پڑا۔

وہ خبیث جوریڈ فاکس کا اسرائیلی ایجنٹ ہی تھا۔ زخمی سلیم کی جانب لپکا تھا تا کہ اس کی گردن دبوچ کر مجھے بے حرکت کر سکے لیکن میں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا ڈالی اور ایک لات چلا دی جو اس کی کمر پر پڑی۔ وہ سلیم کے بیڈ سے اڑ کر دوسری جانب کی دیوار سے جا ٹکرایا لیکن کھڑے ہونے میں اس نے کمال پھرتی سے کام لیا تھا اور جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا، اس نے سنبھلتے ہی میرے چہرے پر گھونسا رسید کر دیا جسے میں سہہ گیا اور غراتے ہوئے اپنے سر کی ٹکر اس کی ناک پر جڑ دی۔ وہ "اوغ" کی کراہ نما چیخ کے ساتھ لمحے بھر کو ڈھیلا پڑا، مگر زور دار تھی، پھر میں نے اس کے سینے پر مکا رسید کر دیا۔ اس کی سانسیں بند ہونے لگیں اور وہ دیوار سے لگا لگا ہی نیچے کو بیٹھتا چلا گیا۔

اسے بے حس و حرکت کرنے کے بعد میں نے اسے کندھے پر ڈالا اور دوبارہ کمرے سے باہر نکلا۔

میرے چاروں ساتھی ان باقی دونوں شکاروں کو گھیرے ہوئے مستعد کھڑے تھے۔ گوردن اور اس کا اسرائیلی حلیف ایجنٹ بڑی بے بسی سے انہیں گھور رہے تھے۔ دونوں کو نہتا کیا جا چکا تھا۔ جوجی آرام سے کرسی پر براجمان تھا۔ نگہت، زبیر اور راحیلہ کے ہاتھوں میں گنیں چمک رہی تھیں۔ میں نے اپنے بے سدھ شکار کو ان کے درمیان فرش پر پھینک دیا۔

"آئی شاواشے!" میں نے جوجی کو کہتے سنا۔ وہ گوردن سے مخاطب تھا۔

"اوئے، کالے کتے! تیرے کس بل نکل چکے، اب اگر تو نے کوئی حرکت کی تو اس کا انجام وہاں دیکھ لے۔" کہتے ہوئے جوجی نے اپنے ایک ہاتھ کا اشارہ اس طرف کیا تھا جدھر ان کے باقی دو ساتھیوں کی لاشیں خون میں لت پت پڑی نظر آ رہی تھیں۔ ہم اب اپنے چہروں سے ماسک اتار چکے تھے۔

"سلیم اندر زخمی پڑا ہے، نگہت اور راحیلہ تم اندر جاؤ اور اسے دیکھو ذرا۔" میں نے ان سے کہا۔ وہ دونوں اندر کی جانب لپکیں۔ میں ہاتھ میں پستول لیے گوردن کی طرف خار بار نظروں سے گھورنے لگا پھر اسی لہجے میں بولا۔

"گوردن! تم لوگوں نے یہاں آ کر اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں، تم لوگ بلیک اسٹون کبھی بھی حاصل نہ کر سکو گے۔"

میں نے اپنا غصہ اس پر نکالتے ہوئے ساتھ ہی اس کے ساتھی اسرائیلی ایجنٹ کی طرف گھورا پھر انگریزی میں اس سے مخاطب ہوا۔

"کیا تم لوگ میرے ہاتھوں بنگلا دیش میں زیگان سمیت اپنے ساتھیوں کا حشر بھول چکے تھے؟ کیسے میں نے انہیں کتے کی موت مارا تھا۔ اب تم بھی کتے کی موت مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک باہر پولیس گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اندر چلنے والی گولیوں نے شاید باہر لوگوں کو اس طرف متوجہ کر لیا تھا اور کسی نے فوراً قریبی تھانے کی پولیس کو ادھر متوجہ کر ڈالا تھا۔



Scanned with CamScanner

استاد جوجی میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر بولا۔

"فکر نہ کرو، آنے دو انہیں۔ میں خود ان سے بات کرلوں گا لیکن تم ایک کام کرو، ایک نمبر بتاتا ہوں، فوراً اس نمبر پر انسپکٹر شیراز سے بات کرو اور میرے حوالے سے...... اور یہاں کی پوزیشن کے بارے میں بتاؤ۔"

میں نے کہا اور اسی وقت دروازے کے باہر ایک سے زائد گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں ابھریں پھر بھاری قدموں کی چاپ اور اگلے ہی لمحے دروازہ زور زور سے دھڑدھڑایا جانے لگا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا لیکن اگلے ہی لمحے بری طرح چونک پڑا۔

☆☆☆

"سہراب...... تم......؟" انسپکٹر شیراز کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا تھا۔ میں جو اسے دروازے پر غیر متوقع طور پر دیکھ کر پہلے ہی ایک خوشگوار سی حیرت میں مبتلا تھا، اس کی بات پر چونک کر بولا۔

"جی، انسپکٹر صاحب! آپ بالکل درست وقت پر تشریف لائے۔" کہتے ہوئے میں نے اس بھلے مانس پولیس آفیسر کا استقبال کیا۔ چند مسلح پولیس اہلکار بھی اندر داخل ہوئے اور حیرت بھری نظروں سے اندر کا حال ملاحظہ کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد ہی میری درخواست پر سب سے پہلے انسپکٹر شیراز نے زخمی سلیم کے لیے ایمبولینس منگوائی اور اسے اسپتال کی طرف روانہ کردیا گیا۔ شیراز کی اجازت سے میں نے زبیر کو سلیم کے ہمراہ ایمبولینس میں سوار کرادیا تھا۔

اس کے بعد میں شیراز کو سارے واقعات کی تفصیل بتانے لگا جسے وہ بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوچکا، وحیدے اور انسپکٹر یار محمد والے معاملے کے دوران میں اس کی منگیتر شاہینہ کمال اور شیراز کو اپنے ان معاملات کے بارے میں میں پہلے ہی بہت کچھ گوش گزار کرچکا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹھوس شواہد بھی اس کے سامنے پیش کرتا رہا تھا اور اب یہ سب دیکھ کر شیراز بھی دنگ رہ گیا تھا۔

"انسپکٹر صاحب! یہ کوئی عام مجرم نہیں ہیں۔" آخر میں، میں شیراز سے مخاطب ہوکر بولا۔ "نہ صرف بہت خطرناک مجرم ہیں بلکہ ایسے غیر ملکی ایجنٹ ہیں جو ملک دشمن عناصر کے زمرے میں بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کے یہاں سہولت کار بھی موجود ہیں جو ان کی ضمانتیں یا انہیں چھڑوانے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ ان سہولت کاروں کی بھی تفاصیل میں آپ کو بتائے دیتا ہوں، وہ بھی گرفت میں آنے چاہئیں۔ آپ یقیناً میری بات کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے؟"

"میں سمجھ رہا ہوں مسٹر سہراب!" انسپکٹر شیراز نے نہایت سنجیدہ اور بردباری سے جواب میں کہا اور آگے بولا۔ "تم فکر مت کرو، میں انہیں ملک کے حساس اداروں کے حوالے کردوں گا اور انہیں اس سلسلے میں بریفنگ بھی دے دوں گا۔"

"بہت شکریہ انسپکٹر صاحب!" میں نے خوشدلی سے کہا۔

اس کے بعد بڑی ذمے داری کے ساتھ انسپکٹر شیراز نے ضابطے کی کارروائی نمٹائی جس میں ڈیڑھ گھنٹا لگا۔ اس کے بعد ہم سب واپس اپنے ٹھکانے پر آگئے۔ سریتا کو بھی انہی کے سپرد کردیا گیا تھا۔

بہرکیف، میں نے سب ساتھیوں کو اس اہم مگر مختصر مہم کی کامیابی کی مبارکباد دی اور ان کی بہادری کی بھی تعریف کی، ساتھ ہی اس کا کریڈٹ میں نے استاد جوجی اور نجمہ کو دیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی ان سے کہا تھا کہ اگر ہم میری منصوبہ بندی کے مطابق عمل میں لائی جاتی ہے تو یہ ایک گھنٹے کے اندر اندر کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی ہے اور ویسا ہی ہوا تھا۔

"کیا سہولت کاروں کے خلاف کارروائی کے دوران سلیم چھالیا بھی حساس اداروں کی زد میں آئے گا؟" راحیلہ نے سوال کیا۔ "کیونکہ بہرحال ان لوگوں کو پناہ تو سلیم نے ہی دی تھی۔"

میں نے راحیلہ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں سے سلیم کے لیے فکر و تشویش کچھ باور کرانے کے لیے مجھے کافی تھی کہ وہ اس کے لیے اپنے دل میں کچھ جذبات رکھتی تھی۔ وجہ یقیناً اس کی یہی رہی ہوگی کہ سلیم کے ساتھ کچھ عرصہ گزارنے کے دوران سلیم کے رویے سے جھلکتے ہوئے اس کے لیے محبت بھرے جذبات اب راحیلہ سے ڈھکے چھپے نہیں رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "وہ جگہ سلیم کی نہیں، کگے چودھری کی تھی، باقی سلیم اگر راہ راست پر آنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کے ساتھ میں رعایت برت سکتا ہوں لیکن پہلے وہ اسپتال سے گھر واپس آجائے، اس کے بعد ہی میں اس سے اپنے طور پر پوچھ گچھ کرکے یہ فیصلہ کروں گا۔"

digest-library.com



Scanned with CamScanner

دو تین گھنٹوں بعد زبیر نے خبر دی کہ سلیم کی حالت خطرے سے باہر ہے اور کل تک وہ اسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔

''یہ ابھی تک کبیر اور پپو نہیں آئے؟'' اچانک جوجی کو خیال آیا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ خود میں بھی اتنی اہم بات بھول گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ ایک یہی تھی کہ اس معاملے میں کوئی مسئلہ ہم نے نہیں سمجھا تھا۔

میں نے اسی وقت فون پر وسیم کی رہائش گاہ کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب بیل جاتی رہی، تیسری بیل پر اس کے ملازم نے فون اٹھایا۔

''وسیم سے بات ہو سکتی ہے؟'' میں نے کہا۔

''آپ کون؟''

''میں اس کا دوست ہوں، سہراب!'' میں نے جواب دیا۔

''وہ تو جی گھر پر نہیں ہیں۔'' اس نے بتایا۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ''کہاں گئے پھر وہ؟'' بے اختیار میرے منہ سے بڑبڑاہٹ نکلی۔

''جی، کیا کہا آپ نے؟'' دوسری جانب سے ملازم نے کہا۔

''میں کہہ رہا تھا کہ کتنی دیر سے وہ گھر پر موجود نہیں ہے؟'' میں نے سنبھل کر پوچھا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ کیا خبر گھر سے ہو کر وہ کبیر اور پپو کے ساتھ واپس آ رہا ہو۔

''وہ تو کئی گھنٹوں سے گھر پر نہیں آئے، خود مجھے بھی فکر ہو رہی ہے صاحب کی۔ آپ کچھ مدد کر سکتے ہیں تو ان کے دوسرے دوستوں سے اتا پتا معلوم کر کے مجھے بھی بتا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔'' ملازم نے فکرمند ہو کر کہا تو میں نے پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے پھر بولا۔

''ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد جوجی کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہمیں وسیم سے پوچھ لینا چاہیے تھا کہ آیا اس نے بومورگا کا مجسمہ کدھر چھپا رکھا تھا، اپنے گھر پر یا کسی اور جگہ؟'' میں نے تشویش سے کہا۔

''کسی اور ہی جگہ رکھا ہوگا۔'' جوجی بے فکری سے بولا۔ ''تھوڑا اور انتظار کر لیتے ہیں۔''

''کہیں ایسا تو نہیں، وسیم نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کوئی چال چلی ہو؟'' اچانک درمیان میں نگہت نے بھی اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس مکار اور چالباز موقع پرست انسان کو اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''لیکن وہ تو راہِ راست پر آ گیا تھا اور یہ اس کی مجبوری بھی تھی ایک طرح سے ورنہ اسے اب خود اپنے ہی لوگوں سے اپنی جان کا خطرہ ہو چکا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ممکن ہے مجبوری کی حالت میں ہی سہی لیکن وہ کوئی چال بھی چل سکتا ہے۔'' نگہت بولی۔

''وہ اب تنہا ہو چکا ہے، ہر چال اس کے اپنے ہی گلے پڑے گی اور ہمارا مفاد اس سے صرف بومورگا کا مجسمہ حاصل کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی، ہم چونک پڑے۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ لوگ لوٹ آئے ہیں۔ رحیم بابا کے بجائے خود میں نے لپک کر بیرونی دروازہ کھولا تو سامنے کبیر کو ایسی حالت میں پایا جیسے وہ کسی سے کشتی لڑ کر آ رہا ہو۔ کپڑے مسکے ہوئے، چہرے پر خراشیں، ایک ہاتھ زخمی تھا اور گردن کے قریب ہنسلی کی ہڈی پر کسی تیز دھار آلے کا چرکا لگا ہوا تھا، وہاں سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس نے اپنی ہی قمیص کا دامن پھاڑ کر وہاں پٹی باندھ لی تھی جو سرخ نظر آ رہی تھی۔ اس کی سانس بھی پھولی ہوئی تھی اور وہ بس یہاں تک ہی پہنچنے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتا رہا تھا کیونکہ دروازہ کھلتے ہی مجھے دیکھ کر وہ گرنے لگا۔ میں نے لپک کر اسے سنبھال لیا۔

بشارت یعنی پپو اس کے ساتھ نہیں تھا۔

☆☆☆

میں کبیر کو سنبھالتا ہوا اندر لے آیا اور سب حیران و پریشان رہ گئے۔ کبیر کی حالت ایسی تھی کہ ابھی اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہ تھا، لہٰذا میں نے چنبیلی سے کہا کہ اوپر جا کر اماں جی کو بلا لائے۔ فوراً ہی اماں جی اپنی روایتی جڑی بوٹیوں کو ساتھ تھامے نیچے اتر آئی۔

کبیر کی حالت دیکھی اور زخموں کا جائزہ لینے کے بعد ہمیں تسلی دی کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ جلد بہتر ہو جائے گا۔ کبیر کو ایک کمرے میں بیڈ پر لٹا دیا گیا، اماں جی اور چنبیلی کو وہیں چھوڑ کر ہم نشست گاہ میں آ گئے۔ میرے اور جوجی کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار تھے۔ باقی سب لوگ بھی متفکر تھے اور اپنے اپنے قیاسات پر خاموشی سے غور کرنے لگے۔

''کیا ہوا ہوگا؟'' میں نے پریشان سے لہجے میں جیسے خود کلامیہ کہا۔

''اس سنپولیے نے دھوکا دیا ہے۔'' جوجی بولا۔ ''خدا



Scanned with CamScanner

کرے پپو خیریت سے ہو، نہ جانے اس بیچارے کا کیا حشر ہوا ہوگا۔"

"میرا خیال ہے ہمیں خود جا کر وسیم کی رہائش گاہ پر دیکھنا ہوگا کہ آیا وسیم وہاں موجود ہے یا نہیں یا کب آیا تھا؟" نگہت نے مشورہ دیا۔

"اس کے ملازم نے تو فون پر یہی بتایا تھا کہ وہ گھر پر تھا اور نہ ہی آیا تھا بلکہ کئی گھنٹوں سے غائب ہے اور وہ خود بھی پریشان ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوسکتا ہے اس کے ملازم نے جھوٹ بولا ہو۔" راحیلہ نے بھی لقمہ دیا تو جوجی بولا۔

"میرا خیال ہے نگہت اور راحیلہ کو وہاں جا کر سن گن لینی چاہیے۔" میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"ہاں، میں تیار ہوں۔" نگہت نے فوراً کہا۔

"مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔" راحیلہ بھی بولی پھر جوجی اور میں نے انہیں کچھ ضروری ہدایات دے کر روانہ کردیا۔ تھوڑی دیر بعد چنبیلی کمرے سے برآمد ہوئی اور ہم نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اماں جی بلا رہی ہیں اندر۔" اس کے کہنے کی دیر تھی کہ میں اور جوجی فوراً اندر لپکے۔ کبیر کی حالت بہتر تھی۔ اماں جی باہر نکل آئیں، میں اور جوجی کرسیاں گھسیٹ کر اس کے بیڈ کے قریب ہوگئے۔ کبیر اب خاصے جوش میں نظر آرہا تھا اور پوچھنے سے پہلے ہی شروع ہوگیا۔

"اس رذیل اور سانپ کی اولاد نے ہمارے ساتھ بڑا بھیانک دھوکا کیا ہے سہراب بھائی! آپ کو کسی صورت بھی اس سنپولیے پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ کئی بار ہمیں ڈس چکا ہے اور...... اور بیچارہ...... پپو......!" کبیر اپنے ساتھی کے ذکر پر رو ہی پڑا۔ میرے اندر آندھیاں چل رہی تھیں، آزمائے ہوئے کو بار بار آزمانے کا نتیجہ میرے سامنے تھا۔ میری زندگی کی واقعی یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ میں نے تڑپ کر پوچھا۔

"پپ...... پپو کو کیا ہوا؟ کچھ بتا تو سہی آگے۔"

"اوئے، کبیرا! آگے بول جلدی، اب اس کمینے کو میں خود ہلاک کروں گا۔" جوجی بھی طیش سے بولا۔

"وسیم پہلے یہاں سے ہمیں یہ کہہ کر اپنے گل ہاؤس والے بنگلے پر لے گیا کہ وہ کئی گھنٹوں سے گھر نہیں گیا، اس کے ملازم پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ہم وہاں گئے......!" اس نے پھر صراحت کے ساتھ بتانا شروع کیا۔

"تھوڑی دیر بعد وسیم ایک فون کرنے کا کہہ کر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے تو نہیں، البتہ بیچارے پپو کو شک تو ہوا لیکن میرا خیال تھا کہ شاید اس کی اب کوئی چھل فریب کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ بہرحال، وہ لوٹا اور پھر ہم روانہ ہوگئے۔ چونڈہ سے تقریباً ایک ڈیڑھ کلومیٹر پر دائیں جانب کسی کچی پکی آبادی کے آثار نظر آنے لگے تو اس نے اپنی کار اسی طرف موڑ دی۔"

میرے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں، سنسناتی کنپٹیوں پر لہو ٹھوکریں مار رہا تھا۔ کبیر آگے بتاتا رہا اور میری نظریں اسی کے چہرے پر جمی رہیں۔

"پھر اس نے گھروں سے قدرے فاصلے پر کسی پرانے مکان کے سامنے کار روک دی۔ یہ آبادی سے کچھ دور تھا، آس پاس جنگل، جھاڑیاں اور ویرانہ سا تھا، کھیت بھی تھے۔ مکان کشادہ مگر قدرے بوسیدہ نظر آیا جس کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ وسیم نے دروازے پر دستک دی، اندر سے دو آدمی برآمد ہوئے، دونوں کے ہی چہروں پر مجھے وحشت سی نظر آئی۔ پپو کا خدشہ میرے اندر بھی اب جڑ پکڑنے لگا۔ ہم بہرحال اندر داخل ہوئے تو ایک لحیم شحیم بھجنگ آدمی کھلے صحن میں ہی کھڑا نظر آیا۔ نیچے اس نے فقط لنگی باندھ رکھی تھی، اوپر بدن برہنہ تھا، بدن بالوں سے ڈھکا ہوا، سر گنجا اور وہ ایک بھیانک ہی آدمی لگا۔ کسی کالے بیل جیسی ابھری ہوئی آنکھوں میں وحشت لیے وہ ہماری طرف یوں گھورنے لگا جیسے قصائی ہو۔"

"گربھ داس! شکار سامنے ہے، ختم کر ڈالو ان دونوں کو۔" وسیم نے ہمارے کانوں میں جیسے انگارے بھر دیے۔ میں اور پپو جو پہلے ہی اندر سے کھٹکے ہوئے تھے، یکدم پلٹے، وسیم پرے ہوچکا تھا لیکن اول الذکر دو افراد ہماری راہ میں آگئے۔ ادھر عقب میں ہمیں گربھ داس کی ہولناک چنگھاڑ سنائی دی۔ بس، استاد جوجی! تمہاری تربیت ہی میرے کام آئی ورنہ تو آج میں بھی پپو بیچارے کی طرح گیا تھا۔ ایک آدمی کو تو میں نے دھوبی پٹکا مار کر پٹخ دیا جبکہ دوسرے کی زد میں پپو آگیا۔ اگرچہ پپو نے بھی اسے زیر کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کمینے وسیم نے تب تک اپنی جیب سے پستول نکال کر پپو پر فائر کردیا۔ گولی اس کے پہلو پر لگی مگر جی دار نکلا، خود کو گرنے نہ دیا اور اپنے مدمقابل کو کسی طرح دھکا لگانے میں کامیاب رہا، جو وسیم کی پستول کی زد میں آگیا۔ کیونکہ اس خبیث مردود وسیم نے دوسری گولی بھی چلائی تھی، نشانے پر اس کا ہی ساتھی آگیا، وہ چیخ مار کر گرا تھا۔ وسیم نے سنبھل کر تیسرا فائر کرنا چاہا تھا کہ میں نے پلٹ



Scanned with CamScanner

کر اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا لے گیا۔

''میری کوشش تھی کہ اس کے پستول پر قبضہ جمالوں لیکن بدقسمتی سے گرتے ہی پستول وسیم کے ہاتھ سے نکل کر اسی جلّاد صفت گربھ داس کے قدموں کی طرف جا لڑھکا تھا۔ اس کی طرف دیکھا تو میری روح ہی فنا ہوگئی۔ اس نے نہ جانے کہاں سے ایک خمدار سا مہیب چھرا نکال رکھا تھا، اس نے زور سے پستول کو لات ماری جو اندر کسی کوٹھڑی میں گم ہوگیا پھر وہ میری جانب خونخوار غراہٹ سے لپکا تھا کہ......''

اچانک یہ سب بتاتے بتاتے کبیر کی آواز رقت آمیز ہوگئی۔ کمرے کی فضا بوجھل تھی۔ ''استاد جی! مجھے پورا یقین ہے، پپو کو شاید اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا اسی لیے اس نے جب دیکھا کہ وہ قصائی نما جلّاد مجھے چھرے سے ہلاک کر ڈالے گا تو اس نے نہ جانے کیسے زخمی ہونے کے باوجود عین آخری لمحوں میں خود کو مجھے اس کے سامنے پیش کر دیا، یعنی میرے اور اس کے درمیان میں آگیا۔ اس موٹے بیل جیسے قصائی نے وہ بھیانک چھرا اس کے پیٹ میں گھونپ دیا اور اس رذیل نے نہ صرف یہ بلکہ چھرا گھونپ کر اسے اپنی طاقت کا اظہار دکھانے کے لیے دستے سے پکڑ کر اوپر سینے تک کھینچ دیا۔ پپو تو دوسرا ساہ (سانس) ہی نہ لے پایا اور ڈھیر ہوگیا۔

''میں نے اسی موقعے سے فائدہ اٹھایا اور دروازے کی جانب لپکا، پھر اس منحوس مکان سے باہر آیا تو پھر نہیں رکا، حالانکہ باہر وسیم کی کار کھڑی تھی لیکن میں نے اپنی ٹانگوں پر بھروسا کیا اور باہر نکل پڑا۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک لوڈر ڈالا نظر آگیا، میں لپک کر اس پر جا چڑھا۔''

اتنا سب بتانے کے بعد وہ رو پڑا، بالکل بچوں کی طرح۔ اسے پپو کے ایسے انجام کا شدید دکھ تھا اور خود ہمارا بھی یہی حال ہوا۔ دکھ، رنج، پشیمانی اور غیظ و غضب تلے میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہونے لگی۔

''یار سمراٹ! میرا دل گھٹ رہا ہے۔'' اچانک جوجی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''پپو کو تو چند ہی دن ہوئے تھے ہمارے ساتھ شامل ہوئے، اتنی بڑی قربانی، اتنی جاں نثاری...... نہیں...... میں اس کتے وسیم اور اس وحشی انسان گربھ داس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ موت سے بدتر سزا ہوگی اب ان دونوں مردودوں کی۔ بس۔ اب کوئی رعایت نہیں چلے گی۔''

جوش غیظ تلے جوجی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اس کا ہاتھ پکڑ لیا مگر جوجی نے بڑے زور سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جوجی نے میرا ہاتھ یوں جھٹکا تھا۔ وہ مجھے سرتاپا لاوا اگلتے ہوئے آتش فشاں کے روپ میں دکھائی دینے لگا تھا۔

''جوجی! ہوش سے کام لے۔ معاملہ بہت گمبھیر ہی نہیں، پراسرار بھی ہے۔'' میں نے کھڑے ہو کر اس سے کہا۔ ''کیا ہوگیا ہے تجھے؟ تو، تو بڑے ہوش و حواس والا آدمی تھا، مجھے تلقین کرتا تھا تو۔ کیا سمجھتا ہے تو، جو آگ تیرے سینے میں سلگی ہے، کیا وہ میرے اندر نہیں بھڑکی ہوگی؟ میرا تو دل اور دماغ، سینہ سب جل رہا ہے جوجی! اس مردار وسیم نے ضرور اپنے پاس ترپ کا کوئی پتا سنبھال رکھا ہوگا ورنہ وہ ایسی جرأت بھی نہ کرتا۔ اسے یقیناً اپنے اسی پتے پر بڑا زعم ہوگا، وہ بھی یہ حقیقت جانتا ہوگا کہ اب اس کا کیا حشر ہم کرنے والے ہیں۔ اس کے باوجود دیکھو، اس نے کس قدر ڈھٹائی سے نہ صرف ہمیں دھوکا دیا بلکہ ہمارا ایک پیارا ساتھی بھی ہلاک کروا ڈالا۔''

''اس حرامی کے پلے کو اس حرام زادی میڈم پچھی کے سوا اور کس کا زعم ہو سکتا ہے۔'' جوجی غرایا۔

نگہت اور راحیلہ بھی واپس آچکی تھیں۔

کافی دیر تک پپو کے سوگ میں خاموشی رہی، اس کے بعد میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ وسیم کون سا گیم کھیل رہا ہے یا پھر بھائی ٹیل سائیں؟''

''کیا مطلب؟'' جوجی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''وسیم ایک طرف ان سے غداری بھی کر رہا ہے اور دوسری طرف......!'' کہتے کہتے اچانک میں رک گیا، یوں جیسے بجلی کی سی تیزی سے سوچتے ذہن میں کوئی بات آگئی ہو۔

''اور...... میرا خیال ہے وسیم ڈبل کراس کر رہا ہے۔''

''نہیں۔'' اچانک درمیان میں نگہت بولی۔ میں اور جوجی اس کی طرف تکنے لگے۔

''اگر غور کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ اب تک کے سارے معاملات پُر کس قدر پُراسراریت ہے۔ بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس کی یہاں موجودگی، میڈم پچھی سے بھائی ٹیل سائیں کی غداری، گربھ داس...... پھر وسیم کا عارضی طور پر ہی سہی، بلیک کیٹس وغیرہ سے مل جانا اور پھر ان سے غداری۔'' ایک ذرا سانس لینے کے بعد وہ پھر کہنے لگی۔

''میں کہہ چکی ہوں کہ وسیم ایک موقع پرست انسان ہے، بہت عیار اور چالاک۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے،



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

گر بھ داس وغیرہ۔ یہ ضرور میڈم پھپھی کے آدمی ہوں گے اور میڈم اکیلی نہیں ہے اور وسیم اس کا وفادار ساتھی ہے۔ بھانڈیل سائیں کی غداری سے متعلق اس نے ضرور کسی طرح میڈم پھپھی کو آگاہ کردیا ہوگا۔ یہی نہیں، بلیک کیٹس وغیرہ کے سلسلے میں بھی اسے بتادیا ہوگا۔ یوں دوغلا کھیل کھیلتے ہوئے اس نے ایک طرف تو بھانڈیل سائیں کے تعلقات بلیک کیٹس وغیرہ سے پتا چلالیے اور دوسری جانب انہیں تمہارے ذریعے ختم بھی کروادیا۔ اب وسیم اور میڈم پھپھی کا میدان صاف ہوچکا۔ اگر تو وہ بھانڈیل سائیں کی حویلی میں گمنامی کی موت سے بچ چکی ہو تو۔"

میں اور جوجی اس کی طرف آنکھیں پھاڑے تکنے لگے، وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ جس طرح موجودہ حالات کے تناظر میں اس کا تجزیہ تھا، وہ بالکل ٹھیک بیٹھ رہا تھا۔

"کبیرا!" میں فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "کیا تم گر بھ داس والے ٹھکانے کے علاقے کا نام بتا سکتے ہو؟"

"ہاں، چک متراں۔" اس نے بتایا۔ "یہ چونڈہ سے بس ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہی ہوگا، دائیں جانب کے کچے پر۔ جب میں لوڈر ڈالے پر سوار تھا تو میری نظر ایک طرف پڑے ٹوٹے ہوئے لکڑی کے بورڈ پر پڑی تھی، اسی پر لکھا تھا۔"

"چک متراں......!" جوجی ہولے سے بڑبڑایا۔

"میرا خیال ہے، میں اُدھر جاچکا ہوں۔ میرے عنفوانِ شباب کے دور میں جب میں کبڈی کا بھی چیمپئن ہوا کرتا تھا، اپنے استاد کے ساتھ گروپ میں وہاں مقابلے کے لیے گیا تھا۔"

"خیر، کبیرا تو ہمیں وہاں تک لے جاسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ضرور، کیوں نہیں۔" وہ ایک جوش تلے بولا۔ "میں بھی ساتھ چلوں گا اور میں اس جلاد صفت اور بے رحم انسان کا سر کاٹنے میں شامل رہوں گا۔ اس کتے وسیم کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میرا خیال ہے سلیم چھالیا سے بھی ان معاملات کے سلسلے میں ہمیں بات کرلینی چاہیے۔" راحیلہ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ بلیک کیٹس وغیرہ کے بقیہ پانچ ساتھی اسی کے ٹھکانے پر ملے تھے۔ وہ بھی بہت کچھ جانتا ہوگا۔" میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں اسے گھورا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ سلیم سے بھی ان کے بارے میں استفسار کرنا باقی تھا کہ آیا اس کا بلیک کیٹس وغیرہ سے کس طرح کا تعلق پیدا ہوا تھا یا پھر نکا چودھری اس کی وجہ تھا، وغیرہ۔

"لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔" جوجی بولا۔ "سلیم ابھی اسپتال میں ہے اور زبیر بھی وہیں ہے اور ڈاکٹروں کے مطابق اسے کل صبح ہی اسپتال سے ڈسچارج کیا جانے والا ہے۔ تب تک کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ ہمیں اسی وقت وسیم اور گر بھ داس کی گردنیں ناپ لینی چاہئیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "تم، میں اور کبیرا اسی وقت چک متراں کی طرف نکلتے ہیں۔ باقی نگہت اور راحیلہ کو صبح تڑکے گڑھ مولا روانہ کردیتے ہیں تاکہ وہ پتا چلائیں کہ آیا میڈم پھپھی کا کیا بنا؟ بس، یہی کام ابھی ان دونوں کو کرنا ہوگا اور کوئی ہنگامہ یا لڑائی نہیں کرنی، تب تک ہم بھی لوٹ آئیں گے۔"

میری پلاننگ پر سب نے صاد کیا۔ حالات ایسے رخ پر تھے کہ ہمیں اب گروپوں کی صورت میں بٹ کر کام کرنا تھا۔ لہٰذا میں، جوجی اور کبیر چک متراں کی طرف روانگی کی تیاری کرنے لگے جبکہ نگہت اور راحیلہ گڑھ مولا کی طرف۔ ان کے پروگرام میں ایکشن لینے کا کوئی منصوبہ فی الحال شامل نہ تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہاں کے حالات بعد میں کیا رخ اختیار کرتے تاہم نگہت اور راحیلہ بھی کم نہ تھیں۔

رات کافی ہوچلی تھی لیکن ہم اب نچلے بیٹھنے والے کہاں تھے۔ کئی کامیاب مہمات ہم نے رات کے اندھیاروں میں ہی نمٹائی تھیں۔ سو، ہم تینوں کار میں اسی وقت چونڈہ (چک متراں) کی طرف روانہ ہوگئے۔ کبیر کی نشاندہی پر جب ہم اس منحوس سے بوسیدہ مکان پر پہنچے تو وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ ہم نے تالا توڑ دیا اور اندر جا گھسے لیکن اندر کی حالت دیکھ کر یوں لگا جیسے عرصہ دراز سے یہاں کوئی بھی نہ رہتا ہو۔ کچھ بھی نہ تھا، مکان خالی پڑا تھا۔ فرنیچر یا سامان کے نام پر لکڑی کا ایک ٹکڑا بھی نہ ملا، انسان کیا ملتا۔ صاف لگتا تھا کہ یہ ان کا عارضی ٹھکانا تھا۔

ہم چک متراں سے واپس روانہ ہوئے اور سیدھا گرین سٹی وسیم کے بنگلے کا رخ کیا۔ وہاں بھی تالا ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ ملازم یا چوکیدار تک نہ تھا وہاں۔

ہم کار میں آن بیٹھے۔

"آئی شاوشے! مجھے تو کسی خوفناک طوفان کی آمد کا احساس ہورہا ہے، یار سہرابے!" جوجی نے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے گمبھیر سے لہجے میں کہا۔



Scanned with CamScanner

"طوفان کیا آنا استاد! اب تو ہم خود ان رذیلوں کے لیے ایک بڑا طوفان بننے والے ہیں، جبھی تو یہ لوگ منظر سے ایک دم غائب ہو چکے ہیں۔ انہیں ہماری طاقت کا بھی خوب اندازہ ہے۔" کبیر کے اندر کا آتش فشاں سرد نہیں ہوا تھا۔
سچی بات تو یہی تھی، خود جوجی اور میری کیفیات بھی ایسی ہی تھیں۔ ہم دونوں ہی وسیم اور گربھ داس کی گردنیں مروڑنے کے لیے بے چین تھے اور پاگلوں کی طرح ان کی تلاش میں سرگرداں بھی۔

"کوئی بات ہے ضرور ان دونوں کے غائب ہونے میں لیکن آخر یہ دونوں کہاں پناہ لیے ہوئے ہیں اور کب تک؟" میں نے کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔" جوجی نے بھی پرخیال لہجے میں کہا۔ "گربھ داس تو چلو غیر ملکی ہوگا لیکن وسیم...... یہ کس کونے میں جا چھپا ہے۔"

"کل اس کے دفتر چلیں گے۔" میں نے کہا۔

"کل کیوں، آج اور ابھی کیوں نہیں؟" اچانک کبیر بولا۔ "اتنا بڑا تو اس کا تیمور انڈسٹریز کا دفتر ہے، ایکڑوں پر پھیلا ہوا۔ کیا خبر ادھر اس کا کوئی خفیہ ٹھکانا بھی ہو۔"

میں اور جوجی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کی بات غلط نہ تھی۔ جوجی پھر نہ رکا اور شہاب پورہ روڈ کی طرف ہو لیا۔ تیمور انڈسٹریز پہنچ کر ہم تینوں نے ہی الگ الگ اندر باہر سب دیکھ لیا مگر وہاں بھی یہ لوگ نہ ملے۔

ناچار تھک ہار کر ہم لوٹ گئے۔ اگلے دن کی خبر ہمارے لیے بڑی سنسنی خیز اور چونکا دینے والی تھی۔ وسیم منظرِ عام پر آ چکا تھا اور بڑے دھڑلے سے آیا تھا۔

یہ خبر سدرہ نے فون پر مجھے دی تھی اور فوراً اپنے پاس بلایا تھا۔

☆☆☆

دن کے گیارہ بج رہے تھے، اوائل سرما کی خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں اکیلا ہی سدرہ کے دفتر جا پہنچا اور اب اس کے سامنے بیٹھا بالمشافہ اس کی زبانی ساری روداد سن رہا۔ اس نے اپنے دفتری وکیل ایڈووکیٹ فاروقی صاحب کو بھی بلا لیا تھا۔

سدرہ نے ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی زیب تن کر رکھی تھی، بالوں کو آج اس نے اخروٹی رنگ میں ڈائی کیا ہوا تھا، کاجل سی آنکھیں گہری محسوس ہو رہی تھیں اور ان میں میرے لیے تشویش و فکر کے سائے بھی ہلکورے لے رہے تھے۔ تاہم اس وقت وہ بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔ فاروقی صاحب نے بھی کوٹ پینٹ پہن رکھا تھا اور ان کے چہرے پر نفیس سنہری فریم والی عینک تھی۔

بہرکیف، لبِ لباب اس خبر کا یہ تھا کہ وسیم نے آج صبح ہی نو بجے شہر کے ایک "معزز" بزنس مین کی حیثیت سے میرے خلاف کورٹ میں پٹیشن داخل کروا دی تھی اور ٹھیک دس بجے اسی حیثیت سے اپنے عالیشان دفتر کے کانفرنس روم میں پریس کانفرنس بھی کی۔

اس نے واشگاف انداز میں کہا تھا کہ سہراب نامی ایک غنڈہ جس کے شہر کے کئی تھانوں میں ریکارڈ بھی موجود ہیں اور جس پر میرے باپ راجا تیمور کو قتل کرنے کا کیس بھی داخل رہ چکا ہے، میری جان کا دشمن بنا ہوا ہے اور ایک پوری مافیا اس کی "بیک سپورٹ" پر موجود ہے۔ مقصد اس کا مجھ سے بھتے کی صورت میں "تاوان" مانگتے رہنا ہے، انکار کی صورت میں اس نے مجھے ہراساں اور بعد ازاں ہلاک کروا ڈالنے کی بھی دھمکی دے رکھی ہے...... وغیرہ۔ یہ صرف میرے لیے ہی نہیں، شہر کے دیگر معزز بزنس مین کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے، لہٰذا آن دی ریکارڈ میں قانون سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے تحفظ دیا جائے اور اس غنڈے کا سدِباب بھی کیا جائے ورنہ شہری امن میں "نقص" کا بھی خدشہ ہے۔

یہی نہیں، اس خبیث نے اپنی پٹیشن اور اپنی پریس کانفرنس میں سدرہ سمیت استاد جوجی، راحیلہ، زبیر، کبیر، پرویز سمیت نگہت کو بھی نہیں بخشا تھا۔ ان سب کے نام میری پشت پر کارفرما ایک طاقتور "مافیا" کی صورت میں پیش کیے تھے۔

میں نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ فاروقی صاحب نے اپنے سامنے رکھی فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر سدرہ کی طرف بڑھایا اور وہی سدرہ نے میری جانب کھسکاتے ہوئے کہا۔

"یہ میں نے فاروقی کے ذریعے وسیم پر ہتک عزت کا نوٹس تیار کروایا ہے۔ جرمانہ پچاس کروڑ رکھا ہے۔ اس پر دستخط کر دو اور یہ آج ہی کورٹ میں جمع ہوگا اور میں چاہتی ہوں کہ تم بھی ایک جوابی پریس کانفرنس کرو، اس دفتر کے ذمے دار ملازم کی حیثیت سے۔ میرا ارادہ تو یہی تھا کہ پریس کانفرنس ادھر ہی ہو لیکن فاروقی صاحب کا کہنا ہے کسی بڑے ہوٹل میں ہونی چاہیے۔ تم کیا کہتے ہو؟"

سدرہ کا مجھ سے تازہ کارِ حالات کے بارے میں استفسار کرنے کے بجائے ایک دم سے میرے دفاع میں یہ



digest library.com

Scanned with CamScanner

سب سوچتا اور عمل کرتا اس کی میرے ساتھ ہمدردی، دوستی اور سچی تعلق داری کی شاندار مثال تھا۔ یوں تو وہ میرے سارے حالات سے آگاہ تھی لیکن میری خبر گیری بھی پوری رکھتی تھی۔ اس نے وسیم کے جواب میں فوری ایکشن لیا تھا جس پر مجھے بھی کوئی اختلاف نہ تھا۔

فاروقی صاحب کو دستخط اور کچھ ہدایات دینے کے بعد جب اسے رخصت کر دیا گیا تو میں نے سدرہ سے کہا۔

''میرا خیال ہے فاروقی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرا دفتر میں کانفرنس کرنا مناسب یوں بھی نہ تھا کہ اول تو میں اس کا اونر (مالک) نہیں تھا، پھر بات تم پر بھی آسکتی تھی۔ وسیم اپنے دفتر کا خود مالک تھا، لہٰذا میرا ہوٹل میں ہی جوابی پریس کانفرنس کرنا ضروری تھا۔

اس کے بعد فاروقی صاحب اور میں نے مل کر ایک پیپر ورک بھی کیا اور وہ ''اسکرپٹ'' بھی تیار کر لیا جس کے مطابق میں نے وسیم کے لگائے ہوئے الزامات کے جواب میں کہنا تھا۔

سدرہ نے سارا انتظام کیا۔ میں نے جوجی وغیرہ کو یہ اطلاع دی، وہ سب گم صم سے ہو گئے۔ وسیم کے اس قدر اقدام پر انہیں بھی سخت طیش تھا۔ سدرہ کا خیال تھا کہ وسیم نے جن جن کا ذکر کیا ہے، وہ سب جوابی کانفرنس میں شامل ہوں لیکن ایڈووکیٹ فاروقی صاحب جن کے خیال سے یا مشورے سے میں بھی متفق تھا، وہ یہی تھا کہ ماسوائے میرے اس جوابی پریس کانفرنس میں کسی کو سامنے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا انہی کے مشورے پر صاد کیا گیا اور اسی دن دوپہر ایک بجے رٹ بنا کر عدالت میں وسیم کے خلاف ہتک عزت کا نوٹس تیار کر کے ایڈووکیٹ فاروقی صاحب نے میری طرف سے جمع کرا دیا، ساتھ ہی ایک نوٹس کی دو کاپیاں تیار کروا کے میرے وکیل کی حیثیت سے ایک ٹیلی گرام کی صورت اس کے دفتری پتے اور دوسرا ارجنٹ میل کے ذریعے اس کی رہائش گاہ پر بھی بھیج دیں۔

یہ سب ہنگامی بنیادوں پر کیا گیا تھا کیونکہ میرا جواب دینا ازبس اور فوری ضرورت تھا، پھر اسی دن دوپہر دو بجے میں نے مقامی ہوٹل میں وسیم کے خلاف جوابی پریس کانفرنس بلوالی۔

میری جوابی پریس کانفرنس بڑی دھواں دھار ثابت ہوئی۔ لب لباب یہی تھا کہ اول تو میں وسیم جیسے ذہنی مریض کو کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا، اگر یہ کورٹ تک بات نہ لے جاتا لیکن ایک امن پسند شہری کی حیثیت سے میں نے جواب کے طور پر کورٹ سے بھی پہلی فرصت میں رجوع کر لیا ہے اور اپنے وکیل کی طرف سے وسیم کے خلاف اس ہرزہ سرائی پر ہتک عزت کا دعویٰ بھی کر ڈالا ہے، لہٰذا اب میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ جواب دیا جائے۔

''وسیم نے جو بھی میرے خلاف بکواس کی، وہ آپ سب نے ملاحظہ کر ہی لی ہوگی جو کہ بغیر کسی ٹھوس ثبوت اور شواہد کی تھی۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ اپنی بکواس کی سچائی میں کوئی ثبوت بھی پیش کر دیتا مگر ہوتا تو پیش کرتا۔ اس طرح کی فضول گوئی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں فقط اتنا ہی کہوں گا کہ وسیم کی عداوت اور بغض صرف سدرہ انکار پور یٹڈ سے


دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے

بیرون ممالک کے لیے زرسالانہ 50,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:
مرزا ثمر عباس
0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی




Scanned with CamScanner

ہے جو اپنے صاف ستھرے لین دین کے سبب کاروباری دنیا میں اپنی ساکھ بہت تیزی سے بنا رہی ہے جسے وسیم اپنی ''تیمور انڈسٹریز'' کے لیے ایک خطرہ سمجھتا ہے۔ میں خود سدرہ انکار پوریٹڈ کا ایک عام ملازم اور اپنی باس سدرہ سکندر کا بزنس ایڈوائزر بھی ہوں۔ اس کی خار کا سبب یہی ہے۔ اس نے مجھے خفیہ طور پر رشوت کی آفر کی تھی کہ میں سدرہ انکار پوریٹڈ کو چھوڑ کر تیمور انڈسٹریز جوائن کر لوں جس پر میں نے صاف انکار کر ڈالا۔ رہی بات اس کی کہ میں اس کے باپ راجا تیمور کے قتل میں ملوث ہوں، اس کا مقدمہ کورٹ سے عرصہ ہوا خارج ہو چکا ہے اور اس مقدمے سے میں باعزت بری ہو چکا ہوں۔ یہ مجھ پر جھوٹا الزام لگایا گیا تھا، بلیک میل کرنے اور مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے۔ اصل میں یہ خود غنڈا گیر شخص ہے جو اپنے کاروباری مخالفین کے خلاف ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتا رہتا ہے۔ دراصل اس نے یہ سب کر کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ چور بھی کہتا ہے کہ میں چور نہیں ہوں، فلاں چور ہے۔ منطقی لحاظ سے ایسا آدمی خود ہی چور ہوتا ہے اور اب میں چند دنوں کے اندر اندر اس کے خلاف ٹھوس شواہد حاصل کر کے نہ صرف اسے جیل کی سلاخوں کے اندر دھکیلوں گا کیونکہ اس نے مجھے چیلنج کیا ہے۔ پہلے میں نے اس کی خرافات اور بلیک میلنگ پر کوئی توجہ نہ دی تھی لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔''

اس کے بعد سوالات ہوئے جس کے جوابات میں نے مناسب اور درمیانے لب و لہجے میں صحافیوں کو دیے۔

ہتکِ عزت کے نوٹس جا چکے تھے وسیم کو۔ میں جانتا تھا کہ ہوگا تو کچھ نہیں، البتہ وہ اب کورٹ سے جان چھڑانے میں لمبے عرصے الجھا رہے گا۔ اس دوران میں میڈم پچھی جیسی عالمی مجرم سے اس کے اور اس کے باپ کے تعلقات ''کالی لہر'' سے بھی ثابت کر کے میں اب لمبے عرصے کے لیے اسے جیل کی ہوا ضرور کھلاؤں گا۔

سہ پہر تک نگہت اور راحیلہ گڑھ مولا کی خبریں لے آئی تھیں جو خاصی چونکا دینے والی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ میڈم پچھی اسی رات کو جب بھانڈیل سائیں نے اسے دھوکے سے اپنی حویلی میں گنا ہی کی موت مارنے کا فیصلہ کر رکھا تھا، وہ اور اس کا ایک ساتھی بھانڈیل سائیں کو ہی زخمی کر کے اور ان کے دو آدمیوں کو ہلاک کر کے راتوں رات فرار ہو گئے تھے۔

نگہت اور راحیلہ کو حویلی کے ہی مکینوں سے یہ سن گن ملی تھی کہ راتوں رات ہی کوئی اجنبی حویلی میں نقب لگا کر داخل ہوا تھا اور اس نے سیدھا میڈم پچھی کی خواب گاہ کا رخ کیا تھا۔ میڈم پچھی کی قسمت اچھی تھی کہ عین اس وقت جب بھانڈیل سائیں خود اپنے دو حواریوں کے ہمراہ رات کی خاموشی میں میڈم پچھی کی خواب گاہ میں داخل ہو رہا تھا تو اسی وقت میڈم پچھی کا آدمی وہاں پہنچا تھا۔ اس نے بڑی جی داری کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور اس دوران میڈم پچھی بیدار ہو گئی اور پھر ایک زبردست لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں بھانڈیل سائیں کے دونوں آدمی ہلاک ہو گئے اور خود بھانڈیل سائیں شدید زخمی ہو کر اسپتال جا پہنچا۔

''یہ وسیم ہی کی حرکت تھی جس نے فوراً گربھ داس کو خبردار کر دیا تھا۔ یقیناً خود گربھ داس یا اس کے کسی ساتھی کو فوراً میڈم پچھی کو بچانے کے لیے راتوں رات گڑھ مولا کی طرف روانہ کر دیا گیا ہوگا۔'' میں نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''آئی شاؤٹ! اس کا مطلب ہے، میڈم پچھی کو وسیم کی پوری سپورٹ حاصل ہے اور پچھی اکیلی یہاں نہیں آئی ہے۔'' جوجی پرخیال لہجے میں بولا۔

''وسیم نے نہ صرف اس کی امانت یعنی وہ مجسمہ اپنے پاس سنبھالے رکھا ہے بلکہ اس کے ساتھیوں کو بھی اس نے پناہ دے رکھی ہے۔'' نگہت بولی۔ کہتے ہوئے اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہونے لگا وہ اسی لہجے میں آگے کہتی رہی۔

''سمجھ لو میری بات تم سب۔ وسیم کو شاید ہم نے کمزور سمجھنے کی کوشش کی ہے جبکہ یہ بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ بہت عیار اور موقع پرست انسان ہے اور اپنی غرض کی خاطر یہ کسی کو بھی قربان کر سکتا ہے۔ میں خود سجاد بیگ والے معاملے میں اس کا تجربہ کر چکی ہوں۔ مطلب کہنے کا یہ کہ وہ اب کسی رعایت کا مستحق نہیں رہا بلکہ اب تو وہ ایک خونی انسان بن چکا ہے۔''

''ہاں، کس قدر چالاکی سے اس نے اپنا دفاع کیا، اس بھگوڑے بزدل کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہمارے ساتھی کو میڈم پچھی کے آدمی گربھ داس کے ہاتھوں ہلاک کروا کے خود بھی خطرے میں پڑ چکا ہے تو اس نے فوراً پریس کانفرنس وغیرہ کروا ڈالی۔'' راحیلہ نے بھی خیال ظاہر کیا۔

''وسیم کچھ بھی کر لے اپنے بچاؤ کے لیے، یہ اس کی بھول ہے۔ میں نے جو اس کا حشر کرنا ہے، وہ کر کے ہی چھوڑوں گا۔'' میں نے طیش سے دانت پیس لیے۔

سدرہ بھی وہاں آئی ہوئی تھی، متانت سے بولی۔



Scanned with CamScanner

"نہیں، سہراب! اب پہلے والے حالات نہیں رہے۔" ہم سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "وسیم حد سے زیادہ ہوشیار اور چالاک نکلا ہے۔ اسے اب ذرا سا کچھ بھی ہوا، وہ فوراً تمہارے خلاف ایف آئی آر کٹوا دے گا، خواہ کسی اور کے ہی ہاتھوں ہو، بلکہ مجھے ڈر ہے کہیں وہ چالباز خود کو ہی زخمی یا جعلی حملہ کروا کے ایسا نہ کر ڈالے۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس طرح کوئی بھی اپنے مخالفین کے خلاف بہ آسانی کر سکتا ہے، ایک عدد کسی کے خلاف پریس کانفرنس کی رٹ داخل کی اور خود کو......"

"یہی ہوتا ہے۔" سدرہ بولی۔ "قانون کی آنکھوں میں پٹی بندھی پھر کیوں دکھائی جاتی ہے۔ جب تک کیس چلے، معاملہ تھانہ لاک اپ تک تو چلا ہی جاتا ہے، پھر ڈیٹینشن بھی ہو جاتی ہے۔"

سدرہ کی بات پر میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ کافی تجربہ کار اور زمانہ شناس ہو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بات پر سوائے میرے، سب ہی نے تائیداً خاموشی اختیار کر لی۔

مجھے خاموش اور الجھا ہوا سا پا کر سدرہ میرے قریب آ کر میرے شانے پر اپنا ایک ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے بولی۔

"میں جانتی ہوں کہ تمہارے اندر اپنے ساتھی پپو کی جانکاہ ہلاکت کا دکھ اور انتقام بھرا ہوا ہے۔ طریقہ اس کا یہی ہو سکتا ہے کہ تم میڈم پنکی کی گردن ناپ لو اور اسے قانون کی گرفت میں لانے کے بعد وسیم بھی نہیں بچ پائے گا اور مجھے یقین ہے پھر یہ دونوں ساری عمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزار دیں گے۔"

میں نے ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی۔

☆☆☆

سدرہ کی باتیں اپنی جگہ لیکن حقیقت یہی تھی کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ میڈم پنکی یا وسیم جیسے ناسور قانون کی گرفت میں آ سکتے تھے۔ جیل کی سلاخیں تو دور کی بات تھی، وہ تھانہ یا لاک اپ تک کو بھی محض ہاتھ لگا کر واپس ہنسی خوشی گھر لوٹ آتے کیونکہ وہ اتنے ہی اثر و رسوخ اور دولت کے مالک تھے۔ ممکن تھا کہ اس کی بھی نوبت نہ آتی، وہ سرے سے گرفت میں ہی نہ آتے۔

جوجی اور دیگر ساتھی جان رہے تھے کہ میں نے ان کی طرح سدرہ کی باتوں پر بالکل صاد نہیں کیا تھا۔ کرنا میں وہی چاہتا تھا جو وسیم اور میڈم پنکی جیسے ناسور گینگسٹرز کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ تاہم اب ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی اور بات تھی۔

وہ دن ہم نے آرام کر کے گزارا، اگلے دن جاگے اور وسیم سمیت میڈم پنکی کی تلاش کا معاملہ کرنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ کبیر کو گربھ داس کا سر کاٹنے کی بے چینی ہو رہی تھی۔ میں نے کبیر کو وسیم کی ریکی کے لیے شہاب پورہ روڈ پر واقع تیمور انڈسٹری کی طرف روانہ کر دیا اور ہدایت دی کہ وہ کوشش کر کے وہاں بھیس بدل کر عام ورکر یا مزدور کی نوکری حاصل کرنے کی کوشش کرے، وغیرہ۔ زبیر اور راحیلہ کو گرین سٹی روانہ کر دیا جہاں وسیم کی کل ہاؤس سوسائٹی میں رہائش گاہ تھی، ادھر ہی کہیں قریب میں انہیں کوئی پورشن کرائے پر لینے کی تاکید کر دی کیونکہ یہ کام ایسا تھا کہ مستقل طور پر ان کے قریب رہنے سے ہی ان کے بارے میں آئندہ کے لیے پتا چل سکتا تھا۔ زبیر اور راحیلہ نے میاں بیوی کی حیثیت سے وہاں قریب میں کہیں رہائش اختیار کرنا تھی۔

جوجی نے گھر پر رہنا تھا، البتہ میری ہدایت پر اس نے پرویز سمیت اپنے ایک ساتھی کو اپنے ہی گھر کے باہر متعین کر دیا جبکہ میں اور نگہت گڑھ مولا کی طرف روانہ ہونے کے لیے تیار ہونے لگے۔ باقی سلیم چھالیا کو میں نے ابھی اس پلاننگ سے دور رکھا تھا اور اسے گھر (کے چودھری کے ٹھکانے پر) جانے کا کہہ دیا تھا۔

اس پلاننگ پر کسی طور پر کام ہونے تک شام ہو گئی۔ تب میں اور نگہت دن ڈوبتے ہی بائیک پر گڑھ مولا کی طرف روانہ ہو گئے لیکن اس سے پہلے جوجی کے ہی مشورے پر ہم نے چونڈہ کے قریب واقع چک حتراں کا بھی ایک چکر لگانا ضروری سمجھا۔

جیسا کہ مذکور ہوا، سردی کی آمد ہو چکی تھی۔ شام میں ٹھنڈ زیادہ ہوتی، ہم نے اسی مناسبت سے ذرا موٹے گرم کپڑے پہن لیے تھے۔ یوں بھی بائیک کھلی سواری تھی، اس میں ٹھنڈی ہوائیں بدن کو کاٹتی محسوس ہوتی تھیں۔

میں نے بلیک جینز اور اس پر لائٹ شرٹ اور اوپر لیدر کی جیکٹ پہن لی، پیروں میں جوگرز تھے۔ نگہت نے گرم ہائی نیک والا جرسی نما سویٹر اور مفلر سا لپیٹ لیا تھا۔ ہم دونوں پہلے چونڈہ کی طرف روانہ ہوئے۔ چک حتراں پہنچنے میں ہمیں بیس منٹ ہی لگے۔

کچے کا علاقہ تھا، سرِ شام ہی وہاں ویرانی مسلط ہو چلی تھی۔ میرا ارادہ ایک بار پھر اسی منحوس مکان کی ریکی کرنا تھا

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

جہاں پپو کو میڈم پچھی کے خونی چیلے گربھ داس نے انتہائی بیدردی سے ہلاک کر ڈالا تھا اور کبیر بھی مرتے مرتے بچا تھا۔ اس خوں ناک واقعے کے فوراً بعد ہی ہم نے یہاں کا رخ کیا تھا مگر اس وقت مکان پر تالا تھا، اندر ہم نے نقب بھی لگائی تھی، کیا خبر باہر دھوکا دینے کے لیے تالا لگا دیا ہو اور اندر دشمن چھپے بیٹھے ہوں لیکن اندر بھی مکان بھائیں بھائیں کرتا ہی ملا تھا۔

اب ہم چوبیس گھنٹوں بعد دوبارہ یہاں آئے تھے۔ بائیک کو مطلوبہ مکان سے ذرا فاصلے پر روک کر ہم دونوں مکان کی جانب بڑھے۔ ہمارے آس پاس ٹھٹھرتی ہوئی ویرانی کا راج تھا۔ دور کہیں آوارہ جنگلی کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی آجاتی، ہر طرف تاریک سناٹے کا راج تھا۔ آسمان پر بھی تارے کم ہی تھے، فقط میں نے ایک چھوٹی سی ٹارچ روشن کر رکھی تھی اور ہم رک رک کر اور گردوپیش کی سن گن لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

مکان کے قریب پہنچے تو اس پر ہنوز ویرانی مسلط تھی۔ الگ تھلگ مقام پر درختوں اور قدِآدم جھاڑیوں میں گھرا یہ منحوس مکان کافی اسرار زدہ محسوس ہونے لگا۔ میں اور نگہت ایک بار پھر ٹھہر گئے۔

”لگتا ہے مکان اب بھی خالی ہی پڑا ہے۔“ نگہت نے ہلکے سے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”ہمم......!“ میرے منہ سے گومگو سا برآمد ہوا۔ ”کیا خبر کوئی اندر بیٹھا باہر نظر رکھے ہوئے ہو۔“ پھر لحظہ بھر کے توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ ”نگہت! تم ایسا کرو، ادھر ہی بیٹھی رہ کر مکان اور اردگرد پر نظر رکھو، میں دوسری جانب سے گھوم کر جدھر جھاڑیوں اور درختوں کی بہتات ہے، وہاں سے مکان کے قریب جا کر جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔“

میں تیزی سے دائیں جانب کو رینگ گیا اور پھر جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ لیتا ہوا ابھی مکان سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر تھا کہ اچانک ایک آواز پر بری طرح ٹھٹک کر وہیں ٹھہر گیا۔

بغور دھیان دینے پر معلوم ہوا کہ یہ آواز کسی موٹر سائیکل کی تھی اور میرے بائیں طرف سے ابھری تھی۔ تب ہی اس کی ہیڈ لائٹ دکھائی دی۔ وہ موٹر سائیکل ہی تھی جس پر دو افراد بیٹھے نظر آئے۔ ان دونوں نے گرم چادروں کی بکل ماری ہوئی تھی۔

موٹر سائیکل دروازے کے قریب جا رکی اور دونوں نیچے اترے۔ دونوں ہی غیر مسلح تھے لیکن ایک کے ہاتھ میں سوٹی تھی۔ شاید یہ راستے میں پڑنے والے جنگلی یا کھیتوں کے محافظ کتوں سے بچاؤ کے لیے پکڑ رکھی ہوگی۔

میں تھوڑا اور قریب جا سرکا تاکہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سن پاؤں۔

”شاہدے! یہاں دروازے پر تو آج بھی جندرہ (تالا) پڑا ہوا ہے۔“ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”ہم کیا کریں پھر؟“ دوسرا شاہدہ نامی ساتھی بولا۔

”زمیندار صاحب کا تو یہی حکم ہے کہ جندرہ توڑ کر مکان کے اندر کا سامان باہر پھینک دو۔ ہم اپنا تالا لگا لیتے ہیں۔“

”یہ تو خیر کرنا ہی پڑے گا شاہدے!“ اول الذکر مخاطب بولا۔ ”لیکن سامان باہر پھینکنے کی کیا ضرورت ہے؟ اندر ہی پڑا رہنے دو، ہم اپنا تالا لگا کر چلتے بنتے ہیں۔“

”چل پھر حیاتے! نمٹا کام جلدی...... سردی بڑی پڑنے لگی ہے۔“ شاہد بولا۔

یہ لوگ اپنے ساتھ اس مقصد کے لیے کوئی آہنی اوزار لائے تھے، اسی کی مدد سے تالا توڑنے لگے۔ میں جیسے غور سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ نہ جانے کیوں میرے دھک دھک کرتے دل کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہو، کچھ ایسا جس کی توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی۔

وہی ہوا...... جیسے ہی تالا ٹوٹ کر نیچے گرا اور ایک ساتھی اپنا لایا ہوا تالا دروازے کے کنڈے میں اٹکانے لگا تھا کہ اچانک ہی اندر سے دروازہ کھلا۔ ظاہر ہے میری طرح ان دونوں کے لیے بھی یہ غیر متوقع تھا، اسی سبب وہ دونوں ہی بری طرح بدک کر کئی قدم پیچھے ہٹتے چلے گئے۔

ٹھیک اسی وقت ایک جانب سے ایک بغیر ہڈ والی جیپ آندھی طوفان کی رفتار سے نمودار ہوئی۔ شاہد اور حیاتا جو پرے کھسک کر کھلے دروازے کو تکے جا رہے تھے، یکدم چونک کر جیپ کی طرف دیکھنے لگے۔

خود میں بھی چونک پڑا تھا۔ جیپ میں چار پانچ مسلح افراد سوار تھے اور جیسے ہی جیپ ان کے قریب رکی وہ سب کدکڑے مار کر نیچے اتر آئے۔

رات کے اس ویران اور تاریک ٹھٹھرتے ماحول میں بڑی عجیب اور اسرار کی سی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی جس نے چند ثانیوں کے لیے مجھے گنگ سا کر کے رکھ دیا تھا۔

**معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں**

سال کے کچھ ایام ملازمین کے لیے بے حد مصروف ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ وقت کرسمس کا ہوتا ہے مگر اگر آپ سیلم میں کام کرتے ہیں تو آپ کے لیے سب سے گہما گہمی والا مہینا اکتوبر ہوتا ہے۔

یہاں ہر سال ہالووین کے موقع پر چار ہزار سے زائد چڑیلیں شہر کو آباد کرتی ہیں۔ ہوٹلوں میں کمرے خالی نہیں ملتے، ریسٹورانوں میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی اور تحفے تحائف کی دکانیں "چڑیلوں کی کینڈروں" سے لد جاتی ہیں۔

# جال

لبنیٰ خان

شہرت ایک ایسا نشہ ہے جو کسی بھی شخص کو پُراعتماد اور بے خوف کر دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی آڑ لے کر وہ کوئی بھی اچھا یا بُرا فعل کرے گا اور کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا... مگر بعض دفعہ یہی خوش فہمی اسے لے ڈوبتی ہے... دولت کی ہوس اس سے وہ کام کرا دیتی ہے جس کا خمیازہ اسے بھُگتنا پڑتا ہے... آخر میں پچھتانا بھی فضول ہوتا ہے اور حاصل بھی کچھ نہیں ہوتا... مگر سچ کی تلاش میں کوشاں فرض شناس سچائی جان کر ہی دم لیتے ہیں۔

لالچ میں بھیانک جرم کرنے والے

اداکار کا قصہ

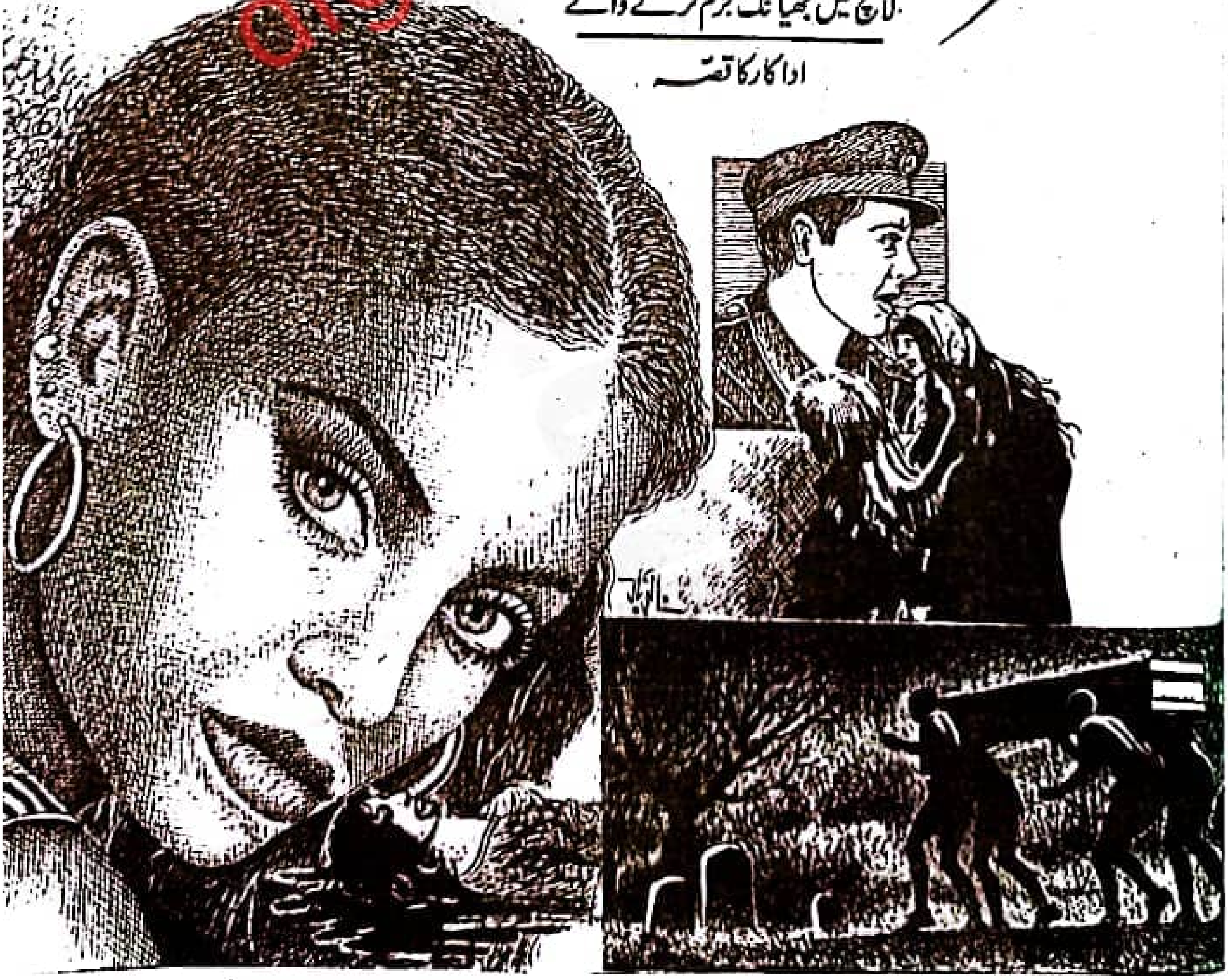

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

وہ پراسرار چمکتے ہوئے بلوریں گولے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ کے گھر کے گرد منڈلانے والی بدروحوں کو قید کر لیتے ہیں۔

آپ شاید اسے محض ایک دلکش کہانی سمجھیں مگر سیلم میں جینے اور کام کرنے والوں کے لیے جادو پر تھوڑا بہت یقین رکھنا ناگزیر ہے۔

سیلم کئی چڑیلوں کے عجائب گھروں کا مسکن ہے۔

مرکزی عجائب گھر میں ایک دورہ کروایا جاتا ہے جہاں بدنام زمانہ چڑیلوں کے مقدمات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ وہاں ان جذباتی نوجوان لڑکیوں کے مناظر بھی دکھائے جاتے ہیں جن کے بے بنیاد الزامات نے یہ سارا فساد شروع کیا تھا۔

چڑیلوں کی تاریخ کا عجائب گھر بھی کم وبیش یہی مواد پیش کرتا ہے مگر اس میں قصبے کے دیگر دلچسپ کرداروں کی کہانیاں بھی شامل ہیں۔

پھر ہے ”چڑیلوں کے تہ خانے کا عجائب گھر“ جو ایک قدیم گرجا میں واقع ہے جہاں سے اصلی قید خانے تھوڑی ہی دوری پر ہوا کرتے تھے۔ وہ قید خانے تو 1967ء میں منہدم ہو گئے لیکن ان کی زندہ جھلک دکھانے کے لیے نقول تیار کی گئی ہیں تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ بے گناہوں پر کس طرح ظلم ڈھائے گئے تھے۔

میں جس میوزیم میں کام کرتی ہوں، وہاں بھی قید خانوں کی نقل موجود ہے۔ ساتھ ہی دیگر ایسی نمائشیں بھی ہیں جو ان سیاہ دنوں کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ ہماری عمارت جو پہلے ایک پرانا گودام تھی، اب ایک خوبصورت ہال میں ڈھل چکی ہے جہاں لیکچرز اور خصوصی تقاریب کے لیے ایک شاندار اسٹیج موجود ہے۔ ہمارے معزز مہمانوں کو پہلے ہمارے کیوریٹر کی طرف سے ایک پُراثر تقریر سننے کو ملتی ہے، پھر ایک مختصر فلم دکھائی جاتی ہے اور اس کے بعد چڑیلوں کے مقدمات سے متعلق چند مناظر کی ڈرامائی پیشکش ہوتی ہے۔ اس کے بعد شائقین تہ خانے میں سیلف گائیڈ نمائش کا دورہ کر سکتے ہیں۔

میرے نزدیک لائیو پرفارمنس اس سیر کا سب سے دلکش پہلو ہے اور کیوں نہ ہو کہ میں خود ان اداکاراؤں میں شامل ہوں۔ مجھے ہر روز میوزیم کے بورڈ پر اپنا نام ”جل مارچ مین“ اپنی عزیز سہیلی لیلی بیل کے ساتھ جگمگاتا دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔

ہم دونوں کی ظاہری وضع قطع میں نمایاں فرق ہے۔ لیلی ایک نازک اندام، سبز آنکھوں والی اور سنہری زلفوں کی مالک لڑکی ہے جبکہ میں ایک دراز قد، گہرے بالوں والی لڑکی ہوں۔ ہم اسٹیج پر بہترین ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ہم دونوں کا خواب ہے کہ ایک دن ہم آرتھر ملر کے شہرۂ آفاق ڈرامے ”دی کروسبل“ میں اپنے فن کا جلوہ دکھائیں۔ وہ ڈراما جو سیلم کے انہی تاریک دنوں کو زندہ کرتا ہے۔

سیلم آنے والے اکثر لوگ ملر کے ان لازوال ڈراموں سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ انہیں پہلے سے ہی اندازہ ہے کہ جو کچھ ہوا، وہ کس قدر ہولناک تھا مگر جب وہ عجائب گھر کا دورہ کرتے ہیں تو وہ اندر تک دہل جاتے ہیں۔

سیاحوں کی تکلیف ان کے چہرے سے صاف جھلکتی ہے، جب وہ ہمارے بنائے ہوئے جیل کے نمونوں کو دیکھتے ہیں جہاں قیدیوں کو بے رحم ججوں کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا تھا جن کا فیصلہ ان کے مقدر کا فیصلہ ہوتا۔ ان کے پاس سیدھے کھڑے ہونے کی بھی بہ مشکل جگہ ہوتی۔ انہیں کھانا بھی تب ملتا تھا جب وہ اس کی ادائیگی کر پاتے اور ان کے خاندان کو نہ صرف ان بھیانک حالات کے لیے بھاری رقم ادا کرنا پڑتی تھی بلکہ پھانسی کے لیے جلاد کی خدمات کا معاوضہ بھی ان سے لیا جاتا تھا۔ یہ تاریخ کا حقیقتاً ایک تاریک باب ہے۔

ہالووین، سیلم کے لیے یقیناً موزوں ترین تہوار ہے مگر میں اس جشن پر متضاد جذبات رکھتی ہوں کیونکہ یہ خوشی کی محفلیں ظلم وستم اور بدی کی کئی تہوں پر رقص کرتی ہیں لیکن کبھی کبھی یہ بدی سطح پر ابھر آتی ہے۔

ایسا ہی اس سال ہوا جب میں نے ”جادوگرنی کا گولا“ توڑا۔

☆☆☆

اکتوبر کی ابتدا خوشگوار تھی، کم از کم میری اور لیلی کی نظر میں۔ جب عجائب گھر کو اطلاع ملی کہ ایک فلمی ٹیم ہالووین تھرلر کی شوٹنگ کے لیے سیلم آرہی ہے۔ یہ کوئی معمولی بجٹ والی ہارر فلم نہیں تھی بلکہ ایک پروفیشنل اور بڑی پروڈکشن تھی جو مشہور ستاروں کی ایک متاثر کن کاسٹ پر مشتمل تھی۔

ہماری خوشی اس وقت قدرے ماند پڑی جب ہماری منتظم انجیلا نے اپنے مخصوص کھردرے انداز میں پروڈکشن کے بارے میں مزید تفصیلات فراہم کیں۔

”یہ فلم ”نیرڈ“ خاندان کی ہوٹل کمپنی ”جیرڈ“ نے پروڈیوس کی ہے۔“ اس نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔



Scanned with CamScanner

''اس میں کیا غلط ہے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔
انجیلا نے چشمے کے اوپر سے میری طرف آنکھیں گھمائیں۔

''یہ کمپنی نیرو خاندان کی ملکیت ہے جو اپنے پُراسرار اور سائے میں چھپے ہوئے نام کی طرح ہیں۔ یہ لوگ یا تو شیطان ہیں یا پھر مکمل طور پر پاگل...... اور ان کا سربراہ جولیان بیمار اب بچی ہے جو اپنی بیٹی کے لیے اس فلم کی فنڈنگ کر رہا ہے تاکہ وہ اپنی غیر معمولی شہرت کے لیے اس میں اداکاری کرے۔ اب جبکہ اس کی عزیز بیٹی نے تیسری یا چوتھی بار ہالی ووڈ کے بڑے ہیرو سے شادی کی ہے تو اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اداکارہ بنے گی۔ اس نے کبھی بھی کوئی ڈراما کلاس نہیں لی اور اس کے دماغ میں صرف گھاس کے تنکے جتنی عقل ہے۔ لگتا نہیں کہ اتنی بڑی کاسٹ کی موجودگی بھی اس کی نااہلی کو چھپا پائے گی۔''

''پولی......! کیا تم پولی نیرو کی بات کر رہی ہو؟'' لیلی اور میں نے ایک دوسرے کی طرف پُرجوش نظروں سے دیکھا۔

پولی نیرو کا تازہ ترین شوہر کیون ڈیرو ے تھا۔ ہالی ووڈ کا بلاک بسٹر ہیرو جو باکس آفس کے دیو کی حیثیت رکھتا تھا۔

''کیا اس کا شوہر بھی اس فلم میں ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔
انجیلا کا چہرہ [illegible] ایسا سپاٹ ہو گیا جیسے دیوار پر لٹکے جج [illegible] کے پورٹریٹ کا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس نام کے جادو [illegible] سے ناواقف تھی۔

''مجھے تو لگتا ہے......!'' میں نے کہا۔ ''کہ اگر وہ اتنی ہی نااہل ہے تو کیون ڈیرو ے اپنی بیوی کے ساتھ فلم میں کام نہیں کرے گا، آخر اس کی ساکھ بھی اہم ہے۔''

انجیلا نے مجھے اس نظر سے دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو، ''کاش تم جانتی ہوتیں۔''

''جو کچھ میں نے سنا ہے، اس کے مطابق کیون خود بھی زوال کی طرف جا رہا ہے ورنہ وہ کیوں ایک بگڑی ہوئی لڑکی سے شادی کرتا جس کی شہرت صرف بے شمار جنسی تعلقات، بچکانہ حرکتیں اور تیز رفتار زندگی گزارنے میں ہے؟''

''شاید وہ اس سے محبت کرتا ہو۔'' لیلی نے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ پولی نیرو اپنے روبی ہم نام کی طرح بے پروا اور بے وفا ہے۔ اس سے شادی کرنا اس کا تیز ترین زوال ہوگا یا شاید اس سے بھی بدتر...... خونی انجام!''

انجیلا نے اپنی پُراسرار پیش گوئیوں سے ہمیں خاموش کر دیا اور پھر بے نیازی سے اپنے بکنگ شیڈول پر دوبارہ نظریں جمالیں۔

''خوب! یہ تو ایسا تھا جیسے کسی نے برفیلے پانی کی بالٹی ہم پر انڈیل دی ہو۔'' لیلی نے کہا، جب ہم دوپہر کے کھانے کے لیے چل پڑے تھے۔ ''وہ اتنی منفی کیوں ہے؟ فلمی عملہ تو ہمارے کاروبار کے لیے اچھا ہی ہوگا۔''

میں نے انجیلا کی سی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے تنبیہی انداز میں انگلی ہلائی اور باوقار لہجے میں کہا۔ ''سیلم ایک قومی تاریخی مقام ہے، آٹوگراف کے شکاریوں کا اڈا نہیں۔''

بدقسمتی سے میں ایک دراز قامت کی عورت کو جو تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی، نہیں دیکھ پائی۔ میرا بڑھا ہوا ہاتھ اس کے تحفے والے تھیلے سے ٹکرا گیا اور تھیلا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فٹ پاتھ پر جا گرا۔ ایک تکلیف دہ چرچراہٹ کی آواز ابھری۔ جب وہ تھیلا اٹھانے لگی تو اس میں سے کسی چیز کی لرزتی ہوئی کھنکھناہٹ سنائی دی۔

''میں بے حد معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے فوراً ندامت سے کہا۔

عورت نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ وہ ایک عجیب سی مخلوق معلوم ہو رہی تھی۔ دبلی پتلی، نکیلے نقوش والی اور اس کے بکھرے ہوئے سرمئی بال زنگ برنگی چادر پر بکھرے ہوئے تھے۔ اگر اس کا لباس سیاہ ہوتا تو وہ ہالووین کے لیے بالکل موزوں لگتی مگر اس کی آنکھوں میں دہشت کے بجائے افسوس کی جھلک تھی۔

صاف ظاہر تھا کہ میں نے کسی قیمتی چیز کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ سیلم میں عام طور پر سستے سیاحتی تحفے تو بک رہے تھے لیکن یہاں قیمتی کرسٹل اور چینی کے نوادرات بھی موجود تھے۔ میں یہ سوچ کر کانپ اٹھی کہ اگر یہ ایسی ہی کوئی چیز تھی تو مجھے بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔

گھبراہٹ کے عالم میں، میں نے تھیلے میں جھانکا۔ دوسرے ہی لمحے راحت کی ایک لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔ اندر صرف ایک چڑیل کی ٹوپی تھی۔ کوئی قیمتی شیشہ یا نازک فن پارہ نہیں تھا۔ ایسی ٹوپیاں تو سیلم کے ہر کونے میں عام دستیاب تھیں، بارہ ڈالر میں نیا تحفہ خریدا جا سکتا تھا۔

''میں فوراً اسے بدل دوں گی۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔



Scanned with CamScanner

"اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔" عورت نے دبی دبی آواز میں کہا۔ "نقصان ہو چکا ہے۔ بدی آزاد ہو چکی ہے، اب اسے واپس قید نہیں کیا جا سکتا۔"

اچانک وہ کراہی اور سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گئی۔

"کیا سب خیریت ہے؟" ایک گونج دار مردانہ آواز نے ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک نوجوان نرمی سے اس پریشان حال عورت کا بازو تھامے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ چونکہ وہ کوئی جواب نہ دے سکی اس لیے میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے غلطی سے ان کا تحفہ گرا دیا۔ میں نے معافی مانگ لی ہے اور تحفہ بدلنے کی پیشکش بھی کر دی ہے۔ مجھے زیادہ محتاط ہونا چاہیے تھا۔"

وہ دراز قد نوجوان سختی سے میری طرف متوجہ ہوا۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں، گھنے سیاہ بال اور تیکھے خدوخال اسے نہایت پرکشش بنا رہے تھے لیکن اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

"جی ہاں، آپ کو زیادہ محتاط ہونا چاہیے تھا۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ اس نے میرے نارنجی لباس پر ایک نظر ڈالی اور میرے کام کی جگہ کا بیج بھی بغور دیکھا۔ "آئندہ اپنے ڈرامائی انداز کو اپنے اسٹیج کے لیے بچا کر رکھنا۔"

پھر وہ واپس عورت کی طرف متوجہ ہوا مگر عورت نے نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹایا، خاموشی سے آگے بڑھی اور سڑک پر غائب ہو گئی۔ جاتے جاتے نوجوان نے ایک آخری تیز نظر میری طرف ڈالی اور پھر لمبے ڈگ بھرتا ہوا دور نکل گیا۔

نیلی اور میں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"خیر۔" میں نے کہا۔ "اب اگر کسی ٹھنڈے پانی کی بالٹی کا ذکر ہو تو امید ہے کہ دن کا باقی حصہ خوشگوار گزرے گا۔"

خوش قسمتی سے ہمارا لنچ پرسکون رہا۔ تازہ دم ہو کر ہم اپنی دوپہر کی شفٹ کے لیے واپس روانہ ہو گئے۔ جب ہم عمارت کے قریب پہنچے تو ایک معزز شخص دروازے پر کھڑا دکھائی دیا۔ اس کا مضبوط جبڑا اور نفاست سے سنورے ہوئے سرمئی بال اسے شاندار شخصیت کا مالک بنا رہے تھے۔ وہ ایک نفیس سوٹ اور اون کے اوورکوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی پوری شخصیت میں ایک بے مثال وقار جھلک رہا تھا۔

ہالووین کے ملبوسات اور موٹی جیکٹوں میں لپٹے سیاحوں کے ہجوم میں وہ خاصا غیر متعلق سا لگ رہا تھا پھر وہ مڑا اور ایک موڑ پر غائب ہو گیا۔

"وہ تو لگتا ہے جیسے "دی گاڈ فادر" سے نکل کر آیا ہو۔" نیلی نے ہنستے ہوئے کہا، جب ہم اندر داخل ہوئے۔

اینجیل نے فرنٹ ڈیسک کے پیچھے ہمیں دیکھا۔ "وہ ایک گاڈ فادر ہی ہے۔" اس نے کہا۔ "جولیان نیرو کا خاص آدمی اور جونیئرز کا مالیاتی مشیر بھی ہے۔ اس کا نام ونچیزو بیلینی ہے اور اس کی ذمے داری ہے کہ پوپی خوش رہے اور ڈیڈی کو اپنی سرمایہ کاری کا پورا فائدہ ملے۔"

"وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

اینجیل کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ "وہ محض ایک رسمی ملاقات کے لیے آیا تھا تاکہ مجھے اطلاع دے سکے کہ انہوں نے ہمارے بورڈ کے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے کہ ہالووین کی رات میوزیم کو لیز پر لیں گے، جیسے اس کی گاڈ ڈاٹر کے لیے بارز اور یادگاریں تباہ کرنا کافی نہیں تھا۔ اب وہ یہاں ایک نجی پارٹی رکھنا چاہتی ہے۔ غالباً ان کے خیال میں اگر وہ پرائیویٹ پارٹی میں رہے گی تو اپنی معمول کی منشیات گرفتاریوں سے بچی رہے گی۔"

نیلی خوشی سے چیخی۔ "ہمیں کیا، ڈیرو سے ملاقات کا موقع ملے گا!"

"اور دوسرے سارے ستاروں سے بھی۔" میں نے کہا اور پھر اینجیل کی طرف دیکھا جو آنکھیں مٹکاتے ہوئے طنزیہ انداز میں ہمیں دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہمیں اپنا ہنر پیش کرنے کا موقع ملے گا؟"

"یہ ایک پارٹی ہے، تم دونوں کا آڈیشن نہیں۔" اینجیل نے کہا۔ "بس ایک بینڈ ہوگا، رقص ہوگا۔ ہاں، وہ نمائش کا دورہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے دوبارہ آنکھیں گھمائیں۔ "شاید وہ تابوتوں والے کمروں میں کانگا لائن ڈانس کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک بھیانک جشن ہوگا اور اس کے بعد صفائی کا بھیانک کام۔"

"لیکن وہ اس سب کا خرچ برداشت کریں گے۔"

"ہمیں یہ یقینی بنانا ہوگا کہ کچھ نقصان نہ ہو اس لیے تم دونوں ڈیوٹی پر رہو گی۔ بس ان اسٹارز سے باتوں میں اتنی مشغول نہ ہو جانا کہ اپنی ذمے داری بھول جاؤ۔"

"ہم بالکل نہیں بھولیں گے۔" ہم دونوں نے خوشی

خوشی کہا۔

ہم اپنی کیوریٹر کی فکروں سے بالکل بے نیاز تھے۔ آخر روز روز تو ہالی ووڈ سیلم نہیں آتا۔

☆☆☆

اگلی صبح خبروں میں جولیان نیرو کی موت کی اطلاع آئی۔

ٹیلی اور میں نے ایک خود غرضانہ امید کی کہ ان کی موت جیرز پروڈکشن پر اثر انداز نہیں ہوگی اور نہ ہی پوپی کے پارٹی پلان پر۔

اینجیل نے بھی نیک خواہش ظاہر کی کہ چونکہ نیرو کی کوئی اور اولاد نہیں تھی، شاید پوپی اپنی دولت خرچ کرنے کے اور طریقے تلاش کرے۔

تاہم اس کی امیدیں چکنا چور ہوگئیں اور ہماری دعائیں قبول ہوگئیں۔

فلمی عملہ اپنی تمام وعدہ شدہ مشہور شخصیات کے ساتھ وقت پر پہنچا۔

اینجیل حسبِ توقع طنزیہ تھی۔

''برطانوی تھیٹر کی شاہی شخصیات اور راک اسٹارز...... یہ تو شان و شوکت اور مضحکہ خیزی کا امتزاج ہے۔ کوئی سمجھا سکتا ہے کہ ایک اداکارہ جیسے جوڈتھ گارڈنر کسی ''ڈیمولیشن'' نامی بینڈ کے گلوکار کے ساتھ کیوں کام کرے گی اور کوئی اربوں کا مالک راک اسٹار کیوں کسی فلم میں کام کرے گا؟''

''ڈیما جوڈتھ تو شاید پیسے کے لیے کر رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور برائن کیونڈش شاید احسان کے طور پر پوپی نیرو کی مدد کر رہا ہے۔ وہ اس کی سابقہ بیوی ہے لیکن اب بھی ان کے تعلقات اچھے سمجھے جاتے ہیں۔''

ٹیلی نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ تو فلم سیٹ کو بہت مزیدار بنا دے گا۔ برائن تو پوپی سے بھی زیادہ جنگلی ہے اور کہیں زیادہ مشہور بھی۔ آٹوگراف شکاریوں کے لیے زبردست موقع!''

اینجیل کا چہرہ مزید سرد ہوگیا۔

''ہمارا میوزیم خالی پڑا ہوگا۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''سیاح، اسٹارز کو دیکھنے میں مصروف ہوں گے۔''

لیکن اینجیل کی بدگمانیوں کے باوجود ہمارے ٹور گروپس کم نہیں ہوئے بلکہ پہلے سے زیادہ لوگ باہر موجود تھے۔ ہر کوئی شہر میں موجود بڑی شخصیات کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش میں تھا۔

پوپی کو اس کے رنگ برنگے نکیلے بالوں والے ہیئر اسٹائل کی وجہ سے پہچاننا آسان ثابت ہوا۔ کیون کو شناخت کرنا قدرے مشکل تھا کیونکہ وہ اکثر نوجوان لڑکیوں کے ہجوم کا شکار ہو جاتا تھا۔ اب اپنی موجودگی کو چھپانے کا عادی ہو چکا تھا لہٰذا وہ پس منظر میں رہتا اور اپنے ہلکے سنہری بالوں کو ایک ہیلمٹ سے چھپا لیتا تھا۔ یہ بھیس اتنا موثر تھا کہ ایک صبح جب میں کام پر پہنچی، وہ دو خوش لباس عورتوں کے ساتھ نکل رہا تھا (جو بعد میں ایونٹ پلانرز نکلیں) لیکن میں نے اسے پہچانا ہی نہیں۔

اینجیل نے خاص لطف لیتے ہوئے مجھے بتایا کہ میں کیا کچھ مس کر چکی ہوں۔ کیون نے اینجیل کو خاصا متاثر کیا تھا کیونکہ وہ اس کی ہر بات کو پوری توجہ سے سنتا اور سنجیدگی سے تسلیم کرتا تھا کہ آج کی ''کینسل کلچر'' والی دنیا میں سیلم کے سبق پہلے سے زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

اینجیل کی پیشگوئیوں کے برعکس وہ تمام متوقع ہنگامے جیسے دیواروں پر تحریریں، بدمعاشیاں اور منشیات کے اسکینڈل وغیرہ میں سے کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

شاید پوپی کے باپ کی موت نے اس کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا تھا یا پھر فلم کے لیے ہونے والی مشقتوں نے اس کے رویے کو سدھار دیا تھا۔

اینجیل نے جواب مکمل طور پر کیون کے سحر میں آ چکی تھی، نتیجہ نکالا کہ پوپی کے پچھلے برے برتاؤ کی وجہ اس کی بدقسمت شادی تھی جو کہ برائن کیونڈش نامی راک اسٹار سے ہوئی تھی جس کا طرزِ عمل اس کے بینڈ کے وحشیانہ نام سے میل کھاتا تھا۔

اکتیس تاریخ کو ایک سرد مگر صاف رات تھی اور سارا دن میوزیم بہت مصروف رہا تھا۔ کئی وزیٹرز نے کاسٹیوم پہنے ہوئے تھے جن میں سے زیادہ تر نے سستے ماسک اور ٹوپیاں پہنی تھیں لیکن کچھ لوگ نہایت شاندار اور مہنگے لباسوں میں بھی ملبوس تھے۔

میوزیم بند ہونے سے کچھ دیر پہلے ایک چمکیلے بھوت نے اسٹیج پر دوڑ لگا دی اور ڈرامائی انداز میں گھوم کر چمکنے لگا، جیسے چاندی کی کرسمس ٹری ہو پھر اس نے اپنی روشنی مدھم کی جو کہ غالباً اس کے کپڑوں میں چھپی وائرنگ سے جڑی ہوئی تھی اور اپنے چہرے پر موجود نقاب ہٹا دیا۔

یہ پوپی نیرو تھی۔ مسکراتے ہوئے وہ سیڑھیاں اتر کر لابی میں آ گئی۔ عین اسی لمحے جیسے جادو سے کیون ڈیرو نمودار ہوا۔ اس کے کندھوں پر ایک گرم اونی شال ڈالی اور

اسے باہر لے گیا۔ اس سے پہلے کہ آٹو گراف لینے والے مداح کچھ کر پاتے، وہ دونوں کیٹررز اور ڈیکوریٹرز کی بھیڑ کے درمیان غائب ہو گئے جو پارٹی کے لیے تیاری کرنے آئے تھے۔

اگرچہ اینجیل کا رویہ کیون ڈیروے کے لیے نرم ہو چکا تھا پھر بھی اس نے نیچے والی منزل پر کوئی تبدیلی کرنے سے سختی سے انکار کر دیا تھا اور پولی کی لاشوں والے تابوتوں کا کمرا سجانے کی درخواست کو بھی مسترد کر دیا تھا۔ صرف ہال کو پارٹی کے لیے سجانے کی اجازت دی گئی تھی۔

نیلی اور میں نے اپنی ڈیوٹی پوری کی، نیچے والے فلور کو چیک کیا اور سیڑھیوں کے دروازے کو تالا لگا کر ڈنر بریک کے لیے روانہ ہو گئیں۔

چونکہ پارٹی میں کھانے کا بندوبست تھا، ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک سینڈوچ کافی ہوگا اور اپنے پسندیدہ کافی شاپ کی طرف چل پڑیں۔

فٹ پاتھ بھرا ہوا تھا اور سیاہ چڑیلوں کی ٹوپیاں ہجوم میں اچھل رہی تھیں، جب لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا کر گزر رہے تھے۔ اسٹریٹ لائٹس سے چمگادڑیں اور ڈھانچے لٹک رہے تھے اور ہر طرف ہالووین کی رونق تھی۔ دکان کی کھڑکی کدوؤں کی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔

کافی ہاؤس بھرا ہوا تھا مگر ہم کسی طرح ایک کونے میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمارا کونا دو میزوں کے درمیان تھا۔ ایک پر دو درمیانی عمر کی جادوگرنیاں قابض تھیں اور دوسری کھڑکی کے پاس تھی جہاں ایک دبلی پتلی نوجوان لڑکی اپنے چمکدار سیاہ بالوں اور مونا لیزا جیسی مسکراہٹ کے ساتھ فوجی شان و شوکت میں ملبوس اپنے آئی پیڈ میں مصروف تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا، وہ اسی دن میوزیم میں بھی دیکھی گئی تھی۔

نیلی آرڈر دینے کاؤنٹر پر چلی گئی اور میں کرسی سے ٹیک لگا کر اردگرد میزوں پر ہونے والی گفتگو سنتی رہی۔ میرے پیچھے بیٹھی ہوئی چڑیل نے اپنی ٹوپی اتار کر اپنی ساتھی سے گفتگو شروع کر دی۔ اسی لمحے ایک مردانہ آواز فضا میں گونجی، اتنی بلند کہ سب نے سن لی۔ یہاں تک کہ وہ چڑیل بھی رک گئی۔

”پولی کہاں ہے؟“

”مجھے لگا وہ تمہارے ساتھ ہے؟“

جواب دینے والی گھنٹی جیسی سریلی آواز کھڑکی کے کونے میں بیٹھی مونا لیزا جیسی لڑکی کی تھی۔

میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ سامنے صرف ایک مضبوط جسامت والے آدمی کی پشت دکھائی دی جو پڑی پہنے ہوئے تھا لیکن اس کی آواز پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم سب کو اندازہ ہو گیا کہ یہ کیون ڈیروے تھا۔

”وہ مجھے قزاقوں کی دکان پر چھوڑ گئی تھی۔“ اس نے کہا۔

مونا لیزا جیسی مسکراہٹ والی لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کر کیا رہی ہے؟“

”پتا نہیں...... مگر آج کل وہ برائن کے ساتھ کافی گھل مل رہی ہے اور تم جانتی ہو جب وہ دونوں اکٹھے ہوتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ کیا وہ آج میوزیم میں تھا؟“

”وہ میوزیم میں نہیں تھا...... یا شاید کسی بھیس میں ہو کیونکہ آج بہت سے لوگ ماسک میں تھے اور جعلی ڈاڑھیاں بھی لگائی ہوئی تھیں تو پہچاننا مشکل تھا۔ شاید برائن بھی ان میں شامل ہو۔“

کیون نے تشویش سے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہیں وہ کسی شرارت کی منصوبہ بندی نہ کر رہے ہوں۔ وہ کافی ناراض تھی کہ منتظم نے نمائش کی چیزیں ہٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے شک ہے کہ آج میوزیم گھومنے کا اس کا کوئی خفیہ مقصد تھا۔“

مونا لیزا نے کہا۔ ”لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی؟ میں تو تقریباً میوزیم بند ہونے تک اس کے ساتھ تھی۔ صرف دس منٹ پہلے مجھے بینک جانا پڑ گیا تھا، تب تک وہ نمائش والی جگہ سے باہر آ چکی تھی اور ہال میں گھوم رہی تھی۔ اتنے کم وقت میں وہ کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی اور تم بھی تو میوزیم بند ہوتے وقت وہیں موجود تھے۔“

میں نے بے اختیار سانس کھینچی جس پر مونا لیزا نے میری طرف دیکھا۔

”معاف کیجیے گا۔“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”میں میوزیم میں کام کرتی ہوں، میں نے آپ کی باتیں سن لی ہیں۔ میں بتا سکتی ہوں کہ بند ہونے سے پہلے ان دس منٹوں میں کیا ہوا تھا۔ سب کچھ بالکل بے ضرر تھا۔ پولی اسٹیج پر گئی، اپنے لباس کی روشنیاں جلائیں اور اپنا نقاب ہٹا دیا تاکہ لوگ اسے پہچان سکیں۔ شائقین نے اسے بہت پسند کیا۔“

نیلی ہمارے آرڈر کے ساتھ واپس آئی تو اس نے گفتگو کا آخری حصہ سنا اور ٹرے ہاتھ میں لیے حیرت سے کیون ڈیروے کو گھورتے ہوئے رک گئی۔



Scanned with CamScanner

"یہ واقعی لاجواب تھا۔" اس نے خوشی سے کہا۔

"میں بھی وہیں کام کرتی ہوں۔" اس نے جلدی سے وضاحت کی، جب کیون نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہم مقدے کا منظر پیش کرتے ہیں۔" مونا لیزا جیسی مسکراہٹ والی لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں، بالکل۔ پوپی اور مجھے تمہاری پرفارمنس بہت پسند آئی تھی۔" اس نے اپنے ساتھی کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں واقعی یہ دورہ کرنا چاہیے اور ان لڑکیوں کو دیکھنا چاہیے۔ یہ بہت اچھا پرفارم کرتی ہیں۔"

کیون ڈیروے نے وہی مسکراہٹ دی جس میں امریکا بھر کے دل دھڑکتے تھے۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ اچھی ہوں گی۔" اس کی آنکھوں میں چمک آئی۔ "کیوں نہ تم مجھے بعد میں پارٹی میں ملو اور میں تمہیں اپنے ڈائریکٹر سے ملواؤں۔"

یہ ایک خوشگوار انداز میں جانے کے لیے کہنے جیسا تھا۔

نیلی اور میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی میز پر واپس آ کر خوشی خوشی اپنے کھانے میں مگن ہو گئیں۔ ہم نے اپنی کافی پی اور آنے والی رات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگیں۔

آج رات ہماری قسمت پر کوئی کالے بادل نہیں تھے لیکن ساتھ والی میز پر حالات کچھ اور تھے۔ مونا لیزا اور کیون ڈیروے بار بار مڑ کر دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم بھی چپ چپ کر ان کی میز کی طرف دیکھتے رہے لیکن جب تک ہماری کافی ختم ہوئی، میری جادوگری کی ٹوپی تحلیل ہو گئی اور پوپی ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔

جب ہم کافی ہاؤس سے نکلنے لگے تو ہم نے پوپی کے گارڈ فادر کو داخلی دروازے کی طرف آتے دیکھا۔ اس کے پیچھے وہی چڑیل بھی آ رہی تھی جس کی شیشے کی گیند میں نے توڑ دی تھی۔ اس کی رنگین چادر کی جگہ اب گہری نیلی چادر تھی جس نے اس کے لمبے اور زرد چہرے کو اور بھی ڈراؤنا بنا دیا تھا۔

میں نے ان کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ جلدی سے اندر گھس گئے اور سیدھا کیون ڈیروے اور اس کی ساتھی کی طرف بڑھے۔

"دلچسپ ہے۔" میں نے نیلی سے کہا، جب ہم میوزیم کی طرف واپس جا رہے تھے۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ یہ چڑیل کیون ڈیروے کے گروپ میں کیسے فٹ بیٹھتی ہے؟ سبھی کافی بے چین لگ رہے تھے۔"

"شاید پوپی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔" نیلی نے کہا۔

"اس کا شوہر بھی پریشان لگ رہا تھا جیسے پوپی کسی خوفناک شرارت کی منصوبہ بندی کر رہی ہو۔"

"ویسے اس کی شہرت بھی کچھ ایسی ہی ہے اور خود سے میوزیم کا دورہ کرنا اور وہ بھی بند ہونے سے عین پہلے، اسے نمائش والے کمروں تک رسائی دیتا ہے۔ شاید اس کے ارادے واقعی کچھ اور تھے۔ تاریخی نوادرات تو اس کے پسندیدہ شعبے میں نہیں آتے نا؟"

مجھے یکدم احساس ہوا کہ نیلی درست ہو سکتی ہے۔ کیا واقعی پوپی نے نمائش میں کوئی چھیڑ چھاڑ کی تھی یا پھر برائن کیونڈش نے چپکے سے آ کر کوئی احمقانہ جال بچھا دیا ہو اور پوپی نے سب کی توجہ اپنی طرف لگا دی ہو؟

نیلی اور میں نے میوزیم کے تہ خانے کی تلاشی لی لیکن ہم نے صرف یہ دیکھا کہ کوئی وہاں چھپا ہوا تو نہیں۔ ہم نے کوئی غیر معمولی چیز نہیں دیکھی، وہ سرسری تلاشی تھی۔

آخر کار میں نے نیلی کی طرف دیکھا۔

"ہمیں واپس جانا چاہیے اور پارٹی شروع ہونے سے پہلے تہ خانے کی نمائشوں کو چیک کر لینا چاہیے...... بس احتیاطاً۔"

میں نے گھڑی دیکھی، آٹھ بجنے میں بیس منٹ تھے۔ ہم نے قدم تیز کر دیے اور ہجوم کے درمیان راستہ بناتے ہوئے میوزیم کی طرف بھاگے۔ میوزیم کے باہر پہلے ہی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کون ہالووین منانے آیا تھا اور کون پارٹی میں شرکت کے لیے۔ اندر بھی ہجوم کم نہ تھا۔ سجاوٹ کا کام آخری مراحل پر تھا۔

اینجیلی کمرے کے بیچوں بیچ کسی ایونٹ پلانر سے بات کر رہی تھی۔ جب ہم نے اسے روکا تو وہ کچھ چڑچڑی نظر آئی لیکن ہمارے چہروں پر پریشانی دیکھ کر اس نے خود کو معذرت کے ساتھ الگ کیا۔ میں نے جلدی سے اسے اپنی تشویش بتائی۔ اینجیلی نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"جس نوجوان سے اس نے شادی کی ہے، وہ تو سمجھدار نظر آتا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اسے ہماری عمارت میں کوئی بدتمیزی کرنے دے گا۔"

میں نے آہ بھری۔ اینجیلی، کیون ڈیروے کی ظاہری دلکشی سے دھوکا کھا گئی تھی۔

"مگر تمہیں پوپی نیرو کی پچھلی حرکتیں یاد ہوں گی۔ وہ ہر بار مسئلے کھڑے کرتی رہی ہے۔ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ایک نظر ڈال لینا بہتر ہوگا؟"

”اچھا، ٹھیک ہے۔ اگر تمہیں واقعی ایسا لگتا ہے۔“ اینجیل نے اپنی جیب سے چابیاں نکال کر مجھے تھما دیں۔ ٹیلی میرے پیچھے پیچھے آرہی تھی اور ہم زینے کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

میں نے دروازہ کھولا اور ہم دبے قدموں اندر داخل ہوگئے۔ ہم آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگے، دائیں بائیں دیکھتے ہوئے، کسی غیر معمولی چیز کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیچے پہنچ کر ہم الگ ہوگئے۔ ٹیلی نمائش کی طویل دیوار کے ساتھ بنے تاریخی منظر ناموں کی طرف بڑھ گئی اور میں آثارِ قدیمہ کے نمائش والے حصے کی طرف گئی جو تابوتوں کی قطاروں کے قریب تھا۔ تمام اشیا اپنی جگہ درست لگ رہی تھیں۔ میں تھوڑی سی پرسکون ہوگئی۔

شاید کیون ڈیروے اپنی بیوی پر ضرورت سے زیادہ شک کر رہا تھا۔

تابوتوں کی قطار کے ساتھ چلتے ہوئے میں سوچنے لگی کہ کیا پولی کا گروپ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوگا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا دھیان بھٹک گیا تھا۔ میں نے پلکیں جھپکائیں اور واپس نمائش پر توجہ مرکوز کردی اور تب مجھے معلوم ہوا کہ پولی اپنے شوہر سے کافی ہاؤس میں ملنے کیوں نہیں آئی تھی۔

میں نے ہانپ کر سانس لی اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا جب میں نے دیکھا کہ قطار کے آخر میں کون سا منظر میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ آخری تابوت والے خانے میں کھڑی تھی اور سیاہ اور خوفناک پورٹریٹ ”جان ہاؤتھورن“ کو گھور رہی تھی لیکن اس کی اُبھری ہوئی مردہ آنکھیں کسی ایسے بھیانک منظر کو دیکھ رہی تھیں جو شاید صرف وہی دیکھ سکتی تھی۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر، پولی کی پارٹی اینجیل کی بدترین ڈراؤنی حقیقت بن گئی۔ پوری عمارت ایک کرائم سین میں تبدیل ہوگئی۔ پولیس نے کنٹرول سنبھال لیا اور مجھے جائے وقوعہ چھوڑنے کی اجازت مل گئی۔ اگرچہ میں لاش دیکھنے کے صدمے سے کچھ حد تک سنبھل گئی تھی مگر اب بھی میرے سینے میں ایک خالی پن کا احساس موجود تھا۔ حقیقت میں ایک لاش کا سامنا کرنا ایک سنسنی خیز ناول پڑھنے سے بالکل مختلف تجربہ تھا۔

اینجیل نے غیر متوقع ماں جیسی شفقت دکھائی اور مجھے اپنے دفتر میں لے آئی تاکہ میں کچھ سکون حاصل کرسکوں۔ اس نے بتایا کہ تفتیش کی نگرانی کرنے والے افسر کا نام ”ڈیکلیو روب اینڈ مز“ ہے اور چونکہ لاش میں نے دریافت کی تھی اس لیے وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ مجھے ہدایت دی گئی کہ وہ جب تک مجھ سے بات نہ کرلیں، میں دفتر میں ہی رکی رہوں۔

انتظار طویل ثابت ہوا لیکن اینجیل نے کچھ ہلکی پھلکی کھانے کی چیزیں فراہم کردیں۔ میں نے وقت گزارنے کے لیے ٹیلی کو میسیج کیے جسے سارجنٹ کے سوالات کے بعد گھر بھیج دیا گیا تھا۔ آخرکار جب ڈیکلیو میرے پاس آیا تو میں کافی بور ہوچکی تھی لیکن جب وہ آیا تو مجھے دوسرا جھٹکا لگا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے سڑک پر میری جادوگرنی کے ساتھ ناخوشگوار ملاقات کے بعد مجھے ڈانٹا تھا۔

”حال ہی میں کسی جادوگرنی کی گیند توڑی ہے؟“ وہ مسکراتے ہوئے اینجیل کے دفتر میں داخل ہوا۔

میں نے اسے غصّے سے گھورا۔

”بس بات شروع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ اس نے ہمدردی سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم صدمے میں ہو۔ کیا تم ٹھیک ہو؟“

اچانک میری سانس اٹکنے لگی اور میں رونے لگی۔

”وہ اتنی خوفناک لگ رہی تھی۔“ میں نے بہ مشکل کہا۔ ”وہ سیدھی کھڑی تھی جیسے پتھر کا مجسمہ۔ تابوتوں کے بیچ میں وہ یوں کیسے کھڑی رہ سکتی تھی؟“

اس نے نرمی سے جواب دیا۔ ”اس کے لباس کا پچھلا حصہ دیوار میں لگے ایک کیل پر اٹکا ہوا تھا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟ لباس تو بالکل ڈھیلا ڈھالا اور بوسیدہ تھا۔ اس میں تو اٹکنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔“

تفتیشی افسر نے سر ہلایا۔

”اس لباس کے نیچے ایک سختی سے بندھا ہوا جواہرات سے سجا ہوا کورسیٹ تھا۔ اسی میں ایل ای ڈی لائٹس بھی سی دی گئی تھیں۔ جب وہ اپنی کمربند میں لگا بٹن دباتی تو یہ روشنی لباس کے اوپر سے جھلکتی۔“

میں نے گہری سانس لی اور خود کو سنبھالا۔

”وہ اندر آئی کیسے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میوسمٹ تو بند تھا، میں نے خود تالا لگایا تھا۔“

”یہی ہم جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایمرجنسی ایگزٹ کا کیا؟ عجائب گھر کے پیچھے کی گلی کسی خفیہ داخلے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ کیا تم نے دیکھا تھا کہ دروازہ صحیح سے بند تھا؟“

”ہاں، سلاخ اپنی جگہ پر تھی۔ کوئی باہر سے اندر نہیں



Scanned with CamScanner

آسکتا تھا۔"

"اور تمہیں یقین ہے کہ جب تم گئیں تو وسمنٹ خالی تھا؟ کوئی واش روم میں تو نہیں چھپا ہوا تھا؟"

"نہیں، میں جانے سے پہلے ہمیشہ دروازوں کے نیچے دیکھتی ہوں کہ کوئی پیر تو نظر نہیں آرہے۔"

اس کی نیلی آنکھوں میں سنجیدگی اور بڑھ گئی۔

"جو چھوٹا سا جھاڑو رکھنے کا کمرا ہے، کیا تم نے وہاں جھانک کر دیکھا تھا؟"

میں پلکیں جھپکنے لگی۔

"ارے نہیں، ظاہر ہے نہیں۔ ہم کبھی وہاں نہیں دیکھتے۔ ویسے بھی کس کو اس جگہ کے بارے میں معلوم ہوگا؟"

"انہیں معلوم ہوسکتا ہے جو یہاں کی ترتیب سے واقف ہوں، یعنی وہ لوگ جو پارٹی کی منصوبہ بندی میں شامل تھے۔ کیون اور نیرو دونوں نے منصوبہ سازوں کے ساتھ یہاں کا دورہ کیا تھا۔"

میں شرمندگی سے سرخ پڑ گئی۔ وہ مجھے میری بے پروائی جتا رہا تھا۔

"لیکن وہ دونوں تو جا چکے تھے۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "کئی لوگوں نے انہیں عمارت سے نکلتے دیکھا تھا۔"

"مگر کوئی اور وہیں چھپ کر نیرو کو ایمرجنسی ایگزٹ سے اندر لا سکتا تھا۔"

"لیکن نیرو دوبارہ کیوں آئی؟"

اس نے مجھے سخت نظر سے دیکھا۔

"اسے شام ساڑھے چھ بجے ایک ٹیکسٹ میسیج موصول ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ عجائب گھر کے پیچھے آؤ۔"

"یہ میسیج کس نے بھیجا تھا؟"

"یہ ایک پری پیڈ فون سے آیا تھا۔ ایک اور بھی پرانا میسیج تھا جس میں کہا گیا تھا کہ بھیجنے والے کو دیر ہوسکتی ہے۔ وہ بعد میں وقت بتائے گا۔ کیون کا خیال ہے کہ یہ اس کی بیوی کے سابق شوہر نے بھیجا تھا۔"

"برائن کیونڈش؟"

"ہاں...... اور نیرو کی پی اے کا بھی یہی ماننا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ دونوں غلط ہوں مگر بہرحال یہ پیغام مشکوک ہے۔"

"پی اے...... وہ حسین سیاہ بالوں والی، جس کے چہرے پر مونالیزا جیسی پراسرار مسکراہٹ تھی؟"

"ہاں، اس کا نام مری وارن ہے۔ وہ نیرو کی کزن بھی ہے اور مسز وارن کی بیٹی ہے۔ وہی عورت جس سے تمہاری حال ہی میں تکرار ہوئی تھی۔"

میری بھویں حیرت سے اٹھ گئیں۔ میں حیران ہوئی لیکن تھوڑا غور کرنے پر مجھے ان دونوں خواتین میں ہلکی مشابہت نظر آگئی۔ میں نے سر ہلایا۔

"ہاں، جب تم نے ذکر کیا تو مجھے ماں کی جھلک بیٹی میں دکھائی دی۔ مری زیادہ خوبصورت ہے، پراسرار سی۔ اپنی ماں کی طرح غم میں ڈوبی ہوئی نہیں ہے۔"

"اس کی ماں نے ایک مشکل زندگی گزاری ہے۔ اس نے اپنے خاندان کی مرضی کے خلاف سیلم کے ایک غریب خاندان میں شادی کی اور پھر......"

"اس وقت تو وہ مکمل طور پر ٹوٹ گئی تھی جب اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ پہلے بھی دماغی عارضوں کا شکار رہی ہے اور برسوں سے اپنے بھائی پر انحصار کر رہی ہے۔"

"اوہ، تو اسی لیے اس کی بیٹی پوپی کے لیے کام کرتی تھی؟"

"اصل میں نہیں۔ غریب رشتے دار ہونا مری کے لیے کبھی رکاوٹ نہیں بنا، وہ کافی ہنرمند ہے۔ اس کے پاس ماموں جیسا کاروباری ذہن ہے۔ اپنے موجودہ کام سے پہلے وہ ہالی ووڈ کی مشہور شخصیات کی پسندیدہ ایجنٹ تھی۔ وہ آج تمہارے میوزیم میں بھی موجود تھی۔"

"ہاں، میں نے اسے وہاں دیکھا تھا۔ اوہ، کیا وہ وہی ہوسکتی ہے جو پیچھے رکی اور جھاڑو رکھنے والی الماری میں چھپی رہی؟" میں نے پوچھا۔

ڈیٹکلیو ایڈمز نے اپنا سر ہلایا۔

"نہیں۔ وہ جلدی چلی گئی تھی تاکہ بینک جا سکے۔ رسید بتاتی ہے کہ وہ پانچ بج کر پچپن منٹ پر بینک پہنچ گئی تھی۔ اس کے فوراً بعد وہ [illegible] حصے والی دکان میں گئی۔ تمہیں کیوں لگتا ہے کہ وہ ملوث ہوسکتی ہے؟"

"اگر وہ پوپی کی کزن ہے تو شاید بڑی وراثت میں حصہ لینے کی امید ہو؟"

"نہیں، اسے کچھ نہیں ملا۔ جولیان نیرو کافی عرصے سے بیمار تھا اور اس نے اپنی بیٹی کے ساتھ مشترکہ اکاؤنٹ کھول رکھا تھا تاکہ وراثتی قانونی کارروائی سے بچا جا سکے۔ اس کی موت کے بعد ساری جائداد بیٹی کے نام ہو گئی تھی۔"

"تو پھر کیون ڈیروے شاید اب بیٹی کے خزانے پر ہاتھ صاف کرے گا؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ممکن ہے۔ کیا تم نے اسے اس شام دیکھا تھا؟"

digestlibrary.com

"ہاں، وہ چھ بجے میوزیم سے پوپی کو لے گیا تھا اور میں نے اسے تقریباً سات بجے مری کے ساتھ کافی ہاؤس میں دیکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس ایک گھنٹے کے درمیان وہ کہاں رہا۔"

"وہ اور پوپی مری سے تحفے کی دکان پر ملے تھے۔ مری نے ان کی قزاق کے مجسمے کے سامنے تصویر کھینچی تھی۔ یہ تصویر اس کے موبائل میں ہے اور یہ چھ بج کر بائیس منٹ پر لی گئی تھی۔ ڈیرو سے دکان میں گیا تھا لیکن پوپی کو ساتھ والے پالتو جانوروں کی دکان میں زیادہ دلچسپی تھی۔ مری نے ان دونوں کو خریداری کرنے چھوڑ دیا اور آگے جا کر کافی ہاؤس میں میز سنبھالنے چلی گئی۔"

"تو پھر پوپی کب غائب ہوئی؟"

"جب ڈیرو سے قزاقوں کی دکان میں تھا۔ وہ پوپی کو تلاش کرنے کے لیے پالتو جانوروں کی دکان میں گیا لیکن وہ وہاں نہیں گئی تھی۔ لگتا ہے جیسے ہی کوئی پیغام موصول ہوا، وہ وہاں سے چلی گئی۔"

"وہ پیغام اس کے قاتل نے بھیجا تھا۔" میں نے سرگوشی کی اور لرز گئی۔ یہ ایک خوفناک خیال تھا۔

میں کافی تھکی ہوئی تھی تو میرا تفتیش کار یکایک مہربان ہو گیا اور مجھے تاکید کی کہ اگر کچھ اور یاد آئے تو اسے فون کروں۔

☆☆☆

اگلی صبح سرد اور خاموش طلوع ہوئی جیسے پچھلی رات کی محفلوں نے پورے شہر کی توانائی نچوڑ لی ہو۔ رات کو جو سجاوٹیں دلکش لگتی تھیں، دن کے اجالے میں پھیکی اور مدھم نظر آ رہی تھیں لیکن جیسے ہی تابوتوں والے سیل میں لاش کی خبر پھیلی، ایک دبی دبی سنسنی پورے ماحول میں چھا گئی۔ کیا سیلم میں دوبارہ جادو ٹونا شروع ہو گیا تھا؟ کسی بدنیت روح نے ہالووین کی تقریبات میں رخنہ ڈال دیا تھا؟

فرانزک ٹیموں کے اپنا کام مکمل کرنے تک میوزیم بند رہا لیکن اگلے ہفتے ہمیں دوبارہ کھولنے کی اجازت مل گئی۔ میں دوبارہ اپنا کردار ادا کرنے کے لیے پرجوش تھی لیکن بیسمنٹ میں ڈیوٹی دینے کے خیال سے تھوڑی گھبرائی ہوئی تھی۔

نیلی نے جو میری حالت سمجھتی تھی، اصرار کیا کہ وہ تابوت والے حصے کی نگرانی کرے گی اور میں دوسرے مناظر سنبھال لوں۔

کام پر پہلے دن میوزیم لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ قتل کی خبر نے ہجوم اکٹھا کر دیا تھا اور ان سب میں کچھ سنسنی کے متلاشی بھی تھے۔

"اوہ خدایا۔" نیلی نے شفٹ ختم ہونے پر کہا۔ "کاش! انجیلا جان ہیتھورن کو منظر سے ہٹا دیتی۔ کلک، کلک، کلک۔ وہ لوگ پہلے تابوت کی تصویر لیتے ہیں پھر فوراً جان ہاتھورن کی، جیسے اسی نے پوپی نیرو کا قتل کروایا ہو۔"

میں اپنے مہمانوں کو بار بار یاد دلاتی کہ فلیش فوٹوگرافی منع ہے۔ آخر کوئی ہوش مند انسان کسی تصویر کی تصویر کیوں لینا چاہے گا؟

نیلی نے اپنی ٹوپی اتاری اور سیڑھیوں کی طرف بڑھی مگر میں اچانک رک گئی۔ میرے ذہن میں ایک شاندار خیال آیا۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے؟ میں نے فوراً اپنا آئی پیڈ نکالا اور نیلی کو واپس بلایا۔

"اپنا فون مجھے دو۔" میں نے کہا۔ "میں ایک چیز آزمانا چاہتی ہوں۔"

☆☆☆

ڈیٹیکٹیو روب ایڈمز میری فون کال پر خوش ہوئے حالانکہ جو مشورہ میں نے اسے دیا، اس پر وہ پہلے ہی غور کر چکا تھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے نصیحت کی کہ میں اس کا ذکر کسی اور سے نہ کروں کیونکہ قاتل ابھی تک آزاد گھوم رہا تھا۔

اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے اشارہ دیا کہ جب کیس مکمل ہو جائے گا تو شاید وہ مجھ سے رات کے کھانے پر ملاقات کرے گا۔

جب میں نے نیلی کو یہ خبر سنائی تو وہ ہنس دی۔

"اب تو تم دونوں ایک دوسرے کو پہلے ناموں سے بلانے لگے ہو۔" وہ شرارت سے ہنسی۔ "لگتا ہے تم نے اسے متاثر کر دیا جب اس نے تمہیں ڈانٹا تھا۔"

☆☆☆

تین دن بعد کیون کو اس کی بیوی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور مری وارن کو اس کی معاونت کے الزام میں۔

انجیلا حیران تھی لیکن نیلی اور میں بالکل حیران نہیں ہوئے۔ ہم جانتے تھے کہ کیون نے اپنا جعلی عذر کیسے تیار کیا تھا۔

اب میں بے چینی سے اس خوبصورت نیلی آنکھوں والے ڈیٹیکٹیو سے ملاقات کی منتظر تھی...... اور صرف آنکھوں کی وجہ سے نہیں...... میں پوری کہانی سننے کے

لیے بے تاب تھی۔

کیس مکمل کرنے میں شاید کافی وقت لگ گیا تھا کیونکہ پورا ایک مہینا گزر گیا تب جا کر روب نے مجھ سے رابطہ کیا۔ اس وقت تک میری کیفیت تجسس اور خفگی کے درمیان جھول رہی تھی مگر آخرکار تجسس غالب آیا اور ہم اگلے ہفتے ملنے کا وعدہ کر بیٹھے۔

ہم نے ایک ایسا ریسٹورنٹ منتخب کیا جو سمندری اور زمینی دونوں اقسام کے کھانے پیش کرتا تھا اور جلد ہی ہم ایک ایسی میز پر بیٹھے تھے جہاں بندرگاہ کا منظر کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔

اندھیرے پانی پر کشتیوں کی روشنی چمک رہی تھی اور پانی چاندی کی طرح دمک رہا تھا۔ ہم نے مشروبات منگوائے، ایک سمندری خوراک کی پلیٹر شیئر کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔

روب نے خاموشی توڑتے ہوئے وہ بات چھیڑ دی جس کی مجھے توقع تھی۔

"تمہاری ذہانت قابلِ تعریف ہے۔ تم نے اندازہ لگا لیا کہ کس طرح کیون نے اپنی بیوی کی موجودگی کا فریب رچایا کہ پوپی پائریٹ اسٹور میں زندہ موجود ہے جبکہ حقیقت میں وہ پہلے ہی مردہ حالت میں تابوت میں بند تھی۔"

میں زیادہ فخر ظاہر کیے بغیر مسکرائی۔

"شیلی اور میں نے یہ تجربہ اس کے موبائل فون اور میرے آئی پیڈ پر کیا تھا اور یہ بالکل ویسا ہی کام کر گیا۔"

میرا ساتھی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "بہت چالاکی ہے۔"

"مری نے وہ تصویر پہلے ہی لے لی تھی جب وہ اور پوپی میوزیم آئی تھیں پھر اس نے اسے اپنے آئی پیڈ پر بھیج دیا۔ موبائل سے فوٹو ڈیلیٹ کر دی اور بعد میں جب وہ اور کیون دوبارہ پائریٹ اسٹور آئے تو تصویر کی تصویر لی۔ اس کے بعد کیون نے دکھاوے کے طور پر اپنی بیوی کو [illegible] کی اور مری سے کافی شاپ میں ملا جہاں دونوں نے مزید ایک ڈراما رچایا۔"

"جن میں سے ایک تماشائی میں تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ تو میں سمجھ گئی لیکن یہ اب تک واضح نہیں ہوا کہ پوپی کو دوبارہ اندر کیسے لایا گیا؟ اگر مری میوزیم سے بینک جانے کے بہانے نکلی تھی اور پوپی، کیون کے ساتھ گئی تھی تو وہ اندر کیسے پہنچے؟ کیا کوئی تیسرا شخص بھی شامل تھا؟"

"نہیں۔" روب نے کہا۔ "مری خود ہی جھاڑو والے کمرے میں چھپ گئی تھی، وہ کبھی بینک گئی ہی نہیں۔ کیون نے اس کا اے ٹی ایم کارڈ استعمال کر کے پیسے نکالے پھر پوپی سے ملا اور دونوں کو میوزیم کے پچھلے دروازے سے اندر مری نے ہی دوبارہ داخل کروایا۔ ایمرجنسی ایگزٹ کے ذریعے اندر داخل ہونے کے بعد کیون نے پوپی کا گلا گھونٹ دیا اور اس کی لاش کو تابوت نما سیل میں رکھ دیا۔"

"تو وہ ٹیکسٹ میسج محض ایک چال تھی؟"

"ہاں۔ مری نے پے ایز یو گو فون استعمال کیا تاکہ پہلا پیغام پوپی کے موبائل پر بھیجا جا سکے اور تھریڈ کو کھلا چھوڑا تاکہ وہ پیغام جو ساڑھے چھ بجے بھیجا گیا، ایسا لگے کہ وہ بھی پڑھا گیا ہے۔ پھر وہ ایمرجنسی ایگزٹ سے نکل گئے اور لاش کو ایک بند کمرے میں چھوڑتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ انہوں نے صحیح اندازہ لگایا تھا کہ اندھیری رات اور بھیڑ بھاڑ والی سڑکیں یہ چھپا لیں گی کہ پوپی ان کے ساتھ نہیں ہے لیکن وہ اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکے کہ پوپی کے گاڈ فادر نے ایک باڈی گارڈ کو تعینات کیا تھا تاکہ وہ چپکے سے اس کی نگرانی کرے۔ اگرچہ کیون کے میوزیم سے پوپی کو لے جانے کے بعد وہ آدمی ان کو کھو بیٹھا لیکن وہ شام کے ابتدائی حصے میں انہیں دیکھ چکا تھا اور اس نے مری کو پانچ بجے نوادرات کی دکان کے باہر اصلی تصویر لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب ہم نے کیون کے بہانے پر سوالات اٹھانے شروع کیے تو وہ مرکزی مشتبہ بن گیا پھر یہ صرف ہمارے ماہرینِ تکنیک اور فارنزک ٹیمز کا کام تھا کہ وہ ثبوت حاصل کریں جو ہمیں اس کے خلاف مضبوط کیس بنانے کے لیے چاہیے تھے۔"

"اور کیا تمہیں وہ ثبوت ملے؟"

"اوہ ہاں، لیکن ہمیں اعتراف بھی مل گیا۔ جیسے ہی ڈاروے کو اندازہ ہوا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے، وہ پنجرے کا پرندہ بن گیا۔ پولیس کی حراست وینس ٹیکنیکی کی طرز کے "انصاف" کا سامنا کرنے سے کہیں بہتر تھی۔ پوپی کا گاڈ فادر اپنی ذمے داریوں کو بہت سنجیدگی سے لیتا ہے۔"

ہم خاموش ہو گئے [illegible] کہ جب پلیٹر ہمارے سامنے آئی۔

پھر کھانے کی مزیدار اقسام پر خوشی کا اظہار کرتے ہم نے چند لمحے ان نعمتوں کا لطف اٹھانے میں صرف کیے۔ آخرکار میں نے وہ سوال کیا جو کئی دنوں سے مجھے پریشان کر رہا تھا۔

"کیون نے مری کو کیسے راضی کیا کہ وہ اس کی مدد کرے...... اسے کیا فائدہ ملا...... کیا وہ یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ

اس سے محبت کرتا ہے؟''

میرے ساتھی کی نیلی آنکھوں میں سختی آ گئی اور مجھے اس کے لہجے میں تلخی محسوس ہوئی۔ اس نے جواب دیا۔

''وہ اس سے محبت کرتا تھا، بہت پہلے سے، جب اس نے پوپی سے شادی بھی نہیں کی تھی۔ وہ ہالی ووڈ میں ملے تھے جب مرسی اس کی فلموں میں کام کر رہی تھی۔ وہی اس منصوبے کی اصل محرک تھی۔ اس نے اسے قائل کیا کہ اگر وہ صحیح چال چلیں تو بہت بڑی دولت ہاتھ لگ سکتی ہے۔ مرسی نے ہی پوپی سے اس کا تعارف کروایا اور کیون نے دل لبھانے کا مظاہرہ کیا۔ پوپی سے شادی کرنا اس کے لیے آسان تھا لیکن وہ ہمیشہ مرسی کے زیرِ اثر رہا۔ یہ ہے جادوگری کی ایک مثال۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''تمہاری وہ خاتون جو مونا لیزا جیسی مسکراہٹ رکھتی تھی، دراصل ایک نہایت بدذات عورت تھی۔''

میں حیران رہ گئی...... اور مایوس بھی۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد ہالی ووڈ کے ہیرو کے بارے میں میری رومانوی سوچ چکنا چور ہو چکی تھی۔ کیون ایک چالباز عورت کا کھلونا بن گیا تھا۔

مجھے خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے روب کی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ وہ ہنسا اور بولا۔

''کیا تم اس جھینگے کو نہیں کھاؤ گی جو تم نے کانٹے کے کنارے پر رکھ چھوڑا ہے؟''

میں چونکی، جھینگا نگلا اور کہا۔ ''پوپی نیرو اپنی بدنام شہرت کے باوجود اپنے کزن اور شوہر کے مقابلے میں معصوم نکلی۔''

''میں متفق ہوں۔'' روب نے کہا۔ ''اس نے تو ان کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں بھی مدد دی۔ وہ میوزیم اسٹیج پر جو مظاہرہ ہوا، وہ دراصل مرسی کو موقع دینے کے لیے تھا تاکہ وہ چپکے سے نیچے اتر کر الماری میں چھپ سکے۔''

میں حیرت سے چیخی۔ ''کیا واقعی...... وہ ایسا کرنے پر راضی کیسے ہو گئی؟''

''کیونکہ وہ واقعی اس بات سے ناراض تھی کہ [illegible] منتظم نے انہیں [illegible] پرستش بنانے کی اجازت نہیں دی۔ کیون نے اسی بات کا فائدہ اٹھایا۔ یہ پوپی کی شوخی نہیں تھی کہ وہ ایسا اسٹنٹ کر رہی تھی بلکہ اصل سازش کیون اور مرسی کی تھی۔''

''پوپی کو قائل کر لیا گیا تھا کہ وہ واقعی لاشوں کو ان تابوت نما خانوں میں رکھنے والے ہیں۔''

''لیکن اسے حقیقت کا یقین دلانے کے لیے کچھ ٹھوس ثبوت تو درکار ہوتے نا؟''

روب نے نظریں جھکا لیں اور مجھے لگا جیسے اس کے چہرے پر شرمندگی چھا گئی ہو۔

''انہوں نے اسے ثبوت دکھایا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''کیون کے پاس برہنہ پھولی ہوئی گڑیاؤں سے بھرا بیگ تھا۔ اس نے بعد میں وہ بیگ برائن کیونڈش کے ٹریلر میں رکھ دیا۔ شکر ہے کہ ہم نے وہ ڈھونڈ لیا اور بطور ثبوت رکھ لیا۔ سوچ کر ہی ڈر لگتا ہے کہ وہ راک اسٹار ان کا کیا کرتا۔''

اینجیل کو پلاسٹک کی برہنہ گڑیاؤں کی قطار کے سامنے دیکھنے کا تصور کر کے میری ہنسی چھوٹنے لگی مگر یہ خیال جلد ہی سنجیدگی میں بدل گیا۔ یہ بالکل مضحکہ خیز نہیں تھا، یہ ایک شیطانی منصوبہ تھا۔ اچانک مجھے اپنی اداس زرد چہرے والی چڑیل یاد آ گئی جس کا پارسل ٹوٹ گیا تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ مسز واوارن پریشانی میں گھل رہی تھی۔ وہ جانتی ہوگی کہ اس کی بیٹی کے دل میں کھوٹ ہے۔

''بیچاری مسز وا!'' میں نے آہ بھری۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اس سازش سے واقف تھی؟''

''نہیں، لیکن اسے شک تھا کہ اس کی بیٹی اور کیون کسی خطرناک ساز باز میں شریک ہیں۔ وہ بے بس تھی، کچھ کر نہیں سکتی تھی۔''

''مجھے ہمیشہ اس کا جادوگرنیوں کا گولا توڑنے کا افسوس رہے گا۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔ ''وہ ٹھیک کہتی تھی، ہے نا؟ جب ایک بار برائی کو آزاد کر دیا جائے تو اسے دوبارہ قید کرنا ممکن نہیں ہوتا۔''

میرے ساتھی نے مجھے گہری نظر سے دیکھا۔

''اوہ نہیں، واقعی تم یہ تو نہیں مانتیں کہ پوپی بچ جاتی اگر تم نے مسز وا کا ہاتھ نہ جھٹکا ہوتا؟ شیشے کا ایک گولا مرسی کو اس کا منصوبہ مکمل کرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ وہ چڑیلوں والی گیند تو محض ایک علامت تھی۔''

میں نے اپنا گلاس اٹھایا اور سکون سے مشروب کا گھونٹ بھرا۔

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا اور گلاس کے پیچھے سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں پھیلائیں۔ ''لیکن اگر تم سیلم میں رہتے ہو تو جادو پر تھوڑا بہت یقین رکھنا ہی پڑتا ہے۔''

×××

# تاوان

مہوش اسد شیخ

خوبصورت گھر کا خواب ہر کوئی دیکھتا ہے... اور اسے بڑے مان سے سجاتا اور سنوارتا ہے... ایسے میں ان کے سکون میں کوئی خلل پیدا کرے تو یہ انہیں قابلِ قبول نہیں ہوتا... ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ خوبصورت گھر لے کر وہ دونوں بہت خوش تھے... مگر کوئی تھا جو ان کے سکون کو غارت کر رہا تھا... اس کی پھیلائی بدنظمی دکھائی تو دیتی تھی مگر وہ خود نظروں سے اوجھل تھا... اسی دوران جھنجلاہٹ میں اُن سے ایک غلطی ہو گئی... جس کا تاوان انہیں ادا کرنا ہی تھا...

ماورائی مخلوق کی ایک جوڑے کے خلاف کارروائی

"لسٹ بنالی آپ نے، کس کس کو دعوت دینا ہے؟" نبیلہ چائے کی ٹرے لیے لاؤنج میں داخل ہوئی جہاں اشعر بیٹھا حساب کتاب کر رہا تھا۔

"ہاں، وہی کر رہا تھا۔ تم ایک بار فہرست پر نگاہ ڈال لو پھر میں کھانے وغیرہ کا حساب دیکھ لیتا ہوں۔" اشعر نے میز پر رکھے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔

نبیلہ نے ٹرے میز پر رکھ کر چائے کا کپ شوہر کو تھمادیا جسے شکریے کے ساتھ تھام لیا گیا۔ نبیلہ اب صوفے

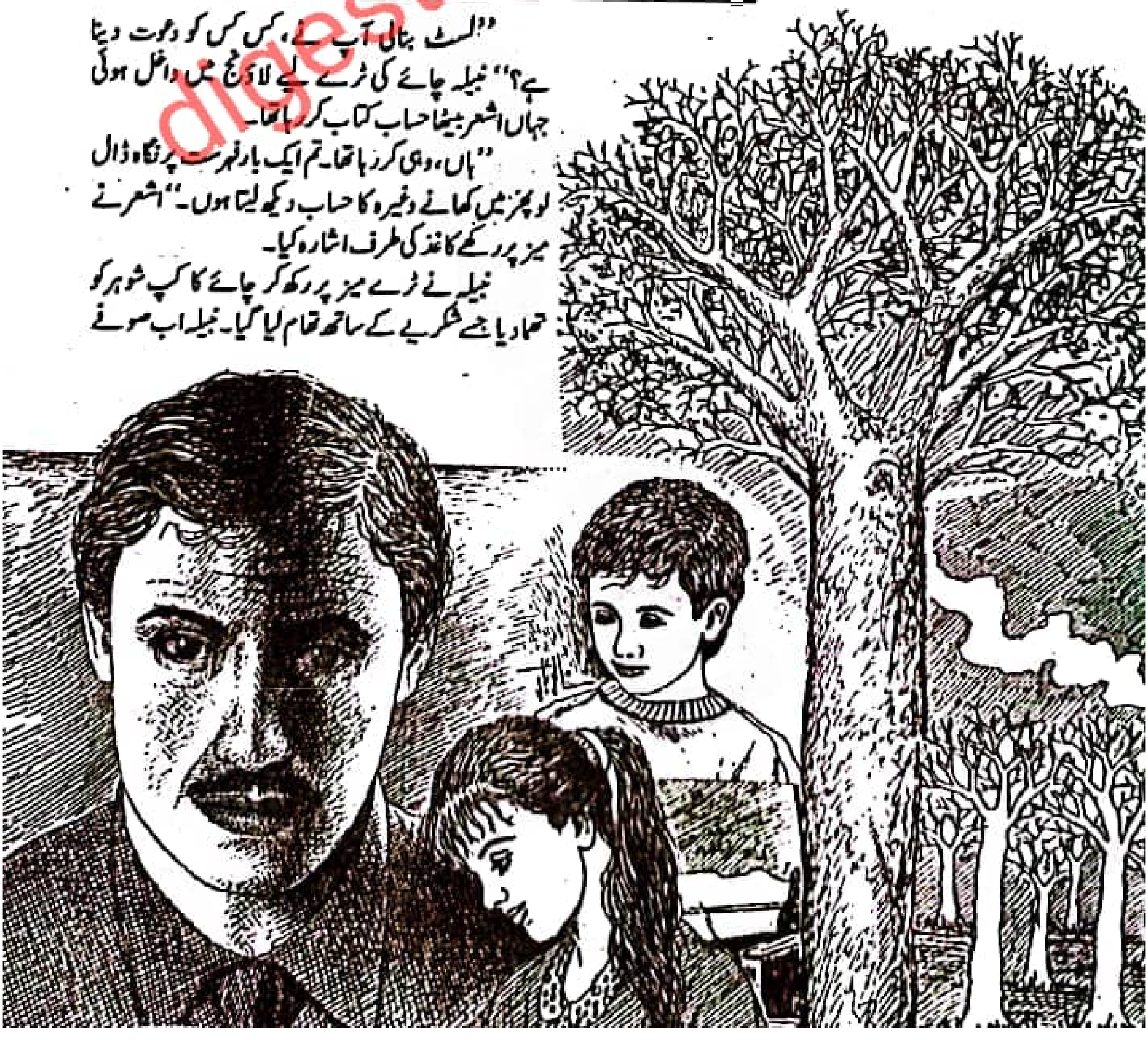

digest library.com

Scanned with CamScanner

پڑ بیٹھی فہرست دیکھ رہی تھی۔

''ارے آپ نے قاری صاحب کا نام تو لکھا ہی نہیں۔'' اس نے حیرت سے اشعر کی طرف دیکھا۔

''اوہ...... لکھنا بھول گیا۔ ویسے میرے ذہن میں ہے کہ انہیں بطورِ خاص دعوت دینا ہے۔'' اشعر نے چائے کی چسکی بھری۔

''ان کی آمد ہمارے نئے گھر اور ہمارے لیے باعثِ رحمت و برکت ہوگی۔'' نبیلہ کا لہجہ عقیدت سے بھرپور تھا، اشعر نے بھی اس کی تائید میں سر ہلایا۔

☆☆☆

سارا خاندان ''اشعر ولا'' میں مدعو تھا۔ سجاوٹ سے لے کر کھانے تک، سارا انتظام بہت زبردست کیا گیا تھا۔ پہلے قاری صاحب اور ان کے شاگرد بیٹھے قرآن پڑھتے رہے پھر دعا میں سارا خاندان شامل رہا۔ کھانے کے بعد باری باری سبھی رخصت ہونے لگے۔

''بھئی اشعر میاں! گھر نہیں، محل ہے یہ تو...... اللہ پاک تمہارے لیے مبارک ثابت کرے اس گھر کو...... محبت و خوشیوں کی خوشبو سے مہکتا رہے یہ آشیانہ۔'' قاری صاحب نے اشعر کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے دعائیہ کلمات ادا کیے۔

''آپ کی دعاؤں کا سایہ ہمیشہ سلامت رہے ہمارے سر پر...... اور کیا چاہیے۔'' اشعر نے تعظیماً سر جھکایا۔

''آیئے، آپ کو سارا گھر دکھاتا ہوں۔'' وہ قاری صاحب کو لیے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

''ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ...... الحمدللہ!'' قاری صاحب کی زبان پر مسلسل ورد جاری تھا۔ وہ گھر دیکھتے اور سراہتے جا رہے تھے۔ پچھلے، آخری کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ انہوں نے عجیب نگاہوں سے در و دیوار کو دیکھا۔ لب تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے ہوئے کمرے کی کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے اور بغور باہر کا منظر دیکھنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں ان کے کھنچے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

''کیا ہوا قاری صاحب؟'' اشعر نے فکرمندی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں برخوردار!'' وہ دھیرے سے مسکرا دیے اور اس کی پشت سہلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لیے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

''آج تو بہت تھک گئی۔'' نبیلہ نے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بھئی تم کیوں تھک گئیں؟ کھانا باہر سے آرڈر کیا گیا تھا، گھر میں ملازمہ فل ٹائم تمہاری مدد کے لیے موجود تھی۔ وہ بھاگ بھاگ کر برتن لگاتی، اٹھاتی رہی۔ تم نے کیا کیا ہے؟'' اشعر نے بیوی کو مصنوعی گھوری سے نوازتے ہوئے کہا۔

''آپ مردوں کی نظر میں تو ہم عورتیں کچھ کرتی ہی نہیں ہیں۔'' وہ منہ بسورتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ جیولری اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی، الماری سے کپڑے لے کر واش روم میں گھس گئی۔ تبھی باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ سمجھی اشعر کمرے میں آیا ہے۔ کپڑے بدل کر باہر نکلی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ کندھے اُچکا کر بیڈ پر آ بیٹھی۔ ابھی لیٹنے کے لیے تکیہ ہی درست کر رہی تھی کہ ایسا لگا جیسے کوئی بیڈ پر اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا ہے۔ فوراً سے پیشتر گردن گھما کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ وہم سمجھ کر سر جھٹکنے ہی لگی تھی کہ نظر گدے پر جا پڑی۔ گدا ایسے دبا ہوا تھا جیسے ابھی تک وہاں کوئی براجمان ہے۔

نبیلہ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ آنکھیں مکمل وا کیے وہ دبا ہوا حصہ دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہاں سے اٹھ جائے لیکن جسم جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔ اچانک اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ مڑ کر دیکھنا چاہتی تھی۔ معاً کسی نے گدے پر کودنا شروع کر دیا جیسے بچوں کی عادت ہوتی ہے۔ وہ گھبرا کر بیڈ سے یوں اتری جیسے وہاں یکدم کانٹے اُگ آئے ہوں۔

''لیجیے بیگم صاحبہ! آپ کے لیے گرما گرم الائچی والی چائے۔'' معاً اشعر کمرے میں داخل ہوا۔

نبیلہ نے ہراساں نگاہوں سے بیڈ کا جائزہ لیا۔ اب سب کچھ نارمل تھا۔ ایک طائرانہ نگاہ سارے کمرے پر ڈالی۔ اب وہاں کسی کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔ کچھ دیر پہلے والی پراسرار کیفیت مٹ چکی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اشعر نے نبیلہ کی زرد پڑتی رنگت دیکھی تو پریشان ہو گیا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ اشعر کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''شاید کچھ زیادہ تھک گئی ہو۔ چلو، چائے پی لو۔ طبیعت بہتر ہو جائے گی۔ کہو تو کوئی دوا دے دوں؟'' اشعر نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

''نہیں۔'' وہ محض سر ہلا سکی اور جھجکتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ اشعر اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ دے کر خود بھی ساتھ بیٹھ گیا۔

"ویسے بڑی ناشکری ہو۔ بندہ چائے بنا کر لایا، تم سے شکریہ کے دو بول نہ بولے گئے...... تعریف تو دور کی بات ہے۔" اشعر کا لہجہ شرارت سے بھرپور تھا۔

نبیلہ ہڑبڑا کر اپنے حواسوں میں لوٹی۔

"چائے آج عجیب تھکاوٹ ہے۔ میں اپنے حواسوں میں ہی نہیں شاید۔" اس نے عجیب نگاہوں سے اپنے اطراف میں دیکھا۔

چائے میں مگن اشعر اس کے لہجے کی سراسیمگی محسوس نہ کر سکا۔

"چائے بہت مزیدار ہے۔ اتنی اچھی بناتے ہیں، پہلے کیوں نہیں بتایا؟ یہ ڈیوٹی اب آپ ہی نبھایا کریں گے۔" کچھ ہی دیر میں نبیلہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

"ارے یہ ظلم نہ کیجیے ملکۂ عالیہ!" اشعر اداکاری پر اتر آیا۔

چائے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو نے نبیلہ کا دھیان بٹا دیا۔

☆☆☆

اگلے روز اشعر آفس چلا گیا اور نبیلہ نے بازار کا رخ کیا۔ گھر کی سجاوٹ سے اس کا دل ہی نہیں بھر رہا تھا۔

سارا دن شاپنگ کرتے گزرا۔ واپسی پر وہ باہر سے ہی کھانا پیک کروا لائی۔ اشعر کے آنے سے پہلے فریش ہو کر کھانا میز پر لگا دیا۔ کھانے کے دوران وہ اشعر کو اپنی شاپنگ کا احوال سناتی رہی۔ وہ اس کے چہرے کی چمک دمک دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ وہ اتنا خوبصورت گھر پا کر بہت خوش تھی۔

اگلے روز وہ گھر کے کام نمٹا کر دوپہر کو قیلولے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ تھکاوٹ اتنی تھی کہ بستر پر گرتے ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سمجھی اشعر آفس سے جلدی واپس آ گیا ہے لیکن کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اس نے واضح طور پر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر نکلی اور سارے گھر میں دیکھ لیا، کوئی نہ تھا۔ اشعر کو آوازیں دیں لیکن جواب ندارد۔

اسے یکدم خالی گھر سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ وہ رہائشی حصے سے نکل کر باہر لان میں جا بیٹھی اور بے صبری سے اشعر کا انتظار کرنے لگی۔ اس دوران مسلسل قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی۔ دل سوکھے پتے کے مانند لرز رہا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد چائے کے دوران اشعر سے سرسری ساذکر کیا۔

"تمہیں نیند میں ایسا محسوس ہوا ہوگا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواب حقیقت معلوم ہوتا ہے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں تسلی دے دی۔

اب نبیلہ کو بھی ایسا ہی لگنے لگا تھا کہ وہ اتنے بڑے گھر کے کام کر کے تھک جاتی ہے تو ایسا ہوتا ہے۔ اشعر نے اگلے روز ہی صفائی وغیرہ کے لیے ایک عورت کا بندوبست کر دیا۔ کچھ دن تو نبیلہ اس عورت کے ساتھ اتنی مصروف رہی کہ قیلولے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

اس روز رضیہ نے بنا بتائے چھٹی کر لی تھی۔ نبیلہ کی طبیعت بھی کچھ سست تھی۔ اس نے کھانا بنایا اور بنا کھائے صرف چائے کا ایک کپ لیے کمرے کا رخ کیا۔ چائے کا کپ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اسے پھر کمرے میں اپنے علاوہ کسی اور کی موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے اپنے پورے ہوش وحواس میں چائے کے کپ کو میز پر دھیرے دھیرے حرکت کرتے دیکھا۔ وہ مارے خوف کے کپ کی طرف ہاتھ نہ بڑھا سکی۔ کپ کبھی ایک طرف سرکتا کبھی دوسری طرف۔ ایسا لگتا تھا جیسے دو لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہیں کہ چائے کون پیے گا۔

اچانک چائے کا کپ فرش پر جا گرا۔ کپ ٹوٹ گیا اور چائے اچھلے فرش کو داغدار کر گئی۔

نبیلہ کی چیخ نکل گئی۔ وہ سب کچھ ویسا ہی چھوڑ کر کمرے سے باہر بھاگی۔ مرکزی دروازے کے پاس پہنچی تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔ نبیلہ کی چیخوں سے فضا گونج اٹھی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے نبیلہ نے اشعر کا چہرہ دیکھا تھا۔

ہوش آیا تو خود کو اپنے کمرے میں پایا۔

"اشعر!" اس نے پوری قوت سے اسے پکارا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

"کیا ہوا؟"

"اشعر! یہاں کپ رکھا تھا چائے کا، وہ خود بخود فرش پر گر گیا تھا۔ یہاں کوئی ہے...... میرا یقین کرو...... یہاں کوئی ہے۔" وہ رونے لگی۔

اشعر اس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔

"یہاں سے گرا تھا کپ......" اس نے گردن گھما کر سائڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تو حیرت کی زیادتی سے آنکھیں اور منہ کھل وا ہو گئے۔



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

ٹھنڈی چائے سے بھرا کپ ہنوز وہاں موجود تھا۔ چائے کی رنگت بتا رہی تھی کہ دو تین گھنٹے پہلے بنائی گئی تھی۔

”یہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ نبیلہ کے لہجے میں بے بسی بول رہی تھی۔ اشعر نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

”دیکھو، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ تھکاوٹ یا پھر تنہائی کی وجہ سے بھی ایسا ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے ہم ایک چکر سائیکاٹرسٹ......“

”تم...... تم سمجھ رہے ہو میں پاگل ہوں یا کوئی ڈراما کر رہی ہوں؟“ وہ اشعر کی بات قطع کرتے ہوئے چیخی۔ خود کو زبردستی اس سے الگ کر لیا۔

”نہیں نبیلہ! مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہا ہوں۔ صرف ایک بار میری بات مان لو۔“ اس نے ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

نبیلہ کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے بستر پر دراز ہو گئی۔

’یہ سب کیا ہو رہا ہے؟‘ وہ جتنا سوچ رہی تھی، اتنی ہی الجھتی چلی جا رہی تھی۔

”کیا اسے واقعی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے؟“ وہ خود سے پوچھ رہی تھی لیکن جواب بار بار نفی میں آ رہا تھا۔

☆☆☆

”میں تھوڑی دیر کے لیے آفس جا رہا ہوں، جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ آج شام کی ڈاکٹر کی اپائنٹمنٹ ہے، یاد رکھنا۔“ وہ اس کے بالوں پر بوسہ دے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھی چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی رہی۔ ڈور بیل کی آواز پر چونکی۔ خالی کپ میز پر رکھ کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”ہائے باجی! آپ کو کیا ہو گیا...... کتنی بیمار لگ رہی ہیں۔“ رضیہ نے اس کی صورت دیکھتے ہی شور مچا دیا۔

”کچھ نہیں ہوا مجھے۔ تم چھٹیاں کم کیا کرو، تمہارے حصے کا کام کر کر کے میری یہ حالت ہو گئی ہے۔“ نبیلہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے اس کا دھیان بٹایا۔

”کیا کروں باجی! میری بھی مجبوریاں ہیں۔“ رضیہ کام نمٹانے کے ساتھ ساتھ اپنے درد بھی بانٹنے لگی۔ نبیلہ بھی کچن میں مصروف ہو گئی۔ باہر گاڑی کے ہارن پر رضیہ دروازہ کھولنے چلی گئی۔ نبیلہ نے روٹی کے لیے توا رکھ دیا۔

”کھانا نہیں کھاؤں گا رضیہ باجی! میرے لیے چائے بنا دیجیے۔“ اندر داخل ہوتے ہوئے اشعر، رضیہ باجی سے کہہ رہا تھا۔ نبیلہ نے سنا تو توا ایک طرف کر دیا اور کچن سے نکل آئی۔

”آپ کمرے میں چلیے، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ اس نے اشعر کو دیکھتے ہی کہا۔

”نہیں، رضیہ باجی بنا دیتی ہیں، تم تھوڑا آرام کر لو۔“ اشعر نے اس کی طبیعت کے پیش نظر منع کر دیا۔ دونوں کمرے کی طرف چل دیے۔

اشعر نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ٹھٹک گیا۔ سامنے میز پر رکھے ٹشو باکس میں سے ٹشو خود بخود اڑ کر باہر آ رہے تھے۔ اچانک دراز بند ہونے کی آواز آئی۔ اشعر نے مڑ کر دیکھا۔ نبیلہ شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو...... ’اب تو یقین آ گیا نا، میں ٹھیک کہتی تھی؟‘

کسی کام سے ان کے پیچھے آتی رضیہ نے درازوں کو خود بخود کھلتے اور بند ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس کی تو چیخیں نکل گئیں۔

”ارے، اس گھر میں تو سایہ ہے، ہائے اللہ...... باجی! کسی پیر فقیر سے رابطہ کرو۔ ہائے اللہ! اب کیا ہو گا۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ کافی دفعہ اس کمرے سے آوازیں سن چکی ہوں لیکن اپنا وہم سمجھتی رہی۔“

اس کے واویلے پر اشعر کو ہوش آیا۔ وہ فوراً کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”ارے...... آؤ، آؤ اشعر میاں! بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔“ قاری صاحب اٹھنے لگے تو اشعر نے ان کے کندھے پر دباؤ ڈالتے ہوئے بیٹھے رہنے کا اشارہ دیا۔

”بس قاری صاحب! زندگی مصروف سے مصروف تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک بہت بڑی مشکل آن پڑی ہے۔“

”اللہ خیر رکھے...... کیا پریشانی ہے؟“ قاری صاحب بھی پریشان دکھائی دینے لگے۔

”وہ بات یہ ہے کہ......“ اشعر نے ابھی پریشانی کا احوال سنانا ہی شروع کیا تھا کہ قاری صاحب کی پیشانی پر پڑے بل رفتہ رفتہ مٹنے لگے۔ لبوں پر ایک شریری مسکان آ ٹھہری۔

”اس کے علاوہ کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ، یہ تو ہم جانتے ہیں۔“

”کیا مطلب...... آپ جانتے ہیں؟“ اشعر پھٹی پھٹی نگاہوں سے قاری صاحب کو دیکھنے لگا۔

”اشعر بیٹا! وہ معصوم سے بے ضرر بچے ہیں۔ ان کو لے کر اتنی پریشانی اچھی نہیں۔“ قاری صاحب کی مسکراہٹ



Scanned with CamScanner

گہری ہو گئی۔

"کون سے بچے..... کس کے بچے.....؟"

"اشعر میاں! وہ آپ کے ہمسائے کے بچے ہیں۔ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ بس ذرا شریر سے ہیں۔ ماں کو ستاتے ہیں تو وہ درخت سے اتار دیتی ہے پھر وہ تمہارے کمرے میں گھس آتے ہیں۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں قاری صاحب..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" اشعر کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔

قاری صاحب نے قریب رکھے جگ سے گلاس میں پانی ڈال کر اشعر کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گیا۔

"اب آرام سے میری بات سنو۔ جس دن میں تمہارے گھر آیا تھا، پچھلے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے کسی غیر مرئی مخلوق کی خوشبو محسوس کر لی تھی۔ کمرے میں مجھے کوئی دکھائی نہ دیا تو کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ سامنے ہی چھوٹی چھوٹی کیاریاں دکھائی دیں جن میں تم نے بہت شوق سے سبزیاں اگا رکھی ہیں۔ وہیں دیوار کے ساتھ ایک کافی بڑا درخت ہے۔ اس پر پورا خاندان بستا ہے۔"

یہ سننا تھا کہ اشعر کی پیشانی پر شفاف قطرے نمودار ہونے لگے۔ اسے اپنے ہر مسام سے پسینہ پھوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

"پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ نیک خاندان ہے، اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ بچے تھوڑے شرارتی ہیں لیکن بے فکر رہو، کوئی مالی نقصان وہ بھی نہیں کریں گے تمہارا۔ بس دوپہر کو تھوڑا کھیلنے کودنے جائیں گے تمہارے گھر میں..... اس سے زیادہ کچھ نہ ہو گا۔" قاری صاحب دھیرے دھیرے بول رہے تھے۔

"میری بیوی گھر میں اکیلی ہوتی ہے۔" اشعر منمنایا۔

"اسے ڈر لگے تو بس تھوڑے رعب سے کہہ دیا کرے کہ چلو نکلو یہاں سے..... بچے ہیں، ڈر کر بھاگ جائیں گے۔" قاری صاحب نے فوراً حل پیش کر دیا۔

"انہیں مستقل بھگانے کا کوئی طریقہ؟" اشعر کا خوف ہنوز قائم تھا۔

"ارے میاں! بچے ہی تو ہیں، یہی سمجھ لینا ہمسائے کے بچے کھیلنے آتے ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ دکھائی نہیں دیتے۔ کیا خبر انہی کے قدموں کی برکت سے تمہارے آنگن میں بھی پھول کھل اٹھیں۔" قاری صاحب رسان سے بول رہے تھے۔ اشعر تفہیمی انداز میں سر ہلائے جا رہا تھا۔

بات اشعر کی سمجھ میں آ چکی تھی لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ نبیلہ کو کیسے سمجھانا ہے۔ جانے اس کا ردعمل کیا ہو گا۔

☆☆☆

"یکی بات ہے نا..... وہ کوئی نقصان تو نہیں پہنچائیں گے؟" نبیلہ سہمی بیٹھی تھی۔

"قاری صاحب نے پورا یقین دلایا ہے۔" اشعر نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبا کر یقین دہانی کروائی۔

پرسکون سانس خارج کر کے اس نے صوفے کی پشت پہ سر ٹکا لیا۔ اشعر نے دل ہی دل میں کلمۂ شکر ادا کیا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ نبیلہ اتنی آسانی سے بات سمجھ جائے گی۔

☆☆☆

کام کاج نمٹا کر وہ معمول کے مطابق کمرے میں آئی تو یکدم بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اگلے ہی لمحے گزشتہ روز اشعر کا دیا گیا حوصلہ سر اٹھانے لگا۔

"چلو شاباش پیارے بچو! اب اپنے گھر چلو۔ مجھے آرام کرنا ہے۔" وہ بظاہر بے نیازی سے کہہ کر بیڈ تک چلی آئی۔

اس کی پشت پر دراز کھلی اور بند ہو گئی۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"اب مزید کوئی شور نہیں ہونا چاہیے..... سمجھے؟" قطعیت سے کہتی وہ بستر پر دراز ہو گئی اور دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی۔ آنکھیں موندے کافی دیر ہو چکی تھی۔ کمرے میں گہری خاموشی کا راج تھا۔

"اس کا مطلب ہے، وہ چلے گئے۔" وہ زیر لب مسکرا دی۔

اب یہ روزانہ کا معمول بن گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بہ آواز بلند بچوں کو تنبیہ کر دیا کرتی اور بچے واقعی خاموشی سے کمرا خالی کر دیتے تھے۔ زندگی میں یکدم سکون سا آ گیا تھا۔

ایک دن اس کی طبیعت ناساز تھی۔ رضیہ بھی غیر حاضر تھی۔ نبیلہ کچن کا کام بھی ادھورا چھوڑ کر کمرے میں چلی آئی۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا، بدن بخار سے ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ کمرے میں جاتے ہی بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ دروازہ کھل کر بند ہوا پھر دراز کھلنے کی آواز آئی۔ نبیلہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے طیش میں آ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا لکڑی کا ٹشو باکس اٹھا کر آواز کی جانب اچھال دیا۔

"تمیز نہیں ہے تم لوگوں کو، سکون تباہ کر کے رکھ دیا میرا۔ درد سے مری جا رہی ہوں یہاں، انہیں اپنے کھیل تماشوں سے فرصت نہیں۔" وہ چیخی۔

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

یکدم کمرے میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ اگلے لمحے نبیلہ پر غنودگی چھانے لگی۔

کمرے میں سسکیوں کی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ چند قدم آگے بڑھ کر بیڈ کے دوسری جانب فرش پر نگاہ پڑی تو چیخ نکل گئی۔ چھ سات سال کا بچہ زخمی حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ بہہ کر فرش کو لال کیے دے رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانا چاہا تو وہ اس پر جھپٹ پڑا۔ زوردار چیخ کے ساتھ نبیلہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی سانس دھونکنی کے مانند چل رہی تھی۔ کیسا عجیب خواب تھا، وہ سوچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

اگلے کئی دن تک کمرے سے کوئی آواز نہ آئی تھی، نہ کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا لیکن گھر کی فضا میں عجب سوگواری کھلی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ کانوں میں کسی کے کراہنے یا سسکیوں کی آوازیں اچانک سنائی دینے لگتیں۔ اس نے اپنا وہم سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ اشعر بھی ان دنوں آفس کے کام میں بہت الجھا ہوا تھا۔ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا، رات گئے لوٹتا تھا۔ ضرورت سے زیادہ بات چیت نہیں ہو پا رہی تھی۔

انہی دنوں وہ عجیب و غریب خواب بھی دیکھنے لگی تھی۔ زخمی بچہ دکھائی دیتا تھا۔ کبھی وہ خونخوار انداز میں اس پر حملہ آور ہو جاتا، کبھی اس کے گھر میں توڑ پھوڑ کرنے لگتا۔ وہ چیختی رہتی لیکن اسے باز نہ رکھ پاتی۔ آنکھ کھلنے پر اس کا بدن پسینے میں شرابور ہوتا۔ وہ باہر نکل کر لان میں جا بیٹھتی۔ اسے گھر کے اندرونی حصے سے خوف آنے لگتا۔ وہ اشعر سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن موقع ہی نہ مل پا رہا تھا۔

"اشعر! میں آج کل بہت عجیب و غریب خواب دیکھ رہی ہوں۔ کوئی مجھ پر حملہ کر رہا ہے بار بار۔ مجھے اس گھر سے خوف آنے لگا ہے۔" رات اشعر کے سامنے کھانا رکھنے کے بعد وہ قریب ہی بیٹھ گئی۔

"بس کرو نبیلہ...... بس کرو...... تھک گیا ہوں میں ان باتوں سے۔ اس گھر سے تمہیں خوف آتا ہے نا؟ خوش ہو جاؤ، بیچنے لگا ہوں اسے۔ کاروبار میں اتنا نقصان ہو چکا ہے کہ اس کے بغیر میرے پاس کوئی چارہ نہیں...... خوش ہو جاؤ تم اب۔" وہ تلخی سے کہتا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ نبیلہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

قاری صاحب جب سے آئے تھے، مراقبے کی صورت بیٹھے تھے۔ آنکھیں کھول کر تاسف بھری گہری سانس خارج کی۔ اپنی نشست چھوڑ کر کھڑکی کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ گہری نگاہیں سامنے دیوار کے قریب درخت پر مرکوز تھیں۔

"لوگ تو اچھے تھے لیکن اولاد کا دکھ مارے ڈالتا ہے۔ اچھے بھلے لوگ بپھر جاتے ہیں۔ انتقامی کارروائیاں کرنے لگتے ہیں۔"

نبیلہ اور اشعر نافہم انداز میں انہیں دیکھ رہے تھے۔

"تم لوگوں کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ نبیلہ بیٹی نے بنا سوچے سمجھے ٹشو باکس اٹھا مارا۔ بس یہیں سے بربادی کا آغاز ہوا۔ وہ لوگ تمہیں یہاں سے نکال کر ہی دم لیں گے۔" قاری صاحب شکست خوردہ لہجے میں بول رہے تھے۔

"میں...... میں...... ان سے معافی......!"

"میرا نہیں خیال کہ معافی تلافی ممکن ہے۔" انہوں نے نبیلہ کی بات قطع کر دی۔

"کوئی تو حل ہوگا؟" اشعر کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"میرا خیال ہے وقت ضائع کیے بنا گھر خالی کر دو۔ ایسا نہ ہو وہ جان لینے کے درپے ہو جائیں۔"

"میں ان سے ایک بار معافی ضرور مانگوں گی۔ میں انہیں بتاؤں گی، میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا۔" نبیلہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

"نبیلہ! ہم صبح ہی یہ گھر خالی کر دیں گے، ضروری سامان سمیٹ لو۔" اشعر کہہ کر قاری صاحب کو لیے باہر نکل گیا۔

"مجھے معاف کر دو، جو ہوا انجانے میں ہوا...... میں نے کبھی نہ چاہا تھا کہ تمہارا بچہ......"

کمرے کی ٹیوب لائٹ دھماکے کے ساتھ پھٹ گئی اور پنکھا نیچے آ گرا۔ نبیلہ دھماکے کی آواز پر سہم کر دیوار کے ساتھ نہ جا لگتی تو پنکھا گرنے سے زخمی ہو سکتی تھی۔ وہ گھبرا کر فوراً کمرے سے باہر بھاگی اور دھماکے کی آواز سن کر اس طرف آتے اشعر سے ٹکرا گئی۔ وہ اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اپنے حواس کھو بیٹھی۔

کبھی کبھی انجانے میں کی گئی غلطیاں ناقابلِ معافی جرم بن جاتی ہیں اور اس کا بھاری تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔ انسان اس کے ازالے کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے لیکن جس طرح کمان سے نکلا تیر واپس نہیں ہو سکتا اسی طرح غلطیوں کا ازالہ بھی ناممکن ہی ہوتا ہے۔ یہی کچھ نبیلہ کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

xxx



Scanned with CamScanner

بارش جاری تھی۔ وحشت سے بھرپور اور مستقل بارش، سر سے پاؤں تک پانی میں ڈبو دینے والی بارش...... جیسے کوئی چکنا کیچڑ یا پھر اچھلتا ہوا فوارہ۔ بارش جو آنکھوں پر کوڑے برساتی ہوئی محسوس ہوتی ہو اور تختوں کو چھلنی کر رہی ہو۔ وہ بارش جو پچھلی تمام بارشوں کی یاد بھلا دے، جو قطروں کی صورت میں آئے اور پورے جنگل کو اپنے قبضے میں لے لے۔ جو قینچی کی طرح درختوں کو کاٹ دے، گھاس کو اکھاڑ دے اور زمین میں سرنگیں بناتے ہوئے جھاڑیوں

# بارش کا قید خانہ

محمد عثمان ذوالفقار

پانی بہت بڑی نعمت ہے... مگر کبھی کبھی یہ بہت بڑی زحمت بن جاتا ہے... جب یہی پانی بارش بن کر کسی کے سر پر پڑے تو ایسا گمان ہوتا ہے جیسے کوئی چیز پتھر بن کر سروں پر برس رہی ہو... وہ بھی ایسی ہی صورتِ حال کا شکار تھے... وہ ایک ایسے سیّارے پر تھے جہاں ہر طرف جل تھل تھا جو سالوں سے رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا... کوئی بھی راستہ انہیں پناہ گاہ کی طرف پہنچانے کے بجائے کہیں اور ہی پہنچا رہا تھا... اور انہیں اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی... اب دیکھنا یہ تھا کہ آخری کوشش انہیں کہاں لے جاتی؟

طوفانی بارش میں گھرے زندگی بچانے کی جدوجہد کرنے والے فوجیوں کا احوال

digest library.com

Scanned with CamScanner

تک کو نہ چھوڑے۔ ایک ایسی نہ رکنے والی بارش جو آدمی کے ہاتھ کو سکیڑ کر کسی بندر کا جھریوں زدہ ہاتھ بنا دے۔

”ابھی کتنا دور ہے لیفٹیننٹ؟“

”میں نہیں جانتا۔ ایک میل، دس میل یا شاید ہزار میل۔“

”کیا تمہیں یقین نہیں؟“

”میں کیسے پُریقین ہو سکتا ہوں؟“

”مجھے یہ بارش بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ اگر ہمیں صرف یہ معلوم ہو جاتا کہ ابھی ”پناہ آفتاب“ کتنا دور ہے تو یقیناً اچھا محسوس ہوتا۔“

”یہاں سے ایک یا دو گھنٹے دور۔“

”کیا تم واقعی ایسا سمجھتے ہو، لیفٹیننٹ؟“

”یقیناً۔“

”یا پھر تم ہمیں خوش کرنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہو؟“

”میں تم سب کو خوش رکھنے کے لیے جھوٹ بول رہا ہوں۔ اب چپ کر جاؤ۔“

دو آدمی برستی بارش میں ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ بقیہ دو بھی بارش میں بھیگے اور تھکے ہوئے زمین پر یوں گرے جیسے چکنی مٹی کہیں سے پھسلتی ہے۔

لیفٹیننٹ نے اوپر کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جو کہ کبھی بھورا ہوتا تھا، اب پیلا پڑ چکا تھا۔ بارش نے اس کی آنکھوں، دانتوں اور بالوں سب کا رنگ اڑا دیا تھا اور اب وہ سب سفیدی مائل نظر آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ اب اس کی وردی بھی سفید ہونے لگی تھی اور اس پر کئی جگہوں پر سبز کائی نظر آ رہی تھی۔ اس نے بارش کو اپنے گالوں پر برستے ہوئے محسوس کیا۔

”کتنے لاکھوں سال پہلے سیارہ وینس پر بارش رکی ہوگی؟“ اس نے پوچھا۔

”پاگل مت بنو۔“ اگلے دو میں سے ایک آدمی نے کہا۔ ”وینس پر کبھی بارش نہیں رکتی۔ میں یہاں دس سال سے ہوں اور میں نے کبھی بھی ایک منٹ یا ایک سیکنڈ کے لیے بھی بارش کو رکتے نہیں دیکھا۔“

”یوں لگتا ہے جیسے ہم پانی کے نیچے رہ رہے ہوں۔“ لیفٹیننٹ نے کہا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی بندوق کو سنبھالا اور کہنے لگا۔ ”اب ہمیں چلنا چاہیے۔ ہم جلد ہی پناہ آفتاب ڈھونڈ لیں گے۔“

”یا پھر نہیں ڈھونڈ پائیں گے۔“ سائمن نے کہا۔

”شاید ایک گھنٹے یا کچھ زیادہ میں۔“

”اب تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو لیفٹیننٹ!“

”نہیں، اب میں اپنے آپ سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ تھک کر گرنے کے قریب ہوتے ہیں۔ شاید میں زیادہ دیر تک ایسا نہ کر پاؤں۔“

پھر وہ جنگل میں بنی ہوئی پگڈنڈی میں چلنے لگے۔

اب وہ اپنے قطب نماؤں کو دیکھ رہے تھے کیونکہ یہ صرف قطب نما ہی بتا سکتا تھا کہ کس طرف جانا ہے۔ یہاں سرمئی آسمان تھا جس سے بارش برس رہی تھی، جنگل اور اس میں جاتا ہوا راستہ تھا یا پھر کہیں دور ایک خلائی جہاز تھا جو انہیں لے کر یہاں گرا تھا۔ وہ جہاز جس میں ان کے دو ساتھی مردہ حالت میں پڑے بارش سے بھیگ رہے تھے۔

وہ بغیر کچھ بولے ایک قطار میں جا رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ ایک دریا کے کنارے پہنچے جو بھورا اور چوڑا تھا۔ یہ دریا بہتا ہوا سمندر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی سطح پر بارش کے قطرے گرنے سے ہزاروں سوراخ بنتے اور بند ہوتے نظر آ رہے تھے۔

”شروع ہو جاؤ سائمن!“ لیفٹیننٹ نے کہا تو سائمن نے اپنی پیٹھ سے ایک پیکٹ نکالا جو اس کے اندر موجود کسی پوشیدہ کیمیکل کی وجہ سے پھول کر کشتی کی صورت اختیار کر گیا۔ لیفٹیننٹ ایک درخت کی طرف بڑھا اور یوں تھوڑی دیر میں کشتی کے لیے چپو تیار ہو چکے تھے۔ انہوں نے کشتی کو دریا میں ڈالا اور چپو کی مدد سے آگے بڑھنے لگے۔

لیفٹیننٹ کو اپنے گالوں، گردن اور حرکت کرتے ہوئے بازوؤں پر بارش کے ٹھنڈے قطرے گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سردی اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہونا شروع ہو گئی تھی۔

”میں کل رات سو نہیں پایا۔“ اس نے کہا۔

”کون، کب سو سکا ہے؟“ سائمن نے کہا۔ ”ہم کتنی راتوں سے نہیں سو پائے۔ شاید تیس دن اور تیس راتوں سے۔ کون اس ماحول میں سو سکتا ہے جب بارش آپ کے سر پر کسی ہتھوڑے کی طرح لگتی ہو۔ میں ایک ٹوپی کے لیے کچھ بھی دینے کو تیار ہوں تاکہ یہ بارش مزید میرے سر کو چھو نہ سکے۔ اس کی وجہ سے میرے سر میں درد شروع ہو چکا ہے جو ہر وقت تکلیف دیتا رہتا ہے۔“

”میری غلطی ہے جو میں چین آ گیا۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”میں پہلی بار وینس کو چین کہتے ہوئے سن رہا ہوں۔“ سائمن نے حیرت کا اظہار کیا۔

”بالکل، چین میں پانی سے علاج کیا جاتا ہے۔“

پکارڈ نے کہنا شروع کیا۔ ''کیا تم وہ قدیم سزا بھول گئے جس میں آدمی کو رسی سے دیوار کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا اور پھر اس کے سر پر ہر تھوڑی دیر بعد پانی قطرہ قطرہ کر کے گرایا جاتا تھا۔ اس سزا سے بندہ پاگل ہو جاتا ہے۔ وینس پر یہ سب بڑے لیول پر موجود ہے۔ ہم پانی کے لیے نہیں بنے۔ تم سو نہیں سکتے، سانس نہیں لے سکتے اور ہر وقت بھیگتے رہنے سے انسان پر ایک پاگل پن سوار ہو جاتا ہے۔ اگر ہمیں اپنے خلائی جہاز کے کریش ہونے کا پہلے سے معلوم ہوتا تو ہم اس میں سے اپنی واٹر پروف وردیاں اور ٹوپیاں ضرور نکال لیتے تاکہ ہم سب بارش کے اس عذاب مسلسل سے بچ سکتے جو معلوم نہیں ہمیں کب تک جھیلنا پڑے گا۔''

''ویسے ایک بات ماننا پڑے گی کہ جس نے بھی پناہ آفتاب کا تصور پیش کیا ہے، کمال کیا ہے۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔

دریا کو عبور کرتے ہوئے ان کے ذہنوں میں پناہ آفتاب کا تصور جگمگانے لگا جو آگے کہیں جنگل کے درمیان میں دھوپ کے مانند چمک رہی ہوگی۔

پناہ آفتاب ایک گول زرد رنگ کے مکان پر مشتمل تھی۔ یہ مکان چالیس فٹ اونچا اور سو فٹ کے قطر پر پھیلا ہوا تھا۔ ایک ایسی پناہ گاہ جہاں روشنی تھی، گرم کھانا تھا اور سب سے بڑھ کر اس بارش سے نجات تھی۔ وہاں ایک مصنوعی سورج بھی موجود تھا جو عمارت کی بلند ترین جگہ پر تیرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے آپ چاکلیٹ کھا سکتے ہیں، سگریٹ نوشی اور چاہیں تو کسی کتاب کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس سورج کی سکون آور حرارت میں لوگ وینس پر ہر وقت برسنے والی بارش کو بھول جاتے ہیں۔

لیفٹیننٹ نے پلٹ کر ان تین لوگوں کو دیکھا جو زندگی کی آخری حدوں سے نبرد آزما چھ چلانے میں مصروف تھے۔ ان کے سفید بے تاثر چہروں سے وینس کی سرزمین نے جیسے ہر رنگ، ہر تاثر کو نچوڑ لیا ہوا ہو۔ ان کے آس پاس پھیلا ہوا جنگل ایک ڈراؤنا خواب بن چکا تھا۔ مسلسل بارش اور سورج کی روشنی کے بغیر کوئی جنگل کیسے سرسبز رہ سکتا ہے۔ بے رنگ جنگل اور اس میں موجود درختوں کے پتوں سمیت ہر چیز زندگی سے عاری لگ رہی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا جو کہیں ندی کی شکل اختیار کر لیتا، کہیں تالاب کی، تو کہیں سمندر کی۔ اسی اثنا میں لیفٹیننٹ کی آواز ہوا میں گونجی۔

''ہم پہنچ گئے۔''

وہ پانی میں چھپاکے مارتے ہوئے کنارے پر پہنچ گئے۔ سائمن نے کشتی کو دوبارہ سکیڑ کر سگار جیسے ڈبے میں بند کر لیا۔ اس نے بھیگتے ہوئے ساحل پر کھڑے ہو کر سگریٹ سلگانے کی کوشش کی جو پہلے ہی کش پر بارش کے قطروں نے بجھا دیا۔ تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد سب خاموشی سے چلنے لگے۔

''ذرا رکو۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔ ''شاید آگے کچھ ہے۔''

''پناہ آفتاب؟''

''معلوم نہیں، بارش پھر تیز ہو گئی ہے۔''

''پناہ آفتاب۔'' سائمن یہ سنتے ہی دوڑ پڑا۔

''واپس آؤ، سائمن!'' لیکن وہ نہیں رکا تو باقی سب بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔

تھوڑی دور جانے کے بعد انہوں نے سائمن کو ایک کھلی جگہ پر کھڑے پایا۔ ان کے سامنے وہی تباہ شدہ خلائی جہاز پڑا ہوا تھا جس پر وہ آئے تھے۔ وہ سب پھر وہیں آ گئے تھے جہاں سے انہوں نے اپنے اس سفر کا آغاز کیا تھا۔ جہاز کے ملبے میں دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں جسے سبز کائی نے ڈھانپنے کی کوشش کی تھی لیکن برستے پانی نے یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی تھی۔

''ہم واپس کیسے آ گئے؟'' سائمن نے پوچھا۔

''کہیں طوفان کی وجہ سے ہمارا قطب نما خراب تو نہیں ہو گیا؟'' کسی نے جواب دیا۔

''ممکن ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو۔'' دوسرے نے اپنی رائے ظاہر کی۔

''تو پھر اب کیا کریں؟''

''پھر سے شروع کرتے ہیں۔''

''خدا کی پناہ! ہم تو کہیں پہنچ ہی نہیں۔''

''سائمن! ہوش سے کام لو۔''

''اس بارش میں کوئی ذی روح ہوش میں رہ سکتا ہے؟''

''ابھی دو دن کا راشن باقی ہے، اگر ہم احتیاط سے استعمال کریں تو۔''

بارش کی وجہ سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے جسم کا ہر مسام پانی اگل رہا ہو۔

اچانک دور سے ایک زوردار گرج کی آواز سنائی دی اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے بارش سے ایک خوفناک مخلوق برآمد ہو رہی ہو۔

یہ مخلوق کڑکتی بجلیوں کے ہزاروں پیروں پر کھڑی لگ رہی تھی۔ اس کے ہر قدم پر زمین لرزتی، درخت گرتے، آگ بھڑک اٹھتی جو پھر بارش کے قطروں سے بجھ کر رہ جاتی۔ اس کی سفیدی مائل بجلیاں کسی کوڑے کی طرح جنگل کے مختلف حصوں میں پڑتی اور انہیں چیر کر رکھ دیتیں۔



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

"یہ تو وہی طوفان ہے۔" پکارڈ نے کہا۔ "جس نے ہمارے قطب نما خراب کیے ہیں اور اب یہ ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔"

"زمین پر لیٹ جاؤ۔" لیفٹیننٹ نے سب کو حکم دیا۔

"بھاگو۔" سائمن چلایا۔

"بیوقوف مت بنو۔ یہ طوفان بلند چیزوں کو نشانہ بناتا ہے۔ اگر ہم خلائی جہاز سے پچاس فٹ دور لیٹ جائیں تو ممکن ہے کہ اس سے بچ جائیں۔"

"وہ آرہا ہے؟"

"ہاں آرہا ہے۔"

"کتنا قریب؟"

"دوسو گز۔"

"اور اب کہاں تک آگیا ہے؟"

"بس ہمارے سروں پر پہنچ گیا ہے۔"

طوفان کسی دیو کی طرح ان کے اوپر آپہنچا۔ اس نے آتے ہی خوفناک گرج کے ساتھ اپنی کڑکتی ہوئی بجلیاں ان کے آس پاس گرانا شروع کر دیں۔

"نہیں، نہیں۔" ایک سپاہی چیختا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"پاگل ہو گئے ہو؟ جلدی سے زمین پر لیٹو۔" لیفٹیننٹ نے چلا کر کہا۔

"نہیں۔" اس نے چیختے ہوئے کہا۔

ایک کڑکتی بجلی خلائی جہاز پر گری اور اسے چیر کر رکھ دیا۔ لیفٹیننٹ نے سر پر بازو رکھ کر اوپر کی طرف دیکھا۔ چمکتی بجلی کی لکیریں آسمان کا سینہ چیر رہی تھیں، درخت شق ہو کر زمین بوس ہو رہے تھے۔ طوفان کسی دیو کی طرح گھوم رہا تھا اور ہر قدم پر اپنی بجلیاں کسی نیزے کی طرح نیچے پھینک رہا تھا۔

وہ سپاہی جو اچانک اٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ اب بجلی سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔

اچانک کئی بجلیاں ایک ساتھ اس پر گریں۔ انہوں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی اور پھر فضا میں جلے ہوئے گوشت کی بساند پھیل گئی۔ لیفٹیننٹ نے نظریں جھکا لیں۔

"اوپر مت دیکھنا۔" اس نے باقیوں کو کہا۔

وہ خود بھی اس دہشت ناک منظر سے خوفزدہ ہو چکا تھا کہ کہیں اس کے قدم بھی نہ اکھڑ جائیں۔

بادل نے ایک مرتبہ پھر اپنا قہر برسایا اور پھر آہستہ آہستہ دور ہوتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد صرف بارش رہ گئی جو فضا میں موجود جلنے کی بدبو کو صاف کرنے میں مصروف ہو گئی۔ وہ تینوں خاموش بیٹھے اپنی دھڑکنوں کو معمول پر لانے کی کوشش کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر اس جھلسے ہوئے جسم کے پاس پہنچے، ایک آخری امید لیے ہوئے کہ شاید زندگی کی کوئی رمق باقی ہو۔ انسان موت کو تب تک نہیں مانتا جب تک وہ اسے چھو کر نہ دیکھ لے اور لاش کو دفن کرنے یا جنگل کے حوالے کرنے کا فیصلہ نہ کر لے۔

لاش میں صرف دانت ہی بچے تھے جو سفید لگ رہے تھے۔ باقی کا جسم ایسا لگ رہا تھا جیسے موم کی گڑیا کو آگ میں جھونک کر نکالا ہوا اور سب کچھ سیاہی میں بدل گیا ہو۔

"اسے نہیں اٹھنا چاہیے تھا۔" انہوں نے یک زبان ہو کر کہا اور پھر ان کی آنکھوں کے سامنے سے لاش غائب ہونے لگی۔ پودے، بیلیں اور چھوٹے پتے اس پر چڑھنے لگے۔ پھول بھی اسے اپنے آپ میں چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔ یوں لگا جیسے فطرت مردے کو کفن سے ڈھانپ رہی ہو۔

وہ تینوں پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ دریا، نالے اور چشمے عبور کرتے ہوئے وہ سمندر تک جا پہنچے۔ وینس پر صرف ایک ہی برِاعظم تھا جو تین ہزار میل لمبا اور ایک ہزار میل چوڑا تھا۔ اس برِاعظم کو ایک اکلوتے سمندر نے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ وہی سمندر جو ایک ساکن اور سفید ساحل پر خاموش کھڑا تھا۔

"اس طرف۔" لیفٹیننٹ نے جنوب کی طرف اشارہ کیا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس طرف دو پناہ آفتاب موجود ہیں۔"

"جب بنائے ہی تھے تو سو اور کیوں نہیں بنا دیے؟" پکارڈ نے کہا۔

"اب تو شاید ایک سو بیس سے اوپر ہیں نا؟" سائمن نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا۔

"پچھلے ماہ تک تو ایک سو چھبیس تھے۔ کانگریس میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ دو درجن اور بنائے جائیں مگر یہ سیاست...... انسان چاہے پاگل ہو کر مر جائے مگر انہیں بارش سے بچاؤ کی کوئی جلدی نہیں۔"

لیفٹیننٹ، سائمن اور پکارڈ جنوب کی جانب چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد سائمن کو کسی عمارت کا دھندلا سا عکس نظر آیا۔

"وہ رہا۔"

"کیا؟"

"پناہ آفتاب۔"

لیفٹیننٹ نے آنکھوں سے پانی صاف کیا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھنے لگا۔ دور ساحلِ سمندر اور جنگل کے کنارے پر انہیں ایک زردی روشنی نظر آئی۔ یہ آنکھوں کا دھوکا نہیں تھا بلکہ واقعی پناہ آفتاب کی عمارت تھی۔ یہ دیکھ کر تینوں مسکرا دیے۔

"لگتا ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیفٹیننٹ!"

"بس ہماری خوش قسمتی ہے۔" لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔

"یار! اسے دیکھ کر تو جیسے بدن میں جان آگئی ہے۔ چلو، جلدی کرو۔" سائمن عمارت کی طرف دوڑ پڑا۔ باقی دونوں بھی اس کے پیچھے لپکے۔

"ایک بڑے کافی مگ کے ساتھ، دھوپ میں لیٹ کر کھانا، کتنا مزہ آئے گا۔" سائمن ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔

"یار! جس نے پناہ آفتاب ایجاد کیا تھا، اسے تو ایک بڑا سا تمغہ ملنا چاہیے۔" جیسے جیسے وہ عمارت کے قریب پہنچتے جا رہے تھے، زردروشنی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"پتا نہیں کتنے لوگ اس بارش سے پاگل ہوئے ہوں گے تب جا کر انہوں نے یہ حل نکالا ہوگا۔ برسوں پہلے میرا ایک دوست انہی جنگلوں میں گھومتا ہوا پاگل ہو گیا تھا۔ جب وہ ملا تو وہ بس یہی بڑبڑا رہا تھا کہ مجھے اندر جانا ہے۔" پکارڈ نے کہا۔

"بس کرو، نہیں تو سانس پھول جائے گا۔" لیفٹیننٹ نے کہا اور پھر وہ تینوں ہنسنے لگے اور دوڑتے ہوئے پناہ آفتاب کے دروازے تک پہنچ گئے۔

"جلدی کرو، کافی لاؤ۔" سائمن نے دروازہ کھولتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ کوئی جواب نہ آیا۔

وہ تینوں اندر داخل ہوئے تو انہیں ایک جھٹکا لگا۔ اندر ہر طرف تاریک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہ کوئی مصنوعی سورج کی روشنی اور نہ کوئی کھانے پینے کا سامان۔ چھت میں موجود سیکڑوں سوراخوں سے بارش قطرہ قطرہ گر رہی تھی۔ قالین، صوفے اور کتابوں کی الماریوں سمیت سب کچھ بھیگا ہوا تھا اور جنگل کائی کی صورت اندر تک گھس آیا تھا۔ پکارڈ کے ہونٹوں سے ایک پھیکی ہنسی برآمد ہوئی۔

"چپ رہو پکارڈ!" لیفٹیننٹ نے اسے جھڑکا۔

"خدا کی پناہ! اب یہاں ہمارے لیے کیا رہ گیا ہے۔ وینس کے باسیوں نے کچھ بھی تو نہیں چھوڑا۔" پکارڈ نے مایوسی سے کہا۔

"ہر کچھ عرصے بعد وینس کے باسی سمندر سے نکل کر پناہ آفتاب کی عمارتوں پر حملے کرتے ہیں کیونکہ وہ یہ جان

## اعلان

کانٹے میں پھنسی ہوئی ایک مچھلی کو کھینچنے کی دھن میں ایک شکاری ریلنگ پر اس طرح جھکا کہ توازن کھو بیٹھا اور گہری ندی میں گر گیا۔

اگلے ہی لمحے وہ سطح پر ابھر کر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے چلانے لگا۔ "مدد...... مدد! میں تیرنا نہیں جانتا۔"

پل پر سے گزرتے ہوئے ایک شرابی نے ریلنگ پر جھک کر اس سے کہا۔ "تو کیا ہوا، میں ستار بجانا نہیں جانتا لیکن میں اس کا اعلان تو نہیں کرتا پھرتا۔"

☆☆☆

ایک طوطے کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ انگریزی، اردو اور پنجابی تینوں زبانوں میں بول سکتا ہے۔ ایک صاحب نے اس کا امتحان لینے کی غرض سے کہا۔ "How do you do?"

طوطا بولا: "I am fine, how are you?"

"کیا حال ہے تمہارا؟" اس بار وہ صاحب اردو میں بولے۔

"میں ٹھیک ٹھاک ہوں، آپ کیسے ہیں؟" طوطے نے فوراً جواب دیا۔

"کی حال اے تیرا؟" اب کے پنجابی میں سوال کیا گیا۔

اس پر طوطے نے گھور کر ان صاحب کو دیکھا اور بولا۔ "اوئے الو دے پٹھے، کچھ ہور گل وی کر کہ حال ای پچھی جائیں گا۔"

(ابے پاگل کے بچے، کچھ اور بات بھی کر یا حال ہی پوچھے جائے گا)

(مرسلہ: حنا حیات، سرگودھا)

## تکمیلِ تمنا

لڑکا: میرے کان تمہارے منہ سے وہ پانچ الفاظ سننے کے لیے ترس رہے ہیں جن سے میری دنیا بدل جائے گی۔ میں ہواؤں میں جھولا جھولنے لگوں گا۔ آخر تم وہ پانچ الفاظ بول کیوں نہیں دیتیں؟

لڑکی: جاؤ اور پھانسی چڑھ جاؤ۔

(مرسلہ: نازش کلیم، مری)

گئے ہیں کہ اگر یہ پناہ گاہیں نہ رہیں تو ہم بھی نہیں رہیں گے۔" سائمن نے جواب دیا۔

"لیکن یہاں تو توپیں بھی لگائی گئی تھیں نا؟" پکارڈ نے استفسار کیا۔

"بالکل تھیں لیکن پانچ سالوں سے کوئی حملہ نہیں ہوا تو ان کا دفاع سُست پڑ گیا اور یہی غفلت ان کو لے ڈوبی۔" لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔

"اور لاشیں؟"

"وہ وینس کے باشندے اپنے ساتھ لے گئے۔ سنا ہے کہ ان کے ڈبونے کا انداز بہت دلکش ہے یعنی آٹھ گھنٹوں میں آہستہ آہستہ ڈبونا۔"

"اب یہاں کھانا تو بالکل نہیں ہوگا نا؟" پکارڈ نے کہا۔ لیفٹیننٹ نے سائمن کو اشارہ کیا تو وہ کچن کی طرف گیا۔ وہاں چند باسی روٹیاں، سبز بالوں والی جڑی بوٹیاں اور ہر طرف پانی موجود تھا۔

"کمال ہے۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم یہ سوراخ بند کر سکتے ہیں۔"

"خوراک کے بغیر؟" سائمن نے پوچھا۔ "اور یہاں اس مصنوعی سورج کی روشنی بھی تو موجود نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اگلی پناہ گاہ کی طرف جانا چاہیے۔"

"کتنی دور ہے؟" پکارڈ نے پوچھا۔

"زیادہ دور نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی ریسکیو ٹیم آجائے۔" سائمن نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"وہ تو آکر چلے بھی گئے ہوں گے۔ اب شاید چھ ماہ بعد ہی مرمت کے لیے آئیں اور وہ بھی تب جب انہیں حکومت کی طرف سے رقم ملے گی۔ اس لیے ان کا انتظار کرنا فضول ہے۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔

"تو پھر بچا ہوا راشن استعمال کرتے ہیں اور نکل پڑتے ہیں۔" سائمن نے کہا۔

"کاش کہ چند لمحوں کے لیے یہ بارش تھم جائے اور میں یاد کرسکوں کہ بارش کے بغیر رہنا کیسا لگتا ہے۔" پکارڈ نے کرب آمیز لہجے میں کہا پھر وہ کہنے لگا۔ "مجھے یاد ہے کہ اسکول کے زمانے میں ایک لڑکا میرے پیچھے بیٹھتا تھا۔ وہ ہر تھوڑی دیر بعد مجھے چٹکی کاٹتا تھا جس کی وجہ سے میرے بازو اکثر سوجے رہتے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ ان چٹکیوں کی اذیت سے تو میں پاگل ہوجاؤں گا۔ پھر ایک دن ایسا ہی ہوا اور میں نے دھات کا ترازو اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ میں تو شاید اس کا گلا ہی کاٹ دیتا اگر دوسرے لوگ مجھے پیچھے نہ کھینچ لیتے۔" پکارڈ سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا۔ "یہ بارش بھی اس چٹکی کی طرح مجھے پاگل کیے جارہی ہے لیکن اب کس سے کہوں، کس کو ماروں، کس سے کہوں کہ مجھے چھوڑ دے؟" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"ہم اگلی پناہ گاہ آفتاب تک شام چار بجے تک پہنچ جائیں گے۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔

"اگر باقی سب پناہ گاہیں بھی اسی طرح تباہ کردی گئی ہوئیں اور ان کی چھتوں سے بھی بارش کا پانی اندر آتا ہوتو کیا ہوگا؟" پکارڈ نے کہا۔

"میرے خیال میں ہمیں ایک بار قسمت آزمانا چاہیے۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔

"میں تھک گیا ہوں قسمت آزماتے آزماتے۔ مجھے بس ایک چھت چاہیے اور بس۔" پکارڈ نے کہا۔

"صرف آٹھ گھنٹے ہیں، اگر برداشت کرسکو تو۔"

"میں کرلوں گا۔" پکارڈ... کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

"چلو، پھر کھاتے ہیں۔" سائمن نے جواب دیا۔

☆☆☆

کھانے کے بعد وہ دوبارہ ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف روانہ ہوگئے۔ چار گھنٹے بعد انہیں دریا کے گرد ایک اندرونی راستہ لینا پڑا جو چوڑا اور اتنا تیز تھا کہ اس پر کشتی نہیں چل سکتی تھی۔ چھ میل چلنے کے بعد وہ سخت زمین پر چلتے ہوئے سمندر تک جا پہنچے۔

"مجھے نیند چاہیے۔" پکارڈ بولا اور تھک کر بیٹھ گیا۔ "چار ہفتوں سے سویا نہیں ہوں۔ بہت کوشش کی لیکن نہیں سوسکا۔ اب مجھ میں مزید چلنے کی ہمت نہیں ہے۔"

آسمان تاریک ہوتا جارہا تھا اور وینس پر رات چھارہی تھی جو اتنی سیاہ تھی کہ چلنا بھی خطرناک تھا۔ سائمن اور لیفٹیننٹ بھی گھٹنوں کے بل گر گئے۔

"چلو، دیکھتے ہیں کہ کیا ہوسکتا ہے۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔ "لیکن میرا نہیں خیال کہ اس موسم میں ہمیں نیند آسکے گی۔"

انہوں نے لیٹ کر اپنے سروں کو کچھ اونچا کیا تا کہ ان میں پانی نہ جاسکے اور سونے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

ان کے جسم پر بارش کے قطرے گرتے اور پہلے سے موجود پانی کے ساتھ مل کر چھوٹی چھوٹی نہریں بنارہے تھے۔ لیفٹیننٹ کو یوں محسوس ہوا جیسے جنگل کی جڑی بوٹیاں اس کے جسم سے لپٹنے کی کوشش کررہی ہوں اور سبز کائی انہیں اپنے حصار میں لینے کی کوشش کررہی ہو۔ لیفٹیننٹ نے دوسرے

دو آدمیوں کی طرف دیکھا جو یوں لگ رہے تھے جیسے گرے ہوئے درخت ہوں اور ان پر سبز گھاس اور پھولوں کی بیل نہ چڑھ گئی ہو۔

چہرے پر مسلسل گرتی بارش سے تنگ آکر اس نے کروٹ لی اور الٹا ہو کر لیٹ گیا پھر اچانک وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنے جسم سے پانی جھاڑنے لگا۔ اسی ہڑبڑاہٹ میں وہ کسی سے ٹکرا گیا۔ یہ سائمن تھا جو گھٹن سے لڑتے ہوئے کھانس رہا تھا۔ پھر پکارڈ اٹھ کھڑا ہوا اور بدحواسی سے ادھر اُدھر دوڑنے لگا۔

"ٹھہرو پکارڈ!"

"بند کرو...... جلدی بند کرو۔" وہ چیخا اور اپنی بندوق سے آسمان کی طرف فائر کرنے لگا۔ گولیوں کی چمک میں انہوں نے دیکھا جیسے بارش کے قطرے فضا میں جمنے لگے ہوں، پھر روشنی ختم ہوئی اور وہ قطرے جو چند لمحوں کے لیے ہوا میں ٹھہر گئے تھے، دوبارہ زمین پر گرنے لگے۔

"بند کرو...... جلدی بند کرو۔" پکارڈ پر جیسے پاگل پن سوار ہو گیا تھا۔ لیفٹیننٹ نے ہاتھ میں موجود لائٹ روشن کر کے پکارڈ کے چہرے پر ڈالی تو وہ دہل کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل چکی تھیں، منہ کھلا ہوا تھا اور چہرہ اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ پانی اس کی آنکھوں میں پڑ رہا تھا جو ناک میں بلبلے بناتے ہوئے زبان پر گرتا اور ہونٹوں سے سرکتا جا رہا تھا۔

"پکارڈ!"

لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ وہ کافی دیر تک یونہی کھڑا رہا۔ بارش کی بوندیں اس کے کانوں سے بہہ رہی تھیں۔

"پکارڈ! جلدی کرو، ہمیں چلنا چاہیے۔ ہمارے ساتھ آؤ۔"

"پکارڈ! کیا تمہیں ہماری آواز آرہی ہے؟" لیفٹیننٹ نے اس کے پاس جا کر اونچی آواز میں کہا۔

"اسے یہیں رہنے دو۔" سائمن نے کہا۔

"لیکن ہم اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

"یہ خود کے لیے بھی بیکار ہے اور ہمارے لیے بھی۔ مجھے پتا ہے یہ یہیں کھڑا رہے گا اور پھر پانی میں ڈوب جائے گا۔" سائمن نے تھوکتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس کی حالت دیکھ کر سمجھ جانا چاہیے۔ وہ سر اوپر اٹھائے ہوئے ہے اور بارش اس کے ناک اور منہ سے اندر جا رہی ہے۔"

"نہیں۔"

"تمہیں یاد ہے کہ ہمیں جنرل مینڈٹ بھی ایسے ہی ایک چٹان پر بیٹھا ہوا ملا تھا۔ اس کا چہرہ آسمان کی طرف تھا اور پھیپھڑے پانی سے بھر چکے تھے۔"

"پکارڈ!" لیفٹیننٹ نے دوبارہ روشنی پکارڈ کے چہرے پر ڈالی اور ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک تھپڑ بھی رسید کیا۔

"وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر سکتا۔" سائمن نے کہا۔ "اس بارش میں رہنے سے انسان کے ہاتھ پاؤں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔"

لیفٹیننٹ نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں وحشت پھیل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنا ہاتھ محسوس نہیں کر سکتا۔

"لیکن ہم پکارڈ کو یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔" سائمن نے پکارڈ کی طرف اپنی بندوق سیدھی کی اور فائر کر دیا۔ پکارڈ کسی بے جان چیز کی طرح بارش زدہ زمین پر گر گیا۔

"تم بھی حرکت مت کرو ورنہ تمہارے لیے بھی میری بندوق تیار ہے۔" سائمن نے بندوق کی سمت لیفٹیننٹ کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی وہ یا تو بیٹھا رہتا یا کھڑے کھڑے ہی اس بارش میں ڈوب جاتا۔ ہم نے تو اس پر احسان کیا جو اسے اس تکلیف دہ صورت حال سے بچا لیا۔"

لیفٹیننٹ نے لاش کی طرف دیکھا اور پلکیں جھپکائیں۔ "مگر تم نے تو اسے مار ہی ڈالا۔"

"ہاں، ویسے بھی وہ ہمارے لیے بوجھ بن چکا تھا۔ تم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا، اس پر پاگل پن سوار ہو چکا تھا۔" سائمن نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

کچھ لمحے بعد لیفٹیننٹ نے سر ہلایا اور وہ دونوں بارش میں چل پڑے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ان کے ہاتھ میں موجود لائٹ کی روشنی صرف چند قدم دور تک ہی جا پا رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ تھک کر رک گئے اور بھوک سے نڈھال صبح کا انتظار کرنے لگے۔ جب صبح ہوئی تو انہوں نے پھر سے چلنا شروع کر دیا۔

"ہم نے غلط اندازہ لگایا تھا۔" سائمن نے کہا۔

"نہیں، میرا خیال ہے کہ بس ایک گھنٹا اور رہ گیا۔"

"اونچا بولو، مجھے سنائی نہیں دے رہا۔" سائمن نے اپنے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ "یوں لگ رہا ہے جیسے مسلسل بارش کی وجہ سے میرے کان بند ہو چکے ہیں۔"

"کیا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا؟" لیفٹیننٹ نے پوچھا۔



Scanned with CamScanner

سائمن کی آنکھوں میں حیرت پھیل گئی۔ ”کیا کہا؟“

”کچھ نہیں، چلو آگے۔“ لیفٹیننٹ نے کہا۔

”میرا خیال ہے میں یہیں بیٹھتا ہوں، تم چلے جاؤ۔“ سائمن نے نیچے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”میں تمہیں سن نہیں پا رہا۔ تم چلو، میں تھک چکا ہوں۔ مجھے نہیں لگتا ہے کہ اس طرف پناہ آفتاب ہے اور اگر ہوئی بھی تو پچھلی بار کی طرح اس کی بھی چھت ٹپک رہی ہوگی، اس لیے میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔“

”میں کہتا ہوں، اٹھ جاؤ۔“

”نہیں لیفٹیننٹ! اب نہیں۔“

”اتنا نزدیک پہنچ کر ہمت مت ہارو۔“

”میرے پاس بندوق ہے اور یہی میری راہنمائی کرے گی۔ ویسے بھی اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ابھی تک تو میں پاگل نہیں ہوا لیکن مجھے لگتا ہے کہ جلد ہو جاؤں گا، اس لیے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ جیسے ہی تم میری نظروں سے اوجھل ہو گے تو میں یہ بندوق اپنے لیے استعمال کروں گا۔“ سائمن نے کہا تو اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

”سائمن!“

”تم نے میرا نام لیا ہے نا؟ میں تمہارے ہونٹوں کی حرکت سے سمجھ گیا ہوں۔“ سائمن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”سائمن!“ لیفٹیننٹ نے دکھ بھرے لہجے میں اسے پکارا۔

”دیکھو، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ میں اب مروں یا کچھ گھنٹوں کے بعد۔ ذرا سوچو، اگر تم اگلی پناہ گاہ کے پاس پہنچ گئے اور اس کی بھی چھت ٹپک رہی ہو تو تمہیں کیسا لگے گا؟“ سائمن نے دلیل دی۔

لیفٹیننٹ یہ سن کر کچھ دیر کے لیے رکا اور آگے بڑھ گیا۔ تھوڑا آگے جا کر وہ مڑا اور اس نے ایک بار پھر سائمن کو پکارا مگر وہ خاموش اپنی جگہ بیٹھا، بندوق ہاتھ میں لیے اس کے نظروں سے اوجھل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ سائمن نے آخری بار اسے دیکھا اور سر ہلا کر الوداع کیا۔

بھوک سے نڈھال لیفٹیننٹ نے چلتے ہوئے راستے میں موجود پھول کھانے کی کوشش کی مگر معدے نے کچھ دیر برداشت کرنے کے بعد قے کر دی۔ اس نے بارش سے بچنے کے لیے پتوں کی ایک ٹوپی بنانے کی کوشش کی جیسا کہ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی کر چکا تھا مگر بارش اس بار بھی پتوں کو اس کے سر سے بہا کر لے گئی۔

”پانچ منٹ اور پھر میں سمندر میں اتر کر چلا جاؤں گا۔“ لیفٹیننٹ نے سوچا۔

وہ کیچڑ اور جنگلی پودوں میں لڑکھڑاتا ہوا ایک چھوٹی سی پہاڑی پر پہنچا۔ دور بارش میں اسے ایک پیلا سا دھبا دکھائی دیا۔ غالباً اگلی پناہ گاہ۔ وہ چند لمحے یونہی کچھ فاصلے پر درختوں کے بیچوں بیچ اس گول پیلی عمارت کو تکتا رہا اور پھر ایک دم جوش سے اس کی طرف دوڑ پڑا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد خوف نے اس کی رفتار سست کر دی۔ ایک خوفناک اندیشہ اس کے ذہن میں گونجنے لگا۔

”اگر یہ وہی پرانی پناہ گاہ ہوئی جس میں کوئی سورج نہیں تھا تو کیا ہوگا؟“ اس کا پاؤں رپٹا اور وہ پھسل کر نیچے جا گرا۔ اسے اپنے اندر سے ایک آواز سنائی دی۔

”سکون سے لیٹ جاؤ۔ آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں، یہ وہی پرانی پناہ گاہ ہے۔“

مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا اور اٹھ کر آگے بڑھا۔ رفتہ رفتہ وہ پیلی روشنی نزدیک آتی گئی۔ اس کے ہاتھوں نے دیوار میں موجود شیشوں کو چھوا۔ دوسرے ہی لمحے وہ عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ عمارت کے دروازے پر موجود ”پناہ آفتاب“ کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ اس نے سن ہوتے ہاتھوں سے دروازہ چھوا، کنڈی گھمائی اور دروازہ کھول کر لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ دروازے کے سامنے ایک میز پر گرما گرم بھاپ اڑاتی ہوئی چاکلیٹ موجود تھی اور اس کے ساتھ ہی ٹرے میں مرغی کے سینڈوچ اور تازہ کٹے ہوئے ٹماٹر اور پیاز رکھے ہوئے تھے۔

اندر ایک طرف سبز ترکی تولیا لٹک رہا تھا اور دائیں طرف حرارت دینے والی مشین رکھی ہوئی تھی جو پل بھر میں انسان کو خشک کر دیتی تھی۔ ایک کرسی پر نئی وردی رکھی ہوئی تھی، شاید اس جیسے ہی کسی گمشدہ کے لیے۔

اسے کچھ لوگ اپنی طرف بڑھتے نظر آئے مگر وہ خاموش رہا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنی آنکھوں، چہرے، سینے، بازوؤں اور ٹانگوں سے نمی خشک ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے اپنے چہرے پر گرمی محسوس ہوئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے کمرے کے وسط میں اونچائی پر تیرتا ہوا سورج دکھائی دیا۔ دروازہ بند کیا جا چکا تھا اور کمرے میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بارش صرف ایک یاد بن کر رہ گئی۔ اس نے نیلے آسمان میں موجود روشن سورج کو دیکھا اور آگے بڑھتے ہوئے اپنے کپڑے پھاڑنے لگا۔

⌘⌘⌘

ایران میں دشتِ لوط کے جنوب مشرق میں کرمان شاہ نامی جگہ آج بھی موجود ہے۔ وہاں تبع تابعین کے دور میں شاہ شجاع کی حکومت تھی۔ شاہ شجاع کو گھڑ سواری اور شکار کا بہت شوق تھا۔ ان کا زیادہ وقت گھوڑے کی پشت پر سوار سیر

کرمان شاہ جو آج بھی اس نام سے ایران میں موجود ہے، دشتِ لوط کے مشرق میں جنوب کی طرف۔ یہاں آپ کا خاندان حکمران تھا پھر آپ بادشاہ ہوگئے، عیش و عشرت، سیر و شکار، خواہشات کی فراوانی... جو چاہا پالیا، جو سوچا مل گیا۔ آخرت اور عقبیٰ نام کی کوئی شے اس بادشاہ کے لیے نہیں تھی۔ لہو و لعب ہی اس کا سب کچھ تھا... اللہ والوں نے بہت سمجھایا مگر انھوں نے کان نہ دھرے... پھر ایک انقلاب آگیا۔ اس انقلاب نے ہر شے کو اتھل پتھل کردیا۔ وہ بادشاہ جس کی بادشاہی چند روزہ تھی، دیکھتے ہی دیکھتے صوفیوں کا بادشاہ بن گیا اور وہ آج بھی ہم میں زندہ ہے... چکی کے دو پاٹوں میں آجانے والا پس کر فنا ہوجاتا ہے مگر وہ دانا جو چکی کی کیلی سے متصل ہوجاتا ہے، بچ جاتا ہے۔ یہ اللہ والے بھی اس دانے کی طرح حق کی کیلی سے لگ کر واصل بحق ہوجاتے ہیں اور زمانہ انہیں زندہ رکھتا ہے۔

ایک واصل بحق درویش کے دلچسپ اور ایمان افروز واقعات

# شاہ شجاع کرمانی

ضیا تسنیم بلگرامی

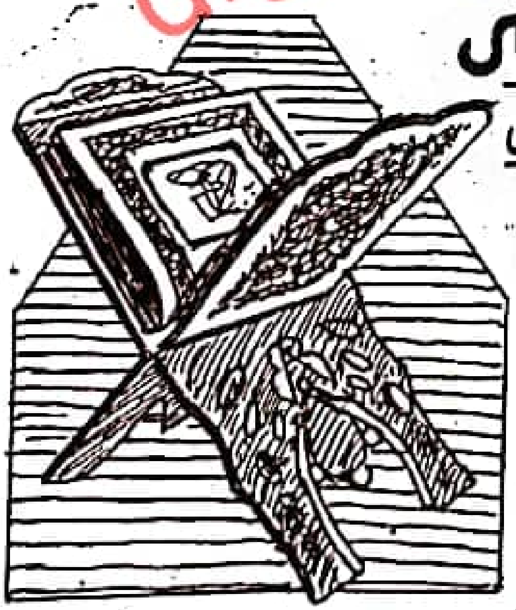

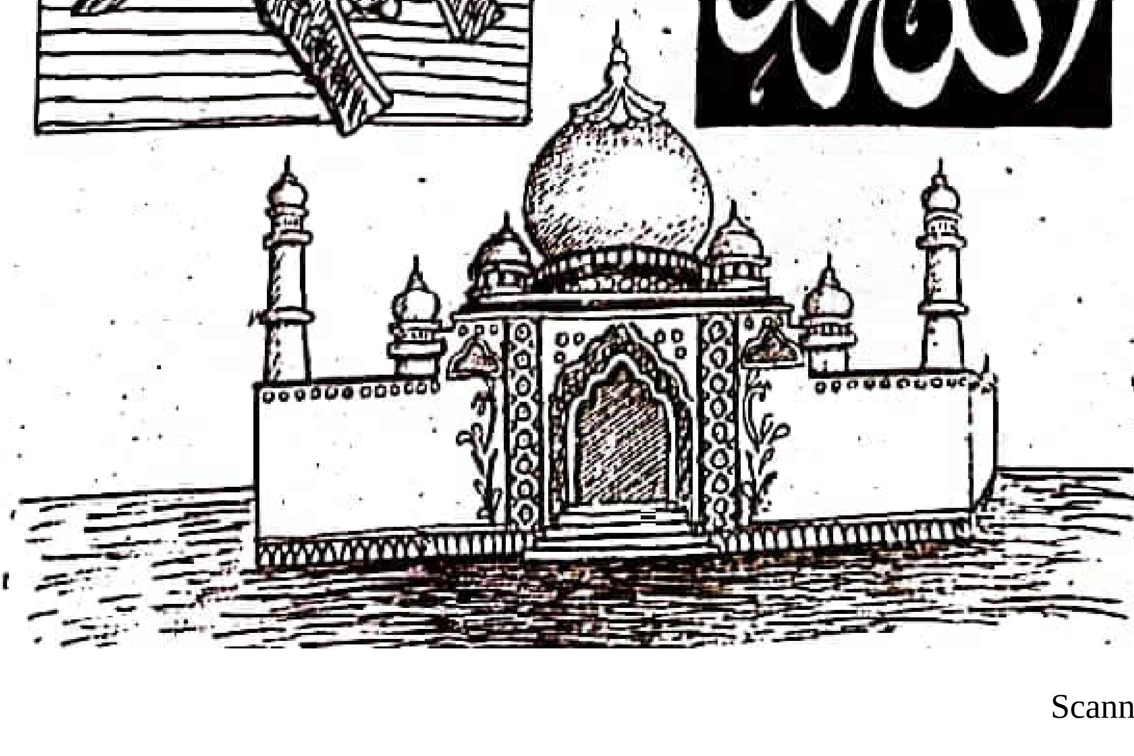

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

و شکار میں گزرتا۔ سالانہ گھڑسواری کے مقابلے ہوتے تو یہ بھی ان میں شریک ہوتے اور مقابلے میں اول آتے۔ قرب و جوار کے شہسوار ان کا شہرہ سن کر آتے، مقابلہ کرتے اور جب ہار کر واپس جانے لگتے تو کہتے۔ ''شاہ شجاع تو ابوالفوارس ہیں، ان سے جیتنا بہت مشکل ہے۔'' فوارس گھڑسوار کو کہتے ہیں اور ابوالفوارس کا مطلب ہوا ''گھڑسواروں کا باپ'' یعنی ماہر ترین گھڑسوار۔

رہنے کو شاندار محل تھا اور اس محل میں آرام و آسائش کی ساری چیزیں موجود تھیں۔ وہ دنیا کے عاشق تھے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے۔ اگر کسی اللہ والے نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو اس سے صاف صاف کہہ دیتے کہ تو اس حالت اور کیفیت کو کیا جانے جو ہمیں حاصل ہے۔ اگر تجھ کو بھی یہ عزت اور آرام میسر ہوتے تو، تو کبھی بھی ایسی باتیں نہ کرتا۔ جا دنیا کو حاصل کرنے کی کوشش کر۔ جب یہ مل جائے تو مجھے بتانا پھر میں تجھ سے پوچھوں گا کہ بتا اب کیا حال ہے تیرا؟

نصیحت کرنے والوں نے جب یہ دیکھا کہ شاہ شجاع کے دل و دماغ پر ان کی کوئی بات اثر ہی نہیں کر رہی تو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

میر شکار نے انہیں اطلاع دی کہ دشتِ لوط کے جنوبی کنارے پر ہرنوں کی ڈار دیکھی گئی ہے اور شکاریوں میں اس ڈار کا بڑا چرچا ہے۔

شاہ شجاع کے لیے اس خبر میں بڑی کشش تھی۔ فوراً حکم دیا کہ شکار کی تیاری کی جائے۔

شکار کی تیاری شروع ہو گئی اور تیر کمان، فتراک، خنجر اور خیمہ و خرگاہ کے ساتھ شکاریوں کا قافلہ مذکورہ سمت چل پڑا۔ شاہ شجاع شکار کھیلنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ میر شکار اپنی دلچسپ باتوں سے شاہ کا دل بہلا رہا تھا۔ آخر جب وہ جگہ قریب آئی تو کھلے میدان میں خیمے نصب کر دیے گئے اور شاہ نے اپنے خدمت گاروں کو تو وہیں چھوڑا اور خود شکار کھیلنے کے لیے جنگل میں داخل ہو گیا۔ میر شکار اور معاون شکاریوں کی ایک جماعت شاہ کے ساتھ ساتھ تھی۔

شاہ شجاع ہرنوں کی ڈار کی تلاش میں ادھر ادھر گھوڑے دوڑاتا رہا لیکن مایوسی کے سوا وہاں کچھ بھی نہ ملا۔ اب وہ میر شکار پر برس پڑا، بولا۔ ''کہاں ہے وہ ہرنوں کی ڈار جس کی تو بڑی تعریفیں کر رہا تھا؟''

میر شکار نے جواب دیا۔ ''جناب والا! میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ آپ خود ملاحظہ فرمالیں گے کہ وہ ہمیں یہیں کہیں مل جائے گی۔''

شاہ شجاع اس ڈار کو پھر تلاش کرنے لگا اور میر شکار کو متنبہ کیا، بولا۔ ''دیکھ، اگر وہ ڈار نہ ملی تو تیری خیر نہیں۔ میں اس کے لالچ میں خاصا خوار ہوتا پھر رہا ہوں، اسے ملنا ضرور چاہیے۔ اگر وہ نہ آئی یا نہ ملی تو تم سب کی بھی خیر نہیں۔''

اور وہ لوگ ایک بار پھر ہرنوں کی ڈار کی تلاش میں تیزی اور شدت دکھانے لگے۔ اس تگ و دو اور بھاگ دوڑ میں شاہ شجاع اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ یہ ہرنوں کی ڈار کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ شاہ شجاع نے اپنا گھوڑا ان کے پیچھے ڈال رکھا تھا۔

ڈار کچھ اس طرح بھاگ رہی تھی کہ شاہ شجاع ان پر حملہ آور ہو گئے۔ کئی تیر ان پر چھوڑے مگر اس سے ایک ہرن بھی شکار نہیں ہوا۔ انہیں اپنی ناکامی اور مایوسی پر غصہ آ رہا تھا۔

یہ کچھ دیر بعد تھک گئے اور ادھر ادھر پناہ گاہ کی تلاش میں پھرنے لگے۔ ہرنوں کی ڈار ان کے سامنے چرنے میں مشغول تھی لیکن اب ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کا شکار کرتے۔ یہ تھک ہار کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور اپنے آدمیوں کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی یہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ انہیں اپنے قریب ہی کہیں سے مختلف درندوں کے بولنے اور غرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ تیر کمان سنبھال کر بیٹھ گئے۔

اتنے میں انہوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ایسا منظر کہ اس سے پہلے کسی اور نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ انہوں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو ایک گرانڈیل چیتے پر سوار ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا اور اس کے چاروں طرف دوسرے درندے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، مطیع و فرمانبردار جانوروں کی طرح۔ شاہ شجاع کو بڑی حیرت تھی کہ یہ کیسا انسان ہے کہ اسے درندوں سے ڈر نہیں لگتا اور درندے اس کے مطیع و فرمانبردار کیونکر ہو گئے؟ شاہ شجاع کو ان درندوں سے خوف آ رہا تھا۔ پہلے کچھ دیر تو یہ ہمت کر کے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے لیکن پھر جب انہوں نے محسوس کر لیا کہ درندوں کی نیت ٹھیک نہیں ہے تو یہ چپکے



Scanned with CamScanner

سے اٹھے اور اپنے گھوڑے کی طرف بڑھے لیکن درندوں نے بھی ان کا ارادہ سمجھ لیا تھا۔ وہ زبانیں باہر نکالے اور آنکھوں میں خونخواریت لیے ان کی طرف بڑھے۔ ان کی رفتار میں زیادہ تیزی آ گئی۔ درندے بھی اور تیزی سے ان کی طرف بڑھے اور جب ان دونوں کا فاصلہ برائے نام رہ گیا تو چیتے کی پشت پر سوار نوجوان نے درندوں کو ڈانٹا۔

''کیا کرتے ہو، یہ شاہ شجاع ہیں۔ کیا تم انہیں نہیں جانتے؟ یہ کرمان کے حکمراں ہیں، تم سب ان کی رعایا ہو۔ خبردار! جو انہیں گزند پہنچانے کی کوشش بھی کی۔''

درندے جہاں تک آئے تھے، وہیں رک گئے اور ''کوں کوں'' کرنے لگے۔

شاہ شجاع کو اس نوجوان پر اور زیادہ حیرت ہوئی جس کا حکم درندوں پر بھی چل رہا تھا۔ شاہ شجاع خود بھی جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ اس نوجوان کے پاس جائیں اور اس سے باتیں کریں مگر درندوں کے حصار میں جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

نوجوان نے انہیں دور ہی سے مخاطب کیا۔ ''کیا سوچ رہے ہو شاہ شجاع؟''

شاہ شجاع نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر میں تجھ سے ملنا چاہوں اور تجھ سے باتیں کرنا چاہوں تو کیا کروں اور کس طرح تیرے پاس آؤں؟ یہ درندے مجھے آنے ہی نہیں دیں گے۔''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں آنے دیں گے؟ کیا یہ تمہارا علاقہ نہیں ہے، کیا یہ تمہاری رعایا نہیں ہیں؟ تعجب ہے کہ بادشاہ کی رعایا اس کا ادب نہ کرے اور اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے، تم کیسے بادشاہ ہو؟''

شاہ شجاع نے کہا۔ ''میں بادشاہ ہوں، میری رعایا مجھ سے محبت بھی کرتی ہے اور مجھ سے خوفزدہ بھی رہتی ہے مگر یہ تو درندے ہیں، عقل و شعور سے عاری درندے۔ یہ کیا جانیں کہ بادشاہ کیا ہوتا ہے، وزیر کسے کہتے ہیں۔ ان پر میرا رعب کیونکر قائم ہو سکتا ہے؟''

نوجوان نے تحقیر آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''تب پھر تم حکومت چھوڑ دو۔ میری طرف دیکھو اور مجھ سے سیکھو۔ میں نہ تو کسی سے ڈرتا ہوں نہ کسی پر میرا ایسا رعب ہے کہ کوئی میرا دبدبہ اور خوف کھو۔ یہ درندے جنہیں تم میرے آس پاس دیکھ رہے ہو، یہ مجھ سے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔ ہاں، احترام البتہ کرتے ہیں۔''

شاہ شجاع نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟ کس طرح؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''دیکھو شاہ شجاع! تم ایک دنیادار انسان ہو، دنیا ہی تمہارے لیے سب کچھ ہے حالانکہ میں تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھ رہا ہوں کہ وہاں حُبِ دنیا کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس میں اللہ کی محبت اور دنیا سے بیزاری پائی جاتی ہے مگر دل کا یہ حصہ ابھی تک سنسان کیوں ہے؟''

شاہ شجاع نے کہا۔ ''مگر نوجوان تم ہو کون؟ حیرت ہے کہ تم نے میرے دل کی گہرائیوں میں اتر کر بھی دیکھ لیا اور میں اپنے دل کی اس کیفیت سے ناواقف ہوں۔''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''شاہ شجاع! بات صرف اتنی سی ہے کہ تم ابھی تک دنیا کے عشق میں مبتلا ہو۔ دنیا نے تمہیں غافل کر رکھا ہے اور سیر و شکار سے تمہیں فرصت ہی نہیں ہے حالانکہ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس دنیا کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے، دوسری دنیا۔ تمہارا ابھی ایک آقا ہے۔''

شاہ شجاع نے کہا۔ ''تیری باتیں بھی تیری ہی طرح عجیب و غریب ہیں۔ میں اپنے آدمیوں سے بچھڑ گیا ہوں، مجھے ان کا انتظار ہے۔ پھر کوئی وقت دے تو بہت ساری باتیں بھی ہو جائیں گی۔ اس وقت میں بہت تھکا ہوا بھی ہوں۔''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''پھر کیا معنی؟ ابھی کیوں نہیں۔ دوبارہ نہ تو میں ملوں گا اور نہ تم ہاتھ آؤ گے۔ اس لیے مجھے جو کچھ کہنا سننا ہے اسی وقت کہہ سن لوں گا۔ دیکھو شاہ شجاع! تمہارا بھی ایک آقا ہے۔ اگر تمہارا کوئی غلام تمہاری خدمت نہ کرے اور تم سے انعام و اکرام کا بھی خواستگار ہو، تو تم اس کی حماقت یا سادہ لوحی پر ہنسو گے یا انعام و اکرام سے نواز دو گے؟''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''سیدھی بات ہے، جس نے خدمت ہی نہ کی ہو وہ انعام و اکرام کا مستحق کیونکر ہو سکتا ہے؟''

نوجوان ہنسنے لگا، بولا۔ ''شاہ شجاع! خدا تمہارا بھلا کرے۔ یہی میں بھی تم سے کہلوانا چاہتا تھا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے آقا کی کتنی خدمت کی ہے جو اس سے آخرت میں انعام و اکرام کی خواہش کرو گے اور اگر تم اس کی خواہش کرو گے بھی تو کیا یہ تمہاری حماقت اور سادہ لوحی نہیں ہو گی؟''



Scanned with CamScanner

شاہ شجاع کا دل کروٹ لے رہا تھا، اس کے سوئے ہوئے جسے بھی بیدار ہو رہے تھے۔ شاہ شجاع بھاگ دوڑ سے بہت تھکے ہوئے تھے اور انہیں بھوک پیاس نے بھی تنگ کر رکھا تھا، بولے۔ ''اے نوجوان! میں نے کہہ تو دیا کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور مجھے اپنے آدمیوں کا بھی انتظار ہے کیونکہ کھانے پینے کا سامان ان کے پاس ہے اور میں یہاں بھوک پیاس سے ہلکان ہو رہا ہوں۔''

نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں خود بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ بھوک پیاس نے تمہیں پریشان اور ہلکان کر رکھا ہے اور دنیادار لوگوں کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ مت گھبراؤ، میں تمہاری پیاس کا انتظام بھی کیے دیتا ہوں۔''

اس کے بعد نوجوان نے کسی اور زبان میں کسی سے کچھ کہا۔ جواب میں ایک بوڑھی عورت ایک ہاتھ میں پانی کا پیالہ اور دوسرے میں کھانا لیے ہوئے نمودار ہوئی۔ نوجوان نے کہا۔ ''شاہ شجاع! یہ شاہی کھانا تو نہیں ہے لیکن ہے بہت مزیدار۔ اسے کھالو، اس کے بعد پانی پی لو۔''

شاہ شجاع نے یہ کھانا جو کھایا تو یہ اتنا لذیذ اور مزیدار نکلا کہ پچھلے تمام کھانے حقیر اور بے مزہ محسوس ہونے لگے۔ انہوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔ پانی کا پیالہ نوجوان کے ہاتھ میں تھا۔ اس میں سے اس نے کچھ خود پی لیا اور بقیہ شاہ شجاع کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''معاف کیجیے گا شاہ شجاع! میں بھی پیاسا تھا اس لیے میں نے بھی تھوڑا سا پی لیا۔''

شاہ شجاع کی پیاس جھوٹے اور غیر جھوٹے کی پروا نہیں کر رہی تھی۔ انہوں نے پیالے کا جھوٹا پانی بے تکلف پی لیا اور دل ہی دل میں انہیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اتنا میٹھا اور مزیدار پانی انہوں نے پہلے کبھی نہیں پیا تھا۔ شاہ شجاع نے اس بوڑھی عورت کو نظروں سے تلاش کیا مگر اب وہ وہاں نہیں تھی۔

نوجوان نے پوچھا۔ ''شاہ شجاع! کس کو تلاش کر رہے ہو؟''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''اس عورت کو جو یہ کھانے پینے کا سامان لائی تھی۔''

نوجوان نے پوچھا۔ ''اگر وہ تمہیں مل جائے تو تم کیا کرو گے؟''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''میں اس سے پوچھوں گا کہ وہ یہ کھانے پینے کا سامان کہاں سے لائی تھی۔ میں اس سے اس شخص کا پتا پوچھوں گا جس نے اتنا لذیذ کھانا پکایا اور اس شخص کا پتا بھی پوچھوں گا جس نے یہ شربت بنا کے بھیجا تھا۔''

نوجوان کو ہنسی آ گئی، بولا۔ ''وہ بڑھیا تو تمہاری ملازم ہے اور اسی کو تم نہیں پہچانتے؟ تعجب ہے۔''

شاہ شجاع نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ میری ملازم ہے اور میں ہی اس سے واقف نہیں، کمال ہو گیا۔ اس کا نام کیا ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''دنیا...... یہ تمہاری نوکر ہے۔ بس یہی چیز تمہارے اختیار میں ہے شاہ شجاع! اور ذرا اس پہلو پر بھی غور کرو کہ دنیا نوکر تو تمہاری ہے اور تعمیل کرتی ہے میرے حکم کی۔''

شاہ شجاع نے کہا۔ ''دیکھو بھائی! بھوک لگی تھی، کھانا مل گیا، کھا لیا اور شکم سیر ہو گیا۔ پیاس لگی تھی، پانی مل گیا، پی لیا اور شکم سیر ہو گیا۔ اب یہ باتیں کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ مجھ سے میرے آدمی بچھڑ گئے ہیں، وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ اب میں انہیں تلاش کروں گا۔''

لیکن نوجوان کہاں پیچھا چھوڑنے والا تھا، بولا۔ ''شاہ شجاع! جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ آج کے بعد پھر کون کس سے ملے گا، میں اپنا فرض آج ہی ادا کر دینا چاہتا ہوں۔ سنو، یہ بڑھیا جس نے ہمیں کھانا پہنچایا، آج کل اس کو میری خدمت پر متعین کیا گیا ہے۔''

شاہ شجاع کو اب یہ باتیں فضول لگ رہی تھیں، بولا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔''

نوجوان نے کہا۔ ''جانا چاہتے ہو...... کہاں؟ کہاں جاؤ گے؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں اپنے آپ پر اختیار ہے؟ تمہارے اختیار کا تو اندازہ مجھے بھی ہو گیا۔ تم کرمان کے بادشاہ ہو مگر حالت یہ ہے کہ یہ درندے تم سے نہیں ڈرتے، تم ان سے ڈرتے ہو۔ تم بے انتہا مال و دولت کے مالک ہو مگر حال یہ ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے تم بھوکے پیاسے تھے اور تمہارے پاس ایک لقمہ کھانے کا اور ایک گھونٹ پانی کا بھی نہیں تھا۔ تمہیں دنیا دی گئی ہے لیکن آقا بنا کے؟ دنیا تمہاری آقا ہے اور تم اس کے غلام ہو۔ مجھے دیکھو، میری طرف۔ مجھے بھی دنیا دی گئی ہے لیکن میں آقا ہوں اور دنیا غلام۔ میں جہاں چاہوں اپنے غلام کو طلب کر لوں۔''



Scanned with CamScanner

شاہ شجاع نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”اسی طرح جس طرح کچھ دیر پہلے بڑھیا آئی تھی...... اور کس طرح۔“

شاہ شجاع کو اب ادھر بھی توجہ دینا پڑی، پوچھا۔ ”کیا اس عورت کو جب تم چاہو بلالو، آجائے گی؟“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”ابھی تم نے دیکھا نہیں کیا؟ شاہ شجاع جب دنیا تخلیق کی جارہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت دنیا سے یہ کہہ دیا تھا کہ اے دنیا! جو کوئی میری خدمت کرے گا تو بھی اس کی خدمت کرے گی اور جو تیری خدمت کرے گا تو تجھے اختیار ہے کہ تو اس سے خدمت لیتی رہ۔“

اب شاہ شجاع میں انقلاب آچکا تھا۔ نوجوان سے کہا۔ ”ہاں تو، تو نے کیا کہا، ذرا پھر سے تو کہنا۔ جب اللہ نے دنیا کو تخلیق کیا تھا تو اس سے کیا کہا تھا؟“ نوجوان نے اپنی بات دہرادی۔

شاہ شجاع کا دل بھر آیا، آنکھیں بھیگ گئیں، آہستہ سے کہا۔ ”ہاں تو نوجوان! خدا تجھے اور زیادہ بلند مقام عطا فرمائے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو نے ایک اور بھی کام کی بات کی تھی، آقا اور غلام والی۔ جو غلام اپنے آقا کی خدمت نہیں کرے گا وہ انعام واکرام کا حقدار کیونکر ہوگا۔ شاید یہی بات کی تھی تو نے۔“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔“

شاہ شجاع نے کہا۔ ”ہاں، ایک بار پھر اپنی زبان سے کہہ۔ تیری زبان کی بات ہی کچھ اور ہے۔“

نوجوان نے جوابادہی باتیں دوبارہ دہرادیں۔

شاہ شجاع کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”جس نے خدمت ہی نہ کی ہو وہ انعام واکرام کا مستحق کیونکر ہوسکتا ہے۔“

نوجوان نے کہا۔ ”درست۔ تمہارا بھی ایک آقا ہے شاہ شجاع! تم اپنے آقا کی یہاں خدمت کرو گے تو دوسری دنیا میں اس کا انعام واکرام بھی حاصل کرو گے۔“

شاہ شجاع پر رقت طاری ہوگئی، کہا۔ ”میں نے اپنی عمر کا کتنا حصہ لہو ولعب میں ضائع کردیا ہے۔ اب میں کس طرح اس گھاٹے کو پورا کروں گا؟“

نوجوان نے انہیں تسلیاں دیں، کہا۔ ”جو گزر گیا اس پر منفعل ہوجانا ہی کافی ہے۔ توبہ کرو اور اللہ سے دعا مانگو کہ وہ آئندہ تمہیں ان کوتاہیوں اور غفلتوں سے دور رکھے اور آج ہی سے اللہ کی طرف راغب ہوجاؤ۔“

شاہ شجاع نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنی غفلتوں اور لغزشوں سے پُر ماضی پر غور کیا تو دل ہولنے لگا۔ انہیں رونا آگیا اور آہ وزاری کرنے لگے۔ ”الٰہ العالمین! میری غفلتوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمادے۔ میں بے حد شرمندہ ہوں۔ اب میں تیرے سوا کس کے پاس جاؤں اور کس سے معافی مانگوں۔ میری توبہ قبول فرمالے، اپنے رسول ختمی مرتبت ﷺ کے طفیل۔“

اب شاہ شجاع نے آنکھیں جو کھولیں تو وہاں نہ تو وہ نوجوان تھے اور نہ درندے۔ یہ پریشان حال اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ آخر انہیں قرار آگیا اور وہ آہستہ آہستہ اپنے گھوڑے کے پاس گئے، کمان کو شانے میں پھنسایا اور تیر کو ترکش میں ڈال لیا۔ اب وہ اپنے آدمیوں کی تلاش میں جارہے تھے، ان کے آدمی انہیں تلاش کررہے تھے۔ پھر جب ساتھیوں سے ملاقات ہوگئی تو شاہ شجاع نے انہیں حکم دیا کہ شکار نہیں کھیلا جائے گا، ہم سب واپس چلیں گے۔

میر شکار نے عرض کیا۔ ”لیکن حضور والا! کیا خالی ہاتھ؟ شکار تو ہم نے کیا ہی نہیں۔“

شاہ شجاع نے حکم دیا۔ ”میں نے حکم جو دیا، اب شکار نہیں کھیلا جائے گا۔“

خیمہ وخرگاہ اکھڑنے لگے۔ سامانِ خورد ونوش مویشیوں پر بار کردیا گیا اور یہ لوگ شاہی محل کی طرف روانہ ہوگئے۔

شاہی محل میں داخل ہونے سے پہلے شاہ شجاع نے نہایت افسردگی سے اعلان کیا۔ ”دوستو! یہ میرا آخری شکار تھا۔ اب تم کسی اور کے ساتھ شکار کے لیے جایا کرو گے لیکن بہتر یہ تھا کہ تم لوگ بھی اس لہو ولعب سے توبہ کرلیتے تو اچھا تھا تاکہ عمر کے کسی بھی حصے میں میری طرح تمہیں بھی شرمندہ نہ ہونا پڑے۔“

☆☆☆

محل میں تمام رشتے داروں کی موجودگی میں شاہ شجاع نے حکومت اپنے بھائی کے حوالے کردی اور کہا۔ ”میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ضائع کردیا ہے، اب اس کو توبہ واستغفار سے پاک کرنا چاہتا ہوں۔“

بھائی نے کہا۔ ”بھائی صاحب! آپ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی فرمالیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو اپنے اس فیصلے پر شرمندہ



Scanned with CamScanner

ہونا پڑے۔"

شاہ شجاع نے جواب دیا۔"شرمندہ تو میں اپنے ماضی پر ہوں۔اللہ نے چاہا تو اب میں شرمندہ نہیں ہوں گا۔"

آپ کی ایک بچی تھی جو ابھی چھوٹی تھی۔بیوی نے یہ فیصلہ سنا تو پوچھا۔"اگر آپ حکومت سے کنارہ کش ہو جائیں گے تو رہیں گے کہاں اور ہماری گزر اوقات کس طرح ہوگی؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا۔"نیک بخت! کیا محل اور حکومت چھوڑ کے ہم اپنے رب سے بھی محروم ہو جائیں گے؟ کیا دنیا کا ہر انسان بادشاہ ہے اور شاہی محل میں رہتا ہے؟ ہرگز نہیں۔اب میں اللہ کے سوا ہر شے سے ناتا توڑ لوں گا۔اگر تو ہمارے ساتھ رہنا چاہے تو ٹھیک ہے ورنہ تو محل میں رہ سکتی ہے۔"

بیوی نے کہا۔"جہاں آپ ہوں گے، وہیں میں رہوں گی۔میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی۔"

شاہ شجاع نے جب محل چھوڑا اور حکومت سے کنارہ کشی اختیار کی تو بہتوں کو اس سے دکھ پہنچا۔انہوں نے آبادی سے دور ایک جھونپڑی بنالی اور اس میں رہنے لگے۔جب لوگ انہیں اس حال میں دیکھتے تو ان کے دلوں پر اس کا بڑا اثر ہوتا لیکن شاہ شجاع کو یہاں بہت سکون تھا۔شاہ شجاع دن بھر محنت مشقت کرتے اور رات کو صبر و شکر کر کے اللہ سے لو لگاتے۔قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی جہاں ان کے علاوہ اِدھر اُدھر کی چھوٹی بستیوں کے لوگ بھی نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔

اسی جھونپڑے نما کچے مکان میں ایک بچہ پیدا ہوا۔اس بچے کے سینے پر ہلکے سبز رنگ میں "اللہ جل شانہ" لکھا ہوا تھا۔شاید یہ نسیں تھیں جن سے قدرت نے "اللہ جل شانہ" لکھ دیا تھا۔اس کا چرچا ہوا اور لوگوں کا ہجوم بچے کو دیکھنے کے لیے آنے لگا۔

کسی نے آپ سے پوچھا۔"حضرت! اس کا کیا مطلب ہوا، آپ کچھ بتا سکتے ہیں؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا۔"میرا یہ لڑکا بھی اسی طرح اللہ کی طرف گریز اختیار کرے گا جس طرح میں مڑا ہوں۔اللہ اس کو لہو و لعب سے محفوظ رکھے اور اپنی طرف راغب فرمائے۔"

بچے کی پرورش جس ماحول میں ہو رہی تھی اس میں ناز و نعم اور آرام کا کہیں گزر ہی نہ تھا۔بچہ ذرا بڑا ہوا تو اسے یہ ماحول پسند نہیں آیا۔باپ نے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری خود اپنے سر لے رکھی تھی۔ذہانت اور اخذ و قبول میں کوئی کمی نہ تھی۔شاہ شجاع واعظانہ انداز میں جب کچھ بتاتے تو اس کو ان کی باتیں زیادہ پسند نہ آتیں۔اسی دوران لڑکے کی دوستی ان لڑکوں سے ہوگئی جو موسیقی سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔شہزادے کو بھی یہ شوق پیدا ہو گیا اور اس نے اپنے باپ سے چھپ کے بربط بجانا شروع کر دیا۔ہم عصر لڑکے شہزادے کی بربط نوازی سے بہت خوش ہوتے اور آپس میں کہتے کہ ہم نے دوسروں سے بربط سنا ہے لیکن ان میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔

جب اس کا چرچا عام ہوا تو شاہ شجاع کو بڑا دکھ ہوا اور بیٹے سے پوچھا۔"بیٹے! یہ میں لوگوں سے کیا سن رہا ہوں؟"

بیٹے نے جواب دیا۔"پتا نہیں آپ کیا سن رہے ہیں؟"

شاہ شجاع نے پوچھا۔"یہ تو سارا سارا دن کہاں غائب رہتا ہے آخر؟"

بیٹے نے جواب دیا۔"پتا نہیں میں کہاں غائب رہتا ہوں، آپ اس کا بھی پتا لگالیں۔"

شاہ شجاع کو اس جواب سے بڑی تکلیف پہنچی، کہا۔"بیٹے! دوستوں کی بری صحبت نے تجھ کو یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ گستاخی کرنے لگا ہے۔"

بیٹے نے جواب دیا۔"بابا جان! اس موضوع کو زیادہ نہ بڑھائیں تو اچھا ہے کیونکہ اس سے جتنی تکلیف آپ کو پہنچے گی، اس سے کچھ زیادہ مجھے ہوگی۔"

شاہ شجاع نے اسی وقت گفتگو بند کر دی اور بیٹے کو اس کے حال پر چھوڑ کر بیوی کے پاس چلے گئے۔اس کو ساری تفصیل بتا کر نہایت دردمندانہ انداز میں کہا۔"اب میں تو اس سے بات کروں گا نہیں، تم بات کرو، مجھے یہ لڑکا بہت دکھ پہنچا رہا ہے۔"

بیوی نے جواب دیا۔"میں اس سے بات کروں گی لیکن شاید ہی اس پر اثر ہو۔جب تک اس کو لڑکوں کی صحبت سے نہ نکالا جائے، اس کی اصلاح مشکل ہے۔"

شاہ شجاع نے پوچھا۔"کیا میں اس جگہ کو بھی چھوڑ دوں؟"

بیوی نے جواب دیا۔"اگر اس کی اصلاح مقصود ہے تو آپ کو یہ بھی کرنا ہوگا۔"

digestlibrary.com



Scanned with CamScanner

شاہ شجاع خود کو بے بس محسوس کر رہے تھے، بولے۔ ’’لیکن شاید بر بط نوازی کی عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ وہ جگہ اور ماحول بدلنے کے بعد بھی قائم رہے۔‘‘

بیوی نے کہا۔ ’’وہ تو ٹھیک ہے لیکن تدبیر کرنا بھی تو ضروری ہے۔‘‘

شاہ شجاع نے بے دلی سے کہا۔ ’’بہرحال یہ کر کے بھی دیکھ لوں گا۔‘‘

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں، دوسری طرف شاہ شجاع کے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا اور حکومت بھتیجے کے حصے میں آ گئی تھی۔ یہ خبریں ہر طرف گشت کر رہی تھیں، جب شاہ شجاع کی بیوی نے بیٹے سے بات کی اور کہا۔ ’’بیٹے! یہ میں تیرے بارے میں کیا سنتی رہتی ہوں؟‘‘

بیٹے نے جواب دیا۔ ’’یہ باتیں والد صاحب سے بھی ہو چکی ہیں ماں! براہِ کرم آپ اس موضوع پر کوئی بات نہ کیجیے۔‘‘

ماں نے غصے میں کہا۔ ’’واہ، یہ کیا بات ہوئی، میں تیرے منع کرنے سے باز آ جاؤں گی، یہ تو نے کس طرح سمجھ لیا؟‘‘

بیٹے نے پوچھا۔ ’’آخر آپ کیا باتیں کریں گی مجھ سے؟ یہ مجھے بھی تو معلوم ہو۔‘‘

ماں نے کہا۔ ’’بیٹے! تیرا باپ کتنا عبادت گزار اور اللہ والا ہے۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تو بربط نواز، شاہ شجاع کا بیٹا ہے تو وہ بہت افسوس کرتے ہیں اور تیرا باپ بھی شرمندہ ہو جاتا ہے۔‘‘

بیٹے نے کہا۔ ’’ماں! سنتا ہوں کہ چچا کا انتقال ہو گیا اور حکومت ان کے بیٹے کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اگر والد صاحب محل میں ہوتے تو یہ حکومت آج بھی انہی کے پاس ہوتی اور میں شاہی محل میں ٹھاٹ سے رہ رہا ہوتا لیکن آج جب میرے ساتھی، میرے دوست مجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ تیرے باپ نے تاج و تخت کو لات کیوں مار دی تو میں شرمندہ ہو جاتا ہوں اور انہیں کوئی جواب نہیں دے پاتا۔‘‘

ماں نے پوچھا۔ ’’آخر تو چاہتا کیا ہے؟‘‘

بیٹے نے جواب دیا۔ ’’میں چاہتا ہوں جس طرح میں دوسروں کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتا اسی طرح میرے معاملات میں بھی دخل نہ دیا جائے۔‘‘

ماں کو اس جواب سے بے حد افسوس ہوا۔ اس کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ شہزادہ بربط لیے گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں بجاتا پھر رہا ہے۔ شاہ شجاع اور ان کی بیوی نے اس پر صبر کر لیا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’اے اللہ! میں اس کی اصلاح نہیں کر سکتا، تو ہی اس کو سدھار۔‘‘

کئی دن بعد شاہ شجاع کا حکمراں بھتیجا شاہی حشم و خدم کے ساتھ ان سے ملنے آیا۔ آس پاس والوں پر اس کا بڑا رعب پڑا۔ شاہ شجاع نے اپنے بھتیجے سے پوچھا۔ ’’تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟‘‘

بھتیجے نے جواب دیا۔ ’’عم محترم! والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد مجھے بادشاہ بنا دیا گیا لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ہمارے پاس آپ کی امانت ہے، آپ جب چاہیں ہم سے واپس لے لیں۔‘‘

شاہ شجاع نے کہا۔ ’’بیٹے! جس چیز کو میں ٹھوکر مار چکا ہوں، اب اسے لے کر کیا کروں گا۔ حکومت تجھی کو مبارک۔‘‘

حکمراں بھتیجے کی نظریں اپنی عم زاد بہن پر پڑ گئیں جو جوان ہو کر بے مثل ہو گئی تھی۔ اس کو یہ لڑکی بہت اچھی لگی اور اپنے عم محترم سے کہنے لگا۔ ’’عم محترم! آپ اپنے ساتھ انہیں بھی پریشان کر رہے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ یہیں رہیں اور انہیں محل میں بھیج دیں؟‘‘

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ نہیں، افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں جہاں بھی رہوں گا، یہ میرے ساتھ رہیں گی۔‘‘

اتنے میں بیٹا بھی آ گیا۔ اس نے شاہی حشم و خدم کا باہر ہی مشاہدہ کر لیا تھا۔ گلے میں بربط ڈالے اندر جو داخل ہوا تو حکمراں بھتیجے نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’یہ کون ہے عم محترم؟‘‘

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ’’تیرا عم زاد بھائی!‘‘

نوجوان بادشاہ نے اس سے ہاتھ ملایا اور بربط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’یہ گلے میں کیا لٹکا رکھا ہے بھائی؟‘‘

شہزادے نے جواب دیا۔ ’’یہ ایسی چیز تو نہیں ہے کہ آپ کو اس کا علم ہی نہ ہو اور جس چیز کا آپ کو علم ہے میں اس کا کیا جواب دوں۔‘‘



Scanned with CamScanner

نوجوان بادشاہ کو اس چچا زاد کے پن پر غصہ آ گیا لیکن وہ ہنس کے ٹال گیا۔ اس نے کہا۔ ”اگر تم چاہو تو میں تمہیں محل میں لے چلوں۔ وہاں تمہارے لیے رہائش کا خاص انتظام کردوں گا۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”جس شے کو میرے باپ نے ٹھکرا دیا ہو، میں اس کو کس طرح قبول کرسکتا ہوں۔“

بیٹے کے اس جواب نے سبھی کو خوش کردیا۔ شاہ شجاع نے بیوی کی طرف دیکھا اور ان کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہوگئی۔

نوجوان بادشاہ نے اپنے عم زاد بھائی سے پھر کوئی بات نہیں کی اور دلبرداشتہ ہو کر محل واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی شاہ شجاع نے کہا۔ ”آج بیٹے کے جواب نے مجھ کو بے حد خوش کردیا۔“

بیوی بھی بہت خوش تھی، جواب دیا۔ ”اور مجھے بھی۔“

شاہ شجاع نے کہا۔ ”لیکن آج شاہی سواری کو اپنے در پر دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں پھر آئے۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”آپ کا بھتیجا ہے، ہم اسے کس طرح منع کرسکتے ہیں؟“

شاہ شجاع نے کہا۔ ”ہم اس کو منع تو نہیں کرسکتے مگر ہم یہ جگہ تو چھوڑ سکتے ہیں۔“

شوہر پرست بیوی کو ہر حال میں اپنے شوہر کی خوشنودی عزیز تھی، بولی۔ ”آپ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں، میں نے آپ سے کبھی اختلاف کیا ہے؟“

شاہ شجاع کو بس بیٹے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ باہر جاتے جاتے بولے۔ ”اللہ میرے بیٹے کو سدھار دے، بس میرے لیے یہی کافی ہے۔ یوں میں کوشش کروں گا کہ اس جگہ کو چھوڑ دوں اور کہیں اور چلا جاؤں۔“

کئی دن بعد شاہی سواری اپنے حشم و خدم کے ساتھ دوبارہ آ گئی۔ اس بار نئے بادشاہ کے ساتھ اس کی ماں بھی آئی تھی۔ ماں نے اندر جا کر دونوں سے بڑی شکایت کی اور کہا۔ ”بھائی صاحب! اسی شہر کی نواحی بستی میں رہتے ہو اور ہم سے رشتہ بھی قائم ہے پھر کیا بات ہے کہ تم لوگ آتے جاتے بھی نہیں۔“

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ”میں نے جس چیز کو خود لات مار دی، اب اس کے طواف سے کیا حاصل۔ میں تو اس کے سائے تک سے گریزاں ہوں۔“

بادشاہ کی ماں نے اپنی بھتیجی کو سینے سے لگا لیا اور کہا۔ ”کیا چاند سا چہرہ پایا ہے میری بیٹی نے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے اس کی پیشانی کا چمکتا دمکتا نور اس کو ایک بار پھر شاہی محل واپس لے جائے گا۔“

ان باتوں نے شاہ شجاع کے کان کھڑے کردیے وہ سوالیہ نظروں سے اپنے بھائی کی بیوہ کو دیکھنے لگے پھر پوچھا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ ذرا کھل کر بتایئے۔“

مرحوم بادشاہ کی بیوہ نے جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! اصل بات تو یہ ہے کہ جب سے آپ لوگ وہاں سے آئے ہیں، آپ کے مرحوم بھائی چین کی نیند نہ لے سکے اور شاید اسی غم میں ان کا انتقال ہوگیا۔“ اس کے ساتھ وہ خود بھی رونے لگیں اور کچھ دم لے کر دوبارہ بولنا شروع کردیا۔ ”آج اگر وہ زندہ ہوتے اور آپ لوگوں کو اس حال میں دیکھ لیتے تو معلوم نہیں مارے غم کے ان کا کیا حال ہوتا۔“

شاہ شجاع بیوہ کی بات سننا چاہتے تھے جس کی یہ تمہید تھی۔ آخر ان سے رہا نہ گیا، کہا۔ ”مرحوم بھائی کی بیوہ خاتون! آخر ان باتوں سے کیا حاصل؟ میں تو آپ کی زبان سے وہ باتیں سننا چاہتا ہوں جس کے لیے آپ ہمارے گھر آئی ہیں۔“

مرحوم بادشاہ کی بیوہ نے اب جس قسم کی باتیں شروع ہو چکی تھیں، ان سے کوئی بھی تو خوش نہیں تھا خاص کر شاہ شجاع اور ان کی بیٹی۔

(جاری ہے)

**مضمون کے مآخذ**

تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔ روضۃ الریاحین ابی محمد عبداللہ بن اسعد یمنی۔ کشف المحجوب حضرت داتا گنج بخش۔ طبقات الاولیاء، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ حکایات شیریں، مدیر مجلہ آئینہ، لاہور



digest library.com

Scanned with CamScanner

# سحر طراز

جاوید بسام

شیطان صفت لوگ ازل سے اس دنیا میں بُرائی کو بڑھاوا دینے کے لیے کوشاں رہے ہیں... اس کے لیے انہیں کسی کی جان بھی لینا پڑے تو وہ اس سے گریز نہیں کرتے... شیطانی طاقتیں ان کے عمل کو مزید قوت بخشتی ہیں اور وہ اپنی راہ میں آنے والے ہر دشمن کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے ہیں... مگر جب قانونِ قدرت حرکت میں آتا ہے تو اس کے آگے بڑے بڑے سورما پانی کا بُلبلا ثابت ہوتے ہیں... بے شک بُرائی کا انجام آخر کار عبرتناک ہی ہوتا ہے۔

**دولت کے لالچ میں جادو کا سہارا لینے والے ایک شخص کا عبرت اثر انجام**

اگرچہ مسٹر کارل میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ میں ان کے چہرے سے واقف تھا۔ راستے میں آتے جاتے اکثر ہماری ہیلو ہائے ہوتی لیکن کوئی باضابطہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہمارے علاقے میں حال ہی میں آباد ہوئے تھے۔ انہوں نے دو بار مجھے ملاقات کا پیغام بھیجا لیکن میں کسی وجہ سے نہ جاسکا۔

پھر ایک دن ہفتے کے آخر میں جیکسن نام کا ایک آدمی میرے پاس آیا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا اور جنوبی امریکا سے ایک کان کی رپورٹ لے کر آیا تھا جس میں میری کمپنی نے دلچسپی ظاہر کی تھی۔ ہم پہلی دفعہ ملے تھے اس لیے

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

ہمارے درمیان اجنبیت کی دیوار حائل تھی۔ جلد ہی ہماری بات چیت مکمل ہوگئی اور ہم خاموش ہو گئے۔ اب ہمارے پاس کرنے کے لیے کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اس کی واپسی کی ٹرین رات کو تھی تب تک اسے میرے پاس ہی ٹھہرنا تھا۔ آخر میں نے اسے شام کی چہل قدمی کی دعوت دی۔ میں اکثر شام کو باہر جاتا تھا۔ وہ فوراً آمادہ ہوگیا۔ ہم گھر سے باہر نکلے اور مغرب کی طرف اس راستے پر چل دیے جس کے دونوں طرف خوبصورت کاٹیج بنے ہوئے تھے اور گھنے درخت تھے۔ اسی سڑک پر مسٹر کارل کا گھر بھی تھا۔

موسم خوشگوار تھا، ہلکی ہوا چل رہی تھی اور درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ جب ہم مسٹر کارل کے گھر سے کچھ قدم پیچھے تھے تو اچانک ان کے گھر کا دروازہ کھلا اور وہ مسکراتے ہوئے باہر آئے اور چلائے۔

''آیئے آیئے...... آخر آج آپ کو ملاقات کا خیال آہی گیا۔ میں نے آپ کو کھڑکی سے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے استقبال کے لیے باہر چلا آیا۔''

اگرچہ میرا ان سے ملنے کا بالکل ارادہ نہیں تھا لیکن ان کی اس گرمجوشی کو دیکھتے ہوئے میں نے چہل قدمی کو موقوف کیا اور آگے بڑھ کر ان سے ملا پھر اپنے مہمان کا تعارف کرایا۔

وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے کیونکہ ان کی یہاں کے لوگوں سے بہت کم شناسائی تھی۔ وہ بس اپنے نوکروں کے ساتھ بالکل تنہا رہتے تھے۔ یہ بات کچھ عجیب لگتی تھی کہ انہیں اتنے بڑے گھر کی ضرورت کیوں پڑی لیکن ہر کوئی اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہے۔ ہم ان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے اور ایک پرتعیش ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔

وہ موسم گرما کی ان خوشگوار شاموں میں سے ایک تھی جب کھلی کھڑکیوں سے پھولوں کی خوشبو اندر آرہی ہوتی ہے اور ہر طرف ایسا پرسکون ماحول ہوتا ہے جو شہر میں رہنے والوں کو کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ جلد ہی ہم نے ایک دوسرے کا تعارف کرایا اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ کارل کی صحبت میں ہمارا وقت اچھا گزرے گا۔ اتفاق سے کارل کا تعلق بھی کان کنی کے شعبے سے تھا۔ جلد ہی وہ اور جیکسن دونوں تکنیکی بات چیت میں محو ہو گئے۔ میں ایسی باتیں پہلے بھی کبھی نہیں سمجھ پایا تھا اس لیے میں نے سامع کا کردار ادا کیا اور سنہری شام میں خوشبودار کافی کے گھونٹ بھر کر لطف اندوز ہوتا رہا۔ گھنے باغ میں کہیں درختوں کے درمیان ایک بلبل اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے گاتے ہوئے اپنے ساتھی کو پکار رہی تھی۔

یہ سب ایک چمگادڑ کی اچانک آمد سے شروع ہوا۔ آپ جانتے ہیں کہ گرمیوں کی شاموں میں سورج غروب ہونے سے پہلے وہ کیسے اُڑتی پھرتی ہیں۔ وہ عموماً بالکل خاموشی سے اڑتی ہیں اور جب کسی کا دھیان ان کی طرف نہیں ہوتا، وہ اچانک کھلی کھڑکیوں سے گھر کے اندر آجاتی ہیں اور پھر آپ اپنے ہاتھ میں اخبار لیے بے بسی کے ساتھ ان کے پیچھے بھاگتے ہیں اور وہ یہاں، پھر وہاں، پھر وہاں، پھر یہاں۔ ناپاک مخلوق یقیناً لیکن بنیادی طور پر بے ضرر۔ بس اس شام بھی ایک چمگادڑ ہمارے میزبان کے کمرے میں چلی آئی اور بے چینی سے اِدھر اُدھر اڑنے لگی۔ پہلے تو ہم تینوں گھبرا گئے لیکن پھر حقیقت جان کر کم از کم میں اور جیکسن سنبھل گئے لیکن ہم اس وقت حیرت زدہ رہ گئے جب ہم نے دیکھا کہ مسٹر کارل سخت خوفزدہ ہیں۔

وہ چیختے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''اسے باہر نکالو.... اسے باہر نکالو۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنا گنجا سر صوفے کے کشن کے نیچے چھپا لیا۔ ہم مسٹر کارل کی اس حالت پر حیران تھے۔ اتنے بڑے اور صحت مند آدمی کا اتنا ڈرنا ہماری سمجھ سے باہر تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلے ایسا ڈرپوک آدمی نہیں دیکھا تھا۔

مجھے لگتا تھا کہ میں ہنس پڑوں گا پھر میں نے اس سے کہا۔ ''کارل! فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہے۔'' اور بڑھ کر روشنی گل کر دی۔

چمگادڑ نے ایک یا دو بار ہمارے سروں پر پرواز کی پھر پر پھڑپھڑاتی ہوئی جتنی خاموشی سے آئی تھی، اتنی ہی بے آواز اڑتی ہوئی کھڑکی سے باہر نکل گئی۔

مسٹر کارل نے کشن کے نیچے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ان کا چہرہ خوف سے سیاہ ہو رہا تھا۔

''کیا وہ اڑ گئی؟'' انہوں نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

''یقیناً وہ اڑ گئی ہے۔'' میں نے انہیں یقین دلایا۔ ''آپ نے تو اتنا شور مچایا جیسے یہاں شیطان ظاہر ہو گیا ہو۔ کیا آپ واقعی اتنے خوفزدہ تھے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید وہ شیطان ہی تھا۔'' مسٹر کارل نے سنجیدگی سے کہا۔ جب وہ اٹھ کر بیٹھے تو میں نے ان کی آنکھیں دیکھیں جو حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مجھے ہنسی آنے لگی لیکن میں رک گیا۔ وہ واضح طور پر ایک بزدل آدمی تھے۔

''کھڑکیاں بند کر دیں۔'' انہوں نے تیزی سے حکم



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

دیا پھر انہوں نے مشروب کی بوتل لی اور اپنے لیے ایک تیز مشروب تیار کیا۔ ایسی خوشگوار شام میں کھڑکیاں بند کرنا عجیب معلوم ہوتا تھا لیکن گھر ان کا تھا۔ چنانچہ جیکسن نے ان کے حکم پر عمل کیا۔ جب ہم اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو مسٹر کارل نے ہچکچاتے ہوئے اپنی حالت پر معافی مانگی۔

ان حالات میں گفتگو قدرتی طور پر جادو ٹونے اور اسی طرح کی باتوں کی طرف مڑ گئی۔ جیکسن کا کہنا تھا کہ اس نے برازیل کے جنگلات میں کچھ عجیب وغریب کہانیاں سنی ہیں لیکن میں متاثر نہیں ہوا کیونکہ اپنے خالص انگریزی نام کے باوجود وہ خود بھی مخلوط نسل کا لگتا تھا اور بدیسی آدمی ہمیشہ ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہیں مگر کارل کے ساتھ بنیادی طور پر معاملہ مختلف تھا۔ وہ ایک برطانوی تھا۔ جب اس نے مجھ سے سنجیدگی سے پوچھا کہ کیا میں کالے جادو پر یقین رکھتا ہوں؟ تو میں نے اس کی بات کا سنجیدگی سے جواب دیا کہ میں اس پر یقین نہیں رکھتا۔

انہوں نے پرزور لہجے کہا۔ ”آپ غلطی پر ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں، اگر یہ کالا جادو نہ ہوتا تو ہم آج یہاں ساتھ نہ بیٹھے ہوتے۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”نہیں۔“ کارل نے کہا۔ ”میں تیرہ سال تک ساؤتھ افریقا میں پیدل گھومتا رہا۔ ایک ”غریب گورا آدمی“ کیا آپ اس اصطلاح کا مطلب سمجھتے ہیں؟ ٹھیک ہے، آپ نہیں سمجھتے۔ میں اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ یہ زمین پر جہنم کے مانند ہے۔ ایک کے بعد ایک بدتر کام اور زندگی گزارنے کے لیے مختصر پیسے۔ نہ کھانے کے لیے گوشت کا ایک ٹکڑا اور نہ پینے کے لیے کچھ...... بس آدمی ہر طرح کی ذلت برداشت کرے اور سیاہ فاموں کے درمیان رہے۔ زندگی میں آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہیں۔ مجھے لگتا تھا کہ تمام سیاہ اور سفید لوگ مجھے حقیر سمجھتے ہیں۔ اگر مجھے کالے جادو کے بارے میں علم نہ ہوتا اور میں اس سے پیسا نہ کماتا تو آج وہیں ایڑیاں رگڑ رہا ہوتا۔ میں نے پیسے کمائے اور کاروبار کرنے لگا۔ بائیس سال گزر چکے ہیں، اب میں امیر ہوں اور آرام کرنے کے لیے مرا جا رہا ہوں۔“

[illegible] جو کچھ بھی کہا، اس کا مطلب واضح تھا اور [illegible]

مجھے تسلیم کرنا چاہیے کہ اس نے مجھ پر اثر لیا۔ وہ ہیپ اعصابی مریض کی طرح نہیں بلکہ ایک صحت مند سو کلوگرام وزنی اینگلوسیکسن مرد کی طرح نظر آتا تھا۔ آپ اس کے ساتھ مشکل میں پڑنے سے نہیں گھبرائیں گے۔ اس لیے جب وہ چمگادڑ سے اتنا ڈرا تو میں حیران رہ گیا تھا۔

”مجھے یقین کرنا مشکل لگتا ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”لیکن شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے کبھی اس طرح کی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آپ ہمیں اس بارے میں مزید بتا سکتے ہیں؟“

ایک لمحے کے لیے کارل اپنی گول نیلی آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے، اگر آپ چاہیں تو اپنے اور دوست کے گلاس بھر لیں۔“

ہم نے اپنے اپنے گلاس بھرے اور اس نے اپنی کہانی شروع کی۔

☆☆☆

”میں نے یہاں ذکر کیا ہے کہ چمگادڑ شیطان کا روپ دھار سکتا ہے لیکن حقیقت میں صرف چمگادڑ نہیں بلکہ کئی دوسرے جانور بھی روپ بدلنے پر قادر ہوتے ہیں جیسے بلی، سانپ اور الو وغیرہ۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کس طرح ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے۔ شاید کچھ لوگوں میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ایسے جانوروں کو اپنے تابع کر لیتے ہیں اور پھر ان بدی کی قوتوں سے گھناؤنے کام لیتے ہیں۔ وہ شیطان کو بلانے کے قابل ہو جاتے ہیں جو کسی جانور کے روپ میں ہوتا ہے۔ بس ایک طلسم ہر چیز پر طاری ہو جاتا ہے۔ اس طرح جیسے ایک ریڈیو ریسیور سگنل وصول کرتا ہے اور دنیا میں برائی پھیلتی ہے۔

”آپ نے بلیاں دیکھی ہوں گی۔ وہ کیسی خوفناک مخلوق ہیں۔ وہ اندھیرے میں کیسے دیکھتی ہیں لیکن وہ اس سے زیادہ کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ سب کچھ دیکھ سکتی ہیں جو ہم دن کی روشنی میں نہیں دیکھ سکتے۔ آپ نے کئی بار دیکھا ہوگا کہ وہ کس طرح دبے قدموں احتیاط سے کسی ایسی چیز کے گرد گھوم رہی ہوتی ہیں جو ہمارے خیال میں کمرے میں نہیں ہوتی۔

”بلی بلاشبہ اپنے آپ میں بالکل بے ضرر جانور ہے مگر جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے یا جب اسے مرضی کے خلاف کہیں بند کیا جاتا ہے تو وہ برائی کا آلہ بن جاتی ہے۔ بہرحال میں یہ بات ویسے ہی کہہ رہا ہوں۔ خیر، مجھے تیرہ سال ساؤتھ افریقا میں دربدر گزارنے پڑے۔ میں نے ڈربن سے ڈمارلینڈ تک اور اورنج دریا سے متابیلے تک پورے ملک میں پیدل سفر کیا۔ میں نے مالی، کان کن، دکاندار، ہر قسم کی گاڑیاں چلانے، بطور کلرک کام کرنے سے لے کر کاٹھ کباڑ جمع کرنے تک سب کچھ کیا۔ میں نے



Scanned with CamScanner

کبھی کسی کام کو انکار نہیں کیا جس کی مجھے پیشکش کی گئی ہو لیکن میں نے پیسا نہیں کمایا۔ لگتا تھا کہ میں نے یہ سارا وقت جیل میں ہی گزارا ہے۔

"آج تک میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ مالک کے طور پر کون زیادہ سخت ہے۔ ایک پرہیزگار ولندیزی آدمی جس کی آواز نرم ہو یا جنوبی افریقی اسکاٹ مین جو مشروب کی بو میں ڈوبا ہوا ہو۔

"آخرکار میں سوازی لینڈ چلا گیا۔ یہ پرتگالی مشرقی افریقا کے ساتھ سرحد پر ہے، لورینکو مارکوس اور خلیج ڈیلاگوا کے قریب۔ وہ بہت خوبصورت جگہ ہے، خوابوں جیسی۔ اب وہ مقامی آبادی کے لیے مخصوص ہے لیکن تب وہ پورے ملک میں بکھرے ہوئے مٹھی بھر سفید فاموں سے آباد تھی۔

"بہرحال، وہیں میری ملاقات بینی آرزا کسن سے ایک پب میں ہوئی۔ اس نے مجھے نوکری کی پیشکش کی۔ میری جیب میں ایک پینی بھی نہیں تھی، میں نے فوراً نوکری قبول کر لی حالانکہ وہ ایک سخت گیر آدمی لگتا تھا۔ آپ نے ایسا شخص کم ہی دیکھا ہوگا۔ جسامت میں مجھ سے بڑا، سیاہ چہرہ، چکنے کالے گھنگرالے بال، طوطے کی چونچ جیسی بڑی ناک، تفصیلی اور عیارانہ چمک دار آنکھیں۔ بینی نے مجھے جو کچھ بتایا اس سے میں سمجھ گیا کہ اس نے جس اسٹور کیپر کو رکھا ہوا تھا، وہ اچانک مر گیا ہے۔ جب وہ مجھے اسٹور کیپر کی موت کے بارے میں بتا رہا تھا تو اس کے لہجے نے مجھے حیران کر دیا کہ وہ کس بے دردی سے اس کی موت کا ذکر کر رہا ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ یا تو بینی یا پھر میں جا کر مقامی لوگوں سے کاٹھ کباڑ جمع کروں۔ آخر میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھے ملک کے شمال میں کئی میل دور اپنی مشہور دکان پر لے گیا جہاں شاید سارڈینز کے دو ڈبے اور ایک مرے ہوئے چوہے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بہت جلد مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ وہاں کوئی قانونی تجارت نہیں ہو رہی۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مجھے قریب سے دیکھنے کے بعد بینی نے فیصلہ کیا ہوگا کہ میں کوئی نکتہ چیں آدمی نہیں ہوں۔ میں نے محتاط رویہ اختیار کیا کہ ضرورت سے زیادہ تجسس نہ دکھاؤں۔ یاد رہے کہ میرے پیشرو کی موت کا سو... [illegible] ...

"ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ بینی کو مجھ پر اعتماد ہو گیا۔ اس نے اپنے معاملات... [illegible] ... چھپانے کی کوئی خاص ... [illegible] ... وہ کسی حد تک اسلحے کی اسمگلنگ اور بڑی حد تک شراب کی اسمگلنگ میں ملوث تھا۔ یہ سامان پرتگالی مشرقی افریقا سے لایا جاتا تھا۔ ہمارے گاہک تقریباً تمام سیاہ فام تھے۔ اس دوران بینی کی بیوی ربیکا کے علاوہ مجھے آس پاس کوئی سفید فام آدمی نظر نہیں آیا تھا۔

"کچھ دن بعد جب میں نے اچھی طرح کام سنبھال لیا تو مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ بینی کا تمام خفیہ مال جعلی اور دو نمبر ہے۔ یہاں تک کہ وہ جعلی کارتوس بھی بیچتا تھا۔ اس کی اکاؤنٹس بکس سے مجھے پتا چلا کہ اس نے اپنی مصنوعات کے خفیہ کوڈ رکھے ہوئے ہیں۔ "جلی ہوئی چینی" کا مطلب پانچ میں سے دو جعلی گولیاں تھا اور "پھیکی چینی" کا مطلب پانچ میں سے تین تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جعلی گولیاں گتے سے بنی تھیں جن پر سیسے کی طرح رنگ چڑھایا گیا تھا۔

"اس نے میرے ساتھ مجموعی طور پر اچھا سلوک کیا مگر گرمیوں کی ایک شام میری آمد کے فوراً بعد جب ہم باہر کرسیوں پر بیٹھے ڈوبتے سورج کا نظارہ کر رہے تھے تو ہم جھگڑ پڑے اور اس نے اپنے بڑے سرخ ہاتھ کے ایک مکے سے مجھے فرش پر گرا دیا۔ بعد میں جب بھی مجھے غصہ آتا، ایسا عموماً تب ہوتا جب وہ اپنے سیاہ فام غلاموں کے ساتھ برا سلوک کرتا۔ میں نے یہ اصول بنا لیا کہ خود کو تھوڑا سا پرسکون کرنے کے لیے کہیں باہر نکل جاتا تھا۔ اگرچہ میں خود ایک اچھا آدمی نہیں ہوں لیکن اس کا برا رویہ دیکھ کر مجھے غصہ آتا تھا۔

"یوں جوں جوں میں اس کے کام کو سمجھتا گیا، مجھ پر انکشاف ہوا کہ بینی صرف اسلحے اور شراب کی اسمگلنگ نہیں کر رہا بلکہ وہ ایک ساہوکار بھی ہے اور یہیں سے وہ بھٹک گیا اور کالے جادو کی زد میں آ گیا۔ میں جادوگر اسٹونگا کے بینی کے ساتھ ابتدائی معاملات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

"وہ بوڑھا جادوگر وقتاً فوقتاً سیپیوں اور چیتے کے دانتوں کی مالا گلے میں سجائے وہاں نظر آتا تھا۔ بینی رسمی طور پر اس کا استقبال کرتا پھر وہ گھٹنوں بیٹھ کر خالص الکحل کے گلاس پیتے۔ آخرکار اسٹونگا نشے میں دھت ہو جاتا اور اس کے آدمی اسے مردے کی طرح اٹھا کر لے جاتے۔

"بوڑھا بدمعاش اپنے قبیلے کی کنواری لڑکیوں کو بینی کے ہاتھ بیچ دیتا تھا جو انہیں آگے پرتگالی اور مشرقی افریقا کے غریب لوگوں کی بیویاں بننے کے لیے ... [illegible] ... کر دیتا جو اس کے چنگل میں آسانی سے آ جاتے۔ ... [illegible] ... اپنے قرضہ ... [illegible] ... سود ادا کرنے سے قاصر ہوتے تھے۔

"بینی کے ساتھ نو ماہ تک رہنے کے بعد ایک مسئلہ شروع ہو گیا۔ اسٹونگا فضول خرچی کرنے والا تھا۔ جب اس کے قبیلے میں کنواریوں کی کمی ہونے لگی تو اس نے قرض لینا



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

شروع کر دیا۔ آخر کار وہ قرض میں اتنا ڈوب گیا کہ قرضے کی واپسی اس کے بس میں نہیں رہی۔ اب بنی کے ساتھ اس کی ملاقاتیں معمول کی طرح پُرجوش نہیں ہوتی تھیں کیونکہ بنی نے اسے مزید قرض دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بس اسٹونگا اپنی بڑی کالی چھڑی کو لہراتے اور بنی کو دھمکیاں دیتے ہوئے چلا جاتا تھا مگر بنی پر دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے پہلے بھی دھمکیاں ملتی رہتی تھیں۔ اس نے اسٹونگا کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے اپنی کچھ بیویاں فروخت کر دے۔

''میں ان کی ملاقاتوں میں کبھی موجود نہیں ہوتا تھا لیکن میں نے ان کے درمیان ہونے والی بحث کو سنا تھا اور میں اتنا تو سمجھ سکتا تھا کہ اسٹونگا نے سیڑھیوں سے نیچے جاتے ہوئے کیا کہا۔

''ایک دن اسٹونگا تین عورتوں کے ساتھ آیا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کی قیمت اصل قرض کے برابر ہے لیکن بنی کا حساب کتاب الگ تھا۔ اسٹونگا کو قرض لیے کچھ عرصہ گزر گیا تھا۔ ادائیگی میں جتنی دیر ہوتی گئی، سود اتنا ہی بڑھتا گیا۔ وہ عورتیں اس قرض کی ادائیگی کے لیے کافی نہیں تھیں۔ لہٰذا اسٹونگا سے کہا گیا کہ وہ قرض کی ادائیگی کے لیے تیس خوبصورت اور جوان لڑکیاں فراہم کرے۔

''بوڑھا جادوگر دیر تک بنی کو گھورتا رہا پھر لوٹ گیا۔ اگلی بار جب وہ آیا تو مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ وہ معمول کے مطابق دوپہر کو نہیں بلکہ شام کو آیا تھا اور ہمارے ساتھ بیس منٹ سے زیادہ نہیں رہا۔ پتلی دیواروں کے پیچھے سے میں نے ان کی زیادہ تر گفتگو سنی۔ بوڑھا آدمی بنی کو ایک انتخاب پیش کر رہا تھا۔ تین عورتیں یا صبح سے پہلے موت۔

''اگر بنی ہوشیار ہوتا تو وہ عورتوں کا انتخاب کرتا لیکن اس میں عقل کی کمی تھی۔ اس نے اسٹونگا کو جہنم میں جانے کو کہا۔ آخر اسٹونگا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے آدمیوں کی تعداد دس کے قریب تھی۔ وہ باہر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر بوڑھا احاطے میں بیٹھ گیا اور جادو کرنا شروع کیا۔ اس نے اپنے آدمیوں سے دو مرغ منگوائے، ایک کالا اور ایک سفید، پھر اس نے انہیں عجیب طریقے سے مار ڈالا اور ان کے جگر کا بغور جائزہ لینے لگا۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل گر کر آگے پیچھے ہلنے اور اپنی بوڑھی اور کرخت آواز میں ایک خوفناک منتر پڑھنے لگا۔ اس کے [illegible] بھی منہ کے بل زمین پر گر پڑے اور سانپوں کی طرح لرزتے ہوئے ایک کے بعد ایک اس کے گرد رینگنے لگے۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک اسی طرح رینگتے رہے

اور بوڑھے کا منتر یکساں آواز میں جاری رہا پھر بوڑھا اٹھ کر ناچنے لگا۔ مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہے کہ بندر کی دم کی پٹی اس کے اردگرد کس طرح پھڑپھڑا رہی تھی اور جب وہ چھلانگ لگاتا تھا اور اوپر کی طرف گھومتا تھا تو اس پتلے بوڑھے وحشی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آتا کہ اس میں اس طرح ناچنے کی طاقت ہوگی۔ پھر اچانک اسے دورہ پڑا۔ پہلے وہ مجسمے کی طرح جم گیا پھر منہ کے بل زمین پر گرا اور جب اس کے چیلوں نے اسے سیدھا کیا تو ہم نے دیکھا کہ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے ہیں۔

''آپ جانتے ہیں کہ منطقہ حارہ کے علاقوں میں رات فوری طور پر کیسے آتی ہے؟ اسٹونگا نے اپنے منتر اس وقت شروع کیے جب روشنی تھی اور اس نے انہیں پڑھنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا تھا لیکن جب وہ ختم ہوئے تو چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا اور صرف چاند اور ستاروں کی کہکشاں ہی اندھیری دنیا کو روشن کر رہے تھے۔

''ان جگہوں پر زیادہ تر لوگ اب بھی قدرتی گھڑی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ریبکا، بنی اور میں نے رات کا کھانا کھایا۔ بنی قدرے پریشان دکھائی دے رہا تھا لیکن اتنا نہیں تھا جتنا میں حالات کو دیکھتے ہوئے سمجھتا ہوں۔ پھر حسب معمول وہ دن کی آمدنی کا حساب کرنے کے لیے دفتر اور میں بستر پر چلا گیا۔

''صبح چار بجے کے قریب مجھے اس کی بیوی نے جگایا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ سو گئی تھی اور جب بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ بنی بستر پر نہیں آیا تھا۔

''ہم جھونپڑی سے ہوتے ہوئے دفتر گئے اور وہاں ہم نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی اور بے حرکت ہیں۔ اس کے ہاتھوں نے کرسی کے بازوؤں کو جکڑا ہوا ہے اور اس کا پورا جسم کسی بھیانک چیز کے خوف سے سکڑا ہوا ہے۔ وہ پہلے بھی کوئی خوش شکل آدمی نہیں تھا مگر اب اس کے سیاہ چہرے پر چھائی ہوئی دہشت سے اس پر نگاہ ڈالنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کئی گھنٹوں پہلے مر چکا تھا۔

''ریبکا نے اپنا سر پیٹ لیا اور اتنی زور زور سے چیخیں ماریں کہ لگتا تھا گھر گر جائے گا۔ میں نے اسے دفتر سے باہر لے جانے کے بعد یہ جاننے کی [illegible] موت کی وجہ کیا ہے۔ ان دنوں میں بھی آپ کی طرح تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ دانتوں کے بغیر احمق بوڑھا اسٹونگا کسی کو اس طرح دور



Scanned with CamScanner

سے مارنے کے قابل ہوسکتا ہے۔

''میں نے کمرے کا بغور جائزہ لیا لیکن مجھے کوئی ٹوٹ پھوٹ یا کسی کی موجودگی کے آثار نہیں ملے۔ میں نے پھر بینی کا غور سے معائنہ کیا اور مجھے ایسا لگا کہ وہ فالج یا کسی اور حملے سے مرگیا ہے...... لیکن کیوں؟ اس نے کچھ دیکھا تھا جو بہت بھیانک اور عقل سے ماورا تھا۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ ایک یا دو ہفتوں میں، میں خود بھی اسی چیز کا مشاہدہ کروں گا۔

''بینی کو اگلے دن دفن کردیا گیا۔ انہوں نے تدفین سادگی سے کی۔ خواتین نے ماتم کیا اور مردوں کو مفت مشروبات ملے۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ افریقا کا آدھا حصہ ہمیں دیکھنے کے لیے آگیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاہ فاموں میں خبریں کس تیزی سے اور پراسرار طریقے سے پھیلتی ہیں۔

''اسٹونگا بھی جنازے میں آیا لیکن اس کے چہرے سے خوشی یا افسوس کا اظہار نہیں ہورہا تھا۔ وہ بس کھڑا دیکھتا رہا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس کے خلاف واحد ثبوت گزشتہ شام کی وہ گھٹیا کارروائی تھی مگر کوئی بھی عام یورپی اس بنا پر اسے قتل میں ملوث ہونے پر غور نہیں کرے گا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ جو کچھ ہوا وہ ایک ناقابل یقین اتفاق کا نتیجہ تھا۔ جنازے کے بعد اسٹونگا میرے پاس آیا۔

''آپ خادموں کو کیوں نہیں مارتے تاکہ وہ رب عظیم کے تخت کے سامنے اپنے مالک کے ساتھ ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے وضاحت کی کہ گھر میں ایک موت ہی کافی ہے۔ پھر اسٹونگا نے اپنی چھڑی کا مطالبہ کیا جو اس کے مطابق وہ گزشتہ شام بینی کے دفتر میں بھول گیا تھا۔

''آپ تصور کرسکتے ہیں کہ میں نے اس سے کافی سختی سے بات کی تھی لیکن پھر میں چھڑی لینے گھر چلا گیا۔ میں اس کی چھڑی کو اچھی طرح پہچانتا تھا، اسی طرح جس طرح میں اپنی کنگھی سے واقف تھا۔ اس کی چھڑی مجھے کمرے کے فرش پر پڑی ملی۔ وہ چار فٹ لمبی سانپ کی شکل کی چھڑی تھی۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے بھی ویسی چھڑی دیکھی ہوگی۔ وہ انہیں صرف یورپیوں کے لیے چھوٹا بناتے ہیں۔ وہ سخت لکڑی سے تراشی جاتی ہے۔ اس کا ہتھا سانپ کے سر کی شکل میں اور دوسرا سرا دم کی نوک کی طرح ہوتا ہے۔ ہینڈل اور نوک کے درمیان پانچ سے بارہ بل ہوتے ہیں اور پوری لمبائی کے ساتھ نشانات بنائے جاتے ہیں تاکہ سانپ کے بل کھاتے جسم کا تاثر پیدا ہو۔ اسٹونگا کے پاس ایک بہترین چھڑی تھی، کافی پتلی لیکن بھاری، جیسے سیسے سے بنی ہو۔ سیاہ رنگ کی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آبنوس کی لکڑی سے بنائی گئی تھی۔ اس میں بالکل بھی لچک نہیں تھی لیکن اسے کامیابی سے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ فرش سے چھڑی اٹھا کر میں نے بغیر کچھ کہے اسے اسٹونگا کے حوالے کردیا۔

''تقریباً دس دن تک وہ دوبارہ نظر نہیں آیا۔ دیکا رونا دھونا ختم کرکے کاروبار پر چلی آئی تھی۔ لگتا تھا بینی نے اسے زیادہ تر معاملات سے آگاہ رکھا تھا، جو وہ ضروری سمجھتا تھا اس لیے جلد ہی کاروبار پر اس کی کافی اچھی گرفت ہوگئی۔ ہم نے اتفاق کیا کہ میں اس کے ساتھ بطور منیجر کام کرتا رہوں گا۔ کچھ دن بعد اسٹونگا کا سوال پیدا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ سود کا فیصد ریشو بہت زیادہ ہے اور بوڑھا آدمی درحقیقت خطرناک ہوسکتا ہے لیکن وہ کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ جب میں نے سود کو مکمل طور پر بھول جانے کا مشورہ دیا تو وہ اس طرح غضب ناک ہوئی جیسے میں نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ اس نے غصے اور حقارت سے مجھے گھورا۔

''تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟'' وہ چیخی۔ ''مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ مجھے اپنی اور اپنے مستقبل کی فکر ہے۔ تم اسی وقت کسی ملازم لڑکے کو اس کے پاس بھیجو اور اسے ملاقات کا پیغام دو۔ جب وہ آئے تو اس سے قسطوں کی ادائیگی کا مطالبہ کرو۔''

''میرے پاس متفق ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہوشیار مالکن بعض باتوں میں بینی سے بھی بدتر تھی۔''

☆☆☆

''اگلی صبح میں نے ایک لڑکے کو اسٹونگا کے پاس بھیجا اور چوبیس گھنٹوں کے اندر وہ حاضر ہوگیا۔

''میں نے اسے بینی کے دفتر میں مدعو کیا۔ اس کا وفد باہر رک کر انتظار کررہا تھا۔ میں نے بینی کی کرسی سنبھالی جس پر اس کی موت ہوئی تھی اور فوراً ہی مدعا زبان پر لے آیا۔

''اسٹونگا چند لمحوں تک خاموش بیٹھا میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا بوڑھا جھرّیوں والا چہرہ سڑے ہوئے پھل جیسا لگ رہا تھا اور گول کالی آنکھیں کسی عجیب اندرونی آگ سے سلگ رہی تھیں۔ آخر اس نے گفتگو کے لیے الفاظ کا انتخاب کیا اور دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔ ''ماسٹر! آپ بہت بہادر نوجوان ہیں۔''

''نہیں، میں صرف ایک پیشہ ور آدمی ہوں اور کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔



digest.library.com

Scanned with CamScanner

"کیا آپ جانتے ہیں کہ بوڑھے ماسٹر کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ مرگیا۔ اس نے خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ اسے اپنے رب کے پاس جانے کی جلدی تھی۔" وہ بولا۔

"اس کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ میں نے ان میں ایک خاص شرارتی چمک محسوس کی۔ مجھے الجھن ہونے لگی لیکن میں نے اپنے احساس کو ظاہر نہیں کیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا قرض نقد یا مساوی سامان کی صورت میں فوری ادا کرے۔

"کیا بنی کے ساتھ جو ہوا، وہ آپ بھول رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔ "آپ دوسروں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ میں آپ کا احترام کرتا ہوں مگر یہ مت بھولیں کہ اسٹونگا جادو کرسکتا ہے۔ میں آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہوں۔"

"لیکن میں اپنے مفادات کی نہیں بلکہ مالکن کے مفادات کی نمائندگی کررہا تھا۔ میں تمہارا قرض معاف نہیں کرسکتا۔ تمہیں وہ ہر حال میں ادا کرنا پڑے گا۔" میں نے اسٹونگا کو جواب دیا۔

"پھر میں نے اسے بنی کی بندوق دکھا کر خبردار کیا کہ کسی بھی شرارت کی صورت میں، میں بلا جھجک اسے گولی ماردوں گا۔ جواب میں بوڑھا صرف حقارت سے مسکرایا۔ اس سے زیادہ حقارت آمیز مسکراہٹ انسان کے چہرے پر کم ہی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ دفتر سے اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ پھر انہوں نے کالے اور سفید مرغوں کے ساتھ وہی بے ہودہ عمل شروع کیا۔ وہ اپنے پیٹوں پر سانپوں کی طرح رینگتے رہے اور بوڑھا اس وقت تک ناچتا رہا جب تک کہ گر کر بے ہوش نہ ہوگیا اور اس کے ساتھی اسے اٹھا کر نہ لے گئے۔

"اسی دوران رات ڈھل گئی اور میری روح اداسی سے بھر گئی۔ مجھے بنی کا ہیبت ناک چہرہ اور اس کی بے روح آنکھیں یاد آئیں۔ مالکن کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں دفتر میں چلا گیا۔ جب شراب پینے کی بات آتی ہے تو میں کسی سے پیچھے نہیں رہتا لیکن اس رات میں نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میرا اپنے دماغ کو مکمل طور پر پُرسکون اور ہوش وحواس میں رکھنے کا ارادہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اسٹونگا کے آدمیوں میں سے کسی نے بنی کے ساتھ کچھ کیا تھا۔ شاید اس کے مشروب میں زہر ڈال دیا ہوگا۔

"میں نے دفتر کی ایک ایک انچ جگہ کا بغور معائنہ کیا اور اس بات کو یقینی بنایا کہ وہاں کوئی چیز چھپی ہوئی تو نہیں

ہے۔ پھر کھڑکیوں کو مضبوطی سے بند کرکے ان کے سامنے ایک ایک کرسی رکھ دی اور انہیں یوں جھکا دیا کہ کوئی بھی کرسیوں کو ہٹائے بغیر اندر نہ آسکے۔ اگر میں سوجاتا تو کرسیوں کے گرنے کا شور مجھے جگا دیتا۔ میں نے بتیاں بند کردیں تاکہ میں تیروں یا نیزوں کا نشانہ نہ بنوں اور انتظار کرنے بیٹھ گیا۔

"خدا نہ کرے کہ وہ رات دوبارہ میری زندگی میں آئے۔ آپ جانتے ہیں کہ اندھیرے میں اکثر پراسرار چیزیں سایوں کی طرح ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ اس لیے جو کچھ میں نے صرف چند گھنٹوں میں دیکھا، اسے دوبارہ تصور میں لانا مشکل ہے۔ مجھے باہر گھاس کے میدان سے آنے والی مدھم آوازیں کسی رینگتے ہوئے دشمن کی آوازیں لگ رہی تھیں جن سے میں بار بار چونک جاتا۔ میں اندھیرے میں ظاہر ہونے والے سایوں کی عجیب وغریب شکلوں پر پانچ یا چھ بار گولی چلانے والا تھا۔ میں اعصابی تناؤ سے تقریباً ٹوٹ رہا تھا لیکن ان دنوں میں بہت سخت جان آدمی تھا۔ آخر میں نے خود پر قابو پالیا تھا۔

"گیارہ بجے کے قریب چاند نمودار ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب ماحول بہتر ہوجائے گا لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ اس نے خوف میں اضافہ ہی کیا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ایسے ماحول میں اکثر چاندنی بھی کیسی خوفناک ہوسکتی ہے۔

وہ روشنی غیر فطری لگ رہی تھی اور چاند کے برائی کا علمبردار ہونے کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے، میں اس پر بہت یقین رکھتا تھا۔ ایک ساکن اور ناگوار روشنی پردوں میں سے داخل ہو کر چمک دار دھاریوں کی صورت میں فرش پر گر رہی تھی۔ میں ان دھاریوں کو دیکھتا اور گنگنا رہا اور ٹھنڈی اور سحر انگیز روشنی سے مسحور ہو گیا لیکن پھر خود کو جھنجوڑتے ہوئے میں اپنے آپ کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے سامنے میز پر کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا تھی لیکن کچھ دیر پہلے وہاں موجود چیز غائب تھی۔

''اچانک مجھے احساس ہوا کہ کیا ہوا ہے اور میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ اسٹونگا شام کو دوبارہ اپنی چھڑی بھول گیا تھا جسے میں نے دفتر کا معائنہ کرتے ہوئے فرش سے اٹھا کر میز کے اوپر رکھ دیا تھا۔ میں پچھلے تین گھنٹوں سے نیم اندھیرے کمرے میں اس کا اوپری حصہ دیکھ رہا تھا۔ چھڑی سیدھی اور بے حرکت کھڑی تھی مگر اب وہ اچانک غائب ہو گئی تھی۔

''وہ اگر گری ہوتی تو میں اس کی آواز سن لیتا۔ میری آنکھوں میں تناؤ سے درد ہونے لگا اور میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا۔ کیا ہو گا اگر یہ چھڑی، چھڑی نہ ہو بلکہ کچھ اور ہو؟

''میں سیدھا ہو کر بیٹھا اور اس کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ آخر وہ مجھے نظر آ گئی۔ وہ چاندنی میں سیدھی اور بے حرکت زمین پر یوں پڑی ہوئی تھی جیسے لیٹی ہو۔ وہی تمام آٹھ یا دس لہراتے مخفی خطوط جو میں نے پہلے بھی درجنوں بار دیکھے تھے۔ میں نے سوچا یہ میرا قیاس تھا کہ میں نے چھڑی کو میز پر رکھا تھا۔ وہ شروع سے فرش پر پڑی ہوئی لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں۔ میں نے چھڑی میز پر ہی رکھی تھی۔

''میں نے اپنی نظریں اس پر جمائیں اور سانس روک کر یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ آیا وہ حرکت کر رہی ہے لیکن میں اس قدر دباؤ میں تھا کہ مجھے اپنے مشاہدات پر یقین نہیں تھا۔ فرش پر چاندنی کی چمکیلی دھاریاں ہلکے ہلکے کانپنے لگی تھیں اور میں نے محسوس کیا کہ میری بینائی کمزور ہو رہی ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں پھر جب میں نے انہیں کھولا تو دیکھا کہ ایک سانپ اپنا سر اٹھائے فرش پر موجود ہے۔ میں نے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس کیے اور میرے جسم پر سے پسینا بہنے لگا۔ میں نے سوچا، بوڑھے بنٹی کو کس چیز نے مارا تھا اور اس کا چہرہ کالا کیوں ہو گیا تھا؟ اسٹونگا کی چھڑی صرف چھڑی نہیں تھی۔

میں پورے افریقا میں سب سے زیادہ مہلک سانپ بلیک مامبا کا سامنا کر رہا تھا جو بجلی کی طرح تیز رفتار تھا۔ وہ سرپٹ بھاگتے گھوڑے کو پیچھے چھوڑنے اور اس کے سوار کو مارنے کے قابل تھا۔ وہ اتنا زہریلا تھا کہ اس کے کاٹنے کے بعد جسم چار منٹ میں بے جان ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا لیکن یہ خیال مجھے احمقانہ اور بیکار لگ رہا تھا۔ اگر میرے ہاتھ میں شاٹ گن ہوتی تو میں شاید اس کے سر پر گولی مارنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن ہم دفتر میں بندوق نہیں رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے ایک بے وقوف کی طرح خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔

''مامبا اپنا پھن پھیلائے دھیرے سے رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اب اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اسٹونگا ایک ماہر سپیرا تھا اور وہ اس خطرناک مخلوق کو اپنے تابع کر کے گھناؤنے کاموں کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ میں وہاں پریشان بیٹھا تھا، بالکل اسی طرح جیسے غریب بنٹی اس دن رہا ہو گا۔ میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے کوئی ترکیب بھی سوچ رہا تھا لیکن میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ سانپ دھیرے دھیرے قریب آ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری ٹانگوں میں سے جان نکل گئی ہے۔ پھر جوں ہی سانپ نے حملہ کرنے کے لیے اپنا پھن اٹھایا، میں نے اچھل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن میرا پاؤں پھسل گیا اور میں نے کوڑے کی ٹوکری کو گرا دیا جو میز کے ساتھ ہی رکھی تھی۔ اتفاق سے سانپ بید کی ٹوکری کی زد میں آ گیا۔ اس کا سر ٹوکری کے نیچے دبا ہوا تھا اور باقی جسم تیزی سے بل کھا رہا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ کیا ہوا ہے پھر مجھے یاد آیا کہ اس دن اپنی میز کی درازوں کو چھانٹتے ہوئے میں نے سنگ مردار کی ایک بڑی تعداد ٹوکری میں ڈالی تھی۔ انہوں نے ٹوکری کو ایک تہائی بھر دیا تھا۔ اس کا وزن کافی تھا۔ جب ٹوکری الٹی تو خوش قسمتی سے سانپ ٹوکری کے نیچے دب گیا۔ وہ ایک بڑے سیاہ چابک کی طرح ہوا میں لہرا رہا تھا لیکن کوشش کے باوجود اپنا سر نہ چھڑا سکا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور اٹھ کر بھاری اکاؤنٹس بکس اٹھائیں اور مامبا کے باقی جسم پر رکھ کر اسے بے بس کر دیا۔ اس میں مجھے آدھا وقت لگا جتنا آپ کو چگادڑ کو بھگانے میں لگا تھا۔

پھر میں نے دوبارہ ریوالور اٹھا لیا اور بڑبڑایا۔

''آہا...... میرے خوبصورت دوست! جلد ہی تم میرے

ہاتھ میں ہو گے پھر میں سکون سے تمہارا سر اتار دوں گا اور تمہاری جلد سے اپنے لیے بہترین جوتوں کا ایک جوڑا بنواؤں گا۔''

''میں گھٹنوں کے بل بیٹھا اور ماما کے جسم کا جو حصہ مجھے نظر آرہا تھا، اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ اس کی دم دو بار غصے سے لہراتی ہوئی میری سمت آئی لیکن مجھ سے تقریباً تیس سینٹی میٹر دور سے گزر گئی۔ بس ٹوکری زور و شور سے ہل رہی تھی۔ آخر میں نے اپنی پوزیشن بدلی اور آدھے میٹر کے فاصلے سے اس کے جسم کا نشانہ لیا لیکن پھر ایک بہت ہی عجیب بات ہوئی۔ یہ وہی لمحہ تھا جب کالا جادو کام کرنے لگا۔

''اچانک چاند کی ہلکی روشنی غائب ہو گئی اور کمرے میں پھر اندھیرا چھا گیا۔ وہ پراسرار روشنی چلی گئی تھی اور سانپ نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا تھا۔ مجھے تصور میں دیواریں کمرے سے الگ ہوتی اور خود پر گرتی محسوس ہوئیں اور مقامی لوگوں کی تیز بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں امٹونگا کی جھونپڑی میں چلا آیا ہوں۔ اچانک میں نے امٹونگا کو دیکھا۔ وہ سو رہا تھا۔ ٹھیک ہے، اگر آپ چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ امٹونگا کا سر مقامی رسم و رواج کے مطابق اس کی بیویوں میں سے ایک کے پیٹ پر ٹکا ہوا تھا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا، میں نے بے دلی سے ہاتھ آگے کیا۔ جوں ہی میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوا، میں نے خوف محسوس کیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں نے سانپ کو چھوا ہے۔ میرے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں قوتِ ارادی کی زبردست کوشش سے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ امٹونگا کو نیند میں جھٹکا لگا پھر ایک مدھم آواز سنائی دی۔ میں نے اپنے ہاتھ پر سانپ کو رینگتے محسوس کیا۔ میں خوف سے ہوش کھونے والا تھا اور اس قدر کانپ رہا تھا کہ میرے دانت بج رہے تھے۔ اچانک میں نے اپنے اوپر برفیلی ہوا محسوس کی۔ میں سردی سے کانپ اٹھا حالانکہ حقیقت میں وہ ایک گرم اور حبس زدہ رات تھی۔ امٹونگا کی طرف سے آنے والی ہوا تیزی سے مجھ سے ٹکرا رہی تھی۔ میں جسم چھیدنے والی سردی سے اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا پھر مجھے لگا کہ میں اگلے ہی لمحے سانپ پر گر جاؤں گا۔

''آخر میں نے اپنی ساری توجہ ہاتھ میں پکڑے پستول پر مرکوز کر دی۔ سانپ نظر نہیں آرہا تھا لیکن میری نظریں امٹونگا کے ماتھے پر جمی ہوئی تھیں۔ کاش میری ساکت انگلی محرک کو دبا سکتی...... میں نے ایک ناقابلِ یقین کوشش کی اور پھر ایک بہت ہی عجیب واقعہ ہوا۔

''امٹونگا سوتے ہوئے مجھ سے بات کرنے لگا لیکن الفاظ میں نہیں، جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔ بس، جیسے ایک روح دوسری روح سے بات کرتی ہے۔ وہ مجھے سانپ کی طرح ہلتا، بل کھاتا اور سسکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ میں اسے اتنا ہی واضح طور پر دیکھ رہا تھا جیسے اس وقت آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نے مجھ سے قتل نہ کرنے کی درخواست کی۔ گہری خاموش رات میں جب جگہ اور وقت کا وجود ختم ہو گیا تھا، میں نے محسوس کیا کہ سانپ اور امٹونگا ایک ہی ہیں۔

''مجھے معلوم تھا کہ سانپ کو مار کر میں امٹونگا کو مار ڈالوں گا۔ کچھ ناقابلِ یقین طریقے سے اس نے برائی کی قوتوں کو زیر کر لیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ جب وہ اپنے منتر کے اختتام پر بے سدھ ہو کر گر گیا تھا تو اس کی بری روح ایک خوفناک مخلوق کے جسم میں داخل ہو گئی تھی۔

''میرا خیال تھا کہ مجھے سانپ کو مار دینا چاہیے۔ اس طرح امٹونگا بھی ختم ہو جائے گا لیکن جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ موت کے وقت ڈوبنے والے شخص کی پوری زندگی اس کی آنکھوں کے سامنے چمکتی ہے۔ اس طرح میں نے اپنی زندگی کو دیکھا۔ منظر کے بعد منظر، تمام تیرہ سال کی مایوسیاں اور غلطیاں میرے سامنے فلم کی طرح گزر رہی تھیں لیکن میں نے کچھ اور بھی دیکھا۔

''میں نے خود کو جوہانسبرگ میں ایک صاف ستھرے دفتر میں بہت عمدہ لباس میں بیٹھے دیکھا۔ وہ عمارت اس طرح صاف دکھائی دے رہی تھی جیسے میں فٹ پاتھ پر اس کے قریب کھڑا ہوں۔ حالانکہ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے دوسری کئی چیزیں بھی دیکھیں۔ اس وقت امٹونگا میرے اختیار میں تھا لیکن میں نے اس کے الفاظ بالکل واضح طور پر سنے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''یہ سب میں تمہیں دوں گا اگر تم میری جان بخش دو گے۔''

''پھر امٹونگا کے خدوخال دھیرے دھیرے دھندلے ہوتے گئے۔ اندھیرا چھٹ گیا اور میں نے پھر دفتر کی کھڑکیوں کے پردے سے چاند کی روشنی کو اندر آتے اور ماما کے سر کو ٹوکری کے نیچے دبے دیکھا۔''

☆☆☆

''میں نے ریوالور جیب میں ڈالا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد میں اپنے بستر پر چلا آیا۔ میں اس

طرح سویا جیسے میں نے دس دن تک پیدل سفر کیا ہو۔ میں بہت تھکان محسوس کر رہا تھا۔ صبح میں دیر سے بیدار ہوا لیکن مجھے وہ سب کچھ واضح طور پر یاد تھا جو اس رات ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے خواب نہیں دیکھا تھا بلکہ وہ حقیقت تھی۔ میں شاٹ گن لوڈ کرنے کے بعد سیدھا دفتر چلا گیا۔

"سانپ چھڑی ابھی تک میز کے پاس پڑی تھی۔ اس کا سر ٹوکری کے اور جسم بھاری لیجر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ تاہم اب وہ سیدھی ہو کر اپنی معمول کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے ریوالور کے دستے سے ہلکا سا تھپتھپایا۔ وہ بالکل بے حرکت تھی۔ میں یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ صرف اعلیٰ پالش شدہ لکڑی کا ایک بے ضرر ٹکڑا تھا۔ پھر یہ جانتے ہوئے کہ اس میں ایک مکروہ زندگی چھپی ہوئی ہے، میں نے احتیاط کی اور اسے دوبارہ ہاتھ نہیں لگایا۔

"تھوڑی دیر بعد اسٹونگا نمودار ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ وہ کمزور لگ رہا تھا جیسے ایک ہی رات میں نچڑ گیا ہو۔ اس نے بہت بات کی۔ میں قرض کے بارے میں پوچھا کہ کیا میں قرض کا کچھ حصہ معاف کر دوں گا؟ اس کا کہنا تھا کہ وہ پوری ادائیگی کر سکتا ہے لیکن یہ عمل اسے برباد کر دے گا۔ اس نے کہا کہ اپنی تمام بیویوں کو بیچنے کا مطلب قبیلے پر اپنا اختیار کھو دینا ہے۔

"میں نے اسے سمجھایا کہ اس کے قرض کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ربیکا کا مقروض ہے کیونکہ بینی کی موت کے بعد ساری جائداد اس کے پاس چلی گئی ہے۔

"وہ میری بات سن کر حیران رہ گیا کیونکہ مقامی طور پر عورتوں کا جائداد رکھنا پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فارم میرا ہے اور ربیکا کے حوالے سے میرا واحد فرض یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے، اسے نان ونفقہ دیتا رہوں۔

"پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں خود انچارج ہوں تو کیا میں اس کی مدد کروں گا؟ میں نے جواب دیا کہ میں اپنی حد سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ یہ جواب اسے مطمئن کرتا دکھائی دیا۔ اپنے خوفناک دوست یعنی چھڑی کو اٹھا کر وہ اور کوئی لفظ کہے بغیر بڑی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"اگلے ہفتے مجھے کچھ سامان خریدنے کے لیے دوسرے شہر جانا پڑا۔ میں چند دن کے لیے گیا تھا۔ جب میں واپس آیا تو پتا چلا کہ ربیکا فوت ہو چکی ہے۔ اس کا کفن دفن بھی کر دیا گیا تھا۔ ملازم لڑکوں نے مجھے بتایا کہ کیا ہوا تھا۔ میرے جانے کے بعد شام کو اسٹونگا، ربیکا سے ملاقات کرنے آیا۔ ان میں گرما گرم بحث ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ دالان میں دوبارہ اپنا کام کر رہا تھا۔ اسی طرح دو مرغ لائے گئے۔ اسٹونگا نے منتر پڑھے اور اس کے ساتھی سانپوں کی طرح زمین پر رینگنے لگے۔ اگلی صبح ربیکا کی سیاہ لاش کمرے سے ملی۔ میں نے پوچھا کہ کیا اسٹونگا یہاں اپنی چھڑی بھول گیا تھا؟ حالانکہ مجھے جواب پہلے سے ہی معلوم تھا۔

"ہاں، وہ اگلی صبح چھڑی لینے کے لیے آیا تھا۔" ایک ملازم نے جواب دیا۔

"میں خاموشی سے بینی کا کاروبار چلانے لگا مگر میں جانتا تھا کہ وہاں کے لوگ مجھے زیادہ دن برداشت نہیں کریں گے۔ آخر میں نے جھونپڑی کے کونے کونے کی تلاشی لی۔ بینی کو بینکوں پر بھروسا نہیں تھا۔ اس نے اپنا پیسا کسی خفیہ جگہ پر چھپا رکھا تھا لیکن کہاں؟ اس کا گلک تلاش کرنے میں مجھے پورے تین ہفتے لگے۔ اس دوران میں اس کا کاروبار بھی چلاتا رہا۔ آخر کار میرے ہاتھ میں دس ہزار کی خطیر رقم آ گئی۔ میں وہاں سے فوراً رفو چکر ہو گیا۔ وہ رقم میں نے کان کنی میں لگائی اور خوب دولت کمائی۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ کالے جادو کی وجہ سے آج ہم یہاں اکٹھے بیٹھے ہیں۔"

جوں جوں کارل اپنی کہانی کے اختتام پر آ رہا تھا، کسی چیز نے مجھے جیکسن کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گھر کے مالک کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کے زرد چہرے پر اس کی سیاہ آنکھیں ایک شدید آگ سے جل رہی تھیں۔

"تمہارا نام کارل نہیں ہے۔" وہ اچانک تیز آواز میں چلایا۔ "تمہارا نام تھامسن ہے اور میرا اصل نام اساکسن بینی ہے۔ میں وہ بچہ ہوں جس کی ماں تمہاری وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھی اور تم ہماری دولت لے کر فرار ہو گئے۔"

اس سے پہلے کہ میں اس کے الفاظ کے معنی کو پوری طرح سمجھتا، جیکسن اچھل کر کھڑا ہوا اور اپنے لباس سے چمکتے پھل والا ایک چاقو نکالا اور اسے کارل کے سینے میں گھونپتے ہوئے چیخا۔

"شیطان! آخر آج میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا۔ تم نے اس عفریت کو میری ماں کو مارنے کی قیمت ادا کی تھی۔"

اس کے بعد اس نے اطمینان سے اپنے ہاتھ صاف کیے اور گمبھیر آواز میں بولا۔ "اب آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔"

میں نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا اور ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔

xxx



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

پچھلے دنوں میرا لڑکا پیدا ہوا۔ اس سے چند دن پہلے ترقی ہوئی اور مجھے اٹھارواں گریڈ ملا تھا۔ اس سے پہلے میں نے شاہ زمان میں پلاٹ خرید کر اپنی بیوی شائستہ کے نام کر دیا اور لڑکے کا نام تیمور رکھا۔

خدا مجھ پر بہت مہربان تھا۔ مجھے اوپر تلے خوشخبریاں مل رہی تھیں لیکن اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے، انہوں نے میری زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا۔ میں نے شائستہ کے ماں بننے اور اٹھارھویں گریڈ میں ترقی ہونے پر ایک

# انہونی

عمران قریشی

مصائب کسی سے پوچھ کر زندگی میں نہیں آتے... بس اچانک ہی اپنے اثرات ظاہر کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ہنستی بستی دنیا اجڑ جاتی ہے... ایک کے بعد ایک پریشانی انسان کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے... اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا... سب بہت اچھا تھا... زندگی مطمئن اور آسودہ تھی... مگر ایک حادثے نے سب کچھ تلپٹ کر دیا... مایوسی کے عالم میں اسے کچھ نہ سوجھا تو اس نے اپنے تئیں انوکھا فیصلہ کر لیا... اور پھر ایسی انہونی ہوئی کہ اس نے سب کچھ بدل ڈالا۔

حالات سے گھبرا کر اپنا سب کچھ لٹا دینے والے شخص کا غلط اقدام

digestlibrary.com

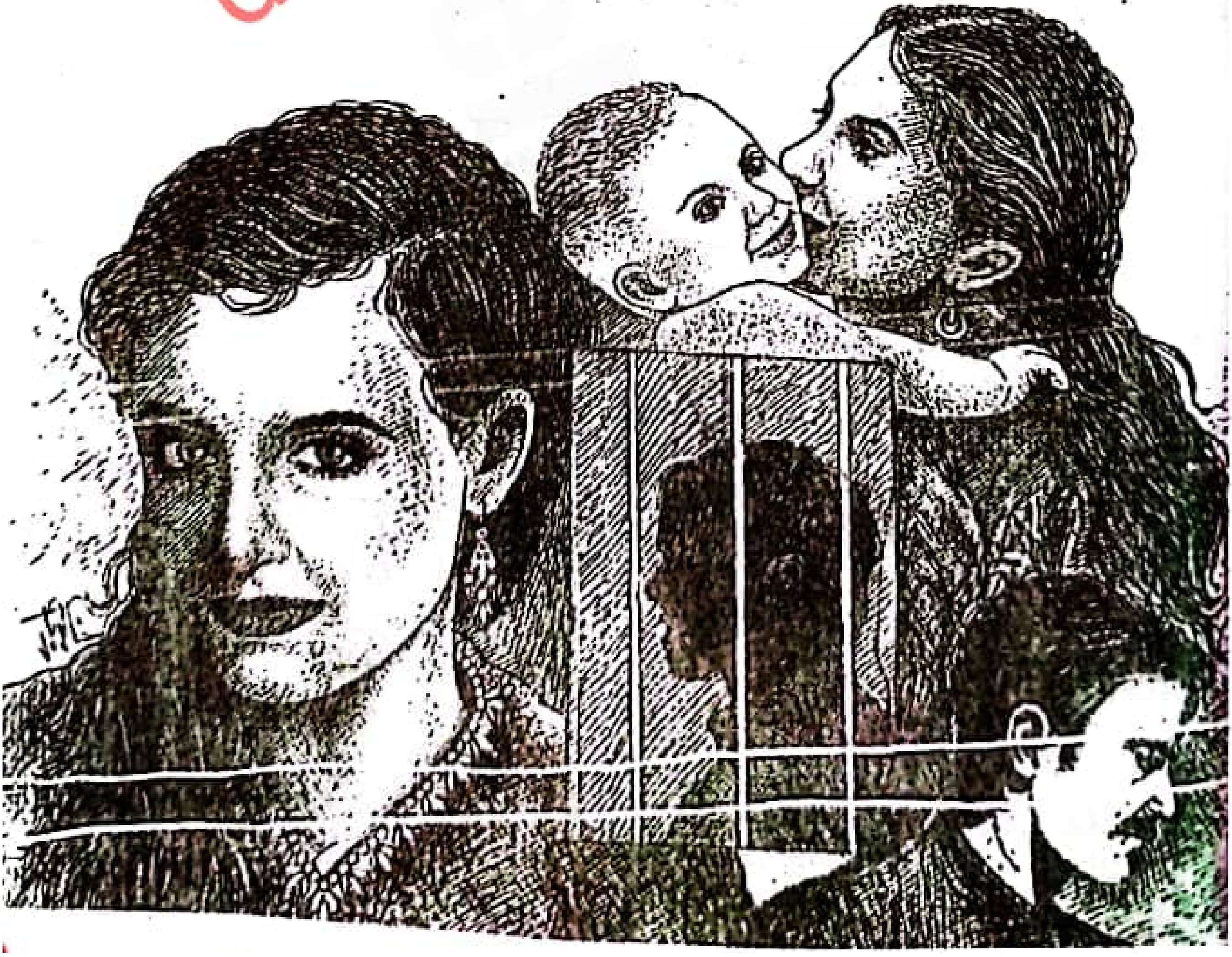

Scanned with CamScanner

بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا اور اس میں شہر کے صاحب اختیار لوگوں کو مدعو کیا۔ اس تقریب میں شراب نوشی کا دور کھلم کھلا چلا۔ میں بہت خوش تھا اس لیے شراب کچھ زیادہ ہی پی لی۔ تین بجے کے قریب مہمانوں کے جانے کا سلسلہ شروع ہوا اور چار بجے صرف میں اور سرور صاحب اکیلے رہ گئے۔ وہ میونسپل کارپوریشن میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ رات کو ان کے ڈرائیور کی طبیعت خراب ہوئی اور اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ اب انہیں کوٹھی لے جانے والا میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ میرا اپنا ڈرائیور دس بجے گھر چلا جایا کرتا تھا اس لیے مجبوراً مجھے گاڑی باہر نکالنا پڑی اور میری حالت اس قابل نہیں تھی کہ میں ڈرائیونگ کر سکتا۔ شراب حواسوں پر سفید دھند کی صورت میں طاری ہوتی چلی جا رہی تھی۔

میں نے سرور صاحب کو اپنی کوٹھی میں رات گزارنے کی دعوت دی لیکن انہوں نے انکار کر دیا کیونکہ انہیں صبح بیرون ملک جانا تھا اس لیے میں نے ہمت کر کے گاڑی کو کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکالا۔ سرور صاحب اگلی سیٹ پر میرے ساتھ براجمان ہو گئے اور کچھ ہی دیر میں خراٹے لینے لگے۔

سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ میں نے گاڑی کو مین روڈ پر ڈال دیا اور ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی طوفانی رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔ مجھے رہ رہ کر سرور صاحب پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ آرام و سکون سے سیٹ پر بیٹھے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ انہیں صبح نو بجے ائرپورٹ جانا تھا۔ اگر یہ چار پانچ گھنٹے میری کوٹھی پر گزار لیتے تو اس میں کیا حرج تھا۔ انہوں نے رات کے اس پہر مجھے خوار کر دیا تھا۔

میں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں گاڑی کے تمام شیشے نیچے کر دیے۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا اندر آنے لگی۔ میرے حواس کچھ بحال ہوئے اور میں نے سڑک پر نگاہ دوڑائی۔ میں صدر کے علاقے میں داخل ہو گیا تھا اور سامنے فوارہ چوک دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض چوک تھا اور ٹریفک کانسٹیبل چوک کے درمیان میں کھڑا تھا۔ حواس بحال ہو جانے کے باوجود بھی وہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔ حالانکہ سامنے اور سڑک کے بالکل درمیان میں کھڑا تھا۔

بس اس کے علاوہ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ اتنی خوشیاں یکلخت مل جانے کے بعد اب زوال کے دن شروع ہونے والے تھے۔ میں نے گاڑی اس کے اوپر چڑھا دی۔ وہ اچھل کر گاڑی کی چھت کے اوپر سے ہوتا ہوا پچھلی جانب سڑک پر جا گرا۔ میں نے گھبرا کر بریک لگائے اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ سرور صاحب بھی ہڑبڑا کر جاگ گئے تاہم وہ اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہے۔ میں نے گاڑی کے پیچھے آ کر کانسٹیبل کا جائزہ لیا۔ اس کے ناک اور منہ سے خون نکل کر وردی کو سرخ کر رہا تھا تاہم وہ مرا نہیں تھا بلکہ سانس لے رہا تھا لیکن اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں اور شاید کچھ پسلیاں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ سرور صاحب بھی گاڑی سے نیچے اتر کر کانسٹیبل کے تڑپتے ہوئے جسم کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے اور آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔

”برخوردار! یہ تم نے کیا کر دیا۔ میرے خیال میں یہ مرنے والا ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے دور چلے جانا چاہیے۔“ ان کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز بہ مشکل تمام نکلی۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے اس لیے ہونقوں کی طرح ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھے چلا جا رہا تھا۔

انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے گاڑی کی طرف لے آئے پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھاتے ہوئے بولے۔ ”چوک میں سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ اگر یہ کام کر رہے ہیں تو تمہارے ساتھ میرا بھی اللہ ہی حافظ ہے۔“

میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کر دیا۔ وہ حادثے کے دوران بند ہو گئی تھی۔ سرور صاحب گاڑی کے آگے سے گھوم کر میرے ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھے اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”میری مانو تو کل میرے ساتھ ہی بیرون ملک بھاگ چلو۔ یہاں رہنا اب تمہارے لیے ممکن نہیں۔ تمہارا پاسپورٹ بنا ہوا ہے، ویزا میں لگوا دوں گا۔“ سرور صاحب بولے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بے سروپا باتیں کر رہے تھے۔ اتنی جلدی ویزا لگنا ممکن نہیں تھا اور حادثے میں جو شخص مرا تھا، وہ کوئی عام شہری نہیں تھا بلکہ پولیس کانسٹیبل تھا اس لیے مجھے پورا یقین تھا کہ صبح ہونے سے قبل ہی مجھے گرفتار کر لیا جائے گا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ مجھے گرفتار ہونے سے قبل اپنے لیے کچھ کر لینا چاہیے تھا۔

سرور صاحب کوٹھی میں اکیلے رہتے تھے۔ ان کے بیوی بچے بیرون ملک سیٹل ہو گئے تھے اور وہ ان سے ملاقات کے لیے وہاں جا رہے تھے۔ کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد میں نے اپنے کزن جاوید احمد کو فون کیا۔ وہ سیکریٹریٹ میں معمولی نوکری کرتا تھا لیکن اس کی جان پہچان تو بنا رکھی تھی۔ وہ تقریب سے واپس جانے کے بعد

اب سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے اسے مختصراً حالات سے آگاہ کیا اور سرور صاحب کی کوٹھی پر آنے کے لیے کہا۔ اس نے مجھے دلاسا دیا کہ وہ سب کچھ سنبھال لے گا اور مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ سرور صاحب نے شراب کا گلاس میرے ہاتھوں میں تھمانے کی کوشش کی تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ سب کیا دھرا شراب کا ہی تو تھا۔ نہ میں تقریب کے دوران پیتا اور نہ ہی حادثہ پیش آتا۔ اب اگر کانسٹیبل مر جاتا تب آپ سوچ سکتے ہیں کہ میرے ساتھ کیا ہو سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد جاوید احمد آ گیا۔ اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات تھے اور ہاتھوں میں موبائل تھامے ہوئے تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر اسے حادثے کے متعلق تفصیل کے ساتھ بتایا تو وہ اپنے کسی دوست کو فون کرنے لگا جو انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے کافی لمبی چوڑی بات چیت کی پھر موبائل بند کرتے ہوئے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''کانسٹیبل کی موت واقع ہو گئی ہے اور پولیس تمہیں گرفتار کرنے کے لیے نکلنے والی ہے۔''

میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ سرور صاحب بھی ہراساں نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ اگر چوک پر لگے ہوئے سی سی ٹی وی کیمرے فعال تھے تو پھر واقعی کچھ دیر کے اندر پولیس مجھ تک پہنچنے والی تھی اور ایک دفعہ میں گرفتار ہو جاتا تو مجھے پھانسی چڑھنے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ چند لمحے چپ رہنے کے بعد جاوید احمد گمبھیر لہجے میں ہمکلام ہوا۔

''کچھ ہی دیر میں انسپکٹر جعفر یہاں آنے والا ہے۔ میں نے اسے تفصیل سے آگاہ کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی بہتر مشورہ دے گا۔''

''میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں [illegible] [illegible] سے بیرون ملک جا [illegible] ہوں۔ برائے مہربانی جو بھی کرو، اپنی کوٹھی پر جا کر کرو۔ میں پولیس کے معاملے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔'' سرور صاحب متوحش لہجے میں بولے۔

''سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں آپ کو چھوڑنے کے لیے یہاں آ رہا تھا۔ اگر نہیں آتا تو شاید حادثہ بھی نہیں ہوتا۔ اب اگر آپ نے میرا ساتھ نہیں دیا تو میں آپ کو اس معاملے میں گھسیٹنے کی پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے خفیف نگاہوں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپس میں لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انسپکٹر جعفر سب کچھ سنبھال لے گا اور سرور صاحب غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔ اگر یہ ملاقات تمہاری کوٹھی میں ہو تو بہتر رہے گا۔'' جاوید احمد بیچ بچاؤ کراتے ہوئے بولا تو میں چپ ہو گیا۔

☆☆☆

صبح آٹھ بجے انسپکٹر جعفر میری کوٹھی پر آیا۔ اس کی عمر چالیس سے پینتالیس سال کے درمیان تھی۔ وہ عام پولیس والوں کی نسبت دبلا پتلا تھا۔ شکل وصورت سے ہی کرخت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اور جاوید احمد نے اسے سٹنگ روم میں بٹھا دیا۔ شائستہ تمام رات جاگنے کی وجہ سے اس وقت سو رہی تھی۔

انسپکٹر جعفر کے بیٹھتے ہی جاوید احمد نے اسے بتایا کہ نادانستگی کے دوران جو حادثہ پیش آیا ہے، اس میں سراسر قصور میرا ہے کیونکہ میں شراب کے نشے میں دھت تھا۔

انسپکٹر جعفر سوچ میں پڑ گیا۔ اسے یقیناً حادثے کے متعلق معلوم ہو گیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ معاملہ کتنا گمبھیر ہے اس لیے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بتانے لگا۔ ''اگر کانسٹیبل کی موت واقع نہ ہوتی تو میں بہ آسانی معاملے کو رفع دفع کر دیتا لیکن موت واقع ہونے کے بعد اب تمام پولیس والے تمہارے دشمن بن چکے ہیں اس لیے معاملے کو سنبھالنا کچھ مشکل ہو گا۔''

''تو پھر تم مشورہ دو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں اپنے کزن کو اپنی آنکھوں کے سامنے پھانسی چڑھتے ہوئے دیکھتا رہوں۔ تمہیں بلایا بھی اسی لیے ہے کہ اسے جیل میں جانے سے کسی بھی طرح بچالو۔'' جاوید احمد بولا۔

''کچھ ہی دیر میں پولیس یہاں آنے والی ہے۔ چونکہ یہ علاقہ میری دسترس سے باہر ہے اس لیے میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔ تمہارے [illegible] [illegible] کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں اس دوران کانسٹیبل کے متعلق معلوم کرتا ہوں۔ تمہاری رہائی اب اس کے گھر والوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ تمہیں معاف کر دیں تو پولیس تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔'' انسپکٹر جعفر نے بتایا۔

''لیکن وہ مجھے کیوں معاف کرنے لگے؟'' میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ ''ہر چند کہ حادثہ نادانستگی کے عالم میں ہوا ہے لیکن اس کے باوجود بھی میں قاتل بن چکا ہوں۔



Scanned with CamScanner

وہ مجھے کسی صورت بھی معاف نہیں کریں گے۔"

"انہیں منانے کے لیے ہمیں رقم کا لالچ دینا ہوگا اور یہ رقم کروڑوں پر بھی مشتمل ہوسکتی ہے۔" انسپکٹر جعفر نے بتایا۔

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ اگر بات لاکھوں تک کی ہوتی تو میں فوراً ہامی بھر لیتا لیکن کروڑوں کی صورت میں مجھے اپنی تمام عمر کی جمع پونجی داؤ پر لگانا پڑتی اور مجھے شائستہ اور بچے کے لیے بھی کچھ سوچنا تھا۔

اب میں آپ کو شائستہ کے متعلق بتاتا ہوں۔ اس کا تعلق باپردہ گھرانے سے تھا۔ باہر کی دنیا اس نے دیکھی ہی نہیں تھی۔ وہ پڑھی لکھی بھی کم تھی اور اسے ڈھنگ سے خریداری کرنا بھی نہیں آتی تھی۔ اس کے متعلق تفصیل بتانے کا مقصد آپ کو بعد میں معلوم ہوجائے گا کیونکہ میں بری طرح پھنسنے والا تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ میرے بعد کیا کرتی۔ اس کے ماں باپ وفات پاچکے تھے اور میرے علاوہ اس کا اور کوئی نہیں تھا۔ پھر اب وہ ایک دودھ پیتے بچے کی ماں بھی تھی۔ میرے بعد وہ دونوں تباہ و برباد ہوکر رہ جاتے۔ مجھے اب ساری توقع جاوید احمد سے تھی۔ وہ میری بیوی اور بچے کے لیے بہت کچھ کرسکتا تھا۔ شائستہ کی طرح وہ بھی ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کی بیوی اور بچہ ٹرین کے حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے اور وہ اپنی ماں کے ساتھ کوٹھی میں تنہا رہتا تھا۔ میں شاید پہلے آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ سیکریٹریٹ میں نوکری کررہا تھا۔ اس کا پراپرٹی کا کاروبار بھی تھا جو بہت اچھا چل رہا تھا اس لیے گزربسر مناسب طریقے سے ہورہی تھی۔ تاہم اس کی جان پہچان اوپری حلقوں میں بہت اچھی تھی اس لیے میرے بہت کام آرہا تھا۔

"یہ بھی ممکن ہے کہ کانسٹیبل کے گھر والے تمہیں رقم لیے بغیر بھی معاف کردیں۔ نرم مزاج اور سنگدل ہر قسم کے لوگ دنیا میں موجود ہیں۔ بس دعا کرو کہ کانسٹیبل کے گھر والے نرم [illegible] جو بھی تمہیں کچھ رقم تو خرچ کرنا ہی ہوگی۔" مجھے انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ دیر معاملے پر مزید بات چیت کرنے کے بعد انسپکٹر جعفر کوٹھی سے رخصت ہوگیا۔ ابھی تک پولیس نے کوٹھی کا رخ نہیں کیا تھا۔ دس بجے کے قریب میں نے قریبی پولیس اسٹیشن میں جاکر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کردیا۔ مجھے لاک اپ میں بند کردیا گیا۔ میں نے ان کے رویے کو دیکھ کر اچھی طرح جان لیا تھا کہ ان کے دلوں میں میرے لیے نرم گوشہ نہیں تھا۔ وہ مجھے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے تاہم چونکہ میرے تعلقات بڑے عہدوں پر متعین افراد سے تھے اس لیے جب چند فون انہیں ان افراد کی جانب سے موصول ہوئے، تب وہ نرم پڑ گئے۔ جاوید احمد نے بہت کوشش کی کہ مجھے ضمانت پر رہا کردیا جائے لیکن بری طرح ناکام ہوا اور پھر اگلے دن مجھے اس نے بتایا کہ انسپکٹر جعفر نے ہلاک ہونے والے کانسٹیبل کے متعلق معلوم کرلیا ہے۔ اس کا نام فضل محمد تھا اور وہ شہر سے باہر اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ چونکہ گزربسر محدود تنخواہ کی وجہ سے مشکل سے ہورہی تھی اس لیے گھر میں پرچون کی دکان بھی کھول رکھی تھی جو ڈیوٹی کے اوقات میں اس کی بیوی چلاتی تھی۔

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میرے دل میں کچھ امید پیدا ہوئی۔ اسے شوہر کے مرنے کے بعد رقم کی ضرورت پڑسکتی تھی کیونکہ اس کے گھر کا کمانے والا واحد کفیل حادثے میں ہلاک ہوچکا تھا۔ شاید اسے پنشن مل جاتی لیکن تنخواہ کی طرح وہ بھی کم ہوتی اس لیے اب اسے اپنی کمائی کا ذریعہ خود تلاش کرنا تھا۔ اگر وہ مجھے معاف کردیتی تو میں اسے اچھی خاصی رقم دے سکتا تھا جس سے اس کی گزربسر بہ آسانی ہوسکتی تھی۔

بہرحال جاوید احمد نے مجھے بتایا کہ وہ اگلے دن انسپکٹر جعفر کے ساتھ کانسٹیبل فضل محمد کی بیوہ سے ملنے کے لیے جانے والا ہے تاکہ اسے رقم دے کر معاف کرنے کے لیے راضی کیا جاسکے اور چونکہ وہ علاقہ انسپکٹر جعفر کی حدود سے باہر تھا اس لیے انسپکٹر سادہ لباس میں وہاں جانے والا تھا۔ میں چپ ہوگیا اور جاوید احمد مجھے سگریٹ کے دو پیکٹ دینے کے بعد وہاں سے باہر چلا گیا۔ جیل میں سگریٹ کا مل جانا نعمت سے کم نہیں۔ میں نے سگریٹ کو سلگایا اور سوچنے لگا۔ حالات نے یکدم ایسی کروٹ بدلی تھی کہ سب کچھ ہی تبدیل ہوکر رہ گیا تھا۔ کہاں خوشیوں کی بوچھاڑ اور کہاں جیل کی کال کوٹھری۔

مجھے شائستہ [illegible] نے لگا۔ جاوید احمد نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسے اپنی کوٹھی میں لے گیا تھا جہاں وہ اس کی ماں کے ساتھ رہ رہی تھی لیکن خوش نہیں تھی۔ اس نے گزشتہ دن سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا اور یہ کہ وہ اسے بھی اپنے ہمراہ اگلے دن جیل لے کر آئے گا۔ مجھے اپنے بچے کا خیال آیا۔ اگر میں پھانسی چڑھ جاتا تو وہ نومولود یتیم ہوجاتا اس لیے کانسٹیبل کی بیوی کو منانا بہت ضروری تھا۔ اگر وہ نہ مانتی تو



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

زور زبردستی بھی کی جاسکتی تھی اور انسپکٹر جعفر ایسا بہ خوبی کرسکتا تھا لیکن بہرحال، مجھے اپنے آپ کو جائداد سے ہاتھ دھونے کے لیے تیار کرلینا چاہیے تھا...... اور میں نے تیار کرلیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن انسپکٹر جعفر، کانسٹیبل فضل محمد کی بیوی سے ملاقات کرنے کے بعد میرے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر ناکامی کے تاثرات تھے اس لیے میں نے کچھ پوچھنا مناسب نہیں جانا۔ تب اس نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد خود ہی بتایا۔

"تمام پولیس والے تمہارے خلاف ہوگئے ہیں اور کانسٹیبل کی بیوی فرزانہ جو بھی کررہی ہے، ان کے کہنے پر کررہی ہے۔ اس نے مجھ سے ملنے سے بھی انکار کردیا تھا۔ میں نے زور زبردستی کی تو مجبوراً اس نے ملاقات کرلی لیکن میرے خیال میں اب مزید ملاقات نہیں کرے گی۔"

"لیکن تم اسے مجبور کرکے معافی نامے پر دستخط کرواسکتے ہو۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے دو بچے ہیں، انہیں کمزوری بناؤ۔ کانسٹیبل کی بیوی کٹھ پتلی بن جائے گی۔" میں نے پریشان لہجے میں کہا۔

"اب یہ ممکن نہیں ہے۔" انسپکٹر نے انکار میں سر ہلایا۔ "پولیس والوں کو معلوم ہوگیا ہے کہ میں تمہاری طرف داری کررہا ہوں۔ میرے یہاں آنے کے متعلق بھی انہیں معلوم ہوگیا ہے۔ اب اگر فرزانہ کو کچھ بھی ہوا تو براہ راست مجھے بھی اس معاملے میں ملوث کرلیا جائے گا۔ بہرحال، میرے پاس فرزانہ کا فون نمبر ہے۔ میں اس سے بات چیت کرتا رہوں گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مان جائے۔"

"پولیس اسے کبھی بھی ماننے نہیں دے گی اور اس کے اقرار کے بغیر میری رہائی ممکن نہیں۔" میں نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

"میں چند لوگوں کو خریدنے کی کوشش کروں گا۔" انسپکٹر جعفر بولا۔ "لیکن شاید تمہیں اپنی جائداد سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ تاہم ابھی معاملے کی شروعات ہے، آگے اور بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو جاوید کو بتادینا، میں مہیا کرنے کی کوشش کروں گا۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد جاوید احمد، شائستہ کو لے کر میرے پاس آیا۔ شائستہ کا چہرہ ان دو دنوں کے دوران مرجھا کر رہ گیا تھا اور وہ بہت کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے نمودار ہونے لگے تھے اور وہ اب بھی رو رہی تھی۔

میں نے اسے دلاسا دینے کے لیے جھوٹ بولا کہ کانسٹیبل کی بیوی مان گئی ہے اس لیے جلد ہی مجھے رہا کردیا جائے گا لیکن تب تک اسے اپنا اور بچے کا خیال رکھنا ہوگا۔ شائستہ بدستور روتی رہی۔ اب مجھے بھی اپنی ہمت ٹوٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس لیے میں نے جاوید کو اسے وہاں سے لے جانے کے لیے کہا۔ وہ اسے باہر لے گیا اور میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے لگا۔

مجھے اپنے بچنے کی کوئی امید دکھائی نہیں دے رہی تھی اور پھر اس رات میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ اگر مجھے پھانسی کی سزا ہوگئی تو میں شائستہ کو طلاق دینے کے بعد اس کی شادی جاوید احمد سے کردوں گا۔ وہ دونوں شاید اتنی آسانی سے راضی نہیں ہوں گے لیکن مجھے ان دونوں کو راضی کرنا ہی ہوگا۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ شائستہ میرے بغیر اکیلی نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے بعد میں بھی شادی کرنا ہی تھی تو پھر پہلے ہی کرنے میں کیا مضائقہ تھا۔ جاوید اس کے لیے ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ شاید میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ وہ دونوں شادی سے پہلے بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن تب جاوید احمد کے والد نے شائستہ کے رشتے کو مسترد کردیا تھا۔

مجھے اپنے خیالات پر شرمندگی محسوس ہونے لگی لیکن میں شائستہ کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے جاوید بالکل مناسب تھا لیکن ابھی تک بہت سے معاملات منظرِ عام پر آنے باقی تھے اس لیے میں نے حتمی فیصلہ کرنا ان کے وقوع پذیر ہونے کے بعد تک ملتوی کردیا اور پھر مجھے جاوید کی زبانی معلوم ہوا کہ انسپکٹر جعفر کو پولیس والوں نے تنبیہ کی ہے کہ اگر اس نے دوبارہ فرزانہ سے ملنے کی کوشش کی تو اسے بھی باقاعدہ طور پر معاملے میں ملوث کرلیا جائے گا اس لیے وہ بھی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اب میں بالکل بے سہارا ہوگیا تھا۔

جاوید احمد سے جو بھی ممکن ہوسکا تھا، وہ کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن پولیس والے متحد تھے اور وہ مجھے اپنا دشمن گردان چکے تھے اس لیے سارے راستے بند ہوتے چلے گئے اور پھر اگلے ہفتے سے مقدمے کا آغاز ہوگیا۔ میں نے شہر کے سب سے بڑے وکیل کو مقدمہ لڑنے کے لیے منتخب کیا۔ اس کا نام ایڈووکیٹ عجیب عالم تھا۔ اس نے کیس کا گہری نظروں کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد مجھے بتایا کہ کانسٹیبل کی بیوی کو منانے کے علاوہ اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر میں نے مقدمہ لڑنے



Scanned with CamScanner

کی کوشش کی تو یقیناً ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ فوارہ چوک والے سی سی ٹی وی کیمروں میں تمہیں کانسٹیبل کو کچلتے ہوئے بہ خوبی دیکھا جاسکتا ہے اس لیے اپنی رقم کو برباد مت کرو اور کانسٹیبل کی بیوی کو منانے کی کوشش کرو۔

میں نے بتایا کہ وہ مان نہیں رہی ہے اور اب پولیس والوں نے اس سے ملنے پر بھی پابندی لگادی ہے۔

ایڈووکیٹ مجیب عالم بولا۔ ”تو پھر تم مقدمے کے دوران وہی بیان دینا جو میں تمہیں بتانے والا ہوں۔ انہیں شراب نوشی کے متعلق بالکل نہیں بتانا بلکہ یہ بیان دینا کہ رات کو فنکشن ختم ہونے کے بعد جب تم سرور صاحب کو کوٹھی پر چھوڑنے کے لیے جارہے تھے تو اس حد تک تھک چکے تھے کہ تمہیں اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ گاڑی کا اسٹیئرنگ کس جانب گھوم رہا تھا اور تمہیں گاڑی کو کس جانب لے جانا تھا۔ اس لیے جب کانسٹیبل اچانک ہی سامنے آیا تو تم بروقت بریک پر پاؤں نہیں رکھ سکے اور گاڑی نے کانسٹیبل کو کچل دیا۔ باقی کے معاملات تم جج پر چھوڑ دینا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے حق میں فیصلہ دے دے لیکن مجھے امید دکھائی نہیں دیتی۔“

وکیل سے ملاقات کے بعد رہی سہی ہمت بھی ختم ہوگئی اور میں نے حوصلہ ہار کر اپنے آپ کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اگلے دن مجھے جج کے سامنے پیش کردیا گیا۔ میری جانب سے مقدمہ لڑنے کے لیے کوئی وکیل تیار نہیں تھا کیونکہ پولیس والے میرے خلاف تھے۔ کانسٹیبل کی طرف سے سرکاری وکیل مقدمہ لڑ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے چند روایتی سوال پوچھے جن کا تعلق میری ذات سے تھا۔ مثلاً میں کیا کرتا ہوں، کتنے بچے ہیں، کوٹھی کس کے نام ہے اور گاڑی کا ڈرائیونگ لائسنس میرے پاس ہے یا نہیں؟ ان سوالوں میں میرے خیال میں صرف آخری سوال اہم تھا، باقی فضول تھے۔ بہرحال، میں نے تمام سوالوں کے جواب اسے بتانے کے بعد لائسنس اس کے حوالے کردیا۔ اس نے تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے کے بعد مجھے واپس دے دیا اور پھر حادثے کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے وہی بیان دہرادیا جو مجھے وکیل نے گزشتہ روز بتایا تھا۔ سرکاری وکیل نے توجہ کے ساتھ بیان سنا اور سرد لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

”تو تمہارے کہنے کے مطابق حادثے والی رات تم نے شراب نہیں پی تھی؟“

اس نے طنزیہ لہجے میں جج کی جانب مڑتے ہوئے بتایا۔ ”شہر میں شراب کی چند دکانیں ہیں۔ میں نے ان سے معلومات لیں تو معلوم ہوا کہ ملزم کی کوٹھی میں فنکشن والی رات بہت بڑی مقدار میں شراب منگوائی گئی تھی۔ ظاہر ہے ملزم نے بھی پی ہوگی اور بہت زیادہ پی ہوگی۔ سی سی ٹی وی کیمرے میں بہ خوبی دیکھا جاسکتا ہے کہ گاڑی سے اترتے ہوئے اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ ہے اور اسی لڑکھڑاہٹ سے پہلے اس نے مقتول کو گاڑی کے نیچے کچل دیا جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی۔“

”سی سی ٹی وی کیمرے کی رپورٹ سے اندازہ لگانا ممکن نہیں کہ ملزم نے شراب پی ہوئی تھی یا نہیں۔ آپ صرف اندازے کی بنیاد پر الزام تراشی نہیں کرسکتے۔ اگر آپ کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے تو پیش کیجیے۔“ جج نے کہا۔

وکیل مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بے شک میرے پاس ہے۔ میں جائے حادثہ پر موجود سرور صاحب کو کٹہرے میں بلانا چاہتا ہوں۔ وہ تمام واقعے کے عینی گواہ ہیں۔ انہیں سب معلوم ہے کہ اس رات کیا ہوا تھا اور غلطی کس کی تھی۔“

جج نے اجازت دے دی اور وکیل نے حاضرین کے درمیان بیٹھے ہوئے سرور صاحب کو کٹہرے میں آنے کے لیے کہا۔

میں نے اب تک انہیں حاضرین کے درمیان بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ چھپ کر بیٹھے تھے۔ بہرحال، وکیل کے کہنے پر کٹہرے میں آگئے۔ وہ مجھ سے آنکھیں چرا رہے تھے۔

وکیل نے انہیں تسلی دینے کے بعد واقعے کی تفصیل بتانے کے لیے کہا تو وہ رٹے ہوئے طوطے کی طرح فر فر بولنے لگے۔

”مجھے حادثے کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں کہ میں گاڑی میں بیٹھتے ہی گہری نیند سوگیا تھا۔ یہ نشے میں دُھت گاڑی چلا رہا تھا۔ جب حادثہ رونما ہوا تب میری آنکھ کھلی اور میں نے گاڑی سے نیچے اتر کر دیکھا تو کانسٹیبل کا کچلا ہوا جسم گاڑی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس کی موت عنقریب واقع ہونے والی تھی۔ میرے ساتھی نے اسے نشے کی حالت میں دُھت ہونے کی وجہ سے بری طرح کچل کر رکھ دیا تھا۔“

وکیل نے فخریہ نگاہوں سے جج کی طرف دیکھا۔ جج نے چند لمحوں کی مزید پوچھ گچھ کے بعد کانسٹیبل فضل محمد کی بیوہ کو کٹہرے میں بلانے کے لیے کہا۔ وہ اگلی رو میں حاضرین کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے پہلی دفعہ اسے دیکھا۔ اس کے متعلق بتانے والی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ دبلی



Scanned with CamScanner

پتلی اور کالی سیاہ رنگت والی پچیس تیس سالہ عورت تھی جس نے معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ مشابہت رکھتے ہوئے دو لڑکے بھی تھے جن کی عمریں بالترتیب تین اور پانچ سال تھیں۔ انہیں جان بوجھ کر عدالت میں لایا گیا تھا تاکہ جج پر ماں اور بیٹوں کا اچھا تاثر پڑ سکے۔ فضل محمد کی بیوہ کا نام فرزانہ تھا۔ اس نے کٹہرے میں آنے کے فوراً بعد آنسو بہاتے ہوئے اپنی غربت کا رونا رویا پھر شوہر کے مرنے کے بعد کے مسائل بتانے لگی۔

میں نے پریشان نگاہوں سے جج کی جانب دیکھا۔ اس کا دل پسیج چکا تھا اور وہ ترحم بھری نگاہوں سے فضل محمد کی بیوہ کی روداد سن رہا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اب مجھے پھانسی چڑھنے سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا لیکن مجھے جج کا فیصلہ تو سننا ہی تھا۔

فرزانہ چپ ہوئی تو جج نے اس سے پوچھا۔ ”ملزم تمہارے سامنے کھڑا بے جواب مجرم بن چکا ہے۔ اس نے تمہاری ہنستی کھیلتی زندگی کو برباد کیا ہے۔ اسے معاف کر دو گی تو تمہارے اوپر زور زبردستی نہیں ورنہ اسے سزا تو ملے گی ہی۔“ جج چپ ہو گیا۔

میرا سانس سینے میں اٹکنے لگا۔ دماغ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ مجھے یوں معلوم ہونے لگا جیسے وقت رک گیا ہو۔ عدالت کے کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری تھی اور پھر اچانک ہی اس خاموشی کو فرزانہ کی آواز نے درہم برہم کر دیا۔ اس کی غصے بھری آواز مجھے سنائی دی۔

”میں اپنے شوہر کے قاتل کو کبھی بھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس نے میری خوشیوں بھری زندگی کو غموں کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ میرے بچوں کے سر سے باپ کا سایہ چھین کر انہیں یتیم بنا ڈالا ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ خدارا اسے عمر قید کے بجائے پھانسی کی سزا دیجیے۔ میں موت کے بدلے میں موت چاہتی ہوں۔“

جج نے اپنے سامنے رکھا ہوا قلم اٹھایا اور کاغذ پر کچھ لکھنے کے بعد قلم کی نوک کو توڑ دیا۔ پھر عدالت کے کمرے میں بیٹھے ہوئے حاضرین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے خیال میں مقدمے کا فیصلہ مقتول کی بیوہ نے آپ کو سنا ہی دیا ہے۔ کیس زیادہ پیچیدہ نہیں تھا۔ قصور سراسر مجرم کا تھا۔ اگر شراب کے نشے میں دھت نہ ہوتا تب سزا میں کمی بیشی کی جا سکتی تھی لیکن شراب پی کر کانسٹیبل کو کچلنا ناقابلِ تلافی جرم ہے اس لیے میں فرزانہ بی بی کی درخواست کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مجرم کو پھانسی کی سزا دیتا ہوں۔“

فرزانہ نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یکدم میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کو کھینچ لیا گیا ہو اور میرا جسم ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا ہو۔ مزید کچھ سوچنے سمجھنے سے قبل ہی قریب کھڑے پولیس اہلکار نے مجھے بازو سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے عدالت کے کمرے سے باہر لے آیا جہاں جیل کی وین میری منتظر تھی۔ مجھے اس میں بٹھا کر جیل کی تاریک کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا۔ پھانسی کا فیصلہ ہونے کے بعد مجھ سے وہ تمام مراعات چھین لی گئیں جو پہلے جان پہچان کی وجہ سے مجھے حاصل تھیں۔ مجھے اب ان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میری زندگی ختم ہونے والی تھی اور مجھے اب صرف شائستہ اور بچے کے لیے سوچنا تھا۔ اس لیے میں شدت کے ساتھ جاوید احمد کا انتظار کرنے لگا۔ اب میرے لیے اس کی حیثیت کسی مسیحا سے کم نہیں تھی۔ وہی میرے بچے اور بیوی کو نئی زندگی دے سکتا تھا۔ اس سے میری ملاقات اگلے دن ہوئی۔ چونکہ اس آدھے گھنٹے کی ملاقات کے دوران مجھے بہت سے معاملات پر بات چیت کرنا تھی اس لیے میں


متحدہ عرب امارات میں مقیم
اردو قارئین کے لیے خوشخبری
جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)
کے چاروں رسائل
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت
ایک فون کال کے فاصلے پر
آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔
اردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زاید آر ڈی، ای 311 شارجہ
971504805734
URDU BOOKS WORLD FZC.
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA,
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES




Scanned with CamScanner

نے گی بندھی بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

اب کی دفعہ اسے کال کوٹھری میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ وہ سلاخوں سے بھی کچھ دور کھڑا تھا۔ اس کے پاس مجھے دلاسا دینے کے لیے الفاظ ختم ہو چکے تھے اور چہرے پر ندامت بھرے تاثرات تھے۔ وہ میرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

''میرے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے چیدہ چیدہ باتیں کروں گا، تم انکار نہیں کرنا۔ میری موت کا فیصلہ جج کے قلم توڑ دینے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ جس دن پھانسی کی سزا ہوگی، اس دن میری زندگی بھی مجھ سے چھین لی جائے گی۔ اس سے پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ اس مشکل گھڑی میں تم میرا ساتھ دو گے۔''

اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تمہاری زندگی یا پھر موت کا حتمی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ ہم سپریم کورٹ سے اپیل کریں گے اور ایڈووکیٹ مجیب عالم بھی فرزانہ سے بات چیت کر رہا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کی کوششوں کے مثبت نتائج جلد ہی سامنے آ جائیں گے۔''

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ سب کوششیں بے معنی ہیں۔ میں نے عدالت کے کمرے میں فرزانہ کے چہرے پر اپنے لیے جو نفرت بھرے تاثرات دیکھے تھے، اسے دیکھنے کے بعد مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ تم بس میری بات کو غور سے سنو۔ اگر تم اس مشکل گھڑی میں میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو پھر شائستہ سے شادی کر لو۔''

جاوید احمد کے چہرے پر زلزلے جیسے تاثرات پیدا ہوئے اور وہ ہکا بکا ہو کر میرے چہرے کو دیکھنے لگا۔

میں نے جذباتی لہجے میں دوبارہ کہا۔ ''ان دونوں کو تمہاری اشد ضرورت ہے۔ شاید آج سے پہلے ایسا نہ ہوا ہو کہ مجبور انسان اپنی بیوی کا ہاتھ اپنی زندگی میں کسی اور کے ہاتھ میں دے رہا ہو۔ یہ مجبوری کی انتہا ہے۔ تم اور شائستہ شادی سے پہلے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اس لیے تمہیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اسے اپنا لو، میں تمہارا یہ احسان تمام زندگی بھلا نہیں سکوں گا۔''

وہ پریشان لہجے میں بولا۔ ''تم پھانسی کے متعلق سن کر پاگل ہو گئے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری باتوں میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تم صرف بے پر کی ہانک رہے ہو۔ تاہم پھر بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ شائستہ اور تمہارے بچے کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اسی کے ساتھ محفوظ اور مطمئن ہیں۔''

میں نے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔ ''بس تم اس سے شادی کر لو ورنہ میں تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گا۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔ تم ہاں کہہ کر مجھے دائمی سکون دے سکتے ہو ورنہ میں شاید پھانسی چڑھنے سے پہلے ہی اس کال کوٹھری میں دم گھٹ کر مر جاؤں گا۔''

جاوید احمد شش و پنج میں پڑ گیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ انکار صرف مروت کے عالم میں کر رہا تھا ورنہ وہ اب بھی شائستہ سے اتنی ہی محبت کرتا تھا جتنی کہ شادی سے پہلے کرتا تھا۔

کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ بالآخر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہارے بعد اس سے شادی کر لوں گا لیکن وعدہ نہیں کرتا۔ دراصل امی میری شادی کی بات کر چکی ہیں۔ مجھے انہیں بھی منانا ہوگا۔''

میں نے بے چین لہجے میں کہا۔ ''میں سب کچھ اپنی زندگی میں ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں میری آنکھوں کے سامنے شائستہ سے شادی کرنا ہوگی۔ میرے پاس دن بہت کم ہیں۔ تم ایک مرتے ہوئے انسان کو سکون دے سکتے ہو۔ میں کل ہی اسے طلاق دے دوں گا اور بعد میں تم اس سے شادی کر لو گے ورنہ میں اپنے آپ کو تمہارے سامنے ختم کر لوں گا۔''

جاوید احمد نے مجھے دلاسا دینے کے لیے کہا۔ ''میں شائستہ سے پوچھ کر تمہیں کل جواب دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ انکار کر دے گی۔''

''نہیں، اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسے طلاق دوں گا تو وہ خود ہی تم سے شادی کر لے گی۔ بعد میں، میں اپنی تمام جائیداد بھی تم دونوں کے نام کر دوں گا۔''

جاوید احمد سوچ میں پڑ گیا۔ اسے شادی تو کرنا ہی تھی۔ اگر اپنی پچھلی محبت سے کر لیتا تو اس میں مضائقہ ہی کیا تھا اور پھر مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ شائستہ کو دل ہی دل میں اب بھی پسند کرتا تھا۔ اس لیے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بالآخر اس نے اقرار میں سر ہلا دیا اور میں مطمئن ہو کر کال کوٹھری کے کونے میں آ گیا لیکن بعد میں جو دل دہلا دینے والے واقعات رونما ہوئے، میں آپ کو ان کے متعلق بتاتا ہوں۔ پہلے ذرا سانس درست کر لوں۔

☆☆☆

اگلے دن جاوید احمد نے طلاق کے کاغذات بنا لیے

اور میں نے ان پر دستخط کر دیے۔ یقیناً شائستہ طلاق کے کاغذات پر اتنی آسانی سے دستخط نہیں کرتی، جاوید احمد کو کروانے پڑتے اور یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ گزشتہ روز میری ملاقات ایڈووکیٹ مجیب عالم سے ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ سپریم کورٹ کو اپیل بھجوادی گئی ہے۔ کچھ دنوں میں پتا چل جائے گا اور یہ کہ وہ فرزانہ سے ملنے کی بھی کوششیں کر رہا ہے لیکن وہ مل نہیں رہی تھی۔ اسے پولیس والوں نے منع کر دیا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ نہ ہی فرزانہ، ایڈووکیٹ مجیب عالم سے ملنے والی تھی اور نہ ہی میری اپیل پر سپریم کورٹ کوئی ایکشن لینے والی تھی۔ اس لیے میں سب کچھ جاوید احمد کے حوالے جلد از جلد کر دینا چاہتا تھا اور پھر حیرت انگیز طور پر دوسرے دن ہی وہ طلاق کے کاغذات لے کر جیل میں آ گیا۔ اس پر شائستہ کے دستخط موجود تھے۔ جاوید احمد نے مجھے بتایا کہ وہ دستخط نہیں کر رہی تھی لیکن اسی کے کہنے پر اس نے بالآخر دستخط کر دیے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے یکلخت پھانسی دے دی گئی ہو، جیسے زبردستی مجھ سے سب کچھ چھین کر جاوید احمد کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ میں اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگا۔ حالانکہ سب کچھ میری مرضی سے ہوا تھا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ شائستہ اتنی جلدی طلاق کے کاغذات پر دستخط کر دے گی۔ وہ یقیناً اب بھی جاوید سے محبت کرتی تھی اور اس سے شادی بھی کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے فوراً ہی دستخط کر دیے تھے۔ میں نے سلاخوں کے دوسری جانب کھڑے ہوئے جاوید سے افسردہ لہجے میں کہا۔

''میں جلد از جلد اپنی تمام جائداد شائستہ کے نام منتقل کر دوں گا اور اس کے بعد تم مجھ سے ملنے کے لیے جیل نہیں آؤ گے۔ ہوسکتا ہے جلد ہی مجھے پھانسی ہو جائے۔ ایڈووکیٹ مجیب عالم نے اپیل سپریم کورٹ بھجوادی ہے۔ وہ اگر مسترد ہو گئی تو پھر میرے لیے پھانسی کا انتظار کرنے کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں بچے گا۔''

جاوید آنکھیں چُراتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ سب کچھ تمہارے مجبور کرنے پر کر رہا ہوں ورنہ میرا ایسا کوئی بھی ارادہ نہیں تھا...... اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں پھانسی نہیں ہوگی بلکہ سپریم کورٹ سے تمہاری اپیل منظور ہو جائے گی اور تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''مجھے اب رہائی نہیں چاہیے۔ میں شائستہ کو طلاق دے چکا ہوں۔ رہا ہو کر میں نے کیا کرنا ہے۔ اب تو مجھے صرف اپنے بیوی بچے کے بہتر مستقبل کے بارے میں سوچنا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم ان دونوں کو بہت خوش رکھو گے۔''

جاوید نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''میں پوری کوشش کروں گا اور اس کے لیے مجھے تمہاری جائداد کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کے بغیر بھی ان کے لیے بہت کچھ کرسکتا ہوں۔ بہرحال شائستہ سے شادی کرنا میری مجبوری ہے ورنہ لوگ بلاوجہ باتیں کریں گے اور ہدف شائستہ بنے گی۔''

میں نے اسے بتایا۔ ''جائداد میں اپنی خوشی سے شائستہ کے نام کر رہا ہوں اور اس پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ شائستہ کا ہے۔ تم شادی کے فوراً بعد شائستہ اور بچے کو لے کر ہنی مون منانے کے لیے بیرونِ ملک چلے جانا تاکہ شائستہ کو میری پھانسی کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہوسکے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور جیل سے باہر چلا گیا۔

اب میں تحریر کو مزید کیا طوالت دوں۔ عدت کے بعد شائستہ نے جاوید سے شادی کرلی۔ اگلے دن اس نے جیل میں آکر مجھے تصویریں دکھائیں۔ شائستہ بظاہر خوش دکھائی نہیں دے رہی تھی، اس کے چہرے پر سوگوار تاثرات تھے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر اپنی گزشتہ محبت کو پالینے کے بعد بہت خوش تھی۔ اس کی گود میں میرا دودھ پیتا بچہ موجود تھا جسے دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ نہ جانے اس کے ساتھ آگے کیا ہونے والا تھا۔

تصویر دکھانے کے بعد جاوید احمد نے مجھے بتایا کہ وہ اگلے ہفتے شائستہ اور بچے کو لے کر لندن جانے والا ہے اور شاید ان کی واپسی ایک مہینے کے بعد ہوگی۔

میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے اسے نیک تمناؤں کی دعا دی اور جلد جائداد کی منتقلی کے کاغذات بنانے کی بھی تلقین کی۔

اس نے بتایا کہ وہ کل سے ہی کاغذات بنوانا شروع کر دے گا۔ شاید اس میں کچھ دن لگ جائیں لیکن امید ہے کہ لندن جانے سے پہلے تمام کام ہو جائے گا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ باہر چلا گیا پھر جائداد کی منتقلی کے دوران ہی ایڈووکیٹ مجیب عالم نے مجھے مختصر ملاقات کے دوران بتایا کہ سپریم کورٹ نے میری اپیل کو مسترد کر دیا ہے اور اب صدر سے اپیل باقی بچی ہے۔ اگر وہاں سے بھی مسترد ہو گئی تب پھانسی کی تاریخ آ جائے گی۔

میں نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔ ''صدر کو اپیل نہ



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

بھجواؤ۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں پھانسی کی تاریخ کا انتظار کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے حیرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا پھر نرم لہجے میں بولا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم مایوس ہو گئے ہو اس لیے اب حالات سے لڑنے کا ارادہ ترک کر چکے ہو لیکن میں ناامید نہیں ہوا ہوں اس لیے صدر کو اپیل کی درخواست ضرور بھجواؤں گا۔ اگر وہاں سے انکار ہو گیا تو آخری وقت تک فرزانہ سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

میں نے جواب دیا۔ "اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کو تباہ کر چکا ہوں۔ اب اگر سزا معاف بھی ہو گئی تو شاید میں جیل سے باہر جانے سے انکار کر دوں۔"

اسے میری بات کی سمجھ بہ خوبی آ گئی کیونکہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ جاوید احمد نے شائستہ سے شادی کر لی تھی اور شاید اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں نے اپنی جائداد بھی ان دونوں کے نام منتقل کر دی تھی۔ اب اگر پھانسی کی سزا معاف بھی ہو جاتی تو میں باہر جا کر کیا کرتا۔ اس لیے وہ کوئی بھی بات کیے بغیر باہر چلا گیا۔

اگلے ہفتے جاوید احمد اور شائستہ بیرون ملک کے لیے روانہ ہو گئے اور میں مزید تنہا ہو گیا لیکن قدرت کے کام بھی نرالے ہیں کیونکہ جاوید احمد اور شائستہ کے لندن جانے کے دوسرے دن ہی مجھے رہا کر دیا گیا۔ میں اتنا حیرت زدہ اپنے والدین کی وفات پر بھی نہیں ہوا تھا، جتنا رہائی کا پروانہ ملنے کے بعد ہوا اور جب میں نے پولیس والوں سے رہائی کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ فرزانہ گزشتہ روز جیل آئی تھی اور اس نے معافی نامے پر دستخط کر دیے تھے۔ اب آگے آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ میری حالت اس وقت کیا ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا سب کچھ بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اب باہر جانے کی کیا تک بنتی تھی۔ اس کے باوجود بھی میں فرزانہ سے ملاقات ضرور کرنا چاہتا تھا اور اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے تب ہی مجھے معاف کرنا تھا جب میں اپنا سب کچھ تیاگ چکا تھا؟ وہ پہلے بھی تو مجھے معاف کر سکتی تھی۔ مجھے اس کا یہ اقدام کچھ غیر فطری لگ رہا تھا اس لیے جیل سے فارغ ہونے کے بعد جاوید احمد کے گھر آ گیا۔ وہاں اس کی والدہ اکیلی تھیں۔ انہوں نے حیرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا تو میں نے انہیں بتا دیا کہ مقتول کی بیوہ نے مجھے معاف کر دیا ہے اور یہ کہ وہ جاوید احمد کو ابھی اس کے متعلق کچھ نہیں بتائیں۔ پھر میں نہا دھو کر جاوید احمد کے کپڑے پہننے کے بعد ٹیکسی پکڑ کر فرزانہ کے گھر کی طرف چلا آیا۔ اس کا کچا پکا گھر شہر کے مضافات میں واقع تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر پریشان نہیں ہوئی بلکہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم مجھ سے ملاقات کے لیے ضرور آؤ گے۔ میں تمہیں پہلے ہی معاف کر دیتی کیونکہ میری طرح تمہارا بھی لڑکا ہے اور میں اس کے سر سے باپ کا سایہ چھیننا نہیں چاہتی تھی لیکن پولیس والوں نے منع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تمہیں کچھ تو سزا ملنی چاہیے تاکہ آئندہ تم گاڑی چلاتے ہوئے شراب پینے سے اجتناب کرو۔ اس لیے انہوں نے معاملے کو طول دے دیا لیکن کل میں نے بیان دینے کے بعد معافی نامے پر دستخط کر دیے۔ پولیس والے اب بھی نہیں مان رہے تھے لیکن میں اپنے بچوں کے ساتھ گاؤں جانا چاہتی ہوں۔ وہاں میرے ماں باپ اور بھائی بہن رہتے ہیں۔" وہ چپ ہو گئی۔

میرے پاس اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ میری وجہ سے اس کا ہنستا بستا گھر اجڑ گیا تھا اور اس وقت میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی موجود نہیں تھی جو میں اس کے بچوں کو دے دیتا۔ تاہم میں نے دل میں پکا تہیہ کر لیا کہ شائستہ کے واپس آنے کے بعد فرزانہ اور اس کے بچوں کو ضرور کچھ نہ کچھ دوں گا۔ اس لیے کچھ دیر وہاں بیٹھ کر واپس جاوید کے گھر آ گیا۔

☆☆☆

پھر اچانک جاوید احمد اور شائستہ واپس آ گئے۔ میری آمد کی خبر یقیناً انہیں جاوید احمد کی والدہ نے دی ہوگی۔ بہرحال، میری بیوی ایک دفعہ پھر میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے تنقیدی نگاہوں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا اور دل تھام کر رہ گیا۔ آپ بھی ذرا ملاحظہ کیجیے۔ وہ عورت جو پہلے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، اب بالکل بدل کر رہ گئی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو کاندھے تک کٹوا لیا تھا اور نہایت عریاں لباس زیب تن کیا ہوا تھا جس میں اس کے جسم کے تمام نشیب و فراز نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کی مخروطی انگلیوں کے ناخن لمبے تھے جن پر اس نے نیل پالش لگا رکھی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گئی تھی یعنی وہ خوش باش تھی، اگر میں پھانسی چڑھ جاتا تب بھی اسے افسوس نہیں ہوتا۔ بہرحال، مجھے سامنے دیکھ کر اس نے خوشی کا مصنوعی اظہار کیا۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے تیمور کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ٹھیک ہے اور جاوید کی والدہ کے پاس ہے۔ میں نے کہا کہ وہ اسے لے آئے، میں

اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ باہر چلی گئی۔ جاوید نہ جانے کہاں تھا۔ میں نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تیمور کو لیے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے ساتھ جاوید احمد بھی تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے گلے لگالیا اور رہائی کی مبارک باد دی۔ میں نے تیمور کو گود میں اٹھالیا۔ اجنبی چہرے کو دیکھ کر اس نے زاروقطار رونا شروع کردیا۔ میں نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا باپ ہوں۔ ابھی اتنا وقت نہیں گزرا کہ تم مجھے بھلادو۔"

شائستہ نے اسے مجھ سے لینے کی کوشش کی۔ میں نے زہرخند لہجے میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب میرے پاس اس کے علاوہ اور باقی بچا ہی کیا ہے۔ سب کچھ وقت نے مجھ سے چھین لیا ہے۔"

جاوید احمد نرم لہجے میں بولا۔ "تم سے کسی نے بھی کچھ نہیں چھینا۔ اب بھی سب کچھ تمہارا ہے۔ اگر کہتے ہو تو میں شائستہ کو طلاق دے دیتا ہوں۔ تم اسے واپس لے جاؤ۔"

میں نے تیکھی نگاہوں سے شائستہ کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب بھرے تاثرات تھے جیسے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پارہی ہو اور جو حالات اس وقت چل رہے تھے، اس میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔

وہ کچھ دیر کے لیے چپ رہی پھر حتمی لہجے میں بولی۔

"میرے خیال میں طلاق کا یہ کھیل اب ختم ہوجانا چاہیے۔ میری زندگی کوئی مذاق نہیں ہے جسے جب چاہو نظرانداز کردو اور جب چاہو اس پر حکمرانی کرنے کی کوشش کرو۔ اب یہ ممکن نہیں ہے۔ میں جاوید کے ساتھ خوش ہوں اس لیے تم یہاں سے واپس چلے جاؤ۔"

میرا خون کھولنے لگا، ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ وہی شائستہ جو مجھے پہلے کسی حور سے کم دکھائی نہیں دیتی تھی، اب چڑیل کے مانند گھناؤنی معلوم ہونے لگی۔ میں نے تیمور کو قریبی صوفے پر بٹھایا اور آگے بڑھ کر شائستہ کا گلا دبانے لگا۔ جاوید نے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن میرے جسم میں جذباتی ہونے کے باعث بے تحاشا طاقت پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا اور دوبارہ شائستہ کا گلا دبانے لگا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں اور منہ سے رال بہنے لگی۔ میری گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جارہی تھی۔ اگر کچھ دیر مزید میں اس کا گلا دباتا تو شاید منکا ٹوٹ جاتا لیکن جاوید نے صوفے کے پاس رکھا ہوا گلدان اٹھایا اور میرے سر پردے مارا۔ مجھے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ شاید خون نکل آیا تھا کیونکہ مجھے ماتھا گیلا ہوتا محسوس ہورہا تھا۔ شائستہ کی گردن سے میرا ہاتھ یکلخت ہٹ گیا اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھاما اور نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ جاوید نے گلدان کو میز پر رکھ دیا پھر تاسف بھرے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"میں اس بدمزگی کے حق میں نہیں تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ سب ہوگا اس لیے میں نے پہلے ہی شائستہ کو کہہ دیا تھا کہ تیمور کو لے کر واپس تمہارے ساتھ چلی جائے لیکن اس نے صاف انکار کردیا۔ وہ تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتی اور تیمور کو بھی تمہارے حوالے نہیں کرنا چاہتی۔ میں جب بے بس ہوگیا تو میں نے اسے طلاق دینے کی دھمکی دی تب اس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے بروقت اسے تھام لیا ورنہ گاڑی سے نیچے چھلانگ لگادیتی۔ میں اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ اگر تم نے اس پر زور زبردستی کی تو شاید دوبارہ خودکشی کرنے کی کوشش کرے گی اور مجھے یقین ہے کہ میری طرح تم بھی اسے مرتا ہوا نہیں دیکھنا چاہو گے۔ اس لیے میری مانو تو یہاں سے چلے جاؤ۔ میں کوشش کروں گا کہ بعد میں سمجھا بجھا کر اسے تمہارے پاس بھیج دوں۔"

میرا دماغ ایک دفعہ پھر گھوم گیا۔ شکست کا احساس انسان کو پاگل بنا کر رکھ دیتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ انسان وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جسے کرنے کے متعلق عام زندگی میں سوچ بھی نہیں سکتا اور میں نے بھی وہی کچھ کیا یعنی میز پر رکھے ہوئے گلدان کو اٹھایا جس سے جاوید احمد نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ وہ مجھ سے بات ختم کرنے کے بعد شائستہ کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ یہی اس کی غلطی تھی۔ میں نے پوری طاقت کے ساتھ گلدان کو اس کے سر پر دے مارا۔ اس کے منہ سے دلدوز چیخ نکلی اور وہ تیورا کر زمین پر گر گیا۔ اس کا سر پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ میرے ہاتھوں سے گلدان نیچے گر گیا اور میں تھکے ہوئے انداز میں قریبی صوفے پر ڈھے گیا۔

شائستہ چیختے چلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے باہر جا کر پولیس کو فون کردیا۔ کچھ دیر بعد پولیس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی پھر مجھے گاڑی میں بٹھا کر تھانے لے گئی۔

مجھ پر دوبارہ مقدمہ چلا لیکن اس دفعہ مجھے پھانسی کی سزا نہیں ہوئی بلکہ عمر قید ہوگئی۔ جیل میں دن رات کاٹے نہیں کٹتے ہیں۔ بس اپنی بقیہ زندگی گزار رہا ہوں۔

✖✖✖

# دیس بدیس

ناہید سلطانہ اختر

دنیا ایک ایسی قیام گاہ جس میں سبھی انسان اپنی اپنی خواہشوں کے اسیر ہیں... کوئی حالات کی سختی کا شکار... تو کوئی سب کچھ مل جانے پر شاداں و فرحاں... کچھ ایسے جنہیں زمانے سے جھڑکیاں اور لعن طعن ہی ملتی ہے... سونے پہ سہاگا غربت بھی ان کے ہم رکاب رہتی ہے... ایسے میں جب منزل کا تعین نہ ہو تو وہ آسمان میں بھٹکتے پنچھیوں کی طرح عازم سفر ہوجاتا ہے... بہتر مستقبل، آسودہ زندگی اور دولت کمانے کی چاہ اسے وطن سے دور نگر نگر گھومنے پر مجبور کردیتی ہے اور وہ پردیس میں قسمت آزمانے چل پڑتا ہے... وہ سمجھتا ہے کہ وہاں کی سڑکیں شیشے کی ہوتی ہیں اور نوٹ اس پر بکھرے پڑے رہتے ہیں جنہیں جتنا مرضی اٹھالو... مگر یہ اس کی خام خیالی.... ہوتی ہے... کیونکہ اپنا دیس اپنا ہی ہوتا ہے... وہاں صعوبتیں اٹھاتے اٹھاتے شدت سے وطن سے دوری اور اپنوں کے نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے... اور یہی کلفتیں سہتے بالآخر زندگی کی شام ہوجاتی ہے... مگر مسافر اپنی منزل سے کوسوں دور ہی ہوتا ہے۔

دلوں میں امنگ، آنکھوں میں سہانے خواب

سجائے پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان

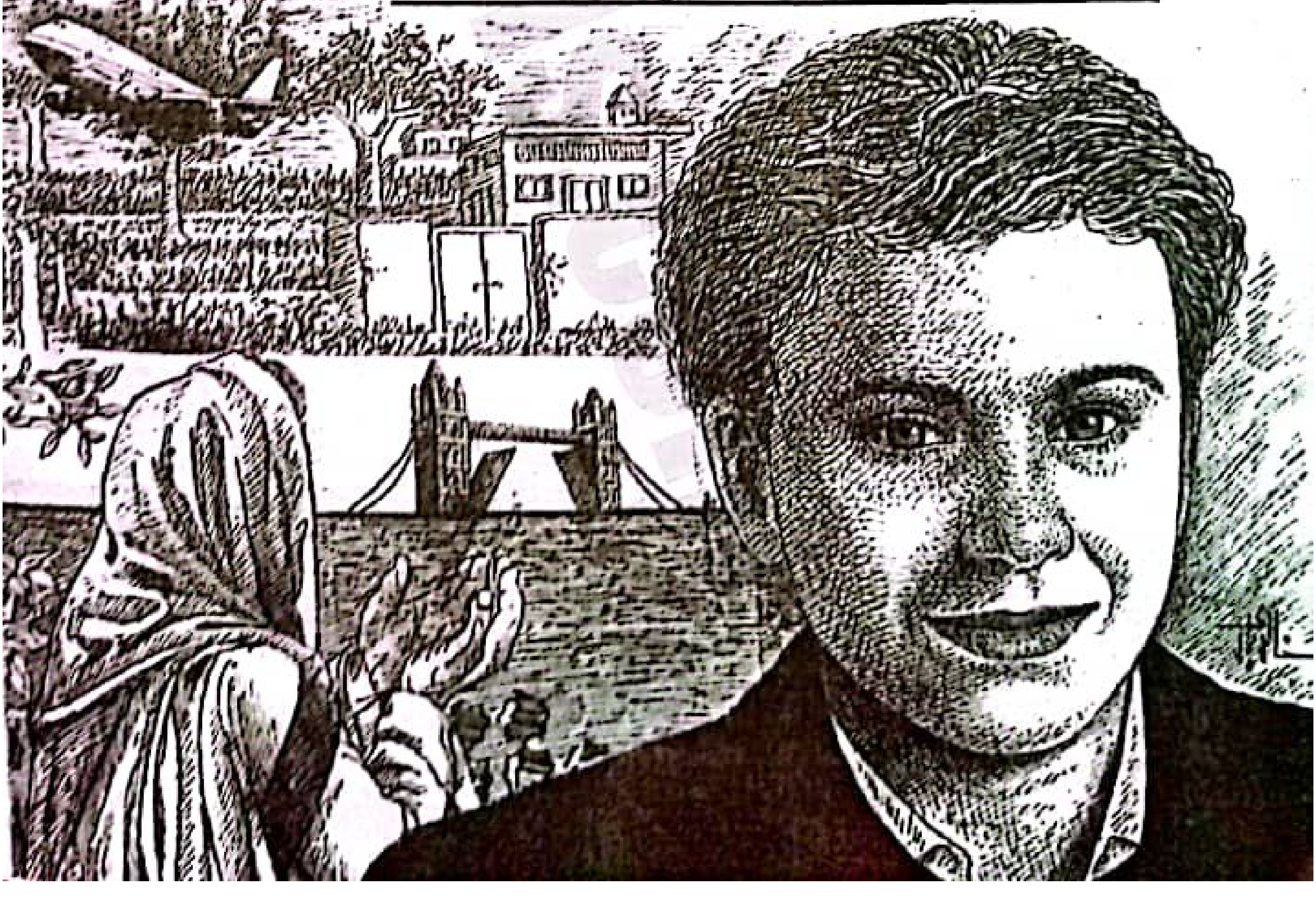

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

تنگ گلی میں بانسوں اور بلیوں کے سہارے سرکیوں اور چٹائیوں سے بنی ایک جھونپڑی کی اوٹ میں بیٹھا رجب علی نہایت سنجیدگی اور دل گرفتگی سے سوچ رہا تھا، کہیں سے دیا سلائی مل جائے تو وہ پوری بستی کو آگ لگا دے مگر دیا سلائی بھی عنقا تھی۔ گھر میں اس کی بوڑھی بیوہ ماں دیا سلائی کو اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ کر رکھتی۔ رجب علی کی دل گرفتگی کا سبب آج کچھ اور ہی تھا۔ بڑے بھائیوں سے الٹی سیدھی سننا اور کبھی کبھی ہاتھ بھی پڑ جانا اس کے لیے نئی بات نہ تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن کا معمول تھا۔ کبھی بڑا بھائی، کبھی منجھلا اور کبھی دونوں شیر و شکر ہو کر اس پر چڑھائی کرتے۔ گھر سے نکل کر کچھ دیر وہ برہنہ پا بستی میں ادھر ادھر گھومتا رہا تھا پھر ایک گلی میں آبیٹھا اور اپنے باغیانہ خیالات میں ڈوب گیا۔ کبھی گھر سے بھاگ جانے کا خیال آتا، کبھی بستی کے اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا دینے کا اور کبھی پوری بستی کو آگ لگا دینے کا...... نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

عجیب تھے وہ دن، سسکتے، کراہتے۔ بے سروسامانی ایسی کہ الامان۔ ماں مٹی کے چولہے میں آگ سلگانے کے لیے دن بھر ادھر اُدھر سے تنکے، کاغذ، سوکھے پتے اور جھاڑ جھنکاڑ چن کر چولہے میں ڈالتی رہتی۔ ماں تہجد گزار تھی۔ فجر کی نماز اور قرآن مجید کی تلاوت سے فارغ ہو کر چولہا جلاتی اور چٹکی بھر چائے کی پتی اور گڑ کی ڈلی سے اپنے لیے قہوہ بناتی اور چولہے کے قریب ہی بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ قہوہ پی کر رب کا شکر ادا کرتی۔

عسرت کے دن تھے۔ نہ پیٹ بھر روٹی ملتی، نہ ستر پوشی کو مناسب لباس۔ رجب علی ننگے پاؤں بستی کی گلیوں میں اکثر بے سبب گھومتا پھرتا، کبھی کبھی سبب بھی میسر آ جاتا۔ کسی گلی میں کنچے کھیلتے لڑکوں میں شامل ہو جانے کا یا گلی ڈنڈا اچھالتے ہوؤں کی خوشامد کر کے ایک دو باریاں لینے کا۔ ہاں، کبھی کبھی میدان میں لنگوٹے کسے جوانوں کی کبڈی رجب علی کو گویا مردود فردا سے بھی بیگانہ کر دیتی تھی۔

مملکت نو آزاد تھی اور بستی نو آباد۔ مہاجرت کی صعوبتیں جھیل کر آنے والوں کی آباد کاری کے لیے نو آزاد مملکت کی ایک مخیر شخصیت نے اپنا بیش قیمت وسیع و عریض رقبہ اراضی نہایت دریا دلی سے وقف کر دیا تھا جہاں مہاجرینِ وطن نے کہیں بانسوں، بلیوں، سرکیوں اور چٹائیوں سے جھونپڑیاں کھڑی کر لی تھیں اور کہیں مٹی گارے، گوبر اور گھاس پھوس سے نیم پختہ گھر تعمیر کر لیے تھے۔

رجب علی، اس کی ماں اور بہن بھائی تقسیم کے بعد پہلے لاہور پہنچے جہاں اس کی بیوہ ماں نے جو تقسیم کے ہنگاموں میں جوان لڑکیوں کی بے حرمتی کے قصوں سے ڈری ہوئی تھی، بڑی اور منجھلی دونوں بیٹیوں کو حسب نسب دیکھے بغیر انجانوں میں بیاہ دیا۔ بڑی کا شوہر پہلے ہی ایک بیوی والا تھا۔ کچھ عرصہ لاہور میں رہنے کے بعد رجب علی، اس کی ماں، دو بھائیوں اور چھوٹی بہن نے عروس البلاد کا رخ کیا تو اس کی شادی شدہ بہنیں بھی کچھ عرصے بعد وہیں آ گئیں۔

مخیر شخصیت کی وقف کردہ زمین پر رجب علی کے خاندان نے بھی ایک قطعۂ اراضی گھیر کر اپنا مسکن تعمیر کر لیا۔ چہار اطراف بانسوں، بلیوں، سرکیوں اور چٹائیوں سے بنے ایک کمپاؤنڈ میں سب مل جل کر رہنے لگے۔ دونوں بھائیوں کو چھوٹی موٹی نوکریاں مل گئیں۔ منجھلی نے پرائیویسی کی خاطر اپنے شوہر کے ساتھ مل کر اپنی نیم پختہ کوٹھڑی کھڑی کر لی۔ رجب علی کی ماں نے بڑے اور منجھلے بیٹے کی اپنے ایک رشتے دار کی دو بیٹیوں سے سگائی کی اور انہیں کمپاؤنڈ میں اپنا علیحدہ گھر تعمیر کرنے کا مشن سونپا۔ شادی کے جوش میں دونوں نے نہ صرف اپنی بلکہ بڑی بہن اور ماں کے لیے بھی نیم پختہ کوٹھڑیاں تعمیر کر دیں۔ ماں دونوں بہوویں گھر لے آئی۔

کمپاؤنڈ میں پانچ کوٹھڑیاں تھیں۔ دو بھائیوں کی، ایک بڑی بہن کی، ایک منجھلی بہن کی اور ایک ماں، رجب علی اور چھوٹی بہن کے لیے۔ رجب علی اور اس کی چھوٹی بہن زیادہ تر بڑی بہن کے پاس رہتے جس کا شوہر کبھی کبھار مہمانوں کی طرح آتا اور چلا جاتا۔ اسے نہ بیوی کی کفالت سے غرض تھی، نہ ان بچوں کی جنہیں وہ مختصر وقفوں میں یکے بعد دیگرے بیوی کی گود میں دے رہا تھا۔ بڑی بہن جسے سب آپا کہتے تھے، بہت ہمت ور عورت تھی اور جتنی ہمت ور تھی، اس سے زیادہ بصیرت مند۔ شوہر کی بے پروائی اور بے اعتنائی پر رونے دھونے اور مسکین بن جانے کے بجائے اس نے محنت مزدوری کو اپنا شعار بنا لیا۔ پہلے دال کی بڑیاں بنا کر دکانوں پر دینا شروع کیں پھر ایک ہوٹل کے لیے نہاری، پائے اور حلیم بنانے لگی۔ ہاتھ پڑا تو ایک سلائی مشین خریدی اور اجرت پر لوگوں کے کپڑے بھی سینے لگی۔ اپنا اور اپنے بچوں کا گزارہ تو کرتی ہی، چھوٹی بہن، بھائی اور ماں کا بھی حسبِ استطاعت خیال رکھتی۔

ماں کا خیال تو میاں سے چوری چھپے منجھلی بیٹی اور منجھلا بیٹا بھی کرتے تھے، بڑے کو البتہ زیادہ غرض نہ تھی۔ رجب علی اور چھوٹی بہن کا کھانا پینا بڑی آپا کے ساتھ ہی تھا۔ بھائیوں یا دوسری بہن پر دونوں کی کوئی ذمے داری نہ تھی مگر

digest library.com



پھر بھی بڑا بھائی اکثر اور منجھلا اس کا ساتھ دینے کو دکانوں تک رجب علی کو پھٹکارنے کھڑے ہو جاتے۔

"سالا، سارا دن گلیوں میں آوارہ گھومتا ہے...... کام کرے کام۔" ایک بھائی بھنکتا۔

"کرلے گا، ابھی چھوٹا ہے۔" ماں دبی زبان سے کہتی۔

"اس کے برابر بلکہ اس سے چھوٹے بھی بازار میں بیٹھے بوٹ پالش کررہے ہیں۔"

"حرام کے لقمے توڑتا ہے۔" دوسرا بھائی کہتا۔

"یہ بوٹ پالش نہیں کرے گا۔" آپا اپنے کمرے سے نکل آتی۔ "تم لوگ اسے کھلاتے تھک گئے ہو کیا؟ کبھی ایک گلاس پانی پوچھنے کی تو توفیق نہیں ہوتی۔"

آپا کے آتے ہی دونوں بھائی کھسک لیتے۔ آپا، رجب علی کی دفاعی لائن تھی، جو ماں نہ کہہ پاتی، آپا بے نقط دونوں بھائیوں کو سنا دیتی۔ رجب علی کا دل شاد ہو جاتا۔

ایک روز وہ آپا سے بولا۔ "مجھے تو لگتا ہے تم ہی میری ماں ہو۔"

آپا مسکرائی۔ "جب تو اماں کے پیٹ سے نکل کر دنیا میں آیا تو دائی کے ہاتھوں سے سب سے پہلے میں نے ہی لیا تھا تجھے اپنی گود میں۔ اللہ بخشے بادا کسی کام سے دلی گئے ہوئے تھے۔ جب تو آنے والا ہوا تو اماں نے مجھ ہی کو بھیجا تھا دائی اماں کو بلانے کو۔ آدھی رات کو تو دنیا میں آیا، سب سوئے ہوئے تھے، میں ہی جاگی ہوئی تھی۔ دائی اماں نے تجھے صاف ستھرا کر کے کپڑے میں لپیٹ کر مجھے دیا کہ تیرا بھائی آیا ہے۔"

"تم کتنی بڑی تھیں اس وقت؟" رجب علی متجسس ہوا۔

"اچھی بڑی تھی...... بڑے بھائی کے بعد میرا ہی نمبر تھا۔"

"اور اب میں بھی اتنا بڑا ہو گیا۔"

"اللہ جیتا رکھے۔ لمبو ہو گیا تو، تو۔" آپا رجب کو پیار سے دیکھتی۔

رجب علی کو آپا اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھی۔ اسے اپنے حلق کا نوالہ کھلانے سے بھی پیچھے نہ ہٹتی۔ عید، بقر عید پر اور ہاتھ پڑتا تو کبھی اور بھی پھیری والے سے کپڑا لے کر اس کا کرتہ پاجامہ سی دیتی۔ عید پر خریدی ہوائی چپل کی جوڑی سال بھر ساتھ نہ دے پاتی۔ رجب علی وہ پھٹی چپل کو پھینک دینے کے بعد ننگے پاؤں ہی گھومتا پھرتا۔

آپا کی محبت کے جواب میں رجب علی حسبِ استطاعت آپا کے کام آتا۔ آپا بڑیاں توڑ کر دھوپ میں اچھی طرح سکھا دیتی تو رجب علی ہی دکانوں پر دے کر آتا۔

نہاری، پائے اور حلیم کے دیگچے وہی ہوٹل پہنچاتا۔ سلائی کے کپڑے گاہکوں کے گھر پہنچانا اور سلائی کے پیسے لے کر آنا بھی اکثر وہی سرانجام دیتا۔ بھائیوں کو اس کی ان خدمات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ خود ان کی طرح رجب علی بھی کوئی نوکری کرے۔

بھائیوں کی آئے روز بک بک سے تنگ آ کر آپا ایک روز رجب علی کو بستی کی بڑی سڑک کے اس پار اسکول میں داخل کرانے لے گئی۔

ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "اس عمر کے لڑکے تو کئے گزرے بھی چھٹی ساتویں جماعت میں ہوتے ہیں۔ تم اسے کچی پکی کے داخلے کے لیے لائی ہو۔"

یوں اس کی تعلیم کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ رجب علی پھر بستی کی گلیوں میں خاک نوردی کرنے لگا۔ تھک کر گھر آتا تو ماں اور آپا سے پہلا سوال یہی ہوتا۔ "روٹی ہے؟"

ماں اس کے حصے کی بچائی روٹی اس کے سامنے رکھ دیتی اور موسم گرما ہوتا تو دستی پنکھے سے اسے ہوا دینے بیٹھ جاتی۔ ایسے میں اگر بڑے بھائیوں میں سے کوئی گھر آ جاتا تو رجب علی کو بے نقط سننے کو ملتیں۔

رجب علی کے حلق میں روٹی اٹکنے لگتی۔ آپا، بھائی کی آواز سن کر اس کے دفاع کو نکل آتی تو خیر، ورنہ وہ سر جھکائے اور ماں کان دبائے بھائی کی سنے جاتے، سہے جاتے۔ بھائی اپنی تقریر ختم کر کے واپس پلٹ جاتا تو ماں رجب علی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دلدوز لہجے میں کہتی۔ "ماں صدقے، دیکھ لے کوئی کام۔"

رجب علی روہانسا ہو جاتا۔ "اماں! کام ملتا ہی نہیں۔ ملباری کے ہوٹل پر گیا تھا، اس نے بھگا دیا۔ کریانے والی دکان پر گیا تو اس نے بولا میرے پاس پہلے ہی آدمی ہے۔"

رجب علی کی چھوٹی بہن ریحانہ بڑے بھائیوں کے رجب علی کے ساتھ ناروا سلوک کے باعث دونوں سے دور دور ہی رہتی بلکہ جب وہ گھر میں ہوتے تو آپا کے کمرے میں رہنے کو ترجیح دیتی۔ رجب علی کی طرح ریحانہ کے لیے بھی آپا ڈھال بھی تھی اور دونوں کی اتالیق بھی۔ انہیں اچھا برا سمجھاتی رہتی۔

بستی میں اچھے لوگ بھی تھے، برے بھی۔ ہر گھر کی، ہر فرد کی اپنی کہانی، اپنی داستان تھی اور ہر گھرانے کی کوئی نہ کوئی عرفیت تھی۔ رجب علی کا گھرانا گھر کے صحن میں کھڑے نیم کے درخت کی وجہ سے "نیم والا" کی عرفیت سے مشہور تھا۔ ہمن دکان والا جس نے بستی میں روزمرہ اجناس کی

digest.library.com

دکان مقبول ہو گئی تھی، اس کا اپنا نام تو غریب نواز تھا مگر جانے کس باعث بن مشہور ہو گیا تھا۔ لالہ پٹھان کے تندور کے علاوہ بھی بستی میں تین چار نانبائی اور بھی تھے مگر جو شہرت اور معروفیت لالہ پٹھان کی تھی، کسی دوسرے کی نہ تھی۔ غریب نواز ہوٹل تھا تو بستی کے بازار میں مگر بستی میں واقع اس کا گھر ”غریب نواز کا گھر“ عرفیت سے جانا جاتا۔ اکبری کا گھر اس کے گھر کے صحن میں بیری کے درخت کی وجہ سے ”بیری والی کا گھر“ کہلاتا۔ بنارس والی خالہ ہندوستان میں اپنے آبائی علاقے کی نسبت سے معروف تھی۔

بنارس والی خالہ ادھیڑ عمر عورت تھی، ایک دم سیاہ رُو۔ بیوہ تھی اور جوان اولاد کی ماں۔ تین بیٹے تھے، دو بیٹیاں۔ بڑی بیٹی شادی شدہ تھی، چھوٹی کا رشتہ بستی سے باہر کسی علاقے سے آیا۔ سننے میں آیا کہ اس کا منگیتر پختہ عمر کا مگر خوشحال کاروباری آدمی تھا۔ بنارس والی محلے والوں کو بڑے فخر سے بتاتی کہ اس کے ہونے والے داماد کا مکان پکا اور روغن شدہ تھا۔ شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ لڑکی نے اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھا نہیں تھا۔ ماں اور بہن بھائیوں نے اس کی رضا لیے بغیر ہی رشتہ طے کر دیا تھا۔ برات آئی تو لڑکی کی سہیلیوں میں سے کسی نے اس کے کان میں پھونک دیا کہ دولہا بڈھا اور گنجا ہے۔ نکاح کے وقت لڑکی نے قبولیت سے انکار کر دیا۔ دولہا اڑ گیا کہ برات دلہن کو لیے بغیر واپس نہیں جائے گی۔ بنارس والی نے خود کو نکاح کے لیے پیش کر دیا۔ دولہا بھی حوصلے والا تھا، بیٹی کے بجائے اس کی ماں سے نکاح کر کے اسے ساتھ لے گیا۔ بنارس والی دوبارہ بستی میں نہیں آئی، البتہ اس کا گھر بدستور بنارس والی خالہ کے گھر کی عرفیت سے معروف رہا۔

اصغری چکبری کی اپنی کہانی تھی، خاصی دلدوز۔ اچھے نقوش کی خوبصورت جوان عورت تھی۔ اس نے محبت کی شادی کی تھی۔ شوہر ہینڈسم جوان تھا۔ دونوں ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ اولاد نہ تھی۔ اصغری کو برص ہو گیا۔ اصغری کے ماتھے، چہرے اور بازوؤں پر برص کے داغ ہو گئے۔ اس کے شوہر سے لوگوں نے کہا یہ ایک سے دوسرے کو لگنے والی بیماری ہے۔ تو ساتھ رہا تو تجھے بھی ہو جائے گی۔ وہ ایسا غائب ہوا کہ پلٹ کر آیا ہی نہیں۔ کسی دور افتادہ گاؤں کا رہنے والا تھا۔ شادی سے پہلے وہ اور اصغری ایک فیکٹری میں اکٹھے کام کرتے تھے۔ اس نے اپنے گھر والوں کو شامل کیے بغیر اصغری سے شادی کی تھی۔ اصغری کو اس کے گھر والوں کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ شوہر کے غائب ہو جانے کے بعد اصغری آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی۔ بستی والے اسے اصغری چکبری کہنے لگے تھے۔

دیوانی آپا کا اصل نام فہمیدہ تھا، شوہر نہایت شریف اور حلیم الطبع آدمی تھا۔ اصغری چکبری کی طرح یہ دونوں بھی لاولد تھے۔ اچھے بھلے رہ رہے تھے کہ فہمیدہ کا ذہنی توازن بگڑنے لگا۔ گھر داری سے غافل ہو گئی۔ برقع اوڑھ کر گھر سے نکل جاتی اور کبھی بے برقع بھی۔ بلامقصد گلیوں میں گھومتی پھرتی۔ کبھی سڑک پر جا کھڑی ہو جاتی اور راہگیروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگتی، کبھی کسی دکان میں جا کر دکاندار کو مغلظات سنانے لگتی۔ شوہر نے کچھ عرصہ برداشت کیا پھر گدو بندر داخل کرا آیا۔ علاج معالجے سے کافی بہتر ہو گئی، شوہر اسے گھر لے آیا۔ ذہنی توازن بگڑنے سے پہلے کی طرح نارمل تو نہ تھی مگر بہتر تھی۔ پاگل خانے سے آنے کے بعد اسے حیرت انگیز طور پر ایک خصوصیت ودیعت ہوئی، لوگوں کے ہاتھ دیکھتی اور ماضی، حال، مستقبل یوں بیان کر دیتی جیسے الہام ہو رہا ہو۔ مستقبل سے متعلق اس کی پیشگوئیوں کو تو ہوائی تیر قرار دیا جا سکتا تھا مگر انجانے لوگوں کا ماضی، حال بتا کر بھی وہ ششدر کر دیتی۔ بستی میں اس کی ایسی شہرت ہوئی کہ جہاں جاتی لوگ اسے گھیر لیتے اور اپنی ہتھیلیاں اس کے سامنے پسار کر بیٹھ جاتے۔ وہ موڈ میں ہوتی تو بولنے لگتی، موڈ نہ ہوتا تو ہاتھ جھٹک دیتی اور جب بولتی تو یوں جیسے الہام ہو رہا ہو۔ ماضی، حال اور مستقبل تو کجا، ہاتھ دکھانے والے کے دل کا حال تک بیان کرنے میں مشہورِ عالم نجومی کیرو اور بعد کے زمانے میں پیشگوئیاں کرنے والے بابا وانگا کے قبیل کی لگتی۔

دیوانی آپا ہی کی طرح بستی کا ایک کردار ”گھیسا“ تھا۔ گھیسا کے اصل نام اور اس کی عرفیت کا سیاق و سباق نامعلوم تھا۔ چھ فٹ سے بھی اونچی قامت اور مضبوط ڈیل ڈول کا گھیسا پھٹی پرانی، میلی کچیلی بش شرٹ اور گھٹنوں تک کی نیکر پہنے ننگے پاؤں بستی کے گلی کوچوں میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا پھرتا۔ اسے نہ منہ دھونے کا ہوش تھا، نہ نہانے دھونے کا۔ آنکھوں کے کویوں میں چیپڑ بھری ہوتی اور اکثر ناک بہہ رہی ہوتی۔ دن بھر گلیوں میں ننگے پاؤں پھرتے رہنے کے بعد رات کو بستی میں واقع لکڑی کی ٹال کے ایک کونے میں پڑ کر سو رہتا۔ بستی والوں میں سے کوئی رحم کھا کر اسے روٹی پکڑا دیتا تو کھا لیتا اور بستی میں لگے سرکاری نل سے پانی پی لیتا۔

گھیسا کے بارے میں بستی کے بعض لوگوں کا بیان تھا کہ وہ بستی میں مہاجرین کی آبادکاری کے ابتدائی دنوں میں



Scanned with CamScanner

digest library.com

کسی کیمپ سے بستی میں آیا تھا۔ جاننے والے بتاتے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں وہ ریلوے کا ملازم تھا۔ تقسیم کے ہنگاموں میں بلوائیوں نے اس کی حاملہ بیوی کو جو پہلے بچے کی ماں بننے والی تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے بے آبروئی کے بعد مار دیا تھا۔ اس صدمے سے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں کیا بڑبڑاتا پھرتا تھا، کسی کو معلوم نہ تھا مگر اس کی آنکھوں سے مترشح بے کسی اس کے باطنی کرب کی غماز تھی۔

اللہ والی بستی کے اکثر مکین دیوانی آپا اور گھیسا دونوں کو پاگل کہتے تھے مگر شاید دونوں ہی پاگل نہ تھے۔ دیوانی آپا کو قدرت نے وہ حیرت انگیز خصوصیت ودیعت کردی تھی جس کو اس کے اردگرد کے لوگ بطور شغل لیتے تھے اور گھیسا اپنے باطنی دکھ کا اسیر تھا۔

بستی کا ایک اور منفرد کردار پوپلی بڑھیا تھی۔ چھ فٹ سے بھی اونچی استخوانی جسامت کی بوڑھی عورت، جس کے منہ میں ایک بھی دانت نہ تھا۔ بولتی تو پھٹی ہوئی آواز میں۔ ململ کی اونچی سی کرتی اور لٹھے کا تنگ چوڑی دار پاجامہ پہنے، سر پر ململ کا دوپٹا اوڑھے غربت کے باعث ننگے پاؤں گھومتی پھرتی۔ ڈھانچا نما جسامت پر اس کا بڑا سا پیٹ نہایت عجیب لگتا۔ اس کا بڑا سا پیٹ تو اسے کوئی عرفیت نہ دلوا سکا البتہ منہ میں دانت نہ ہونے کے باعث وہ پوپلی بڑھیا مشہور ہوگئی تھی۔

بستی میں بعض صناع اور کاریگر بھی آباد تھے۔ بنارسی ساڑیوں کی بانڈگی کا ماہر کاریگر ریاض جو سارا دن اپنے گھر میں چوبی فریم پر جھکا ریشم اور زرتار سے ایسی صنعت گری دکھاتا کہ آنکھ حیران رہ جاتی۔ لکڑی کے ٹال کے پہلو میں حیدرآبادی کنگن اور چوڑیاں گھڑنے والے چوڑی ساز کی دکان تھی۔ دکان کا مالک ایک مکی پر جھکا نہایت عرق ریزی سے چوڑیوں اور کنگنوں میں نگینے جڑے جاتا۔ بستی والے سنتے تھے کہ اس کے کنگن اور چوڑی سیٹ کی بیرون ملک تک شہرت اور طلب تھی۔

کلو حلوائی کی وجہ عرفیت اس کی سیاہ رنگت اور وجہ شہرت دودھ جلیبی تھی جو بستی کے باذوق لوگوں میں بہت پسند کی جاتی تھی۔

بستی کی قصائی گلی کے نکڑ پر ملباری چائے والے کے کھوکے سے دن بھر چائے کی خوشبو فضا میں تحلیل ہوکر چائے کے شوقینوں کے شوق کو ہوا دیتی رہتی۔

اسی گلی کی ایک دکان میں منی حجام اپنی دکان پر حجامت کے لیے آنے والوں کے بال اور تراشیدہ داڑھی مونچھیں دکان کے باہر گلی میں اچھالے جاتا۔

قصائی گلی میں دکانوں کے اندر باہر مذبح گائے، بھینس، بکری کا گوشت، مضبوط آہنی آنکڑوں سے لٹکا گوشت کھانے والوں کو دعوتِ نظارہ ہی نہیں، دعوتِ خریداری کا مظہر بنا رہتا۔

بازار میں منیر پان سگریٹ والے کا کھوکھا پان سگریٹ سے شغف رکھنے والوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔

ریاض اخبار والے کے ٹھیے پر ہر جمعرات کو بستی کے رہائشی جھولی دادا اپنے کرتے کی جھولی میں چنے، کھیلیں اور مرمرے بھر کر آبیٹھتے اور خیرات کے طلب گاروں کو مٹھی مٹھی بھر خیرات بانٹے جاتے۔ جھولی دادا دلی سے اپنے خاندان کے ساتھ آئے تھے۔ بیٹا، بہو، پوتے، پوتیاں...... عزت دار گھرانا تھا۔ بیٹا کاروباری تھا، گھر میں خوشحالی تھی۔ بستی کا شاید واحد گھرانا تھا جہاں فرش پر دری اور سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی اور دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے بھی دھرے ہوتے تھے۔

بستی میں ایک گھر ''بطخوں والا'' کے عنوان سے معنون تھا۔ اس گھر میں بوڑھے میاں بیوی رہتے تھے۔ اس معمر جوڑے نے گھر کے دروازے کے ساتھ ایک کیبن میں حقہ، تمباکو اور کوئلے کی دکان کھول رکھی تھی۔ بڑے میاں سارا دن دکان میں بیٹھے رہتے۔ بڑی بی وہیں انہیں کھانا پہنچا دیتیں۔ گھر کے اندر بڑی بی کا بیشتر وقت بطخوں کی دیکھ بھال اور کھلانے پلانے میں گزرتا۔ سہ پہر کو جب وہ بڑے سے پنجرے کا دروازہ کھول کر بطخوں کو باہر نکالتیں تو آگے پیچھے ساری بطخیں تیزی سے اپنے پر پھڑپھڑاتی زور زور سے قیں قیں کرتی ایسی سرخوشی کے ساتھ گلی میں آتیں جیسے چھٹی کے بعد کسی اسکول سے بچوں کی یلغار مسرت کا اظہار کرتی اسکول سے باہر نکلی ہو۔

بستی کے رہائشی فرید کی وجۂ شہرت اس کا کباب اور تلی ہوئی مچھلی کا ٹھیا تھا۔ مجرد آدمی تھا، صبح سویرے سودا خریدنے بڑے بازار جاتا۔ واپس آکر مچھلی کو دھوتا، شام پڑتے ہی اپنے ٹھیے پر آجاتا۔ مٹی کے تیل کے چولہے جلاتا، ایک پر کباب تلنے کے لیے بڑا سا سیدھا توا اور دوسرے پر مچھلی تلنے کے لیے تیل کی کڑاہی چڑھاتا اور کاروبار شروع ہوجاتا۔ فرید کے کباب اور مچھلی کی نہ صرف بستی اور بازار بلکہ دور دور تک شہرت تھی۔ اس کا مددگار لڑکا اخباری کاغذ میں مچھلی اور کباب رکھ کر اس پر مسالا چھڑک کر دیے جاتا۔ فرید کے ٹھیے پر دھن برستا مگر لوگوں کا کہنا تھا وہ ساری کمائی

digest.library.com

سے میں اڑا دیا تھا، واللہ اعلم بالصواب۔

بستی میں جواری، بھنگ اری بھی تھے، بے نوش اور اچھی بھی۔ اقبال عرف منا ان میں سب سے زیادہ بدنام تھا۔ وہ جواری بھی تھا، بے نوش بھی۔ اس نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ دونوں عورتیں ایک ہی گھر میں رہتی تھیں۔ منا کا ذریعہ آمدن نامعلوم تھا، ٹھاٹھ سے رہتا۔ پی کر اکثر گلیوں میں بہکتا اور لڑکھڑاتا پھرتا۔ عورتیں اور بچے اس سے بہت خوفزدہ رہتے تھے۔ ہوش میں ہوتا تو ایسی چرب زبانی کرتا کہ بڑے بڑے دام میں آجاتے۔

بستی میں ایک گھر ''بجیا کا گھر'' کے نام سے معروف تھا جو اپنی تہذیب و تمدن اور علمی ماحول کی وجہ سے خاص توقیر کا حامل تھا۔ اس گھر میں والد کو بابا، ابا یا ابو کہنے کے بجائے پاپا کہا جاتا۔ والدہ البتہ امی، ممی یا ماما نہ پکاری جاتیں۔ ان کے بچے انہیں بجیا کہتے۔ یہ گھرانا لکھنؤ سے ہجرت کرکے آیا تھا۔ بجیا کو ان کے چھوٹے بہن بھائی بجیا کہتے تھے، سو ان کی دیکھا دیکھی بجیا کی اولاد بھی انہیں بجیا کہنے لگی بلکہ اولاد ہی کیا، گھر میں موجود دو بوڑھی خواتین اتا اور نتا بھی بجیا کو بجیا پکارتی تھیں کہ ان پر صدیوں پرانی ہونے کا گمان ہوتا۔ بصارت سے محرومی اور نہایت نحیف و نزار ہونے کے باعث وہ اپنی جگہ سے خود اٹھنے اور چلنے پھرنے سے یکسر قاصر تھیں۔ ایک تخت پر بیٹھی وہ تمام وقت تسبیح کے دانے گھماتی رہتیں یا نماز پڑھتیں۔ اتا اس خاندان کو تقسیم سے برسوں پہلے ناگفتہ حالت میں ملی تھیں تاہم اب اس گھرانے کا فرد بن چکی تھیں۔ حوائج ضروریہ کے لیے گھر کی خواتین میں سے کوئی انہیں بہ مشکل بیت الخلا تک پہنچاتی اور یہ بڑی بات تھی کہ وہی انہیں طہارت بھی کراتی۔ مہینے دو مہینے بعد انہیں چوکی پر بٹھا کر غسل دیا جاتا۔ بجیا کے گھرانے کے لیے اتا کا کارآمد ترین مصرف یہ تھا کہ گھر کا ہر چھوٹا بڑا فرد ہر معاملے میں اتا سے فال نکلواتا۔

بجیا کے گھر میں توہم پرستی اپنی جگہ مگر علم کی روشنی تھی۔ بجیا خود ایک کانوینٹ میں پڑھی ہوئی تھیں۔ زیادہ نہیں، ابتدائی چند جماعتیں مگر اسی تعلیم نے انہیں انگریزی لکھنا، پڑھنا سکھا دیا تھا اور اب اسی شد بد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ بستی سے کچھ دور خوشحال افراد کی ایک سوسائٹی کے تین چار گھروں میں ٹیوشن دینے جاتی تھیں۔ بجیا کے اپنے بچے بستی سے خاصی دور واقع ایک مشہور شدہ اسکول میں پڑھتے تھے۔ بجیا کے شوہر کسی دفتر میں ملازم تھے۔ پینٹ شرٹ پہن کر دفتر جاتے، دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔

آپا تھی تو کم سن مگر ان پڑھ عورت ہو کر بھی مردم شناس۔ اچھے برے کا شعور رکھتی تھی۔ بھرے پرے محلے میں اس نے چھوٹی بہن ریحانہ کو صرف بجیا کے گھر جانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ بجیا کی بڑی بیٹی عزیز جہاں اور ریحانہ تقریباً ہم عمر تھیں۔ عزیز جہاں سے چھوٹی فرحت جہاں تھی اور اس سے چھوٹی راحت جہاں، اس سے چھوٹا اکلوتا بھائی تھا علی حیدر۔ آپا کو بجیا کے گھرانے پر اعتبار تھا۔ پاپا شریف آدمی تھے۔ صبح کو دفتر گئے، شام کو ہی لوٹتے۔ تینوں لڑکیاں اور لڑکا صبح کو اسکول جاتے تو دوپہر کو گھر آتے۔ بجیا ٹیوشن پڑھانے کے لیے بر تیج اور ڈھ کر دوپہر کو بچوں کے واپس آنے کے بعد گھر سے جاتیں تو شام پڑے واپس لوٹتیں۔ علی حیدر کو اسکول سے آنے کے بعد گھر سے نکلنے کی پابندی تھی۔

آپا کی اجازت سے ریحانہ دوپہر کو اکثر بجیا کے گھر چلی جاتی تھی۔ بجیا کے گھر کا ماحول بستی کے دوسرے گھرانوں سے مختلف تھا۔ اس گھر کے لوگ ایک دوسرے سے آپ جناب سے بات کرتے، زیادہ تر اسکول اور پڑھنے لکھنے کی باتیں ہوتیں۔

ریحانہ نہایت محویت اور دلچسپی سے سنتی رہتی۔ اس کے پاس ان کی اس قسم کی باتوں میں حصہ بٹانے کو کچھ نہ ہوتا۔ بجیا کے گھر میں اسکول، پڑھائی، استانیوں، کتابوں، کاپیوں میں گڈ اور فیئر کی گنتی اور اچھا پڑھنے والی لڑکیوں کی باہمی عداوت کے قصوں میں ریحانہ کو یک گونہ دلچسپی محسوس ہوتی۔ ایک دنیا وہ تھی جہاں وہ، اس کی بوڑھی ماں اور بہن بھائی بستے تھے۔ جہاں ماں کی بے بسی، بہن بھائیوں کی عسرت زدہ زندگی، رجب علی کو بڑے بھائیوں کی صلواتوں اور ناامیدی کے سوا کچھ نہ تھا...... اور ایک دنیا بجیا کے گھر کی تھی۔ تمیز، تہذیب، ایک دوسرے کے احترام، پڑھنے لکھنے کی باتوں اور روشن مستقبل کی امید سے آباد۔ کتنا فرق تھا ان دو دنیاؤں میں۔ بجیا کے گھر آمد و رفت نے ریحانہ کے دل میں بھی امید کی دنیا میں جینے کی آرزو امنگ لینے لگی تھی۔

☆☆☆

بجیا کے مہذب گھرانے کے برعکس بستی میں ایک گھر ایسا بھی تھا جسے مخرب اخلاق اعمال کا اڈا سمجھا جاتا اور شریف گھرانے اپنے بچوں کو اس گھر سے دور دور رہنے کی ہدایت کرتے۔ اس گھر کی مالکن چپلی نامی عورت تھی۔ چپلی کے بارے میں کہا جاتا کہ وہ کسی زمانے میں سرکس میں کام کرتی تھی۔ سرکس چھوڑ کر وہ اللہ والی بستی کے ایک گھر میں آبسی تھی۔ بستی کے خال خال گھروں میں ہی چوبی دروازہ لگا



Scanned with CamScanner

digest library.com

تھا۔ اکثر گھروں کے دروازے پر ٹاٹ یا کپڑے کا پردہ تنا رہتا اور بعض تو اس تکلف سے بھی بے نیاز داخلۂ عام کی دعوت بنے رہتے۔ چکی کا گھر بھی پردے کے تکلف سے بے نیاز تھا اور اس بے پردگی میں بھی اس گھر میں پردہ داری کے تمام کام بے حجابانہ ہوتے۔ جوا وہاں کھیلا جاتا، شراب نوشی کی جاتی، مرد و زن کا بے حجابانہ میل جول رہتا۔ مشہور تھا کہ چکی طلب گاروں کو ٹیکسیاں فراہم کرتی تھی۔ جسم فروش عورتوں کے لیے ٹیکسی کی اصطلاح خدا جانے کب، کس نے اور کیوں رائج کی تھی۔ چکی کے اڈے کو علاقہ تھانے کی بھرپور سرپرستی حاصل تھی۔ اس گھر کے دروازے پر شام سے صبح سویرے تک سائیکل رکشوں میں سواریوں کی آمد و رفت رہتی۔ آس پاس گھروں کے مکین چکی کے اڈے کے خلاف تھے۔ اکثر اس کے خلاف آواز بھی اٹھاتے مگر علاقہ تھانے کی حمایت سے چکی کی مخرب اخلاق سرگرمیاں جاری رہتیں۔ البتہ کبھی کبھار اس کے اور تھانے کے تعلقات بگڑ جانے پر اس کے گھر پر پولیس کا چھاپا بھی پڑتا اور پولیس والے عورتوں اور مردوں، سب کو گرفتار کرکے لے جاتے مگر چکی اور تھانے کے مراسم بحال ہوتے ہی پھر وہ سرگرمیاں شروع ہو جاتیں۔

آبا نے رجب علی کو چکی کے اڈے سے بہت ڈرا رکھا تھا۔ ”بھول کے بھی نہ دیکھیو اس حرافہ چکی کے گھر کی طرف۔“ آبا نے اسے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی مگر بازار جانے کے لیے چکی کے گھر کے سامنے سے گزرنا مجبوری تھی۔

منجھلے بھائی کا صبح کو نان نہاری کے بغیر ناشتا ہی نہ ہوتا تھا اور غریب نواز ہوٹل سے بھائی کے لیے نان نہاری لانا رجب علی کا روز مرہ معمول تھا۔ سلور کی کٹوری میں نہاری اور کاغذ میں لپٹے دو نان جن کی اشتہا انگیز خوشبو رجب علی کو گھر پہنچ کر چھوٹی بھابی کو پکڑانے تک کتنی ہی مرتبہ بدنیتی پر اکسائے رکھتی تھی۔ گلی سے گزرتے ہوئے رجب علی، چکی کے گھر کے سامنے سے یوں لمبے لمبے ڈگ بھرتا جیسے ذرا سستی ہو گئی تو گرفتار بلا ہو جائے گا۔

بستی میں جواری، بھنڈاری، شرابی، کبابی مردوں کے ساتھ نظر بازوں کی بھی کمی نہ تھی جو اپنے گھروں کے باہر یا گلیوں میں یہاں وہاں بیٹھے آتی جاتی عورتوں اور لڑکیوں کو تاکنا فرض عین سمجھتے تھے۔

بستی میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی باہم محبت کی داستانیں بھی گرم رہتیں۔

ناظمہ، بیوہ ماں کی اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی تھی۔ ناظمہ کی ماں بستی سے میل سوا میل دور ایک کوٹھی میں صبح سے شام تک خدمت گزاری کرتی تھی۔ مہینے کی مقررہ تنخواہ کے علاوہ کوٹھی والے اسے بچا کھچا کھانا اور کبھی کبھار گھر کی خواتین کی اترنیں بھی دے دیا کرتے تھے۔ ناظمہ کی ماں صبح کو گھر سے گئی شام پڑے واپس لوٹتی تو اس کے ہاتھ میں کوٹھی والوں کی داد و دہش کی تھیلی ہوتی جسے دونوں ماں بیٹی اکٹھے بیٹھ کر کھاتیں اور خدا کا شکر ادا کرتیں۔ ناظمہ صبح سے شام تک اپنے چھوٹے سے گھر میں اکیلی ہوتی۔ محلے میں اس کی دو تین سہیلیاں تھیں۔ کبھی ناظمہ ان کے گھر چلی جاتی، کبھی وہ ناظمہ کے گھر آ جاتیں۔ دلاور جس کی عرفیت دلو مشہور تھی، ناظمہ کے پڑوس میں رہتا تھا۔ دو بھائی تھے۔ بڑا شادی شدہ تھا، دلو کنوارا۔ دلو کی بھابی سے ناظمہ کا سہلاپا تھا اور اسی نے ناظمہ اور دلو کی لائن ملوائی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں دیوانے تھے۔ دونوں کے تعلقات کا دونوں کے گھر والوں بلکہ ساری بستی کو علم تھا۔

دلاور نہایت خوش گلو تھا۔ اتنا کہ کسی قدر شناس موسیقار کے علم میں آ جاتا تو اس کی آواز مملکت کے طول و عرض میں گونج رہی ہوتی۔ بستی والے اس کی آواز کے اتنے شیدائی تھے کہ ناظمہ اور اس کے باہم عشق کو بھی تکریم دیتے۔ دلاور بازار میں سبزی کا ٹھیلا لگاتا اور اپنی سریلی آواز سے گاہکوں کو اپنے ٹھیلے کی طرف متوجہ رکھتا۔ دوپہر کو جب وہ ٹھیلے پر گیلے بورے ڈھانپ کر کھانا کھانے گھر آتا تو بھابی اسے اور ناظمہ کو ملنے کی راہ فراہم کرتی۔

رات ہوتے ہی دلاور اپنے گھر کے باہر گلی میں آ بیٹھتا۔ اس کا دوست مزمل گھی کا خالی ڈبا اور چمچ سے موسیقی دینے آ جاتا۔ دلاور کی گائیکی سے محظوظ ہونے کے لیے بستی کے جوان ہی نہیں، عمر رسیدہ مرد بھی اپنے گھروں سے نکل کر زمین پر ہی کوئی اکڑوں، کوئی آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا۔ دلاور گانے لگتا۔ دلاور کی آواز تھی کہ دیپ مالا۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا گاتا۔ لڑکے، جوان، بوڑھے اپنی اپنی فرمائشیں داغے جاتے اور دلاور نہایت خوشدلی سے ان کی فرمائشیں پوری کیے جاتا۔ اس کا گلا تھکتا نہ سریلے پن میں فرق آتا۔ رات کے اندھیرے میں دلاور کی آواز دن بھر گھر کے کام کاج اور مسائل کے انبار سے تھکی عورتوں اور مشقت زدہ تھکے ہارے بدن والے مردوں کے لیے لوری کا اثر رکھتی۔ ناظمہ کی محبت میں گرفتار دلاور کی سریلی تان سننے والوں کو مسحور کر دیتی۔ عشق و محبت کی ڈور میں بندھے عاشق و معشوق دلاور کی آواز کو اپنا ترجمان محسوس

digest library.com

کرتے ۔ اپنے گھر میں چھپر تلے جھلنگی کھاٹ پر لیٹی ناظمہ اپنے محبوب کی مدھ بھری تانیں سنے جاتی۔

رات گئے تک موسیقی کی وہ محفل جمی رہتی۔ بستی کے دور پار محلوں سے بھی لوگ اس محفل میں آبیٹھتے۔ رجب علی کو بھی آپا کی اجازت سے اس محفل میں شرکت مل جاتی۔

دلاور کے گانے سن کر اور غنی حجام کی دکان میں لگے دلیپ کمار کے پوسٹرز دیکھ دیکھ کر رجب علی کو بھی گنگنانے اور بالوں کی اگلی لٹ دلیپ کمار کے انداز میں ماتھے پر جمانے کا شوق ہوگیا تھا۔

آپا بڑے بھائیوں کے خلاف رجب علی کی ڈیڈ لائن تو تھی مگر خود آپا کا اس کے ساتھ طرز عمل رجب علی کو اکثر شش وپنج میں مبتلا کر دیتا۔ آپا اس سے پیار بھی کرتی تھی مگر سخت گیر بھی تھی۔ بھائی، رجب علی کو برا بھلا کہتے تو آپا اس کے دفاع کو آ کھڑی ہوتی اور اس بے خوفی سے اس کا دفاع کرتی کہ ایسے موقعے پر ماں کو چپ سادھے دیکھ کر رجب علی کو شبہ ہونے لگتا کہ اماں نہیں، آپا ہی اس کی ماں تھی۔ آپا گھر سے باہر بھی اس کے بارے میں باخبر رہنے کی کوشش کرتی۔ جب اسے گھر سے نکلے زیادہ دیر ہو جاتی، آپا برقع اوڑھ کر اس کی تلاش میں نکلتی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سونٹی ہوتی اور نگاہیں رجب علی کی تلاش میں۔

بستی میں ہر قماش کے لوگ بستے تھے۔ نیک، شریف، نمازی، پرہیزگار، خود بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پیرو اور دوسروں کو بھی آخرت کی فکر کی ترغیب دینے والے...... اور ایسوں کے برعکس خود بھی گمراہ اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والے۔ آپا کو یہی فکر رہتی تھی کہ رجب علی کہیں غلط کاروں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ ادھر آپا ہاتھ میں سونٹی لے کر اس کی تلاش میں نکلتی، ادھر رجب علی کا کوئی ہمدرد مخبر اسے آکر بتا دیتا کہ آپا آرہی ہے۔ رجب علی گلی ڈنڈا پھینک، کنچے بھلا کر بگٹٹ دوڑتا اور آپا کے واپس لوٹنے سے پہلے گھر پہنچ جاتا۔

''کہاں تھا؟'' آپا پوچھتی۔

''کہیں نہیں، یہیں تھا۔'' رجب علی پھولے منہ سے جواب دیتا۔

آپا نظر انداز کر دیتی لیکن اگر رجب علی کو بروقت مخبری نہ ہو پاتی اور آپا اسے کسی ایسے ویسے کے ساتھ دیکھ لیتی تو سونٹی اتنے زور کی پڑتی کہ وہ ''مر گیا، مر گیا'' کا نعرہ لگاتا گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوتا اور ماں کے کمرے میں پہنچ کر ہی دم لیتا۔ آپا اسے ماں کی چارپائی کے نیچے سے بھی کھینچ نکالتی۔

''تو زمین کے سات پردوں میں بھی جا چھپے گا تو نکال لاؤں گی تجھے۔'' آپا اس کا کان مروڑتی۔ رجب علی منہ بسور کر گردن ڈال کر بیٹھ جاتا۔ کھانے کے وقت آپا اسے بلانے آتی۔ ''چل اٹھ، روٹی کھا۔'' رجب علی منہ لٹکائے بیٹھا رہتا۔ ''نخرے نہ دکھا، اٹھتا ہے یا لاؤں سونٹی؟''

ماں خاموشی سے دیکھتی رہتی، رجب علی اٹھ جاتا۔ ماں کبھی کبھی دردانگیز لہجے میں کہا کرتی۔ ''بس پیٹ نہ لگاتا اللہ بندوں کو۔''

رجب علی نے ایک روز پوچھا۔ ''کیوں اماں! پیٹ کیوں نہ لگاتا اللہ بندوں کو؟''

ماں ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولی۔ ''ماں صدقے! سارا روٹی کا چکر ہی تو ہے۔ پیٹ نہ لگا ہوتا تو بھائیوں کی گالیاں کیوں پڑتیں تجھے، میں ایک روٹی کے لیے پاپڑ کیوں بیلتی اور بہن تیرا، ریحانہ اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے مزدوریاں کیوں کرتی؟''

اسے روٹی کھلانے کے بعد آپا نہایت دلسوزی سے سمجھاتی۔ ''دیکھ، رجب! آدمی کو برا بننا بہت آسان ہے۔ شیطان جو اس کے ساتھ لگا ہے مگر انجام ذلت۔ اللہ بخشے ہمارے بابا کہا کرتے تھے، اچھے لوگوں کی صحبت عطر فروش کی سی ہے۔ اس کے پاس بیٹھو گے تو خوشبو آئے گی اور بروں کی صحبت لوہار کی بھٹی کے نزدیک بیٹھنے کی طرح ہے۔ ہاتھ بھی کالے اور چنگاریوں سے جلنے کا اندیشہ بھی۔'' آپا توقف کرتی۔ ''میں تیرے پیچھے اس لیے پھرتی ہوں کہ تو کہیں غلط صحبت میں نہ پڑ جائے۔ میری بات سمجھ رہا ہے نا تو؟''

رجب علی اثبات میں سر ہلاتا۔ آپا کی دردمندی اور دلسوزی سے اس کے دل سے آپا کی سونٹی کی مار سے پیدا ہونے والی کدورت جاتی رہتی مگر ایک دو روز بعد تاریخ پھر خود کو دہرا دیتی مگر داد تھی ماں کو جو کبھی اس کی حمایت کو آپا کے سامنے کھڑی ہوتی بلکہ اگر اتنی خاطر تواضع کے بعد وہ ماں سے آپا کے بارے میں گلہ شکوہ کرتا تو ماں کہتی۔ ''کم مارا اس نے...... تجھے تو اور پڑنی چاہیے تھی۔'' رجب علی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔

اقبال عرف بالا بستی کا ایک بدنام شخص تھا۔ جواری، شرابی اور ٹھگ باز۔ بستی کے کئی سادہ لوح افراد سے اپنی چرب زبانی سے رقوم اینٹھ چکا تھا۔ کسی کو زمین دلانے کا خواب دکھا کر، کسی کو سرکاری نوکری دلوانے کے بہانے۔ آپا کو پتا چلا کہ رجب علی کی بالا سے دوستی ہوگئی ہے، آپا نے



Scanned with CamScanner

رجب سے پوچھا تو وہ صاف مکر گیا۔

''نہیں آپا! میری اس سے کوئی بات چیت نہیں۔''

آپا کو خبر دینے والے ہمسائے پر اعتبار تھا، سو اس نے رجب علی پر گھات لگا دی اور ایک روز عین اس وقت جب رجب علی بستی کے چوک میں بالا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ بالا کے سامنے تو کچھ کہنے سننے سے گریز کیا کہ برے آدمی کی دشمنی بھی بری، رجب سے گھر چلنے کو کہا۔ رجب سمجھ گیا کہ بری گھڑی تھی۔ آپا راستے میں کچھ نہ بولی، گھر پہنچ کر رجب کو گھر کی دی۔

''تو، تو کہتا تھا تیری بالا سے کوئی بات چیت نہیں۔ آج تو، تو اس کے مونڈھے سے مونڈھا لگائے بیٹھا تھا۔''

رجب چور سا بن گیا۔ ''بس آج ہی بیٹھ گیا تھا۔'' وہ منمنایا۔

آپا نے سوٹی اٹھائی۔ ''ہڈی پسلی ایک کر دوں گی۔ بتا، کیوں بیٹھا تھا تو اس کے ساتھ؟'' آپا نے سوٹی گھما کر رجب کی ٹانگ پر ماری۔

''بتاتا ہوں...... بتاتا ہوں۔'' سوٹی اتنے زور کی پڑی تھی کہ رجب بلبلا ہی تو گیا۔

''ہاں بتا...... جھوٹ بولا تو ماروں گی دس اور گنوں گی ایک۔''

رجب علی کو سچ بولے بنا چارہ نہ تھا۔ ''آپا! وہ بولتا ہے میرا شاگرد بن جا، پیسا ہی پیسا۔''

آپا بھڑک اٹھی۔ ''پوچھوں جا کے اس سے؟''

رجب علی گھبرا گیا۔ ''نہیں آپا...... اللہ کے واسطے۔''

آپا نے رجب کو گھور کر دیکھا۔ ''اور کیا بولتا ہے وہ؟''

رجب علی رونے لگا۔

''بتاتا ہے یا میں خود جاؤں اس سے پوچھنے؟''

رجب علی نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''بتاتا ہوں...... وہ بول رہا تھا رات کو جب تیرے گھر والے سو جایا کریں تو چپکے سے اٹھ کر میرے پاس آجایا کر۔ میں تجھے پیسا کمانا سکھاؤں گا۔''

آپا پھر بھڑکی۔ ''اس کی ایسی کی تیسی۔ وہ تو تجھے پیسا کمانا کیا سکھائے گا، میں اسے سبق سکھاؤں گی...... جا کے پوچھتی ہوں اس سے۔''

رجب علی کانوں کو ہاتھ لگا کر گڑگڑایا۔ ''اچھی آپا! اب نہیں بیٹھوں گا اس کے ساتھ۔ تم اس سے کچھ مت کہنا۔''

آپا نے رجب علی پر آنکھیں لگالیں۔ ''اتنا ڈر کیوں ہے تجھے اس سے؟''

رجب علی نے اپنی ناک پونچھی۔ ''آپا! اس نے بولا تھا، تو نے یہ بات کسی کو بتائی تو تیری گردن اڑا دوں گا۔''

## مشغلہ

لندن میں ساقی فاروقی کا محبوب مشغلہ باہر سے آنے والے دوستوں کو مرحوم مشاہیر کے مکانوں اور ان سے منسوب جگہوں کی سیر کرانا ہے۔ ایسی ہی ایک سیر کے دوران اس نے مجھے، عطاالحق قاسمی اور بڑے قاسمی یعنی احمد ندیم قاسمی صاحب کو ڈی ایچ لارنس، چارلس ڈکنز، رابندر ناتھ ٹیگور، جان کیٹس اور ڈاکٹر جانسن سے منسوب مختلف جگہیں دکھائیں اور ساتھ ساتھ تبصرہ بھی جاری رکھا کہ ان مشہور آدمیوں کے ان جگہوں سے تعلق کی نوعیت کیا تھی۔ اس عمل میں تین چار گھنٹے لگ گئے، زبان پر کانٹے اُگنے اور پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے مگر ساقی اپنے وفورِ اضطراب و اشتیاق میں ایسا محو تھا کہ اسے ہماری حالت کی خبر ہی نہیں تھی۔ اچانک ایک جگہ رک کر عطا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بہت سنجیدگی سے پوچھا۔

''یار، ساقی! یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ''مشہور'' لوگ بیٹھ کر کھانا وانا کھایا کرتے تھے؟''

ساقی جو یوں بھی اپنی سیماب صفتی کے باعث مشتعل رہتا ہے، اس بات پر لوٹن کبوتر بن گیا اور فوراً ہمیں ایک ایسے کلب نما ہوٹل میں لے گیا جہاں بقول اس کے قائد اعظم اپنے قیام لندن کے دوران مستقل بیٹھا کرتے تھے۔

امجد اسلام امجد کے سفرنامے ''ریشم ریشم'' سے کشید

مرسلہ: ناہید یوسف، اسلام آباد

## تشویش

ڈاکٹر: آپ کی ٹانگ کافی سوجی ہوئی ہے لیکن پریشانی کی بہرحال کوئی بات نہیں۔

مریض: اگر آپ کی ٹانگ سوجی ہوتی تو میرے لیے بھی پریشانی کی کوئی بات نہ ہوتی۔

☆☆☆

''میری بیگم میرا نام بتا سکتی ہے۔'' ایک صاحب نشے کی حالت میں کہنے لگے۔

''آپ کا کیا نام ہے؟'' اس کے ساتھی نے پوچھا۔

''میاؤں۔''

(مرسلہ: مہتاب احمد، حیدرآباد)



Scanned with CamScanner

digest library.com

آپا کو طیش آ گیا۔ ”دیکھتی ہوں کس کی گردن اکڑی ہے۔“

رجب علی کو آپا کے غصے سے ڈر لگتا تھا۔ ”اللہ کی قسم آپا اب بھی نہیں بیٹھوں گا اس کے ساتھ۔“

آپا نے رجب علی کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔ ”اور جو وہ خود چل کر آیا تیرے پاس؟“

رجب علی منمنایا۔ ”میں گھر سے باہر نکلوں گا ہی نہیں۔“

آپا قدرے پہنچ کر بولی۔ ”کتنے دن نہیں نکلے گا تو گھر سے؟“

رجب علی کے پاس آپا کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”اس لیے سمجھاتی ہوں تجھے برے لوگوں سے دور رہنے کو۔ برے لوگ بری سیکھ دیتے ہیں۔“

رجب علی کو بالا کا ایسا خوف تھا کہ سہم کر بولا۔ ”آپا! بالا سے کچھ مت بولنا۔ میرے باپ کی توبہ جو میں بھی اس سے بات کروں۔“

آپا نے رجب علی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھایا۔ ”دیکھ رجب! برے آدمی سے دوستی بھی بری اور دشمنی بھی عذاب۔ آدمی کو چاہیے برے سے اپنا دامن بچا کر چلے۔ سامنا ہو بھی تو راستہ بدل کر گزر جائے۔“

رجب علی نے نہایت سعادت مندی سے سر ہلایا۔

☆☆☆

آپا کو چھوٹی بہن ریحانہ کو اس کے گھر بار کا کر دینے کی بھی فکر رہتی تھی۔ اس عمر میں تو مجھلی دوسرے بچے کی ماں بن چکی تھی۔ تقسیم کے بعد تو آزاد وطن میں آنے والوں کو جہاں اور بہت سے مسائل کا سامنا تھا، وہاں یہ بھی کہ اچھے رشتے ملنا مشکل ہو رہے تھے۔ حسب نسب، ذات برادری کا تردد کرنے والوں کو انجانوں میں بچے بیاہنا پڑ رہے تھے۔ برادریاں اور خاندان ایسے بکھرے تھے کہ اپنے مطلب کا رشتہ ملنا محال ہو گیا تھا۔ آپا اور مجھلی انجانوں میں ہی بیاہی گئی تھیں۔ دونوں کا جو حال تھا، سو تھا، ماں دونوں کے حالات دیکھتی، کڑھتی۔ ہاں جو خاندانی عورت تھی، دامادوں کو اپنے مرتبے کا نہ جانتی تھی۔

ریحانہ کو بھی دونوں بہنوں کی بگڑی قسمت کا احساس تھا۔ آپا کا خاوند تو پہلی بیوی اور اس کے بچوں کا مرید تھا۔ آپا کے پاس تو مہمان کی طرح آتا۔ آپا اور اس کے بچوں کی کفالت سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ مجھلی کا میاں بچ میں تھا۔ نشہ چڑھتا تو بیوی بچوں پر ٹوٹتا۔ آپا ان بیچاروں کو عالم کے بے جا تشدد سے چھڑا کر ماں کے کمرے میں لا بٹھاتی اور کہتی۔ ”بس، اب اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ تیرے اور تیرے بچوں کے لیے روٹی کی کمی نہیں۔“ مگر وفا پرست مجھلی کو جلد ہی اپنے گھر اور میاں کی یاد ستانے لگتی۔ ماں روکتی رہ جاتی مگر وہ اپنے ڈیرے کی جانب چلی جاتی۔ آپا غصے سے کہتی۔ ”اس کا کوئی علاج نہیں۔“

ہر آئے گئے سے آپا کے کہنے سننے سے ریحانہ کے لیے ایک رشتہ آیا۔ غیر خاندان تھا۔ لڑکے کی کتابوں، کاپیوں کی دکان تھی۔ ریحانہ معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔ اس کے لیے ایسا معزز رشتہ مل جانا قسمت کی بات تھی۔ لڑکے کا پڑھے لکھوں سے کاروبار تھا۔ جاہلوں، ان پڑھوں کا کتابوں، کاپیوں سے کیا واسطہ...... مگر ریحانہ نے تو رونا پیٹنا ڈال دیا۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بڑے بھائیوں نے سنا تو ان کی مردانگی پر شدید ضرب پڑی۔ لڑکی کی یہ مجال کہ شادی سے انکار کرے۔ دال میں ضرور کچھ کالا تھا۔

ماں نے ریحانہ کا گال اپنی چٹکی میں دبا کر آنکھیں دکھائیں۔ ”بے شرم، بے غیرت! کسی سے آنکھ مٹکا تو نہیں کر لیا تو نے؟“

ریحانہ نے تڑپ کر اس الزام سے انکار کیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”مجھے بتا، کیوں انکار کر رہی ہے تو؟ اچھا بھلا رشتہ ہے۔ اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا ہے، کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔“ آپا نے ریحانہ کو سمجھایا۔

”مجھے پڑھنا ہے آپا!“ ریحانہ بولی۔

”کیا......!“ آپا حیران ہوئی۔ ”تیرا دماغ تو نہیں پھر گیا؟ پہلے کسی نے پڑھا ہے ہمارے گھر میں۔“

”پہلے کسی نے نہیں پڑھا تو کیا۔۔۔ میں تو پڑھنا چاہتی ہوں۔“

بھائیوں تک بات پہنچی تو وہ بھڑکے۔ ”اور بھیجو اسے اس بجیا کے گھر۔ وہیں جا کے اس کے دیدوں میں ہوا بھری ہے۔ بستی میں سوائے اس گھر کے اور کس گھر کی لڑکی پڑھ رہی ہے۔ بند کرو اس کا بجیا کے گھر جانا۔ ایک وہ لفنگا ہے رجب...... سارا دن سالا آوارہ پھرتا ہے، کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔“ تان ریحانہ سے ہوتی رجب پر ٹوٹی۔

”کملا تے تھک گئے ہو کیا؟“ آپا ہمیشہ کی طرح رجب کی حمایت کو آ کھڑی ہوئی۔ دونوں بھائی اپنے اپنے کمرے میں جا گھسے۔

آپا نے ریحانہ کو شادی کے فوائد سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ ”پگلی، تیرا اپنا گھر ہوگا، اپنا کھانا پینا۔ شوہر کی



Scanned with CamScanner

digest library.com

خدمت کرے گی تو وہ تیرا بن کے رہے گا۔"

"مجھلی آپا کرتی تو ہے شوہر کی خدمت..... کیا ملتا ہے اسے؟ گالیاں، مار پیٹ۔"

"مارتا ہے تو کیا، وہی اسے روٹی، کپڑا بھی دیتا ہے۔"

"میری روٹی تو تمہارے ذمے ہے۔ میں کسی کی غلامی کیوں کروں؟"

"غلامی کی بچی، آزادی مل جائے گی تجھے۔ اپنی مرضی سے جینا۔ بھائیوں کا خوف نہیں ہوگا۔"

"میں بھائیوں کے سامنے پڑتی ہی نہیں۔ ان سے خوف کھانے کو رجب ہی کافی ہے۔ ایمان سے آپا! کبھی کبھی بہت ترس آنے لگتا ہے مجھے رجب پر۔ سب سے چھوٹا اور سب سے زیادہ گالیاں اسی کو پڑتی ہیں۔ مجھے پڑھنے دو آپا! میں پڑھ لکھ کر نوکری کروں گی۔"

"پاگل ہوئی ہے..... نوکری کروں گی..... بھائیوں نے سن لیا تو زندہ گاڑ دیں گے۔"

"گاڑ دیں۔ مجھے پروا نہیں۔"

"تیرے تو اچھوں کو بھی کرنی پڑے گی۔ دیکھ ریحانہ! بار بار بارش نہیں برستی اور بار بار رشتے نہیں آتے۔ اچھا رشتہ ہے..... پتا نہیں کس کس سے کہا تب یہ رشتہ آیا ہے۔"

"اچھی آپا! میری پیاری آپا!" ریحانہ گڑگڑائی۔ "منع کر دو..... اللہ کے واسطے..... تمہیں میری قسم..... اپنے بچوں کی قسم..... منع کر دو رشتے والوں کو۔ مجھے پڑھنا ہے۔"

آپا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ یہ کیسا سودا سما گیا تھا ریحانہ کے سر میں۔ بھائی ٹھیک ہی تو کہتے تھے کہ بجیا کے گھر جانے کا فساد تھا۔ وہیں جا کر اس کا دماغ پھرا تھا۔

ریحانہ نے آپا کو پریشان دیکھا تو بولی۔ "اپنے بچوں کو تو تم اسکول داخل کرانے کو کہتی ہو اور مجھے منع کر رہی ہو۔"

"تیری طرح بڑھاپے میں نہیں پڑھیں گے میرے بچے۔" آپا نے غصے سے کہا۔

"ہائے اللہ! مجھے بڈھا کہہ رہی ہو۔"

"کہنے کا مطلب ہے، تیری طرح شادی کی عمر کو پہنچنے کے بعد نہیں پڑھیں گے میرے بچے۔ کوئی دن جاتا ہے آگے پیچھے داخل کرا دوں گی انہیں اسکول میں۔"

"مجھے بھی جانے دو۔"

"کہاں؟"

"اسکول۔"

"کون بٹھائے گا تجھ ڈھینگ کو پہلی پکی میں؟"

"بجیا نے کسی لڑکی کو گھر پہ پڑھا کے چوتھی میں داخل کرایا ہے۔ ان سے کہوں گی مجھے بھی پڑھا کے داخل کرا دیں۔"

"اس لڑکی کو پڑھانے کے تو بجیا کو پیسے ملے ہوں گے؟"

"میں ان کے کام کر دیا کروں گی آپا! تھوڑا ان سے پڑھوں گی، تھوڑا ان کی بچیوں سے۔ بس تم ان رشتے والوں کو منع کر دو..... اچھی آپا!" ریحانہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"کوئی نہیں..... میں منع نہیں کروں گی۔"

دو چار دن ریحانہ نے رونے دھونے میں اور آپا نے اس سے خفگی میں گزارے۔ ریحانہ کی آنکھیں سوجی ہونے کی وجہ بجیا کو بھی معلوم ہو گئی۔ آپا سے ریحانہ کی سفارش کرنے کے لیے بجیا نے آپا کو اپنے گھر بلایا اور انہیں سمجھا بجھا کر ریحانہ سے اپنی ناراضی دور کرنے اور رشتے والوں کو انکار کر دینے پر آمادہ کر لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے ریحانہ کی پرزور حمایت کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تو لڑکیوں کے تعلیم حاصل کرنے سے بہت خوشی ہوتی ہے۔ ہم اپنی بچیوں سے کہیں گے ریحانہ کو پڑھنے کے لیے ساتھ بٹھا لیا کریں۔ وقت ملنے پر ہم خود بھی پڑھا دیا کریں گے۔ ہمارے وطن کو ترقی کے لیے تعلیم نسواں کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارا مطلب ہے عورتوں کی تعلیم۔"

"بھائیوں سے کون لڑے گا؟" آپا نے کہا۔

"آپ اور کون۔ ریحانہ بتاتی ہیں کہ آپ کے بھائی صرف آپ کی سنتے ہیں۔ ہم نے سنا ہے آپ بہت حوصلہ مند عورت ہیں۔ ریحانہ کی تعلیم کے سلسلے میں بھی حوصلہ دکھائیے۔ ہمیں امید ہے آپ ریحانہ کا ساتھ دیں گی تو ریحانہ کا مستقبل روشن ہوگا۔"

ستائش انسان کی کمزوری۔ بجیا کی ستائش سے آپا پسیج گئی۔ اس نے ریحانہ کے لیے آنے والے رشتے کو بالا ہی بالا ٹال دیا۔

ریحانہ پڑھنے لگی۔ پہلے الف، ب، پ پھر گنتی پھر اے، بی سی، ڈی۔ شوق تھا، لگن تھی۔ بھائیوں، بھاوجوں سے چوری چھپے اور آپا کی اعانت سے وہ تیزی سے سیکھتی چلی گئی۔ بجیا کے ہاں جاتی تو ان کے گھر کے بعض کام بھی کر آتی۔ ان خدمات کے عوض اسے ہر روز نیا سبق مل جاتا جسے وہ گھر آنے کے بعد چپکے چپکے رٹتی رہتی۔ رات کو دیے کی روشنی میں بجیا کی فراہم کردہ پرانی سلیٹ پر لکھنے کی مشق کرتی۔ بجیا کی بیٹیاں بھی اسے ہنسی خوشی اگلا سبق دیتیں، کبھی بیزاری ظاہر کرتیں اور اسے جھڑک دیتیں۔

"اتنی بڑی ہو کر تمہیں پڑھنے کا شوق ہوا ہے۔"

digest library.com

ریحانہ شرمندہ ہو جاتی مگر ہمت نہ ہارتی۔ آپا اب بھی اسے سمجھاتیں۔ ”کیوں وقت برباد کر رہی ہے تو اپنا۔ چادر، تکیے کاڑھ۔ میں پھر کسی سے کہہ سن کر ڈھونڈ لوں گی تیرے لیے کوئی رشتہ۔“

ریحانہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی۔ بجیا نے اسے آسرا دے رکھا تھا کہ جب وہ ٹیسٹ دینے کے لائق ہو جائے گی تو وہ اسے اپنے ساتھ اسکول لے جائیں گی جہاں چند استانیوں سے ان کی جان پہچان تھی۔

☆☆☆

دیوانی زیبا ایک روز گھومتی گھامتی آپا کے گھر آ بیٹھی۔ دونوں بھاوجیں، مجھلی اور آس پڑوس سے ہمسائیاں دیوانی آپا کو اپنا اپنا ہاتھ دکھانے کو آپا کے کمرے میں آ گئیں۔ دیوانی جس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتی، اس کے ماضی، حال اور دل کا احوال بتا کر اسے ششدر اور مستقبل کا حال جاننے کو بے تاب کر دیتی۔ آپا نے ریحانہ کا ہاتھ دیوانی آپا کے سامنے کیا تو وہ بولی۔ ”پڑھنے کا بہت شوق ہے اسے۔“

ریحانہ خوش ہو گئی۔

”شادی کا بتاؤ..... شادی کب ہو گی اس کی؟“ آپا نے کہا۔

”شادی کی لکیر نہیں ہے اس کے ہاتھ میں۔“ دیوانی نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

”کیسی بدفال نکال رہی ہو اپنے منہ سے میری بچی کے لیے۔“ ماں ہول گئی۔

دیوانی نے ریحانہ کا ہاتھ جھٹک کر پرے کر دیا۔

”شادی نہیں دکھ رہی تو کیسے بول دوں۔“ دیوانی نے کہا۔

اماں بگڑ کر کمرے سے چلی گئی۔

بیٹھک جاری تھی کہ رجب علی بھی آ گیا۔ آپا نے اسے بھی دیوانی کے سامنے لا کے کھڑا کر دیا۔ ”دیوانی آپا! ذرا اس کا بھی ہاتھ دیکھ دو۔“

دیوانی نے نظر اٹھا کر رجب کو دیکھا پھر اس کے ہاتھ پر اپنی نگاہ مرکوز کر دی۔ ”اسے کوئی بہکا کے لے جاتا دکھ رہا ہے پر قسمت والا ہے، بچ جائے گا۔“ دیوانی نے کہا۔

آپا نے دیوانی کی بات کو بڑ سمجھا۔ ”اور دیوانی آپا؟“

”باہر کا سفر ہے اس کے ہاتھ میں۔“ دیوانی بولی۔

”یہ تو ہر وقت ہی سفر میں رہتا ہے دیوانی آپا!“ چھوٹی بھابی طنزیہ بولی۔

”میں باہر ملک کے سفر کی بات کر رہی ہوں۔“ دیوانی برا مان گئی تھی۔

”کہاں دیوانی آپا؟“ ریحانہ کو تجسس ہوا۔

”دنیا بہت بڑی ہے۔“ دیوانی نے جواب دیا۔

”کچھ کام بھی کرے گا یا خالی خولی پھرتا رہے گا؟“ بڑی بھابی نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

دیوانی نے بڑی بھابی کو ایک نظر دیکھا۔ ”تم کون ہو جی؟“

”اس کی بھابی!“

”کام کرے گا، پیسا کمائے گا۔“

”تو پاگل ہے۔“ بڑی بھابی نے دبی زبان سے کہا۔

”پاگل تم ہو۔“ دیوانی نے رجب علی کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے بھابی کو گھور کر دیکھا اور یکلخت اٹھ کھڑی ہوئی۔ لڑکیاں، عورتیں جو اپنا اپنا ہاتھ دکھانے کی منتظر تھیں، دیوانی کو روکنے کے لیے خوشامد کرتی رہ گئیں مگر وہ رکی نہیں، چلی گئی۔ سب نے بڑی بھابی کو مورد الزام ٹھہرایا۔

☆☆☆

ناظمہ کی ماں کو دلاور اور بیٹی کے چکر کا علم تو تھا اور کیوں نہ ہوتا بھلا۔ محلے بھر میں ان دونوں کے عشق کے چرچے تھے۔ دلاور کی بھابی نے ناظمہ کی ماں سے دونوں کے رشتے کی بات چھیڑنی چاہی تھی مگر وہ ٹال گئی تھی۔ دلاور کو وہ پسند نہیں کرتی تھی۔ ناظمہ کو اس نے بارہا دلاور کے چکر سے باز رہنے کی ہدایت کی تھی۔ دو تین مرتبہ اس کی اچھی خاصی مرمت بھی لگائی مگر وہ باز نہ آئی بلکہ ایک روز اس نے منہ کھول کر کہہ دیا۔ ”میں اسی سے شادی کروں گی۔“

ناظمہ کی ماں نے اس کے دونوں گال اپنی چٹکیوں میں دبا کر پوری قوت سے دبائے۔ ”بے شرم، بے حیا! تیری یہ مجال۔“

ناظمہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھی مگر تڑپ کر بولی۔ ”اگر تم نے میری شادی کسی اور سے کی تو میں پھر بھی دلاور کے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔“ ماں دھک رہ گئی۔

چند ہی دن گزرے کہ ایک روز پتا چلا ناظمہ کی ماں نے اسے اس گھر میں لے جا کر جہاں وہ کام کرتی تھی، اس کا نکاح شیرو سے کر دیا تھا۔ شیرو بستی کے دوسرے محلے کا بدمعاش تھا، جوان تھا، کسرتی جسم، بڑی بڑی مونچھیں، کندھے اچکا کر سینہ تان کر چلتا۔ گھر میں بس ماں تھی اور وہ بھی خاصی اتھری اور خونخوار۔ ماں بیٹا دونوں کی محلے ہی نہیں، ساری بستی میں دہشت تھی۔ شیرو جرائم پیشہ آدمی تھا، آئے دن تھانہ، کچہری بھگتتا۔ ماں سخت لڑاکو اور بدزبان۔ کسی سے لڑنے پر آتی تو مارنے مرنے پر تل جاتی۔ گالم گلوچ میں بڑے بڑے مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی۔

digest library.com



ناظمہ کی شیرو سے شادی میں ناظمہ کی ماں کی یہ سوچ غالب تھی کہ شیرو جیسے بدمعاش آدمی اور اس کی ماں جیسی دبنگ عورت کے گھر میں رہتے ہوئے ناظمہ کے پر کٹے رہیں گے اور جیسے کہ اس نے دھمکی دی تھی کہ تم نے اگر میری شادی کسی اور سے کی تو میں پھر بھی دلاور کے ساتھ بھاگ جاؤں گی، وہ ایسا کوئی قدم اٹھانے سے باز رہے گی۔

ناظمہ کے شیرو سے نکاح کے بعد جب حسبِ معمول گلی میں گانے کی محفل سجی تو دلاور کی آواز کا سوز بہت سوں کو رلا گیا۔

بعد میں سننے میں آیا کہ شیرو تو ناظمہ اور دلاور کے عشق سے آگاہ ہونے کے باوجود ناظمہ سے شادی کے بعد پہلے دن ہی اس کے سامنے اپنا دل ہار گیا تھا مگر ناظمہ نے اسے منہ نہیں لگایا تھا۔ اپنی ماں سے وہ اتنی بدظن ہوگئی تھی کہ شادی کے بعد پلٹ کر ماں کے گھر نہیں آئی۔

☆☆☆

اپنے شوق اور لگن سے ریحانہ چند ہی ماہ میں داخلہ ٹیسٹ کے لائق ہوگئی۔ بجیا اسے اپنے ساتھ اسکول لے گئیں۔ ٹیچر نے ٹیسٹ لیا، کچھ چیزوں میں وہ اٹکی، کچھ میں میں صحیح رہی۔ ذرا دیر انتظار کے بعد نتیجہ بھی مل گیا۔ چوتھی جماعت میں داخلے کی نوید مل گئی۔ بجیا نے اس کی عمر اور اپنے مراسم کو بروئے کار لاتے ہوئے اور اس عہد کے ساتھ کہ اگر وہ پہلا امتحان پاس نہ کرسکی تو ایک جماعت پیچھے کردیا جائے، اسے پانچویں جماعت میں بٹھانے کی سفارش کی۔ ریحانہ کا پانچویں جماعت میں داخلہ ہوگیا۔ اب کتابیں، کاپیاں خریدنے اور یونیفارم بنوانے کا مرحلہ تھا۔ بجیا نے اپنی ایک شاگردہ کی پرانی کتابیں لادینے کا وعدہ کیا۔ آپا نے کہا، کاپیاں تو وہ خرید دے گی اور یونیفارم کے لیے نیلی پاپلین بھی۔ سفید شلوار موجود تھی۔ ماں سے ململ کا سفید دوپٹا بھی ملنے کی امید تھی مگر بھائیوں سے کون نمٹے گا؟ اسے اسکول جاتے دیکھ کر تو وہ آسمان سر پر اٹھالیں گے۔

ریحانہ نے آپا سے کہا۔ ”تم ہونا ان سے نمٹنے کو۔“

آپا ایسا کندھا تھی جو ہر بھاری بندوق کا بوجھ سہار لینے کی اہل بھی جاتی۔

☆☆☆

بستی کا ایک سالانہ ”ایونٹ“ قوالی رات تھی۔ اس ایونٹ کے انعقاد کے لیے بستی کے تمام گھر والوں سے چندہ اکٹھا کیا جاتا۔ بستی کے چند معزز اراکین پر مشتمل کمیٹی چندہ مہم کی نگرانی اور دیگر انتظامات کرتی۔ بستی کی عورتیں، مرد، دکاندار سب خوشی خوشی چندہ دیتے بلکہ کسی مخصوص قوال پارٹی کو بلانے کی فرمائش بھی داغ دیتے۔ یوں تو بستی میں بھی ایک قوال پارٹی بستی تھی جس کے سازندے اور قوال اکثر ریاض کرتے رہتے مگر بستی والوں کے لیے وہ اتنے پسندیدہ نہ تھے۔ ان دنوں ریڈیو پر قوالیاں گانے والی ایک پارٹی کا بہت شہرہ تھا۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان سب ان کے گرویدہ تھے۔

قوالی رات کا بندوبست بستی کے بڑے میدان میں کیا جاتا۔ کئی دن پہلے میدان سے جھاڑ جھنکاڑ، کوڑا کرکٹ اٹھانا شروع کردیا جاتا۔ جوان لڑکے میدان میں جھاڑو لگاتے، پانی کا چھڑکاؤ کرکے گرد بٹھائی جاتی۔ پروگرام سے ایک دن قبل شامیانے اور قناتیں کھڑی کردی جاتیں۔ مستورات کے لیے پردے کا انتظام ہوتا، گھڑونچیوں پر مٹکے رکھ دیے جاتے۔ شام بڑی سہانی ہوتی۔ ڈیکوریشن والا اسٹیج کے لیے تخت، دریاں اور چاندنیاں پہنچا جاتا۔ چندہ اکٹھا کرنے والے نوجوان اور ان کے یار دوست انتظامی کمیٹی کی اجازت سے چند دریاں بچھا لیتے۔ لڑکے بالے ان پر قلابازیاں کھاتے اور بعض اپنے گھروں کے بجائے ان دریوں پر ہی سو رہتے۔ علی الصباح عید کی صبح کی طرح جاگ جاتے اور باقی انتظامات ہونے لگتے۔ ماشکی اپنے مشکیزوں سے مٹکوں میں پانی بھر دیتے، اسٹیج آراستہ ہونے لگتا، رنگین کاغذی جھالریں، گلدانوں میں پھول، گلاب پاشوں میں عرق گلاب، اگردانوں میں اگربتیاں۔ سہ پہر کو سامعین کے لیے دریاں اور ان پر چاندنیاں بچھادی جاتیں۔ اسٹیج کے ایک جانب چوبی چوکی پر میزپوش بچھا کر پان کی گلوریوں کی تھالی رکھ دی جاتی۔ قوال پارٹی کے لیے حسبِ ضرورت چائے پانی کا بندوبست بھی ہو رہا ہوتا۔ ساری بستی میں دن بھر گہما گہمی رہتی، شام سے ہی عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ پنڈال کے زنانہ حصے میں پہنچ کر جگہ سنبھالنے لگتیں۔ کھانے کی پوٹلی بھی ساتھ لے آتیں۔ پنڈال میں بیٹھ کر روٹی کھانے میں جو مزہ آتا، بھلا گھر میں کہاں۔

سالانہ قوالی رات میں ایک سال چندہ دینے والوں کی اکثریت نے ریڈیو کی معرفت ابھرتے ہوئے ایک مشہور و معروف خوبرو قوال اور اس کی پارٹی کو بلانے کی زوردار فرمائش کی۔ انہیں سننے سے زیادہ دیکھنے کی چاہت میں بستی کے دوسرے محلوں کی عورتیں اور لڑکیاں بالیاں بھی امڈ آئیں۔ انہی میں بستی کی ایک خوبرو نوجوان شادی شدہ اور معمولی سی پڑھی لکھی عورت حمیدہ بھی تھی۔ حمیدہ آٹھ بہنوں



Scanned with CamScanner

digest library.com

اور دو بھائیوں میں چھٹے نمبر پر تھی۔ بیٹیاں زیادہ ہوں اور ماں باپ غریب تو اکثر جوڑ دیکھے بغیر بیاہ دی جاتی ہیں۔ حمیدہ اور اس کی باقی بہنوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ حمیدہ نہایت کالے کلوٹے ایک بدزو پھل فروش سلامت سے بیاہی گئی تھی۔ سلامت بیوی پر جان چھڑکتا اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر اسے آسائش دینے کی کوشش کرتا۔ حمیدہ اپنے گھر میں خوشحال تھی۔ شادی کو تین سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا، اولاد نہ تھی۔

قوالی والی رات حمیدہ کو پنڈال کے زنانہ حصے میں ایسی جگہ مل گئی جہاں سے وہ اسٹیج کا براہ راست نظارہ کر سکتی تھی۔ چار اطراف مٹی کے تیل سے جلنے والے ہنڈے روشن تھے، پنڈال بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ پروگرام کا آغاز ہوا۔ تیسری چوتھی قوالی پر دو نوجوانوں کو حال آنا شروع ہوئے اور انہوں نے وہ ہاتھ پاؤں چلائے کہ انہیں قابو کرنا مشکل ہو گیا۔ جوں جوں ان کا جوش بڑھتا توں توں قوال بھی اپنی قوالی کے بول دہراتے۔ دونوں نوجوان بہ مشکل قابو میں آئے۔ حمیدہ جو زنانہ حصے میں داخلہ گاہ کے بالکل قریب بیٹھی تھی، ایک نوجوان کو زنانہ داخلہ گاہ کے نزدیک گرتے دیکھ کر گھبرا کر اٹھی تو قوال نے اسے دیکھا اور ہنڈوں کی روشنی میں اس کا دمکتا چہرہ دیکھ کر ایک لمحے کو تو چپ ہی ہو گیا۔ کنڈی میں لعل کا منظر روشن تھا۔ دونوں نوجوان قابو میں آئے تو قوال نے ایک معروف نظم بصورت قوالی گانا شروع کی۔

پنڈال میں بیٹھے سامعین کو جوش ملیح آبادی کی نظم پر قوال کی تک بندی ایسی پسند آئی کہ سب جھومنے لگے۔ جس قدر سامعین کا جھومنا بڑھتا، قوال کی تکرار میں بھی تیزی آتی۔ قوالی کی محفل صبح تک جاری رہی۔

کئی دن تک قوال کی نظم کے بول کی صدا رہی۔

زیادہ دن نہیں گزرے، حمیدہ نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی۔ سننے میں آیا کہ قوال سے حمیدہ کی لائن مل گئی تھی اور بعد عدت دونوں میں شادی کے وعدے وعید بھی ہو گئے تھے۔

☆☆☆

ریحانہ کو اسکول جاتے دیکھ کر دونوں بھائیوں نے بڑی لے دے کی۔ آپا کا مقابلہ کرنے کو کھڑے ہو گئے۔

"تمہاری شہ خراب کر رہی ہے دونوں چھوٹوں کو۔ وہ سالا، رجب لمبی لمبی ٹانگیں مارتا پھرتا ہے۔ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا...... اور اب چھوٹی کے اسکول جانے کا ناٹک شروع ہو گیا۔"

"ناٹک نہیں، ضرورت ہے۔ پڑھ لکھ کے لڑکی بھوکی تو نہیں مرتی کم از کم۔" آپا بولی۔

"ہاں، کتابوں سے پیٹ بھر لیتی ہے۔" بڑا بھائی طنزاً بولا۔

"اپنے پیروں پہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ میاں کی محتاج نہیں رہتی، جیسے جمیلہ ہے۔ میاں مارتا ہے، پیٹتا ہے پھر بھی اس کے گھر پڑی رہتی ہے۔" آپا نے دلیل دی۔

"اور بھجوا سے بجیا کے گھر۔ وہیں گھنٹوں گھنٹوں بیٹھے رہنے سے اس کا دماغ خراب ہوا ہے۔"

"بجیا کو مت گھسیٹو۔ جمیلہ اور میرا حشر دیکھ کر اسے پڑھنے کی راہ سوجھی ہے۔"

"کیا کرے گی پڑھ کے؟"

"وقت بتائے گا۔"

"وقت دکھائے گا، کسی روز اپنی پسند کا کوئی لچا لفنگا گھر لے آئے گی کہ اس سے میرا نکاح پڑھاؤ۔"

"پڑھا دیں گے۔" آپا نہایت اطمینان سے بولی۔

"کیا؟"

"ہاں۔"

"اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا اگر آج کے بعد یہ اسکول کے لیے گھر سے نکلی۔"

"ہمت ہے تو توڑ کر دکھانا۔ یہ آج کے بعد بھی اسکول جائے گی۔" آپا نے کہا۔

ریحانہ اسکول جاتی رہی۔ دونوں بھائی چھپ چھپ کر اس کا پیچھا کرتے رہے۔ ایسا ویسا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ آپا، ریحانہ کی مضبوط سپورٹ بنی رہی۔

☆☆☆

برسات کے دن تھے۔ رجب علی حسب معمول صبح سویرے منجھلے بھائی کے لیے غریب نواز ہوٹل سے سلور کی کٹوری میں نہاری اور کاغذ میں لپٹے دو نان لے کر گھر جا رہا تھا۔ بستی کی گلیوں میں ٹخنے ٹخنے کیچڑ تھی۔ پھسلن اتنی کہ چلنا محال ہو رہا تھا۔ رجب علی بہت سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہا تھا پھر بھی ایک جگہ اس کا پاؤں ایسا پھسلا کہ وہ دھڑام سے گرا اور کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ نان والا ہاتھ تو اس نے اوپر کر لیا تھا، نہاری کٹوری کے تلے میں لگی رہ گئی بس۔

رجب علی سخت متاسف ہوا کہ برسات کے موسم میں نان نہاری کی خوشبو پر اس کا دل ایسا کیوں مچلے جا رہا تھا۔ اس کی اپنی نظر لگ گئی مگر اس نظر کا خوف اس کی اپنی نظر سے

digest library.com



کہیں ہولناک تھا جس کا اسے گھر جانے پر منجھلے بھائی کی طرف سے سامنا ہوتا تھا۔

رجب علی ڈرا سہما، کانپتا کپکپاتا، کیچڑ میں لتھڑا، منہ بسورتا گھر پہنچا۔ ارادہ تھا کہ پہلے آپا کے پاس جا کر اس افتاد میں اس کی پشت پناہی لے گا مگر منجھلا بھائی صحن میں کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بھبکا۔ ”ابے اتنی دیر کردی تو نے۔“

رجب علی کو جائے فرار نہ ملی، ڈرتا ہوا آگے بڑھا اور روہانسا ہو کر بولا۔ ”پاؤں پھسل گیا تھا، نہاری گر گئی۔“

بھائی کا ہاتھ اٹھا اور ایسا زناٹے سے اس کے چہرے پر پڑا کہ وہ بلبلا اٹھا۔ ”اندھا تھا جو گر پڑا۔ چل کان پکڑ، مرغا بن۔“

رجب نے ڈرتے ڈرتے بھائی کو نان اور کٹوری تھمائی اور اپنی دونوں ٹانگوں کے عقب سے بازو نکالے، کان پکڑے اور مرغا بن گیا۔ بھائی سل اٹھا کر لایا اور اس کی پیٹھ پر دھر دی۔

برسات کے دن تھے، آپا بھی اپنے کمرے کے اندر تھی، اماں کو بھی پتا نہ چلا۔ رجب علی پیٹھ پر سل لادے دہرا ہوا اس وقت تک مرغا بنا رہا جب تک آپا کسی کام سے اپنے کمرے سے باہر نہ نکل آئی۔ رجب کو اس حال میں دیکھا تو تڑپ کر آگے بڑھی۔ اس کے پاس آ کر پہلے سل اس کی پیٹھ سے اتاری، اس اذیت کا سبب پوچھا۔

اس کی آواز سن کر بھائی بھی کمرے سے نکل آیا۔ رجب کے بولنے سے پہلے ہی بولا۔ ”سالا ڈھینگ کا ڈھینگ نہاری گرا آیا۔“

آپا گرج کر بولی۔ ”اور تم نے اس کی پیٹھ پر سل لاد دی۔ ارے کیسے ظالم بھائی ہو، دو ٹکے کی نہاری کے لیے تم نے اس کو مرغا بنا رکھا ہے۔“ پھر وہ رجب سے مخاطب ہوئی۔ ”کل سے اگر تو اس کا نوکر بنا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ نان نہاری چاہیے تو یہ خود لے کر آئے۔“

”ایسی حمایتی ہو تو کسی اور کا نوکر کھڑا کرا دو اسے۔ آوارہ گردی سے تو بچے گا۔“ بھائی نے کہا۔

بارش رکی تو آپا اسے آنہ لائبریری کے بغل میں رنگ ریز کی دکان پر لے گئی اور لائبریری والے سے اپنی جان پہچان کی بنیاد پر اسے رنگ ریز کی دکان پر کپڑوں کی رنگائی سیکھنے کے لیے کھڑا کر دیا۔ ”کام سیکھ لے پھر اپنا ٹھیا کھول لینا۔“ آپا نے اسے سمجھایا۔

آنہ لائبریری والے سے آپا کی جان پہچان کا قصہ یہ تھا کہ انگریزی داں بجیا کے علاوہ محلے میں ایک دو اردو پڑھی لکھی عورتیں بھی رہتی تھیں۔ دوپہر کو جب گھروں کے مرد کام پر ہوتے، عورتیں کسی ایک اردو پڑھی لکھی عورت کے گھر میں اکٹھی بیٹھ کر آنہ لائبریری سے منگوائی گئی ناول سنتیں۔ ایک ناول ختم ہونے میں بعض اوقات کئی دن لگ جاتے اور ایک آنہ روز کرائے پر منگوائی گئی ناول کا کرایہ پانچ چھ آنے تک پہنچ جاتا۔ اردو داں خاتون کو اس کی خدمت کے بدلے کرایہ معاف ہوتا۔ ناول سنانے والی خاتون کے اردگرد عورتیں نہایت اشتیاقانہ اور مریدانہ انداز میں بیٹھ جاتیں اور وہ ناول پڑھنا شروع کرتی۔ ناول کے نیک کرداروں کے ساتھ سب کی ہمدردی، محبت اور دعائیں ہوتیں۔ ہیرو، ہیروئن سے ایسا عشق ہو جاتا کہ آئندہ پیدا ہونے والے بچوں کو انہی کے نام دیے جاتے۔ ناول کے سازشی اور برے کرداروں کو باجماعت گالیاں دی جاتیں اور جی بھر کر کوسا جاتا۔ ناول کے المیہ واقعات پر عورتیں رونے لگتیں۔ ناول کا کوئی کردار وفات پا جاتا تو اس کے لیے دعائے مغفرت کی جاتی۔ ناول کے طربیہ اختتام پر سامع عورتیں جھوم اٹھتیں۔ ہیرو، ہیروئن کی شادی ہو جانے پر چندہ کر کے ریوڑیاں، بتاشے، میٹھی ٹکیلیں یا گل کے لڈو منگوا کر بانٹے جاتے۔ آنہ ناولوں کی دنیا، ناول سننے والی عورتوں کو ناول کے طربیہ واقعات پر ان کے مسائل اور غموں سے کچھ وقت کو ہی سہی، بیگانہ کر دیتی بلکہ بعض تو کئی کئی دن اسی طربیہ احساس میں اپنا غم زندگی بھولی رہتیں۔ ناول کے المیہ واقعات اور حوادث انہیں دنوں مغموم رکھتے۔ عجیب تھی آنہ لائبریری کے ناولوں کی دنیا جو کبھی شکستہ دلوں کا مرہم بن جاتی تو کبھی آلام و مصائب میں گھری عورتوں کو یہ احساس دیتیں کہ دنیا میں اور بھی لوگ تھے جو خود ان کی طرح مسائل و مصائب میں گھرے ہوئے تھے۔

☆☆☆

رنگ ریز کی دکان پر ایک روز چگی اپنی ساڑی رنگوانے آ گئی۔ اسے دیکھ کر رجب علی کی تو سٹی گم ہو گئی۔ آپا نے سخت ہدایت کر رکھی تھی کہ بھولے سے بھی اس کے قریب نہ پھٹکنا۔ دکان کا مالک چگی سے نہایت تپاک سے پیش آیا۔

”فیروزی رنگ دیجیو۔“ چگی نے مالک سے کہا۔

”تم بولتی ہو تو فیروزی رنگ دیوں گا پر فیروزی بے وفا ہے۔ ایک دھوپ میں ہلکا پڑ جاوے، دھوپ میں تو سالا اڑ ہی جاوے۔“ رنگ ریز نے کہا۔

”اچھا تو پھر نارنجی کر دو۔“

”ہو گیا۔“

''نیا لونڈا رکھ لیا؟'' چنچل نے رجب علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کام سیکھ رہا ہے۔''

''پچھلا کہاں گیا؟''

''سالا ٹرام پہ ٹکٹ دینے والا لگ گیا...... میرے کو بھی بہت ہے چنچل باجی!''

''کام چلنا چاہیے۔''

''اللہ خوش رکھے، میرے دل کی بات بول دی تم نے۔''

چنچل جتنی دیر دکان پر کھڑی رہی، رجب علی سہما، سمٹا اسے کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ دھانی ساڑی، آنکھوں میں کاجل کے ڈورے، ہونٹوں پہ مستی، ہاتھوں میں کڑے اور کانوں میں بالے۔ آپا ٹھیک ہی منع کرتی تھی، ایسی عورت سے دور ہی رہنا چاہیے۔ ادھیڑ عمر عورت اور یہ رنگ ڈھنگ۔

رنگ ریز کا پرانا لڑکا دکان چھوڑ کر ٹرام پر ٹکٹ کنڈکٹر لگ گیا تھا۔ لڑکا کیا تھا داڑھی مونچھوں والا جوان۔ رنگ ریز کی دکان پر تو دس کام ہوتے تھے۔ ٹرام کنڈکٹری میں بستہ گلے میں ڈالے دن بھر مسافروں سے پیسے لے کر ٹکٹ دینے کا کام تھا اور خود دن بھر مفت کی سیر۔ خاکی زین کی وردی اور گلے میں لٹکا ٹکٹوں والا بستہ اسے معزز بنا دیتا۔ رجب علی کو بہت شوق تھا ٹرام میں سفر کرنے کا۔ آپا کے ساتھ ایک روز لیمارکیٹ جانا ہوا تو وہ اتنا خوش تھا جیسے ٹرام میں نہیں، ریل میں سفر کر رہا ہو۔ ٹرام بھی تو چھوٹی سی ریل ہی ہوتی ہے، اپنی پٹڑی پر چلتی ہوئی۔ رجب علی کو ریل میں بیٹھنے کی بھی شدید آرزو تھی۔

☆☆☆

رجب علی نے آپا کو رنگ ریز کی دکان پر چنچل کے آنے کا قصہ سنایا تو آپا نے پہلے سے زیادہ سختی سے اسے ہدایت کی۔ ''اس کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں تجھے۔ ایسی عورتوں کو دیکھنا بھی گناہ ہوتا ہے۔ آنکھیں گناہگار ہوں تو قیامت کے دن فرشتے گرم گرم سلائیں بھونکیں گے آنکھوں میں۔''

''مجھے کیا ضرورت پڑی دیکھنے کی اسے۔''

ماں اور آپا دونوں ہی بات بات پر ثواب، گناہ، جنت، دوزخ کی بات کرتی رہتی تھیں۔ گناہ اور ثواب کا خیال اور جنت، دوزخ کا تصور رجب علی کے دل میں ایسا راسخ ہو گیا تھا کہ اسے گناہ کے خیال سے ہی خوف آتا۔

بستی کے اس پار امیر لوگوں کی اونچی کوٹھیوں والے علاقے میں ایک جوان عورت نے جو اکثر بے پردہ اپنے شوہر کے ساتھ کبھی پیدل، کبھی موٹر میں آتی جاتی دکھائی دیتی تھی، نہ جانے کس بات پر خود کو آگ لگا لی تھی۔ اس کی جلی ہوئی لاش جسے دیکھنے کے لیے بستی کے لوگ جوق در جوق اس کی کوٹھی کی آہنی کھڑکیوں سے چمٹ گئے تھے، رجب علی بھی سخت دھکم پیل کے باوجود دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کہاں وہ خراماں خراماں اپنے شوہر کے ساتھ چلتی ہوئی پری پیکر اور کہاں اس کی سوختہ لاش۔ رجب علی کئی دن ڈرتا رہا تھا اور ماں وظیفے پڑھ پڑھ کر اس پر دم کرتی رہی تھی۔

''تجھے ضرورت کیا تھی وہاں جانے کی؟'' آپا بولی۔

''سب جا رہے تھے آپا!'' وہ منمنایا۔

''سب کنوئیں میں گریں گے تو، تو بھی چھلانگ لگا دے گا۔'' آپا کی اس بات کا رجب علی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

آپا اکثر اسے یونہی لاجواب کر دیتی تھی۔ کہنے کو آپا ان پڑھ تھی مگر عقل و دانش میں پڑھے لکھوں سے لگا کھاتی۔

شومئی قسمت، چنچل اپنی رنگائی والی ساڑی لینے کے لیے ایسے وقت آئی جب دکان کا مالک دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ رجب علی دکان پر اکیلا تھا، چنچل کو دیکھ کر ہڑبڑا گیا۔

''مالک کہاں ہے تیرا؟'' چنچل نے پوچھا۔

''کھانا کھانے گھر گئے ہیں۔'' رجب نے نظر نیچی کیے جواب دیا۔

''ساڑی رنگنے کو دے گئی تھی...... رنگ گئی؟''

''جی، رنگ گئی۔''

''یہ رسید ہے...... ساڑی دے دے...... وہ...... وہ رہی...... سامنے ٹنگی ہے...... لے لیتی ہوں۔''

''وہ خود ہی آ کے دیں گے۔''

''کیا...... میں اتنی دیر کھڑی رہوں گی؟'' چنچل بگڑ کر بولی۔

''انہوں نے مجھے منع کر رکھا ہے۔''

''کیسا شاگرد ہے تو، کتنی دہاڑ دیتا ہے مالک تجھے؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''ہیں...... مفت میں کام کر رہا ہے، بتا دہاڑ کے؟''

''کام سیکھ رہا ہوں ابھی۔'' رجب علی کی نظر بدستور نیچی تھی۔

''پیسے والا کام کرے گا؟''

رجب علی نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا پھر نظر نیچی کر کے بولا۔ ''آپا سے پوچھ کر۔''

''اے! تو کوئی بچہ ہے...... لمڈھینگ...... داڑھی



Scanned with CamScanner

مونچھ آنے کو ہے اور تو کہہ رہا ہے آپا سے پوچھ کر۔ میرے کو لڑکے کی ضرورت ہے، اچھے پیسے، کھانا پینا مفت، ڈولی (ڈیوٹی) بھی مزے کی...... گاہک بھی بخشش دے جاتے ہیں...... کرے گا میرے پاس نوکری......؟ کسی سے پوچھنے پاچھنے کی ضرورت نہیں...... خود ہاں کر یا نہ کر۔"

"کرلوں گا۔" رجب سر کھجاتے ہوئے نیم دلی سے بولا۔

"پر ایک بات ہے...... حیدر آباد جانا ہوگا۔"

رجب علی نے چونک کر پھر نظر اٹھائی۔ "حیدر آباد!"

"ہاں، دونوں جنی ریل میں چلیں گے۔"

"ریل میں......!"

رجب علی کا دل زور سے دھڑکا۔ ریل میں بیٹھنے کا تو اسے کب سے اشتیاق تھا۔

"بس ایک جوڑا لے آئیو اپنا...... اور ضرورت پڑی تو میں نیا سلوا دوں گی۔"

لے بھئی، یہ تو فس کلاس نوکری تھی...... ریل کا سفر اور نیا جوڑا بھی۔ رجب علی کا دل للچا گیا۔

مگر اس کا کیا علاج کہ آپا نے تو بھولے سے بھی چَپّی تو چَپّی، اس کے گھر کی طرف دیکھنے سے بھی منع کر رکھا تھا۔

"رمضان چچا کھانا کھا کے آجائیں، ان سے تو پوچھ لوں۔"

"پاگل ہوا ہے۔ تو اس کے لیے مفت کام کر رہا ہے، وہ تجھے چھوڑے گا بھلا۔ منظور ہے تو چپ چاپ میرے ساتھ چل، کل ریل سے نکلیں گے اپن دونوں۔ کل کے کل حیدر آباد پہنچ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے...... کس ٹیم (ٹائم)؟"

چَپّی نے وقت بتایا۔ "تو بس سٹاپ پر آجائیو...... بس سے ٹیشن چلیں گے، وہاں سے ریل پکڑ کے حیدر آباد۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ابھی کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، نہ پوچھنے پاچھنے کی۔"

رجب علی نے تائید میں سر ہلا دیا۔

دکان سے چھٹی کے بعد گھر پہنچنے پر رجب علی کی حالت سوا تھی۔ بار بار خیال آتا آپا کو بتا دے، آپا کو نہ سہی، ماں کو تو بتا ہی دے مگر پھر سوچتا منع ہو گیا تو اچھی بھلی نوکری ملتے ملتے رہ جائے گی۔

اس رات وہ سو نہیں سکا۔ رات کے پچھلے پہر دبے پاؤں چارپائی سے اٹھا۔ کپڑوں کے دو تین ہی تو جوڑے تھے اس کے پاس۔ ایک جوڑے کو لپیٹا اور صحن میں مرغیوں کے دڑبے کے پیچھے چھپا آیا۔ گھر سے باہر جانے کا راستہ دڑبے سے چند قدم پر تھا۔ سوچا جاتے ہوئے چپکے سے بغل میں دبا لے گا۔

صبح کو ناشتا بھی ماندے جی سے کیا۔ کہاں تو پوری روٹی چائے میں ڈبو کے کھا جاتا تھا، بہ مشکل آدھی روٹی حلق میں چل پائی۔ دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا۔

"روٹی کیوں چھوڑ دی؟" آپا نے پوچھا۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے تیری؟" آپا نے اس کا ماتھا چھوا۔

"ٹھیک ہے۔"

دوپہر کو دکان پر کھانے کے لیے آپا دو روٹیوں میں کبھی چٹنی، کبھی رات کی بچی بلکہ بچائی گئی سبزی ترکاری رکھ کر لپیٹ دیتی تھی۔ روٹی لے کر وہ باہر نکلا۔ ادھر ادھر دیکھ کر دڑبے کے پیچھے سے کپڑوں کا جوڑا اٹھایا اور سرپٹ گھر سے نکل گیا۔ ماں سے الوداعی ملاقات نہ ہونے کا ملال ہوا مگر اب پیچھے پلٹنے کی جا نہ تھی، پکڑے جانے کا احتمال تھا۔

بھاگم بھاگ اسٹاپ پر پہنچا اور چَپّی کے انتظار میں ایک بند دکان کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی چَپّی آتی دکھائی دی، لپک کر اٹھا اور اس کے نزدیک پہنچا۔ شہر کے مختلف حصوں میں جانے والی بسیں اپنی اپنی قطار میں کھڑی تھیں۔ جس بس کے زنانہ حصے میں چَپّی سوار ہوئی، اس کے مردانہ حصے میں رجب بھی اپنا منہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ بس میں سوار ہوتے ہوئے چَپّی نے آہستہ سے کہہ دیا تھا۔ "کنڈکٹر ٹکٹ کے پیسے مانگے تو بول دینا، آگے ہے۔"

سیٹی بجی، بس چلی تو رجب علی کی جان میں جان آئی مگر اتنی بھی نہیں۔ ریل میں سوار ہونے تک خطرہ ہی تھا کہ کوئی جان پہچان والا دیکھ نہ لے۔

خیریت گزری، اسٹیشن پہنچ گئے۔ ریل کھڑی تھی، چَپّی نے ٹکٹ لیے اور دونوں ریل میں بیٹھ گئے۔ رجب علی کو گھر سے دور جانے کا دکھ بھی تھا مگر اک نئی دنیا کے سفر پر نکلنے کی خوشی بھی، جہاں بھائیوں کی صلواتیں اور مغلظات نہ ہوں گی۔ آپا، ماں اور ریحانہ یاد آئیں گی مگر وہ خود کو سمجھا لے گا۔ پیسے کما کر، جیب بھر کر گھر واپس جائے گا تو تینوں خوش ہو جائیں گی۔ بھئی کمانا تو تھا نا کہ آخر ایک روز دونوں بھائیوں کی طرح اس کی بھی شادی ہونی تھی۔ لڑکی تو موجود تھی...... چھوٹی خالہ کی بیٹی مہر النساء سے اس کی ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ آپا جب خوش ہوتی، اس کا سہرا گانے لگتی تھی۔

حیدر آباد آگیا۔ چَپّی اسے اپنے ساتھ ایک سائیکل

digest library.com

رکشا میں بٹھا کر ایک گنجان آبادی میں واقع مکان پر پہنچی۔ اس مکان میں نوجوان عورتیں بھی تھیں، مرد بھی۔ عورتیں اٹھلاتی، مٹکتی، چہکتی پھر رہی تھیں۔ مرد ان سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ رجب علی کو روٹی اور گوشت کا سالن دیا گیا اور سلور کے کٹورے میں پانی بھی۔ کھانے کے بعد چکی نے اس سے کہا۔ ''تمہارے ساتھ کام کرنے کو تجھے سیکل رکشا چلانا سیکھنا ہوگا۔ میں کسی سے بول دیوں گی، سکھا دے گا تجھے پھر رات کی ڈیوٹی ہوگی۔ سواریاں لے جانی ہوں گی اور سویرے واپس لانی ہوں گی۔''

''ٹھیک۔'' رجب علی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی دن چکی نے اسے ایک سائیکل رکشا والے کی شاگردی میں دے دیا۔

☆☆☆

مغرب ہوگئی، رجب علی گھر نہیں آیا۔ صبح کو جب وہ کام پر جانے کو گھر سے نکلتا تو ماں اسے مغرب سے پہلے گھر آجانے کی ہدایت کرنا نہ بھولتی۔ جب تک دونوں بڑے بیٹے شادی شدہ نہ ہوئے، انہیں بھی ماں کی یہی ہدایت ہوتی تھی کہ مغرب سے پہلے گھر آجانا۔ ماں کہتی تھی مغرب کے بعد شیاطین نکل آتے ہیں اس لیے بچوں کو مغرب سے پہلے گھر کے اندر کر لینا چاہیے۔

رجب علی رنگ ریز کی دکان پر لگنے سے پہلے اور بعد میں بھی مغرب سے پہلے گھر آجاتا تھا۔ اس روز نہ آیا تو ماں اور آپا ہی کو تشویش ہوئی۔ اندھیرا ہو گیا، رجب علی پھر بھی گھر نہیں پہنچا۔ آپا رنگ ریز کی دکان پر پہنچی، وہ تالا لگا کر گھر جا ہی رہا تھا۔ آپا نے رجب علی کی بابت پوچھا تو رنگ ریز نے بتایا کہ وہ تو اس روز دکان پر آیا ہی نہیں تھا۔ آپا دھک رہ گئی۔ کیوں نہیں پہنچا تھا وہ دکان پر...... کہاں چلا گیا تھا...... کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا تھا اس کے ساتھ اللہ نہ کرے، سڑک پار کرتے ہوئے کسی سائیکل یا رکشا نے ٹکر مار دی ہو اور وہ زخمی کسی اسپتال میں پڑا ہو۔ آپا بھاگم بھاگ گھر پہنچی۔ راستے میں محلے کا جو آدمی ملا، اس سے پوچھتی بھی گئی۔ ''رجب کو دیکھا......؟'' ہر ایک سے نفی میں جواب ملا۔

آپا گھر پہنچی اور ماں کو بتایا تو وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ بھائیوں کو بتانا بھی ضروری ہوا۔ وہ بھی فکر مند ہو گئے۔ ذرا سی دیر میں گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ دونوں بھائی اس کی تلاش میں نکل گئے۔ ماں جائے نماز پر کھڑی ہو گئی، مجھلی کا میاں بھی لاکھ برا سہی، رجب علی کی تلاش میں گھر سے نکل گیا۔ گھر کی عورتوں کو برے برے واہم آ رہے تھے۔ یکا یک چھوٹی بھائی کو یاد آیا کہ دیوانی نے رجب علی کا ہاتھ دیکھنے پر کہا تھا اسے کوئی بہکا کر لے جائے گا۔

''اے آپا! یاد نہیں، دیوانی آپا نے رجب کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا، اسے کوئی بہکا کر لے جانے کی کوشش کرے گا...... کوئی بہکا کے نہ لے گیا ہو اسے۔''

''چھوٹی دلہن! خیال تو مجھے بھی آیا دیوانی کی بات کا مگر کون بہکا کر لے جائے گا رجب کو؟'' آپا نے کہا۔

''جوان لڑکے کو کوئی بھی بہکا سکتا ہے۔'' بڑی بھابی بولی۔

''ہاں اور کیا۔'' چھوٹی بھابی نے تائید کی۔

دونوں بھائی اور مجھلی کا میاں گردن لٹکائے بے نیل مرام گھر لوٹے۔ رجب علی کا کچھ پتا نہ چلا۔

''اسی لیے میں بکواس کرتا تھا کہ اسے کام پہ لگاؤ۔'' بڑے بھائی کو کہنے کا موقع ملا۔

''کام پر ہی تو لگایا تھا۔'' آپا بولی۔

''کام وہ ہوتا ہے جس سے دو پیسے جیب میں آئیں، آدمی رات کو چارپائی پر پڑے تو بدن ٹوٹ رہا ہو اور دل کو جیب میں دو پیسے ہونے کی خوشی ہو۔''

''کام سیکھ جاتا تو پیسے بھی کمانے لگتا۔'' آپا بولی۔

''رات تک نہ آیا تو صبح کو تھانے اور اسپتال جا کر دیکھنا ہوگا۔'' دوسرے بھائی نے کہا۔

''اب اور کتنی رات ہوگی...... وہیں سے چلے جاتے۔'' آپا تشویش میں تھی۔

''بسیں چلنا بند ہو گئیں، اب صبح ہی دیکھیں گے۔''

''پریشان نہ ہو آپا...... آجائے گا۔'' مجھلی کے میاں نے آپا کو تسلی دی۔

ماں کے کمرے سے رونے کی آواز سنائی دی۔ ماں، رجب علی کی گمشدگی پر رو رہی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح دونوں بھائی کام پر جانے کے بجائے دوبارہ رجب علی کی تلاش میں نکلے۔ تھانے اور اسپتال بھی گئے، کچھ پتا نہ چلا۔

''دیوانی سے جا کے پوچھو، وہی بتائے گی۔'' چھوٹی بھابی نے رائے دی۔

''اس نے ساری بستی کو بیوقوف بنا رکھا ہے۔ ایسی ہی عالم الغیب ہوتی تو گلی گلی پھرتی پھرنے کے بجائے اپنے گھر میں بیٹھتی۔ عورت کی عزت تو اپنے گھر میں بیٹھنے سے ہوتی ہے۔'' بڑے بھائی نے کہا۔

بھائی کی بات آپا کے دل کو لگی۔ ''دفع کرو دیوانی

digest library.com

کو...... ظہر کے بعد ہم سب بیٹھ کر آیت کریمہ کا ورد کرتے ہیں۔‘‘ آپا نے خشیت سے کہا۔

ظہر کے بعد گھر کی عورتیں، مرد سب وظیفے کے لیے بیٹھے۔ اماں نے رو رو کر رجب علی کی سلامتی اور گھر واپسی کی دعا مانگی۔ رجب علی اس رات بھی واپس نہ آیا۔

رجب علی کی گمشدگی کی خبر آس پڑوس میں بھی ہو گئی تھی۔ افسوس کا اظہار کرنے والی پڑوسنیں دن بھر ماں اور آپا کے پاس حاضری دیتیں اور ایک ہی سوال ہوتا۔ ’’کچھ پتا چلا؟‘‘

رجب علی کی گمشدگی سے گھر کی فضا نہایت سوگوار ہو گئی تھی۔ آپا کو رہ رہ کر دونوں بھائیوں پر غصہ آتا کہ دونوں ہر وقت کل کل رکھتے تھے رجب علی کی جان پر۔ ریحانہ کی اردو دانی ان دنوں بہت کام آ رہی تھی۔ آپا اور منتیں بھی مان رہی تھی، ماں جا نماز پر بیٹھی دعا کرتی رہتی۔

☆☆☆

پانچواں چھٹا دن تھا، آپا صبح سویرے اپنے کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی بنے مٹی کے چولہے میں آگ سلگا کر بچوں کے لیے چائے کی کیتلی چولہے پر رکھنے کے بعد روٹی ڈالنے کے لیے پیڑے بنا رہی تھی۔ دل رجب علی کے لیے فکرمند اور دعا گو تھا۔ یکایک اسے رجب علی اپنے خاندان کی مشترکہ قیام گاہ کی کھلی داخلہ گاہ سے اندر داخل ہوتا نظر آیا۔ ایک لمحے کو تو یہ منظر آپا کو خواب سا لگا لیکن دوسرے لمحے حقیقت بن گیا۔

’’رجب!‘‘ آپا اسے حیرانی سے مخاطب کرتی چولہے کے پاس سے بے تابانہ اٹھی۔

رجب علی جہاں کا تہاں رک گیا۔ آپا لپک کر اس تک پہنچی۔ ’’کہاں چلا گیا تھا تو؟‘‘ آپا نے نہایت بے تابی سے پوچھا اور سر گھما کر آواز لگائی۔ ’’اماں! رجب آ گیا۔‘‘

آن کی آن سب گھر والے اپنے کمروں سے نکل آئے۔

’’کہاں چلا گیا تھا؟‘‘ آپا نے رجب سے دوبارہ پوچھا۔

’’آپا...... وہ...... چچی لے گئی تھی مجھے حیدر آباد۔‘‘

آپا رجب علی سے یوں دور ہٹی جیسے برقی کرنٹ لگ گیا ہو۔ ’’چچی...... حیدر آباد؟‘‘ آپا نے آنکھیں پھاڑیں۔

’’وہ...... وہ تاں دکان پہ آئی تھی ساڑی رنگوانے...... اس نے بولا مفت کام کیوں کرتا ہے، میرے ساتھ چل۔ کام کے ساتھ پیسا بھی ملے گا۔‘‘ رجب علی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

’’اور تو چلا گیا...... اس کے بہکائے میں آ گیا...... تجھے پتا ہے، ہم سب کتنے پریشان رہے...... بس فاتحہ پڑھنی رہ گئی تھی تیری۔‘‘ آپا نے گھر والوں کو ایک طائرانہ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’نواب صاحب، چچی کے ساتھ حیدر آباد گئے تھے۔‘‘

’’تمہارا ہی بگاڑا ہوا ہے۔‘‘ بڑے بھائی کو آپا پر طنز کرنے کا موقع ملا۔

آپا مڑی، چولہے تک پہنچی اور چولہے میں سے سلگتی ہوئی لکڑی نکال کر دوبارہ رجب علی کی طرف آئی۔ ’’تجھے منع کیا تھا نا اس کمینی کی طرف بھولے سے بھی نظر اٹھا کر دیکھنے کو۔‘‘

’’معاف کر دو آپا!‘‘ رجب علی منمنایا۔ ’’غلطی ہو گئی۔‘‘

’’کرتی ہوں معاف۔‘‘ آپا نے رجب پر آنکھیں نکالیں اور لکڑی کا سوختہ حصہ رجب کی ٹانگ پر مارا۔

’’مر گیا...... مر گیا......!‘‘ رجب نے نعرہ لگایا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ آپا نے تڑاتڑ لکڑی اس پر برسانی شروع کی۔ غنیمت کہ لکڑی جل نہیں رہی تھی، دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی۔ گھر کے صحن میں رجب علی آہ و بکا کرتا بریک ڈانسر کی طرح یہاں سے وہاں جھٹکے لیتا پھرا۔ ماں سمیت سب گھر والے دم بخود کھڑے دیکھتے رہے۔ آپا جو موقع بے موقع رجب علی کے حق میں ہر کس و ناکس کے سامنے دفاعی دیوار بن کر کھڑی ہو جایا کرتی تھی، آج خود ہی رجب کی درگت بنا رہی تھی۔ اس منظر میں بھائیوں سے رجب علی کو سلواتوں اور مغلظات کا احتمال نہ تھا۔ رجب علی کے پیچھے لپکتے اور مارتے مارتے آپا کو خود سانس چڑھ گئی۔ سوختہ لکڑی اس نے چولہے کی طرف اچھالی اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ رجب علی کا رونا چلانا سن کر آس پڑوس کے لوگ بھی دروازے کے باہر آ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک دو نے اسے آپا کی ضربوں سے بچانے کی کوشش بھی کی تھی مگر آپا انہیں خاطر میں نہ لائی تھی۔ آپا سے خلاصی کے بعد رجب ماں کے کمرے میں جا گھسا۔ گھلے دار، بھائی بھاوجوں نے صبح سویرے رجب علی پر اس افتاد کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگے۔ رجب علی کے پیچھے پیچھے ماں بھی کمرے میں آ گئی۔

رجب نے آنسو پونچھتے اور ناک سڑکتے ہوئے ماں کو ہمدردی طلب نظروں سے دیکھا مگر اس کی توقع کے برعکس ماں نے بیگانگی سے کہا۔ ’’بہت اچھا کیا اس نے تیری پھینٹی لگا کر۔‘‘

رجب علی نے حیرانی اور شک سے ماں کو دیکھا کہ کیسی



Scanned with CamScanner

digest library.com

ماں تھی جو اس کی چوٹوں کو سہلانے اور دور کرنے کے بجائے اس پر تابڑ توڑ لکڑی برسانے والی کو داد دے رہی تھی۔

"آپا کی بچی، دال دال بچی!" رجب علی تکلیف کی شدت اور غصے سے بڑبڑایا۔ اس کی ایک کہنی پر زخم بھی لگ گیا تھا۔

"آپا کو دال دال بچی کہنے والے، تو اسے جانتا نہیں...... اس کا غصہ دیکھا ہے نا تو نے، تیرے دال چاول سب پکا دے گی۔" ماں نے کہا۔

"میں آپا کے پاس کبھی نہیں جاؤں گا۔"

"تجھے ہی روٹی کے لالے پڑیں گے۔ آخر تو گیا کیوں تھا اس نٹنی پکی کے ساتھ؟"

"آ تو گیا۔" رجب علی نے زمین پر پاؤں مارا۔

"سارے محلے میں تو تیرے نام کے ڈھول بج چکے...... جسے پتا چلے گا کہ تو پکی کے ساتھ حیدرآباد گیا تھا، تیرے ہی نہیں، ہمارے جنم میں بھی تھوکیں گے۔" ماں اس کے نزدیک آ بیٹھی اور دلسوزی سے بولی۔ "ماں صدقے! عزت مرد ذات کی بھی ہوتی ہے، گھر سے بھاگے مرد کی دو کوڑی کی عزت نہیں رہتی...... اور کسی بدکار کے ساتھ تو اور بری بات...... اللہ توبہ...... اللہ توبہ" ماں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے گال پیٹے۔ "چل اٹھ، منہ پر چھپکا مار کے آ...... روٹی رکھی ہے کل کی چنگیر میں، کٹوری میں ٹماٹر کی چٹنی بھی ہے، کھالے۔ وہاں کون سی کوئی تیری ماں بہن بیٹھی ہو گی تجھے روٹی دینے کو۔"

"نہیں کھانی روٹی۔" رجب علی جارحانہ انداز میں اٹھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ ماں اس کے پیچھے لپکی۔ گھر والوں کے خیال سے اسے پکارنے سے گریز کیا۔ رجب علی لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے نکل گیا۔ ماں اس خیال سے دہل گئی کہ رجب علی خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔ دروازے پر کھڑی وہ رجب علی کو گلی سے جاتا دیکھتی رہی، پھر پلٹی اور آپا کے پاس پہنچی۔ آپا ناشتے کی تیاری بھول بھال منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔

"اری وہ چلا گیا۔" ماں نے آپا سے کہا۔

"کون؟" آپا بیگانگی سے بولی۔

"وہی تیرا بھائی...... تیرا لاڈلا۔"

"جانے دو...... میرا کوئی لاڈلا واڈلا نہیں۔"

ماں مایوس ہو کر کمرے سے نکل گئی اور اپنے کمرے میں جا کر جاء نماز پر کھڑی ہو گئی۔ باوضو تو تھی، ہر مشکل وقت میں اسے بس ایک ہی سے لو لگانی ہوتی تھی۔

☆☆☆

رجب علی ایک تنگ گلی میں بانسوں اور بلیوں کے سہارے سرکیوں اور چٹائیوں سے بنی ایک جھونپڑی کی اوٹ میں بیٹھا نہایت سنجیدگی اور دل گرفتگی سے سوچ رہا تھا، کہیں سے دیا سلائی مل جائے تو وہ پوری بستی کو آگ لگا دے...... نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری...... مگر دیا سلائی بھی تو عنقا تھی۔ آپا کے ہاتھوں خوب اچھی دھنائی کے بعد گھر سے نکل کر کچھ دیر وہ برہنہ پا بستی میں ادھر ادھر گھومتا رہا تھا پھر ایک گلی میں آ بیٹھا اور اپنے باغیانہ خیالات میں ڈوب گیا۔ کبھی گھر سے مستقلاً بھاگ جانے کا خیال آتا تو کبھی بستی کے اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا دینے کا اور کبھی پوری بستی کو آگ لگا دینے کا۔

بڑے بھائیوں سے الٹی سیدھی سننا اور کبھی کبھی ہاتھ بھی پڑ جانا اس کے لیے نہ نئی بات تھی، نہ شرم کی۔ ہر دوسرے تیسرے دن کا معمول تھا۔ کبھی بڑا بھائی، کبھی منجھلا اور کبھی دونوں شیر و شکر ہو کر اس پر چڑھائی کرتے...... مگر آج قصہ ہی اور تھا۔ آپا جو بھائیوں ہی نہیں، ہر ایک کے خلاف اس کی دفاعی دیوار ہوا کرتی تھی، آج وہ دیوار اسی پر گر پڑی تھی۔ بھائیوں، بھاوجوں، منجھلی کے میاں اور چند آس پڑوس والوں نے بھی اس کی دھنائی کا خوب تماشا دیکھا۔ بھائی تو بہت خوش ہوئے ہوں گے اور آس پڑوس کے جن لوگوں نے دیکھا اور سنا، وہ سارے محلے کو دو کی چار لگا کر سنائیں گے۔ آپا کے ہاتھوں مار پڑنا اس کے لیے شرمندگی سے زیادہ دکھ کی بات تھی۔ وہ خود کو بھری دنیا میں بالکل اکیلا محسوس کر رہا تھا۔

ماں آخر کو ماں تھی۔ نفل پڑھ کر رجب کی خیریت اور سلامتی کی دعا مانگ کر دوبارہ آپا کے کمرے میں پہنچی۔ آپا خود بھی دکھی بیٹھی تھی کہ آج اس نے پہلی بار رجب علی کو جسے وہ اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھی، اتنا مارا تھا۔ رجب کی پٹائی سے دکھی تو ریحانہ بھی بہت ہوئی تھی۔ اسے آپا پر غصہ بھی آیا تھا، اتنا کیوں مارا اس کے بھائی کو۔ بچوں سے غلطی ہو ہی جاتی ہے مگر اس نے آپا پر اپنے دکھ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یونیفارم پہن کر چائے روٹی کا ناشتا کیے بغیر اسکول چلی گئی تھی۔

دوبارہ آپا کے کمرے میں آنے پر ماں نے گڑگڑا کر کہا۔ "اری دیکھ تو، وہ بختی مارا کہاں نکل گیا۔"

آپا چپ بیٹھی رہی۔

"میں جاؤں اسے دیکھنے؟"

"کہاں ڈھونڈو گی؟" آپا نے ماں کو لاجواب کر دیا۔

رجب علی کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔



Scanned with CamScanner

digest library.com

گزشتہ دوپہر کے بعد اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کچھ دیر ایک ٹھیکری سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں اور الٹے سیدھے نقش ونگار بناتا رہا۔ دل کا درد کچھ کم ہوا تو دلاور سے سنے الیے گیتوں کے ٹکڑے گنگنانے لگا.... گنگنا رہا تھا کہ آپا کی گرجدار آواز نے اسے ہڑبڑانے پر مجبور کر دیا۔ آپا اپنے ہاتھ میں سوٹا لیے کھڑی تھی۔

''رجب! اٹھ...... گھر چل۔'' آپا نے سوٹا دکھایا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''چلتا ہوں...... چلتا ہوں۔''

''تو پاتال میں بھی اتر جائے گا تو ڈھونڈ لاؤں گی۔'' آپا بولی۔

''ہاں، ہاں۔'' رجب علی نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

''سیدھی طرح چل۔'' آپا دہاڑی۔

''چلتا ہوں...... اور مت مارنا۔''

رجب علی ڈرا، سہا آگے آگے اور آپا ہاتھ میں سوٹا لیے اس کے پیچھے پیچھے۔

ماں رجب علی کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔ روٹی کی چنگیر اور چٹنی کی کٹوری اس کے سامنے رکھی اور خود شکرانے کے نفل پڑھنے جائے نماز پر کھڑی ہو گئی۔ رجب کو ماں کے کمرے تک پہنچا کر آپا اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

رجب روٹی کھا چکا تو ماں نے اسے دستی پنکھے سے ہوا جھلتے ہوئے کہا۔ ''جا، بہن سے معافی مانگ لے۔''

''واہ! یہ کیا بات ہوئی...... جو مارے، اس سے معافی بھی مانگو۔'' رجب علی نے نفی میں سر ہلا کر معافی مانگنے سے انکار کر دیا۔

''ماں صدقے! وہ تیرا برا تھوڑی چاہتی ہے۔ اس نے منع کیا تھا تجھے پتلی تو چلی، اس کے گھر کی طرف بھی دیکھنے سے، اس کی گلی سے بے ضرورت گزرنے سے اور تو اسی کے ساتھ دوسرے شہر چلا گیا۔ جو سنے گا، تھوکے گا ہمارے جنم میں...... جا، جا کے بہن سے معافی مانگ...... میرے لال! جو دوست ہوتا ہے، وہی روکتا ہے بری راہ سے۔ دشمن تو الٹا بری راہ لگاتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔''

رجب علی منہ پھلائے بیٹھا رہا۔

ماں نے چند ثانیے انتظار کیا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ''چل اٹھ...... دودھ دینے والی گائے کی لات بھی کھا لیا کرتے ہیں...... بہن اتنا خیال رکھتی ہے تیرا...... ایک دن مار دیا تو کیا ہوا، غلطی بھی تو تھی تیری...... شاباش اٹھ۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

آپا کے کمرے میں پہنچ کر ماں نے اسے آپا کے سامنے کرتے ہوئے اس کی سفارش کی۔ ''بڑی! یہ تجھ سے معافی مانگنے آیا ہے۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔'' آپا خفا تھی۔

''معاف کر دے...... چھوٹوں سے غلطی ہو ہی جاتی ہے...... نا سمجھ ہے یہ۔'' ماں نے رجب علی کے سر پر دھپ لگائی۔ ''چل، بہن کے پاؤں پکڑ۔''

''نہیں...... نہیں۔'' آپا نے اپنے پاؤں پرے سمیٹ لیے۔

رجب علی کو احساس ہوا، آپا واقعی بہت خفا تھی۔ آپا کی مار سے اس کے دل میں پیدا ہوئی کدورت یکلخت ندامت میں بدل گئی۔ اسے احساس ہوا کہ آپا کو ناراض کر کے اس نے اچھا نہیں کیا تھا۔ آپا کو خفا کر کے تو وہ خود بھی چین سے نہیں رہ سکتا تھا۔

دونوں ہاتھ جوڑ کر وہ کسی مجرم کی طرح آپا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''معاف کر دو آپا!'' وہ رونے لگا۔ ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ آپا اٹھی اور اس نے رجب علی کو گلے لگا لیا۔

''بیٹھ جا۔'' آپا نے کہا۔ وہ سمجھ گیا معافی مل گئی تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر آپا نے پوچھا۔ ''لے کر کیسے گئی تھی پتلی تجھے؟''

''ریل سے۔''

''واپس کیسے آیا؟''

''ریل سے۔''

''ریل کا کرایہ کس نے دیا تجھے؟''

''کسی نے بھی نہیں۔''

''پکڑا نہیں تجھے کسی نے؟''

''پکڑا تھا۔''

آپا چونکی۔ ''پھر؟''

''میں نے سچ سچ بتا دیا۔''

''کیا بتا دیا؟''

''میں نے کہا ایک عورت مجھے بہکا کے لے گئی تھی نوکری دینے...... مگر...... اس کا دھندا برا تھا...... میں بھاگ آیا ہوں۔''

''کیا دھندا تھا؟''

''آپا! وہ رات کو لڑکیاں بھیجتی تھی رکشوں میں جو صبح کو واپس آتی تھیں۔''

آپا اور ماں نے ایک دوسرے کو یوں دیکھا جیسے

رجب پر زندگی کا یہ بھید آشکار ہونے پر خجل ہوں۔

"توبہ...... توبہ!" آپا نے اپنے دونوں رخسار چھوئے۔ "اللہ معافی۔"

"مجھے اس نے رکشا چلانا سیکھنے پر لگایا تھا۔"

"اچھا!"

"ہاں...... مگر اس کے ڈیرے پر ایک روز چھاپا پڑ گیا۔ پولیس مجھے بھی لے گئی، پوچھ گچھ کی۔ میں نے کہا، جی میں تو نیا نیا آیا ہوں۔ ایک پولیس والے نے کہا، گھر واپس چلا جا۔"

"کوئی نیک روح ہوگی۔" ماں نے کہا۔

"میں بھاگ لیا...... اللہ توبہ! اب میں کبھی اس کی گلی سے بھی نہیں گزروں گا۔"

"گلی سے تو گزرنا پڑے گا تجھے، راستہ ہی وہ ہے۔" آپا بولی پھر اس نے دلسوزی سے کہا۔ "اس لیے منع کرتی تھی میں تجھے اس حرافہ کے سائے سے بھی دور رہنے کو۔ پتا چل گیا؟" آپا نے رجب علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے سمجھایا۔ "دیکھ رجب! آدمی کو بہکنے میں دیر نہیں لگتی، شیطان جو لگا ہے آدمی کے پیچھے۔ اچھا ہے تو بچ گیا ہے۔ چکی تجھے پیسا کمانے کا لالچ دے کر لے گئی تھی نا اپنے ساتھ؟"

رجب علی نے اپنا جھکا ہوا سر اثبات میں ہلا دیا۔

"پیسا بھی حلال طریقے سے کمایا ہوا اچھا ہوتا ہے۔ حرام کے راستے بہت مگر آدمی کی نہ عزت رہتی ہے نہ سکون۔ آدمی آدھی روٹی کھائے مگر حلال کی اور عزت کی۔ میں تجھے رنگ ریز کی دکان پر اسی لیے بٹھا کے آئی تھی کام سیکھ لے گا تو عزت کی روٹی کمانے کے لائق ہو جائے گا۔ بڑا اور منجھلا دونوں بھائی مزدور ہیں مگر رات کو پاؤں پھیلا کے بغیر کسی ڈر خوف کے سوتے ہیں۔ حرام کمانے والوں کو پولیس، تھانہ، کچہری کا خوف سونے بھی نہیں دیتا۔"

"آپا! مجھے دکان پر واپس بٹھا آؤ۔"

"کس منہ سے لے کر جاؤں تجھے۔ رنگ ریز شریف آدمی ہے، کیا کہے گا کہ یہ تمہارا بھائی تو بھگوڑا ہے۔ بھاگا بھی تو کس کے ساتھ۔"

رجب علی نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"کسی اور کے پاس بٹھا دے اسے۔" ماں نے تجویز دی۔

"کچھ کرنا پڑے گا اماں اس کے پاؤں باندھنے کے لیے۔"

"پاؤں باندھنے کو بیٹھی ہے نا مہرن!"

"اس کی جیب میں کچھ ہوگا تب ہی آئے گی نا مہرن...... خالی جیب پر خالہ، خالو اسے اپنی بیٹی کب دیں گے؟"

"آپا! ایک انڈوں والی مرغی لے دو مجھے...... بچے نکلواؤں گا، پھر جب وہ بڑے ہو جائیں گے تو ان کے انڈے بچے...... اپنا مرغی خانہ کھول لوں گا میں۔"

"شاباش!" آپا نے اسے تیز سی نظر سے دیکھا پھر ماں کی طرف نظر کی۔ "دیکھ رہی ہو اماں! مہرن کا ذکر ہوتے ہی یہ کیسا شیخ چلی بن گیا۔"

ماں دھیرے سے مسکرائی پھر نہایت لجاجت سے آپا سے بولی۔ "کر دے کچھ ایسا کہ یہ اپنے پیروں پہ کھڑا ہو جائے، کب تک مارا مارا پھرے گا۔ تو ہی کچھ کرے گی اس کے لیے۔"

ماں کو دل گرفتہ دیکھ کر آپا کا دل دکھی ہو گیا۔ "میں کون اماں...... اللہ کرے گا۔" آپا نے ماں کو تسلی دی پھر جارحانہ انداز میں بولی۔ "چکی کی خبر ضرور لوں گی میں۔"

رجب علی نے گھبرا کر آپا کو دیکھا۔

ماں اس سے بھی زیادہ گھبرا کر آپا سے بولی۔ "تو میرا مرا منہ دیکھے اگر اس کے منہ لگے۔"

"کیوں اماں! وہ ہمارے لڑکے کو ہم سے پوچھے بغیر دوسرے شہر لے گئی اور ہم اس سے پوچھیں بھی نا۔"

"ہمارا لڑکا کوئی دودھ پیتا بچہ تھا۔ اپنا پیسا کھوٹا، پرکھنے والے کا کیا دوش...... گندی عورتوں کے ہاتھ لمبے۔ بیٹا! ایسے ہے تو آدمی دامن بچا کر چلے...... سو کوس دور رہے۔" ماں نے رجب علی کا کان مروڑا۔ "اس کے کان اینٹھ جو میں بتاتی ہوں ایسی عورت کے ساتھ ہو لیا۔"

"ہاں، غلطی تو آدمی سے ہو جاتی ہے۔" آپا نے تائید کی۔

"غلاظت میں پتھر مارو تو چھینٹیں اپنے اوپر بھی اڑتی ہیں۔ چکی کو کچھ نہ کہنا، اپنے بھائی کا بندوبست کر۔"

آپا نے یوں اثبات میں سر ہلایا جیسے کہتی ہو "ہوں، کروں گی کچھ۔"

☆☆☆

آپا کئی دن سوچ بچار میں رہی۔ رجب علی کو آئندہ بھٹکنے سے بچانے کے لیے اس کے پاؤں باندھنا ضروری تھے۔ وہ تو خیر ہوئی جو رجب اس عورت کے چنگل سے نکل آیا ورنہ برائی کی دلدل میں ایک دفعہ پاؤں پھنس جائے تو آدمی اس دلدل میں اترتا ہی چلا جاتا ہے۔

رجب علی بھی چکی کا سامنا ہونے اور حیدر آباد سے اپنے فرار کا سبب بتانے سے بچنے کے لیے زیادہ وقت گھر میں ہی بیٹھا رہا۔ دن دن بھر گلیوں میں مارے مارے



digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

digest library.com



پھرنے کی عادت تھی، اب بھی گھبراتا تو گھر کے باہر گلی میں بیٹھ جاتا۔ وہیں یار دوست اس کے پاس چوکڑی جما لیتے۔

آپا نے اچھے برے وقت کے لیے کچھ پیسے جوڑ رکھے تھے۔ بازار میں جگہ بہت تھی، زمین کی خرید و فروخت کا رواج نہ تھا۔ جس کی جہاں مرضی ہوتی، ٹھیا جما لیتا۔ بدنیتی، بے ایمانی، چوری چکاری ایسی نہ تھی۔ اللہ کے فضل سے جو بیٹھتا، کچھ کما کر ہی اٹھتا۔

آپا نے بازار میں ایک جگہ تاک کر وہاں چھپر ڈلوایا۔ بارش سے بچاؤ کے لیے چھپر میں پلاسٹک کی تہ بھی ڈلوا دی اور چھپر تلے ایک چوکی ڈلوا کر رجب علی کو انڈے، ڈبل روٹی اور مکھن کی ٹکیوں کی دکان کھلوا دی۔ انڈے، ڈبل روٹی اور مکھن کے کاروبار کا خیال آپا کو اس لیے سوجھا کہ آپا کا میاں پہلی بیوی کے گھر سے جب بھی ایک دو دن کو اس کے پاس آتا تو اسے ناشتے میں انڈے، ڈبل روٹی اور مکھن کی چاہت ہی ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں بستی کے اس پار پختہ مکانوں اور کوٹھیوں کے اکثر رہائشی بھی انڈے، ڈبل روٹی اور مکھن کے خریدار تھے۔

رجب علی دکاندار بن گیا۔

آپا نے اپنی سمجھ بوجھ سے اس کے پاؤں باندھ دیے تھے۔

☆☆☆

حمیدہ اور قوال کا آپس میں کیسے رابطہ ہوا، معاشقہ کیسے پنپا؟ بستی والوں کو پتا نہ چلا۔ پہلے سے شادی شدہ قوال سے اپنے عشق کی خاطر حمیدہ نے شوہر سے طلاق لے کر قوال سے شادی کر لی اور بستی سے ایسی گئی کہ پھر پلٹ کر نہیں آئی۔

ناظمہ اپنے اور دلاور کے عشق کی منڈھے چڑھی بیل اپنی ماں کے ہاتھوں بے رحمی سے کاٹے جانے پر سخت دلبرداشتہ تھی۔ شیرو سے شادی کے بعد وہ ماں کے گھر کا راستہ ہی بھول گئی تھی۔ ماں ان سے ملنے اور اسے کچھ لینے دینے کے لیے اس کے سسرال گھر آتی تو وہ ماں سے سیدھے منہ بات نہ کرتی، اس کی دی گئی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتی۔ شیرو اور اس کی ماں کو دلاور سے اس کے معاشقے کا علم تھا مگر دونوں میں سے کسی نے کبھی اسے اس کے سابقہ عشق کا طعنہ دیا نہ اس پر کوئی سختی کی۔ شاید اس لیے کہ ماں اور بیٹا دونوں ہی کو احساس تھا کہ شیرو کی بستی بھر میں بدنامی کے باعث غیر تو کیا، شیرو کے اپنے رشتے داروں میں سے بھی کوئی اسے اپنی بہن، بیٹی دینے کو تیار نہ تھا بلکہ کانوں کو ہاتھ لگاتے کہ اس بدمعاش کو اپنی لڑکی دے کر اس کی قسمت پھوڑنی تھی۔ ناظمہ سے اس کی شادی لاٹری نکل آنے کے مترادف تھی جو ناظمہ کی ماں نے دلاور سے اپنی ناپسندیدگی اور ناظمہ کے اس سے عشق کے باعث انتقاماً کر دی تھی۔

ناظمہ سے شادی کے بعد شیرو نے خود کو بالکل ہی بدل لیا۔ نہ وہ پہلے کی طرح سینہ باہر نکالے بدمعاشوں کی طرح بستی میں ڈکراتا پھرتا، نہ جوا کھیلتا۔ نشہ برائے نام کر دیا، چوری چکاری کی وارداتوں سے الگ ہو گیا۔ بستی کے راج مستری بابو بھائی کے ساتھ اس نے مزدوری پر جانا شروع کر دیا۔ بابو بھائی پہلے تو ڈرا کہ شیرو کوئی گل کھلانے کو اس کے ساتھ نہ لگا ہو لیکن شیرو نے قسم کھا کر اس سے کہا۔ ”میں اپنی بیوی کے لیے حلال روزی کمانا چاہتا ہوں۔ کل کو بچے بھی ہونے ہیں، حرام کھائیں گے تو اچھے کب نکلیں گے۔ میں اپنے بیوی بچوں کو حرام نہیں کھلاؤں گا۔“ بابو بھائی نے اس کا اعتبار کر کے اسے اپنے ساتھ مزدوری پر لے جانا شروع کر دیا۔ برے آدمی کو اللہ کے کرم سے بدلتے اور راہِ راست پر آتے کتنی دیر لگتی ہے۔

مگر شیرو کے بدلنے سے ناظمہ کی اس سے بے رخی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ اس کی بیوی ضرور تھی مگر اس کا شیرو سے رشتہ بے روح اور بے حدت تھا۔ وہ اس کے گھر میں ساری گھرداری کرتی، صبح کو گھر سے جاتا تو دوپہر کو کھانے کے لیے توشہ دان میں روٹی بھاجی بھی ڈال کر دیتی۔ شام کو گھر آتا تو اس کے سامنے روٹی، پانی بھی رکھتی۔ اس کے میلے کپڑے بھی دھوتی مگر اپنے دل میں اس کے لیے محبت کی ایک چنگاری بھی نہ پاتی۔ اس کا دل و دماغ تو اب بھی دلاور کا اسیر تھا۔

ناظمہ اور شیرو کی شادی بہ مشکل ڈیڑھ سال رہی۔ شیرو کی ماں کی منتوں مرادوں کے باوجود ناظمہ امید سے نہ ہو سکی، پھر اچانک ایسا ہوا جس کا سان گمان بھی نہ تھا۔

شیرو ایک شام کام سے لوٹا تو اس نے رات کو سونے سے پہلے اپنی ماں اور ناظمہ سے کہا۔ ”مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔“

ماں نے کہا۔ ”ہاں، غلطی تو ہے تیری۔ اب تک پوتا نہیں دیا میری گود میں۔“

شیرو نے ناظمہ کو دیکھا اور بولا۔ ”ماں کی یہ آرزو پوری کر دیتی تو اچھا تھا...... خیر، تیری مرضی۔“ شیرو اٹھا اور کچھ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”اچھا بھئی، میں تو چلا...... تم دونوں کا خدا حافظ۔“

ماں کا دل دھڑکا اور اس نے ناظمہ سے کہا۔ ”یہ آج کیسی باتیں کر رہا ہے؟“ ناظمہ چپ رہی۔

صبح شیرو جاگا نہیں۔

"دفع...... میں غیر مرد سے کیوں ملوں؟"

"اس کا اعتبار جو نہیں آرہا تمہیں۔"

"جیسے بہن کہہ رہی ہے، اسے عقل میں بٹھا۔" ماں جو پاس ہی بیٹھی دونوں کی باتیں سن رہی تھی، بولی۔

"اسے آزمانا ہو تو اس سے پوچھنا، لندن جاؤں میں کیسے؟" آپا بولی۔

"ہاں۔" ماں نے تائید کی۔

"ٹھیک ہے۔"

دو دن گزرنے کے بعد رجب علی نے پھر اس شخص کا ذکر کیا۔ "آپا! میں نے پوچھا تھا اس سے۔ وہ کہنے لگا میں تمہیں ووچر منگوا دیتا ہوں۔ ٹکٹ خرید کر ہوائی جہاز میں بیٹھنا، لندن پہنچ جاؤ گے۔"

"ووچر کیا ہوتا ہے؟"

"میں نے پوچھا تھا، کہنے لگا لندن سے تمہارے نام کا خط آجائے گا۔ بس اس خط کے ذریعے چلے جانا۔ اس آدمی کے رشتے دار بھی گئے ہیں لندن اسی طریقے سے۔"

"دفع، تو اس چکر میں نہ پڑ۔"

"آپا! جانے دو...... کچھ پیسے کما کے واپس آجاؤں گا۔"

"نہ ماں صدقے...... اپنا گھر بھلا۔" ماں نے کہا۔

"اماں! وہ کہہ رہا تھا ادھر اچھا بھلا پیسا کما لیتے ہیں لوگ۔"

"تجھے پیسے سے کیا لینا دینا۔ پیٹ بھر روٹی مل جائے بہت۔"

"شادی نہیں کرنی میری؟"

"اچھا......! شادی کے لیے تجھے باہر جانے کی لگی ہے؟" آپا مسکرائی۔

"مذاق کر رہا ہوں آپا!" رجب علی شرما گیا۔ "بس، پیسا کمانا ہے۔"

"پیسے کی لت کیوں لگ گئی تجھے؟" ماں نے کہا۔

"اماں! پیسے والوں کی عزت ہوتی ہے، لوگ جھک کر سلام کرتے ہیں۔"

"نہ کریں سلام...... ہم ایسے ہی بھلے...... اور بیٹے یہ کس نے کہا تجھ سے کہ عزت پیسے والوں کی ہوتی ہے؟ پیسا تو برے کام کرنے والوں کے پاس بھی بہت ہوتا ہے، عزت تو نہیں مل جاتی انہیں۔ عزت ملتی ہے شریفوں کو، پرہیزگاروں کو، اللہ، رسول ﷺ کے رستے پر چلنے والوں کو۔"

"اماں! اللہ، رسول ﷺ کی باتیں بہت کرتا ہے وہ۔ ایمان سے، اچھا آدمی ہے۔"

"اچھا ہو یا برا، تو اس کی باتوں میں نہ آ۔ ایک سے ہزار میں تجھے لندن نہیں جانے دوں گی۔"

ماں نے ناظمہ سے کہا۔ "کیا آج شیرو کام پر نہیں جاتا؟"

"پتا نہیں۔" ناظمہ بے رخی سے بولی۔

شیرو کی ماں اسے جگانے گئی تو وہ ہمیشہ کے لیے جا چکا تھا۔ بستی میں جس نے شیرو کی اچانک موت کی خبر سنی، دانتوں تلے انگلی داب لی۔ جتنے منہ تھے، اتنی باتیں۔ کوئی کہتا، ناظمہ نے شیرو کو کھانے میں کچھ دے دیا۔ کوئی کہتا، شیرو کو بیوی کی بے رخی کا صدمہ مار گیا۔ شیرو کی ماں بھی وہم میں پڑ جاتی اگر اپنی زندگی کی آخری رات شیرو نے خلاف عادت غیر معمولی باتیں نہ کی ہوتیں اور ناظمہ بھی اپنے ہاتھ شیرو کی موت سے پاک سمجھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شیرو کی موت طبعی تھی۔ رہا اس کی بے رخی سے شیرو کے مرجانے کا تعلق، تو وہ مجبور تھی۔

ناظمہ نے عدت اپنی ساس کے ساتھ اس کے گھر میں گزاری۔ ناظمہ کی ماں اس دوران خیر خبر کے لیے آتی جاتی رہی۔ عدت ختم ہونے کے بعد ناظمہ کی ساس نے روتے ہوئے اس کی ماں سے کہا۔ "میرا شیرو تو چلا گیا، میں نے بھی مرنا ہے، تو نے بھی مرجانا ہے۔ ناظمہ اکیلی زندگی کیسے گزارے گی؟ اس کا دوبارہ گھر بسا دے۔"

دلاور ابھی کنوارا ہی تھا۔ ناظمہ کی ماں خود دلاور کے گھر گئی اور اس نے دلاور کے بھائی اور بھاوج کے سامنے ہاتھ جوڑ کر دلاور کے لیے ناظمہ کا رشتہ لینے کی بات کی۔ رشتہ ہو گیا، دلاور اور ناظمہ کی شادی ہو گئی۔

☆☆☆

رجب علی ایک روز دکان سے بچا ہوا سامان تھیلے میں ڈال کر گھر واپس آیا تو اس نے کھانا کھاتے ہوئے آپا کو بتایا۔ "کوٹھیوں کی طرف سے ایک آدمی دوسرے تیسرے دن ڈبل روٹی، انڈے لینے آتا ہے دکان پر۔ آج وہ مجھ سے کہنے لگا، تم شریف اور محنتی لڑکے ہو، لندن والوں کو کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ وہاں چلے جاؤ، ہو سکتا ہے یہاں سے اچھے پیسے کما لو، ادھر تو لکا ماری ہے۔"

"خبردار!" آپا بولی۔ "پنکی کے چکر سے نکل کے تو کسی اور کے چکر میں نہ پڑ جائیو۔"

"نہیں آپا! شریف آدمی ہے۔ اتنی لمبی داڑھی اور سر پر ٹوپی لگا کے رکھتا ہے۔"

"خود کو شریف ظاہر کرنے کو لوگ روپ دھار لیتے ہیں۔ دنیا بڑی خراب ہے رجب!"

"آپا! تم خود مل کے دیکھو...... نور ٹپکتا ہے اس کے چہرے سے۔"

digest.library.com


"حفیظ پکوڑے والا بتا رہا تھا، لندن میں سڑکیں شیشے کی ہیں اور سڑکوں پر نوٹ پڑے رہتے ہیں، جتنے مرضی آئے اٹھالو۔"

"جو مزہ اپنے ہاتھوں سے کمانے میں ہے رجب، وہ سڑکوں پر سے اٹھانے میں نہیں۔" آپا بولی۔

"نہیں اٹھاؤں گا آپا! میں تو حفیظ پکوڑے والے کی بات کررہا ہوں، وہ ایسے بول رہا تھا۔ میں محنت سے ہی کماؤں گا۔"

"ویسے تو ہے شیخ چلی کے خاندان سے۔"

"کیوں...... کیوں؟"

"لندن جاؤں گا...... پیسا کماؤں گا...... ارے کمانے والوں کو یہاں تھوڑا پیسا...... خالی ہاتھ آنے والے یہاں آکر سیٹھ بن گئے...... سیٹھ۔"

"تم دیکھنا، میں بھی سیٹھ بنوں گا لندن جاکر۔"

"ماں صدقے! گھر کی آدھی، باہر کی پوری سے بھلی۔" ماں نے کہا۔

"چھوڑو اماں! پرانی ہوگئیں تمہاری باتیں۔"

"دکان پر بیٹھ کے بہت باتیں بنانی آگئیں تجھے۔" آپا بولی۔

"ہاں، سگریٹ کھوکھے والا کہتا ہے، دکانداری سے آدمی بہت سیکھتا ہے...... تذربہ ہوتا ہے تذربہ۔"

"تذربہ نہیں، تجربہ۔" آپا نے تصحیح کی۔

"ہاں، ہاں وہی۔"

ماں اداس ہورہی تھی کہ رجب اب دوسرے شہر چھوڑ، دوسرے ملک جانے کے چکر میں پڑ رہا تھا۔

☆☆☆

بیس پچیس دن یا شاید مہینا ہی گزرا ہوگا کہ ایک روز رجب علی اپنے ہاتھ میں ایک لفافہ لیے خوش خوش دکان سے گھر آیا۔ "آپا! یہ دیکھو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے لفافے کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے...... کس کا خط آگیا جو تو اتنا خوش ہوکے دکھا رہا ہے...... کیا مہرن نے خط بھیج دیا تجھے؟ اسکول تو پڑھ رہی ہے وہ، خط لکھنا آگیا ہوگا۔"

"آپا! یہ دو چھ ہے دو چھ...... میرے نام کا۔ اسی آدمی نے اپنی کوٹھی کے پتے پر منگوا کر دیا ہے مجھے۔ بس اب ٹکٹ خریدوں گا اور ہوائی جہاز میں بیٹھ کے پھر سے لندن اڑجاؤں گا۔"

"ذرا دکھا تو۔"

"نہیں، نہیں۔ اسے میں اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ تم بس میری تیاری کرادو۔ ہاں، وہی جس نے دو چھ منگوا کے دیا ہے، بول رہا تھا لندن میں کرتہ پجاما نہیں چلتا، کوٹ پتلون لینی ہوگی۔ پان کی دکان والا بتا رہا تھا، لیٹ ہوس (لائٹ ہاؤس) پر لنڈا بازار ہے، وہاں فس کلاس کوٹ پتلون مل جاتے ہیں۔"

"اے او شیخ چلی! کہاں سے لے گا تو ہوائی جہاز کا ٹکٹ اور کیسے خریدے گا کوٹ پتلون؟ باتوں سے چیزیں نہیں آتیں، پیسا چاہیے ہوتا ہے، پیسا۔"

"تم ہونا، کسی سے ادھار لے لینا۔ پیسا کمانے ہی تو جارہا ہوں، ادھار اتار دوں گا۔"

"تو آگیا۔" ماں نے آپا کے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہاں، آگیا اماں! اور اب یہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اڑنے کی باتیں کررہا ہے۔ اسی نے جس نے اسے لندن جانے کا مشورہ دیا تھا، اس کا خط بھی منگوا دیا لندن سے۔" آپا بولی۔

"یہ دیکھو۔" رجب علی نے اترا اترا کر اپنے ہاتھ میں پکڑا لفافہ دکھایا۔ ماں دم بخود رہ گئی۔

"نہ ماں صدقے! جو لیے میں دے دے اسے، جل کے راکھ ہوجائے۔" ماں گڑگڑائی۔

"اماں! لندن جاؤں گا...... لندن جا کے پیسے بھیجوں گا تمہیں۔"

"ایسا پیسا نہیں چاہیے مجھے جو میری اولاد کو مجھ سے دور کردے۔ دو وقت روٹی مل جاتی ہے پیٹ بھرنے کو، پروردگار کا شکر ہے۔ تو، تو میرے پیٹ کی کھرچن ہے...... میں تجھے دور نہیں جانے دوں گی۔"

"اماں! گھر بناؤں گا تمہارے واسطے، حج کراؤں گا تمہیں پیسا جوڑ کے۔"

ماں نے ٹھنڈی سانس بھری، رجب علی نے اس کی کس دیرینہ آرزو پر انگلی رکھ دی تھی۔

"حج نصیبوں سے ہوتا ہے میرے لال! بلاوا آجائے تو خرچہ غیب سے نکل آتا ہے۔" ماں آنکھیں دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

"اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" آپا بولی۔

"تم بھی اماں کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں آپا؟"

"اماں ٹھیک تو کہہ رہی ہیں، حج نصیب سے ہوتا ہے۔"

"تو لندن جانے کی باتیں کررہا ہے، میں تیرے پیروں میں رسی ڈال دوں گی۔" ماں نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ، آج پکایا کیا ہے؟"



Scanned with CamScanner

"جب آئے گا، ایک ہی سوال...... آج پکایا کیا ہے؟"
آپا نے رجب کو ٹیڑھی نظر مگر خواہرانہ محبت سے دیکھا۔
"یاد کیا کروگی۔"

"پھر وہی۔" آپا نے ماں کی دل گرفتگی کے پیش نظر اسے پھر اسی موضوع پر بات کرنے سے روکا۔

اس وقت تو وہ چپ ہو رہا مگر اگلے کئی دن وہ مسلسل آپا کی منت سماجت میں لگا رہا کہ وہ کچھ جوڑ توڑ کر کے، کسی سے قرض لے کر اس کے لندن جانے کا بندوبست کر دے۔ وہ جانتا تھا صرف آپا ہی اس کے لیے ایسا کر سکتی تھی۔

"ایک ایک پیسا چکا دوں گا آپا!" اس نے اپنا عہد جاری رکھا۔

"اور جو یہ دکان میں نے تجھے کھول کر دی، یہ کون چلائے گا؟" آپا کے نزدیک دکان ایک قابلِ قدر اثاثہ تھی۔ مفت کا ناشتا گھر آ جاتا، دو پیسے بھی بچ جاتے۔

"جس کو تمہاری مرضی ہے، دے دینا۔"

"تجھے پتا ہے کتنی مشکل سے میں نے تیری دکان کھلوائی تھی۔ کچھ اپنی جمع پونجی سے، کچھ برابر والی پڑوسن سے لے کر۔ خیر، چکا دیا میں نے اس کا ادھار۔" آپا نے جتایا۔

"بس، آخری بار اور احسان کر دو۔ حفیظ کہہ رہا تھا لندن جانے والے امیر ہو جاتے ہیں۔"

"ماں کا دل دکھا کر جائے گا؟" آپا نے اسے ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔

"ارے آپا! اماں تو بس اپنی محبت دیکھتی ہیں، میری آئندہ زندگی نہیں دیکھتیں۔ کیا ساری زندگی یہیں پڑا بھائیوں کے نخرے اور بہنوں کی پریشانیاں دیکھتا رہوں گا۔ جانے دو تم لوگ مجھے...... میری اچھی آپا! لے لو نا کسی سے ٹکٹ کے پیسے۔ حفیظ کہہ رہا تھا کوٹ پتلون وہ دلوا دے گا مجھے لیٹ ہوس سے۔"

"وہ کیوں دلوا دے گا...... ہم کوئی مر گئے ہیں؟ چپ کر کے بیٹھ، شرافت سے دکان چلا۔ اللہ اسی میں برکت دے گا۔"

"لگا ماری ہے آپا! دو چار ڈبل روٹیاں بک گئیں، درجن، ڈیڑھ درجن انڈے چلے گئے، پاپے تو کم ہی نکلتے ہیں۔ لندن میں تو سنا ہے پیسا سڑکوں پر چھما چھم برستا ہے۔"

"دفع کر...... تو کوئی اللہ کرے فقیر ہے جو سڑکوں پر سے پیسا چننے جائے گا۔ جا اپنے وطن میں مل رہا ہے، اسی پر شکر کر۔"

آپا کی کوئی تاویل رجب علی کے دل سے لندن جانے کا خیال محو نہ کر سکی۔ وہ مسلسل آپا کی خوشامد میں لگا رہا۔

ماں اسے مسلسل منع کرتی رہی۔ رجب علی کے پردیس جانے کا خیال ہی ماں کے لیے روح فرسا تھا۔ اس کی اولاد میں وہ سب سے چھوٹا تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، اس کی عمر کے لڑکے تو بستی کی گلیوں میں کنچے، گلی ڈنڈا، پکڑم پکڑائی، کبڈی، چھپن چھپائی اور اسی طرح کے دوسرے کھیل کھیل رہے تھے اور وہ پیسا کمانے کے لیے سمندر پار جانے کی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے کسی قیمت پر اپنے سے دور نہ بھیجنا چاہتی تھی۔

رجب علی کی مسلسل ضد دیکھتے ہوئے آپا مجبور ہو گئی۔ کچھ اپنے پاس سے، کچھ قرض ادھار کر کے اس کے سفر کی تیاری کا ارادہ کیا مگر ماں کو سمجھانا اور رجب علی کو لندن جانے کی اجازت دلوانا کارِ دشوار ہوا۔

"رجب کی جگہ تیری اولاد تجھ سے دور جانے کو کہتی نا تو پھر تجھ سے پوچھتی میں۔" ماں نے بگڑ کر آپا سے کہا۔

"اماں! رجب کہنے کو میرا بھائی ہے مگر مجھے اپنے بچوں کی طرح پیارا ہے اس سے۔ پیدا ہوا تو سب سے پہلے میری ہی گود میں آیا تھا۔"

"سمجھا اسے...... اپنا گھر، اپنی زمین سب سے اچھی۔"

"بہت سمجھایا، نہیں سنتا۔ اسے جانے کی لگی ہے اماں! کہیں اور نکل گیا...... الٹے سیدھوں کے راستے پڑ گیا تو اور مصیبت۔ میں تو کہتی ہوں جانے دو۔ دور کے ڈھول سہانے، دھکے کھا کر واپس آ جائے گا۔"

ماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

رجب آیا تو ماں نے اس سے کہا۔ "وعدہ کر کہ تو جلدی واپس آئے گا اور وہاں کی میموں کے چکر میں نہیں پڑے گا۔"

"وعدہ اماں!" رجب علی خوش ہو کر بولا۔ "میم کو گولی مارو، میں تو پیسے کے لیے جاؤں گا۔"

ماں نے رجب کو حسرت سے دیکھا۔ "تجھے پیسوں کا چسکا کیوں لگ گیا ماں صدقے؟"

"کیونکہ خالی جیب میں رذالت ہے اماں! کوئی نہیں پوچھتا۔"

ماں نے اسے تعجب سے دیکھا۔ زندگی کی سختیوں نے اسے وقت سے پہلے ہی زندگی کی سب سے تلخ حقیقت سے آشنا کر دیا تھا۔

**خوشحال زندگی کی چاہ میں بیرون ملک جانے والے نوجوان کی مسافرت کا احوال آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے**

digest library.com



Scanned with CamScanner